بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالب الفرقان

(قرآن مجید کی تفسیر ــــ خود ــــ قرآن مجید سے)

جلد اوّل

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

نام کتاب	------------------	مطالب الفرقان (جلد اول)
مصنف	------------------	پرویز
شائع کردہ	------------------	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
		25-B گلبرگ II لاہور- 54660
		email: trust@toluislam.com
		web: www.toluislam.com
ایڈیشن اول	------------------	اکتوبر 1975ء
ایڈیشن چہارم	------------------	اگست 2000ء (بلا ترمیم)
طابع	------------------	**دوست ایسوسی ایٹس**
مطبع	------------------	عالمین پریس، لاہور

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

آئینۂ مطالب

عنوان	صفحہ
آغازِ سخن	ع
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	
١۔ بسم اللہ وحیٔ خداوندی ہے	١
٢۔ حرف بؔ کے معنی	١
٣۔ اسمؔ کے معنی	٢
٤۔ بسم اللہ کی غایت	٢
٥۔ قرآنی افہام وتفہیم کا مقصود (اس کی مزید تشریح ص٢٤ پر ملے گی)	٢
—— (٠) ——	
سُورۃ فاتحہ (١ / ١—٧)	
حمد	
١۔ ایک اعتراض کا جواب	٣
٢۔ حمدؔ کا مفہوم	٣
٣۔ حمدِ خداوندی' کارگہٗ کائنات پر غور وفکر ہی سے کی جاسکتی ہے۔	٤
٤۔ یہ مومنین کا فریضہ ہے.	٥
٥۔ قرآن کی رو سے علماء کون ہیں؟	٦
یہی مومن، متقی اور اربابِ عقل وبصیرت ہیں۔	٦
٦۔ قرآن میں غور وتدبر بھی وجۂ حمدیت ہے	٧
٧۔ احمدؔ ومحمدؔ ومقامِ محمود	٧
٨۔ ظالم اقوام کی جڑ کٹ جانا وجہ حمدِ خداوندی ہے	٧
٩۔ حمد وملک۔ جمال وجلال کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی	٨
اللہ	
١٠۔ اللہ ـ اَلْ + اِلٰہ سے مرکب ہے	٨
١١۔ اللہ کے معنی ـ جس کی اطاعت ومحکومیت اختیار کی جائے۔	٩
١٢۔ اللہ کا عالمگیر تصوّر	٩

عنوان	صفحہ
۱۳۔ لیکن اللہ کا حقیقی تصور صرف قرآنِ کریم میں ہے۔	۱۰
اسی لئے ایمان وہی ایمان ہے جو قرآن کے مطابق ہو۔	۱۰
۱۴۔ تمام اہل مذاہب سے ایمان باللہ کا مطالبہ۔	۱۰
۱۵۔ خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔	۱۱
۱۶۔ انسان صرف اسکی طبیعی زندگی سے عبارت نہیں۔	۱۱
اسکے علاوہ اس کی ذات بھی ہے۔	۱۱
۱۷۔ صفاتِ خداوندی، انسانی ذات کی نشو ونما ماپنے کا معیار ہیں۔	۱۲
۱۸۔ ذاتِ انسانی کی نشو ونما اجتماعی زندگی ہی میں ممکن ہے	۱۲
۱۹۔ انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے آسمانی راہنمائی کی ضرورت	۱۳
۲۰۔ سیکولرازم اس کی قائل نہیں	۱۳
اس انکار کا نتیجہ فسادِ آدمیت ہے	۱۳
۲۱۔ صرف قوانینِ فطرت کے خالق کو ماننا بھی سیکولرازم ہے۔	۱۳
۲۲۔ وہی سما کا اللہ ہے وہی ارض کا اللہ۔ خارجی کائنات کی طرح انسانی دنیا میں بھی اسی کے قوانین کارفرما ہونے چاہئیں	۱۴
۲۳۔ خود اپنے جذبات کو اللہ بنا لینے والے	۱۴
۲۴۔ جذبات اور علم و ہدایت کا باہمی تعلق	۱۴
۲۵۔ کتاب اللہ (قرآن کریم) کو ضابطۂ اقتدار ماننے والے ہی مومن کہلا سکتے ہیں۔	۱۵

مضمون	صفحہ
رب	
۲۶۔ رب کے معنی — نشو ونما دینے والا	۱۶
۲۷۔ کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی؟ کوئی نہیں بتا سکتا۔	۱۶
۲۸۔ لیکن وجود میں آنے کے بعد یہ کس طرح نشو ونما پا رہی ہے علومِ سائنس اس کی نشاندہی کرتے ہیں	۱۷
۲۹۔ اسے نظریۂ ارتقاء کہا جاتا ہے	۱۷
یہی خدا کا نظامِ ربوبیت ہے	
۳۰۔ لفظ رب کا ترجمہ بھی کسی زبان میں نہیں کیا جا سکتا	۱۷
عالمین	
۳۱۔ کائنات، ہستی باریتعالیٰ کی علامت (عالَم) ہے۔	۱۸
۳۲۔ تخلیقِ خداوندی میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔	۱۸
۳۳۔ اجرامِ فلکی میں زندگی	۱۹
یہ سب عالمین میں داخل ہیں۔	۱۹
۳۴۔ عالمین، کے معنی جملہ نوعِ انسان یا اقوامِ عالم۔	۱۹
قرآن، عالمگیر انسانیت کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے	۲۰
۳۵۔ رب العالمین کے معنی، عالمگیر ربوبیت کا ضامن۔	۲۰
۳۶۔ اسلامی نظام تمام نوعِ انسان کی پرورش کا ذمہ دار ہوگا۔	۲۰
اس طرح خدا کی صفتِ عالمگیر ربوبیت کا عملی ظہور ہوگا	..
(۲) الرحمٰن۔ الرحیم	
۳۷۔ رحمت کے معنی سامانِ نشو ونما کا بلا مزد و معاوضہ ملنا۔	۲۰

مضمون	صفحہ
۳۸۔ رحیم اور رحمٰن کا ترجمہ صحیح مفہوم سامنے نہیں لاتا۔	۲۱
۳۹۔ نظامِ ربوبیت ارتقائی ہے۔	۲۱
۴۰۔ ارتقاء کی دو شکلیں ـــ عمومی اور فجائی	۲۱
عمومی ارتقا خدا کی صفتِ رحیمیت کی مظہر ہوتی ہے۔	۲۲
اور فجائی ارتقا، رحمانیت کی	
۴۱۔ ابن مسکویہ اور نظریۂ ارتقاء	۲۲
طفرہ کا نظریہ، فجائی ارتقا کا پیش خیمہ تھا۔	۲۲
۴۲۔ تخلیق انسانی کے مراحل	۲۲
۴۳۔ انسانی ذات کی نشوونما، وحی کی راہ نمائی سے ہوتی ہے۔	۲۳
جسے خدا نے رحمت کہہ کر پکارا ہے۔	
۴۴۔ یہ علم (وحی) خدا سے انبیاءؑ کو براہِ راست ملتا تھا	
اس میں خدا کی صفتِ رحمانیت کی نمود ہوتی تھی۔	۲۳
۴۵۔ ختمِ نبوت سے وحی اپنی تکمیل تک پہنچ گئی	۲۴
۴۶۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی مزید تشریح	۲۴
ملوکیت کی تخریب کاریاں	
حکومتِ خداوندی کی تعمیر سامانیاں	
داستانِ ملکۂ سبا اور حضرت سلیمانؑ	..
۴۷۔ رحم کا صحیح مفہوم کیا ہے؟	۲۵
۴۸۔ عیسائیت کا (باطل) نظریہ	..
۴۹۔ یہی تصور ہمارے ہاں بھی بار پا گیا۔	۲۶
۵۰۔ دین کی عمارت قانونِ مکافاتِ عمل پر استوار ہے	..
یعنی عدل پر۔	
۵۱۔ عدل اور رحم تو دو متضاد عناصر ہیں،	۲۶
۵۲۔ قرآن ان میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔	..
۵۳۔ رحم کا قرآنی مفہوم۔	..
اس سے مراد، تخریب یا نقصان کے ازالہ کی گنجائش ہے	..
۵۴۔ توبہ کا مفہوم ـــ بازآفرینی کا امکان۔	۲۶
۵۵۔ مذاہبِ عالم میں اس کا تصور نہیں۔	۲۷
۵۶۔ بازآفرینی کا یہ امکان خدا کی رحمت ہے	
اور اس سے انکار مایوسی اور کفر۔	
۵۷۔ تلافیٔ مافات کا اصول ـــ ان الحسنات یذھبن	
السیئات۔	

(۳) مالک یوم الدّین

مضمون	صفحہ
۵۸۔ "مالک" کے لغوی معانی	۲۸
۵۹۔ انسانوں کے لئے یہ لفظ استیلاء اور استبداد	..
کا مفہوم لئے ہوگا۔	
خدا کے متعلق اس کا مفہوم اس سے الگ ہوگا۔	..
۶۰۔ یوم ـــ بمعنی زمانہ، مرحلہ، دور، یا وقت۔	۲۹
۶۱۔ الدین ـــ بڑا وسیع المعانی لفظ۔	..
۶۲۔ دینِ خداوندی خارجی کائنات میں جاری و ساری ہے	۳۰
ہر شے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے۔	
۶۳۔ وہ نظام جسے قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کیا	..
جائے، الدین کہلائے گا۔	
۶۴۔ اسے استخلاف فی الارض یا اسلامی مملکت کہا جاتا ہے	..

مضمون	صفحہ
۶۵۔ دین (اسلامی نظام) کے دو اہم گوشے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ اور اطاعتِ رسولؐ	۳۱
۶۶۔ رسول اللہؐ کے بعد یہ نظام خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کی شکل میں آگے چلا جس میں تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوتے تھے۔	۳۲
۶۷۔ یوم الدین میں کسی انسان کا کسی دوسرے انسان پر کوئی زور نہیں ہوگا۔ کوئی جبر و استحصال نہیں ہوگا۔	۳۳
۶۸۔ مفاد پرست گروہوں کی طرف سے اس نظام کی مخالفت۔ ملوکیت، برہمنیت اور نظامِ سرمایہ داری۔	۳۳
۶۹۔ مذہبی پیشوائیت کی ٹیکنیک — امورِ دنیا اور امورِ مذہب میں ثنویت۔ اس سے دین' مذہب میں تبدیل ہوجاتا ہے اور نظامِ حکومت سیکولر بن جاتا ہے	..
۷۰۔ اسلام کے ساتھ یہی بیتی۔ اس وقت دنیا میں دین کہیں نہیں۔	۳۴
۷۱۔ دین سے مراد ہے کتاب اللہ کی حکمرانی، قانون کی اطاعت۔	۳۴
۷۲۔ خدا کے اقتدار (مالک یوم الدین) کا دائرہ یہی دنیا نہیں، آخرت کی زندگی بھی ہے۔	..
(۴) ایاک نعبد	
۷۳۔ دین' مذہب میں تبدیل ہوا' تو عبادت کا ترجمہ "پرستش" کر دیا گیا	۳۵
۷۴۔ عبادت کے معنی محکومیت اختیار کرنا۔	۳۵

مضمون	صفحہ
اپنی جملہ صلاحیتوں کو قوانین و اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔	۳۶
۷۵۔ عبادت اپنی آزاد مملکت (اسلامی نظام) ہی میں ہوسکتی ہے۔	۳۶
۷۶۔ خدا کی عبادت (محکومیت) اختیار کرنے سے انسان ہر نوعِ غلامی سے آزادی حاصل کر لیتا ہے یہ بہت بڑی نعمت ہے۔	۳۷
(۴) ایاک نستعین	
۷۷۔ اپنی ذات میں اعتدال اور توازن پیدا کرنے کی توفیق طلب کرنا۔	۳۷
۷۸۔ دعا کا مفہوم — شدتِ آرزو کا بیساختہ زبان پر آجانا۔	۳۸
۷۹۔ عبدِ مومن کی آرزوئیں قوانین و اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔	۳۹
۸۰۔ دعا کے ساتھ عمل (کام کرنے) کی ضرورت	..
(۵) اھدنا الصراط المستقیم	۴۰
۸۱۔ ہدایت' واضح اور غیر مبہم راہ نمائی کو کہتے ہیں	۴۱
۸۲۔ تمام اشیائے کائنات کو راہ نمائی	..
اسے ان کی جبلت اور قرآن کی اصطلاح میں وحی کہا جاتا ہے۔	..
۸۳۔ انسانوں کے لئے راہ نمائی	..
وحی بذریعہ انبیاء کرامؑ۔	۴۲

مضمون	صفحہ
اسی کو ان کی کتاب کہا جاتا تھا	۴۲
۸۴۔ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ اس لئے وہ اس ہدایت کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کے لئے مختار ہے۔	۴۳
۸۵۔ یہ راہ نمائی کتاب اللہ سے ملے گی اور اسے حاصل کرنے کے لئے محنت کرنی ہوگی۔	۴۳
۸۶۔ منزل پر پہنچنے کے لئے سفر اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی کو عمل کہتے ہیں۔	۴۴
صراطِ مستقیم	
۸۷۔ ایسا راستہ جس میں نہ پیچ و خم ہو نہ اونچ نیچ۔	۴۴
۸۸۔ الصراط میں ایک عظیم حقیقت مضمر ہے۔	''
۸۹۔ فکرِ انسانی کی بنیادی غلطی۔ زندگی کی حرکتِ دوری سمجھ لی گئی۔	''
اس کے تباہ کن نتائج ــــ نظریۂ تناسخ۔	۴۴
عقیدۂ نجات۔	۴۵
۹۰۔ اس سے حرکت اور عمل سب بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔	''
۹۱۔ اہلِ تصوف کا عقیدہ ــــ واصل بالحق ہو جانا۔	''
۹۲۔ قرآن نے ان تمام نظریات کو باطل قرار دیا۔ اس نے کہا کہ زندگی کی حرکت دَوری نہیں صراطی ہے۔ اس کا مقصد آگے بڑھنا ہے۔	۴۶
۹۳۔ خدا بھی صراطِ مستقیم پر ہے، کا مفہوم	۴۷
۹۴۔ سُبُل السلام (سلامتی کے راستے) کیا ہیں؟	''
(۴) انعمت علیھم	

مضمون	صفحہ
۹۵۔ نعمت کے معنی	۴۸
۹۶۔ منعم علیہ قوموں کے امتیازی نشانات۔	۴۹
۹۷۔ نعمائے خداوندی کام کرنے سے ملتی ہیں۔	۵۲
۹۸۔ ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔	۵۲
۹۹۔ کفرانِ نعمت سے یہ نعمتیں چھن جاتی ہیں اور قوم بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔	۵۳
۱۰۰۔ نفسیاتی تبدیلی سے تغیرِ نعمت ہوتا ہے	۵۳
۱۰۱۔ کفرانِ نعمت سے سزا ملتی ہے۔	۵۳
(۵) غیر المغضوب علیھم ولا الضالین	
۱۰۲۔ اس آیت کا غلط ترجمہ	۵۳
۱۰۳۔ قرآن کا اندازِ بیان ــــ اضداد سے مفہوم کی وضاحت	۵۴
۱۰۴۔ غضبِ خداوندی کا مفہوم۔ اور اس کا نتیجہ۔	۵۴
۱۰۵۔ ذلت و مسکنت ـ پستی اور جمود	۵۵
۱۰۶۔ باہمی الفت کے بجائے قتال۔ غضبِ خداوندی	۵۶
۱۰۷۔ ضابطۂ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے سے انکار باعثِ غضبِ خداوندی۔	۵۷
۱۰۸۔ یہ ارتداد ہے اور موجبِ غضبِ خداوندی	۵۷
یعنی قوانینِ خداوندی کے ساتھ غیر خدائی قوانین کی آمیزش۔ یہ شرک ہے۔	۵۷
۱۰۹۔ اس سے ایک شخص دعوئ ایمان کے باوجود مشرک کا مشرک رہتا ہے۔	۵۸

مضمون	صفحہ
۱۱۰۔ معاشی عدم توازن (یعنی غیر متوازن تقسیمِ رزق) وجۂ غضبِ خداوندی۔	۵۸
۱۱۱۔ مغضوب علیہ سے دوستی کے تعلقات بھی جائز نہیں۔	۵۹
(۷/۱) **ولا الضالین**	
۱۱۲۔ ضلالت کے بنیادی معانی	۵۹
۱۱۳۔ ہونیوالے نبی کی تلاشِ حقیقت میں سرگردانی۔	۶۰
۱۱۴۔ تقلید کی تباہ کاریاں۔	۶۰
عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔	۶۰
۱۱۵۔ جذبات سے مغلوب ہوجانے والے بھی ضالین ہوتے ہیں۔	۶۱
۱۱۶۔ جمہوری نظامِ سیاست کی پھیلائی ہوئی گمراہی	۶۲
۱۱۷۔ مذہب کو دین بتا کر بیچنے والے رہزن راہ نما	۶۲
۱۱۸۔ یہ کہنا کہ غریبی امیری خدا کے ہاتھ میں ہے، کھلی ہوئی گمراہی ہے۔	۶۳
۱۱۹۔ ضالین کا اتباع مت کرو۔	۶۳
۱۲۰۔ مغضوب علیہ اور ضال کوئی خاص قومیں نہیں۔ یہ تو خصوصیات ہیں — جن قوموں میں بھی پائی جائیں۔	۶۴
خود ہم میں بھی تو یہ علامات موجود ہیں۔	
بسم اللہ اور سورۃ فاتحہ کا خلاصہ	۶۴

——— (۰) ———

سُورۃ البقرۃ (۲)

پہلا باب — متقین

آیات — ۱ تا ۵

مضمون	صفحہ
۱۔ پس منظر — سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط	۶۸
۲۔ (۲/۱) الٓمٓ۔ مقطعات کیا ہیں۔	۷۰
(۲/۲) **ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ۔**	
۳۔ کتاب کے معنی — ضابطۂ قوانینِ خداوندی	۷۱
حکم اور قانون میں فرق	۷۱
۴۔ قرآن مجید خود رسول اللہ کے زمانے میں، جمع، مرتب، مدون، کتاب کی شکل میں موجود تھا۔	۷۲
۵۔ عربی زبان کی وسعت، مرادفات کی کثرت۔	۷۳
۶۔ ریب کے معنی	۷۳
(۲/۲) **ھدی للمتقین**	۷۴
۷۔ ایک اعتراض۔ ہدایت کی ضرورت تو گمراہوں کو ہوتی ہے۔ جو پہلے ہی متقی ہے، اسے ہدایت کی کیا ضرورت ہے!	۷۵
اس اعتراض کا جواب۔	۷۵
۸۔ تقویٰ (متقی) کا قرآنی مفہوم	۷۵
۹۔ انسانی ذات کا "تقویٰ" — (ایک ضمنی گوشہ)	۷۶
۱۰۔ متقین کی خصوصیات	۷۷
کارگہ کائنات پر غور و فکر اور فطرت کی قوتوں	۷۷

مضمون	صفحہ
کو مسخر کرنے والے۔	۷۷
اس شرط کے ساتھ کہ سرکش جذبات ان پر غالب	۷۷
نہ آجائیں۔	
(۲/۳) **الذین یومنون بالغیب**	۷۸
۱۱۔ لفظ ایمان کے بنیادی معانی۔	۷۸
۱۲۔ اس کا غلط ترجمہ اور مفہوم بے شمار الجھنوں کا موجب۔	۷۹
ایمان (FAITH) نہیں۔ یہ	۷۹
(CONVICTION) ہے۔	
۱۳۔ مومن اور قوانین / آیات خداوندی کے سامنے بھی	۷۹
اندھا بہرا بن کر سر نہیں جھکاتا۔	
علم و بصیرت کی اہمیت۔	۸۰
۱۴۔ مسلک تقلید کی تباہ کاریاں	۸۰
۱۵۔ ہم پیدائشی مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہے؟	۸۱
قرآنی نقطہ نگاہ سے مسلمان اور مومن میں فرق	۸۲
من حیث القوم مسلمانوں کا تشخص بھی اپنا مقام رکھتا ہے	۸۲
۱۶۔ اہل کتاب سے ایمان لانے کا مطالبہ	۸۳
۱۷۔ آیت ان الذین امنو۔ والذین ھادوا	۸۳
والنصاریٰ.... الخ (۲/۶۲) کا صحیح مفہوم	
۱۸۔ برہمو سماج کی تحریک۔	۸۳
مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی غلط نگہی	۸۴
اس کا ازالہ	..
۱۹۔ کفر بالطاغوت کے بعد ایمان باللہ	۸۶

مضمون	صفحہ
لا و الا برگ و ساز امتاں	۸۶
۲۰۔ مومنین کے باہمی روابط۔ اخوت، محبت، اور	۸۷
امن و سلامتی کے ضامن۔	
۲۱۔ غیر مسلم اقوام کو امن کی ضمانت	۸۷
قرآن کریم کا غیر متبدل ہونا اس کی ضمانت ہے۔	۸۸
۲۲۔ قرآن کریم میں دیا ہوا خدا کا منفرد تصور	۸۸
غیر متبدل قوانین کے مطابق عمل کرنے والا خدا۔	۸۸
ڈکٹیٹر شپ نہیں — قانون کی حکمرانی۔	۸۸
۲۳۔ قانون مکافات عمل کی رو سے جزا اور سزا کا مفہوم۔	۸۹
۲۴۔ الغیب کا مفہوم۔	۹۰
۱۔ خارجی کائنات کی مستور قوتیں جو آئندہ جاکر	۹۰
بے نقاب ہو جاتی ہیں۔	
۲۔ ماورائے سرحد ادراک کے بسیط حقائق	۹۱
لیکن یہ گوشہ بھی غور و فکر کے احاطہ سے باہر نہیں۔	۹۲
۳۔ قوانین پر مبنی پروگرام کے ان دیکھے نتائج پر	۹۲
ایمان — کسان کی مثال	
خود داعی کی زندگی بھی اس کے ثبوت میں پیش کی	۹۳
جاتی ہے۔	
اور تاریخی شواہد بھی	۹۴
السابقون الاولون کا بلند مقام	۹۴
قانون کی نتیجہ خیزی پر کامل یقین۔	۹۴
۲۵۔ پیش گوئیوں کی حقیقت	۹۵

مضمون	صفحہ
یہ، حوادثِ فطرت کے متعلق تو حتمی طور پر کی جا سکتی ہیں۔	۹۵
لیکن صاحبِ اختیار و ارادہ انسان کے متعلق نہیں۔	۹۵
یہ علم صرف خدا کو حاصل ہے۔	۹۶
اور حضرات انبیاء کرامؑ کو بذریعہ وحی ملتا تھا۔	۹۶
وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا اب غیب کا علم کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔	۹۶
کشف و الہام کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں	۹۷
(۳) ویقیمون الصّلوٰۃ	۹۷
۲۶۔ قرآنی اصطلاحات کا مفہوم متعین کرنے کا طریق۔ محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات۔	۹۸
۲۷۔ صلوٰۃ کا لغوی مفہوم	۹۸
ان ربی علیٰ صراطٍ مستقیم کا مفہوم	۹۸
۲۸۔ کائنات کی ہر شے اپنی اپنی "تسبیح" اور "صلوٰۃ" کا علم رکھتی ہے۔ یعنی اپنے فرائضِ منصبی کا علم۔	۹۹
۲۹۔ ضیاعِ صلوٰۃ کے معنی ہیں اپنے پست جذبات کا اتباع	۹۹
۳۰۔ فریضۂ اقامتِ صلوٰۃ کی ادائیگی کے لئے اپنی آزاد مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔	۱۰۰
محکومیت میں نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں، اقامتِ صلوٰۃ ممکن نہیں۔	۱۰۰
۳۱۔ الصّلوٰۃ سے مراد نظامِ مملکتِ اسلامیہ ہے۔	۱۰۰
معاشیات بھی اس کے اندر آجاتے ہیں۔	۱۰۰
(حضرت شعیبؑ اور صلوٰۃ)	
۳۲۔ الصلوٰۃ فحشا اور منکر سے روکتی ہے۔	۱۰۱
۳۳۔ اقامتِ صلوٰۃ عظیم انقلابی اقدام ہے۔	۱۰۱
کشمکش صاحبِ ضربِ کلیم و فرعون	۱۰۲
ضمناً۔ انقلاب کس طرح رونما ہوتا ہے۔	۱۰۲
پہلے فضا میں غیر محسوس طور پر تبدیلی آتی ہے پھر محسوس طور پر سامنے آجاتی ہے۔	۱۰۲
۳۴۔ اس انقلاب آفرینی کی شرطِ اولین وحدتِ امت اور وحدتِ نظام و مرکز ہوتی ہے	۱۰۴
(۴) ومما رزقنٰھم ینفقون	۱۰۵
۳۵۔ رزق کا مفہوم — انسانی جسم کی پرورش اور اس کی ذات کی نشو و نما کے لئے ضروری اسباب و عوامل۔	۱۰۵
۳۶۔ انفاق کے معنی — کھلا رکھنا — باندھ کر نہ رکھنا۔ ضمناً — منافق کی ذہنیت۔	۱۰۵
۳۷۔ ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے۔	۱۰۶
خدا نے، تمام مخلوق کے لئے رزق پیدا کر دیا۔	۱۰۷
اس کے بعد سوال تقسیم رزق کا ہے۔	۱۰۷
اور یہی نوعِ انسان کا مشکل ترین مسئلہ بن گیا ہے۔	۱۰۷
۳۸۔ نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ	۱۰۸
۳۹۔ بنیادی نکتہ — رزق خدا کا ہے۔ کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔	۱۰۸
اس کی تشریح و توضیح	۱۰۹

مضمون	صفحہ
۴۰۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ (ایک ضمنی گوشہ)	۱۱۰
یہ قرآنی تقسیم نہیں۔	۱۱۱
اللہ کا صرف ایک حق ہے — حقِ ملکیت' ناداروں کے لئے۔	۱۱۱
۴۱۔ مومنین کا معاملہ خدا کے ساتھ۔	۱۱۱
جان و مال بیچ کر جنت خرید لی۔	۱۱۱
اس کا عملی مفہوم	
۴۲۔ خدا خیر الرازقین ہے۔ اس کا مفہوم۔	۱۱۳
تقسیم رزق میں "خدا کے کارندوں کا کردار"	۱۱۳
۴۳۔ نظامِ سرمایہ داری کی باطل بنیاد — جو جتنا کمالے' وہ اس کا ہے۔	۱۱۳
یہ قارونی ذہنیت ہے۔	۱۱۴
۴۴۔ وحی کی روشنی کے بغیر، اس مسئلہ کے حل کی تلاش میں فکرِ انسانی کی کاوشیں۔	۱۱۵
عقل کا تجرباتی طریق۔	۱۱۵
وحی کا براہِ راست حل عطا کر دینا۔	۱۱۵
حقیقت جہاں بھی منکشف ہوگی وہ رسالتِ محمدیہ ہی کی رہینِ منت ہوگی۔	۱۱۶
۴۵۔ کارل مارکس نے حل تو صحیح پیش کیا۔ لیکن یہ نہ بتا سکا کہ وہ ممکن العمل کیسے ہوگا۔	۱۱۶
اس نے بر سبیلِ تنزل' سوشلزم کا پروگرام پیش کیا لیکن اس سے بات کچھ نہ بنی۔	۱۱۷

مضمون	صفحہ
۴۶۔ سوشلزم کی ناکامی	۱۱۷
۴۷۔ الصلوٰۃ اور انفاق (معاشی نظام) کا تعلق۔	۱۱۸
۴۸۔ صلوٰۃ، فحشآء و منکر سے روکتی ہے	۱۱۸
۴۹۔ تکذیبِ دین کون سے مصلّین کرتے ہیں۔	۱۱۹
ضمناً — قانونِ خداوندی کی رُو سے ذلیل و خوار کون ہوتا ہے — یتیم کی عزت نہ کرنیوالا۔ مسکین کی روٹی کا انتظام نہ کرنیوالا۔	۱۱۹
۵۰۔ صلوٰۃ بے روح اور بے غرض و غایت کی مثال۔	۱۲۰
۵۱۔ الصلوٰۃ بمعنی نماز	۱۲۲
انسانی خیالات' اور ظاہری حرکات کا تعلق بڑا گہرا ہے۔	۱۲۲
انہی کو شعائر و مناسک کہا جاتا ہے	۱۲۲
۵۲۔ اگر ان شواہد ہی کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو دین' مذہب بن جاتا ہے۔	۱۲۳
۵۳۔ صلوٰۃ فریضۂ مؤقت ہے۔ یعنی ان اجتماعات میں وقتِ مقررہ پر شریک ہونا چاہیئے۔	۱۲۴
۵۴۔ ان کے لئے آواز دی جائے گی۔	۱۲۴
۵۵۔ ان میں شرکت کے لئے صفائی اور پاکیزگی نہایت ضروری ہے۔	۱۲۴
۵۶۔ ایک اہم بنیادی نکتہ — اصول اور انکی جزئیات اصول ہمیشہ ناقابلِ تغیر ہوتے ہیں۔ جزئیات بدلتی رہتی ہیں۔	۱۲۵

مضمون	صفحہ
۵۷۔ ناسخ و منسوخ کا مفہوم۔	۱۲۵
۵۸۔ انسانیت اس دور تک آپہنچی جس میں علمِ انسانی نے نہایت تیز رفتاری سے ترقی کرنی تھی۔	۱۲۷
۵۹۔ اُس وقت نے اپنا آخری رسولؐ بھیجا۔ اور تمام نوعِ انسان کی راہنمائی کے لئے مکمل ضابطۂ ہدایت دے دیا۔	۱۲۷
اس ضابطۂ ہدایت کا انداز۔	۱۲۷
غیر متبدل اصول مکمل طور پر، لیکن جزئیات بہت کم۔	۱۲۷
۶۰۔ تعینِ جزئیات، اسلامی نظامِ شورائیت کریگا۔	۱۲۸
۶۱۔ ثبات و تغیر کا حسین امتزاج	۱۲۹
۶۲۔ بعد میں اسلامی نظامِ مملکت باقی نہ رہا، تو جزئیات کے متعلق فرض کر لیا گیا کہ یہ بھی غیر متغیر رہیں گی۔	۱۳۰
اس سے الدین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔	۱۳۰
۶۳۔ صلوٰۃ کی جزئیات قرآن کریم میں نہیں دی گئیں	۱۳۱
۶۴۔ اوقاتِ صلوٰۃ کے متعلق اشارات	۱۳۱
رکعات کے متعلق۔	۱۳۲
۶۵۔ صلوٰۃ، وحدتِ امت کا ذریعہ تھی۔	۱۳۴
اب نماز، تفرقہ کا مظہر بن گئی ہے۔	۱۳۴
۶۶۔ فرقۂ اہلِ قرآن کی غلط نگہی، گمرہی، اور اس کا اثر قرآن کریم پر۔	۱۳۵
۶۷۔ اب کیا کیا جائے؟	۱۳۶

مضمون	صفحہ
قرآنی نظامِ مملکت کو دوبارہ قائم کیا جائے۔	۱۳۷
۶۸۔ جب تک یہ نظام قائم نہ ہو امت کے مختلف فرقے جس انداز سے ارکانِ اسلام ادا کرتے چلے آرہے ہیں کرتے رہیں۔ ان میں کسی قسم کے تغیر یا حک و اضافہ یا کسی نئے طریق کے وضع کرنے کا حق کسی کو حاصل نہ ہو۔	۱۳۷
۶۹۔ تشکیل و استحکامِ امت کے دو بنیادی گوشے یکہمگی اور باہمگی۔	۱۳۸
یہ مقصد اجتماعاتِ صلوٰۃ میں نکھر کر سامنے آجاتا ہے	۱۳۸
۷۰۔ ارکانِ اسلام کی موجودہ شکلوں کا باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔	۱۳۹
لیکن ان میں روح پھونکنا بھی ضروری۔	
۷۱۔ یہ چیز پھر سے نصبِ مرکزیت سے ہو گی۔	۱۴۰
(۴) والذین یؤمنون بما انزل الیک۔	۱۴۰
۷۲۔ وحی کی خصوصیت کہ وہ نازل ہوتی ہے۔	۱۴۰
اس کا مفہوم۔	
۷۳۔ وجدان (INTUTION) بھی فکرِ انسانی ہی کی ایک صنف ہے۔	۱۴۰
۷۴۔ عام عقیدہ کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ وحی جلی (قرآن) اور وحی خفی (احادیث)	۱۴۱
قرآن کریم سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔	۱۴۱
(۵) وما انزل من قبلک	۱۴۲

مضمون	صفحہ
۷۵۔ سابقہ کتب پر ایمان لانے کا مفہوم	۱۴۳
۷۶۔ انبیاؑ سابقہ پر ایمان	۱۴۴
(۲/۴) وبالاخرۃ ھم یوقنون	۱۴۴
۷۷۔ آخرت کے معنی ایسی زندگی جو پہلی زندگی سے مختلف اور متغائر ہو۔	۱۴۴
۷۸۔ آخرت بمعنی مستقبل۔	۱۴۵
۷۹۔ دو نظریاتِ حیات — (۱) زندگی بس انسان کی طبعی زندگی ہے جس کا موت سے خاتمہ ہو جاتا ہے	۱۴۵
(۲) زندگی مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔	
۸۰۔ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل — انسان کا ہر عمل نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے	۱۴۶
۸۱۔ انسان کا ہر عمل اس کی ذات پر اثر مرتب کرتا ہے۔ یہی اس کا نامۂ اعمال ہے۔	۱۴۷
۸۲۔ جنت وجہنم کا بیان تمثیلی ہے۔	۱۴۸
۸۳۔ ایک اہم نکتہ — وہاں سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہونگے۔	۱۴۸
ہر شخص بے نقاب سامنے آجائے گا۔ یہ سب سے زیادہ الم انگیز جہنم ہوگا۔	۱۴۸
۸۴۔ دنیاوی زندگی میں اعمال کے نتائج۔	۱۴۹
۸۵۔ تین قسم کے زاویہ ہائے نگاہ — (۱) صرف اسی دنیا کے مفاد۔ (سیکولرازم)	۱۴۹
(۲) صرف آخرت میں ثواب۔ (مذہب)	۱۴۹
(۳) دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں (الدین)	۱۵۰
۸۶۔ عمل اور نتیجہ میں ربطِ باہمی	۱۵۱
۸۷۔ ایمان بالآخرت کا نتیجہ — اپنے ہر عمل کے لئے جوابدہی کا احساس ویقین۔	۱۵۲
(۲/۵) اولٰئک علیٰ ھدًی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون	۱۵۲
۸۸۔ مفلحون کے معانی	۱۵۳
کھیتی کی تشبیہ	۱۵۳
۸۹۔ گندم از گندم بروید، جو ز جو۔	۱۵۳
۹۰۔ الدین (نظامِ اسلامی) کے نتائج اس دنیا میں۔ استخلاف فی الارض۔	۱۵۴
خلاصہ باب اول۔	۱۵۵
دوسرا باب — کفّار	۱۵۷
آیات — ۶ تا ۷	
(۲/۶) ان الذین کفروا سواءٌ علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون۔	۱۵۸
(۹۱) اس آیت کے عمومی ترجمہ پر مبنی اعتراض	۱۵۸
۹۲۔ کفر کے معنی — یہ بھی پیدائشی نہیں ہوتا۔ اسے اختیار کیا جاتا ہے۔	۱۵۹
۹۳۔ ان تک ہدایتِ خداوندی کا پہنچنا ضروری ہے۔	۱۶۰

مضمون	صفحہ
۹۴۔ انذار و تنذیر کے معنی۔	۱۶۱
انبیاء اسی اعتبار سے بشیر و نذیر ہوتے تھے۔	۱۶۱
۹۵۔ انسانی زندگی کے متعلق دو نظریات	۱۶۲
(۱) محض طبیعی زندگی۔ (۲) انسانی ذات یا نفس کی بیکر زندگی۔	۱۶۲
۹۶۔ اپنی ذات سے انکار بھی کفر ہے۔	۱۶۲
۹۷۔ عقیدۂ جبر قرآن کریم کے خلاف ہے	
۹۸۔ اپنے اختیار و ارادے سے کام ہی نہ لینا۔	۱۶۴
ایسے لوگوں کی چند ایک مثالیں۔	
۹۹۔ تقلید کا شیوہ اختیار کرنے والے	۱۶۴
مترفین۔	۱۶۴
۱۰۰۔ جذبات سے مغلوب ہوجانے والے افراد یا اقوام۔	۱۶۵
یہودیوں کی مثال۔ محض حسد کی بنا پر کفر۔	۱۶۶
۱۰۱۔ پندارِ نفس کی بنا پر انکار۔	۱۶۶
قومِ فرعون کی مثال۔	
۱۰۲۔ نشۂ اقتدار کی سرمستیاں۔	۱۶۷
۱۰۳۔ محفل تمہاری میں بیٹھے ہیں، خیالات کہیں اور ہیں۔	
نظر اور بصر کا لطیف فرق	۱۶۸
۱۰۴۔ یہ تو چلتی پھرتی لاشیں ہیں۔ ان پر تبلیغ کیا اثر کرسکتی ہے۔	۱۶۸
۱۰۵۔ کیا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟	۱۶۹
نہیں! تبلیغ انہیں بھی کرتے رہو۔	
۱۰۶۔ کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے۔	۱۷۰
۱۰۷۔ دین کے نظام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ ثنویت کفر ہے۔	۱۷۱
۱۰۸۔ قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم نہ کرنے والے کافر ہیں۔	۱۷۲
۱۰۹۔ باہمی اختلاف اور فرقہ بندی شرک اور کفر ہے۔	۱۷۲
مسجد ضرار۔	۱۷۳
۱۱۰۔ نظام سرمایہ داری۔ ربوٰ۔ کفر ہے۔	۱۷۳
۱۱۱۔ مخالفین کی ٹیکنیک۔ کسی تک قرآن کی آواز مت پہنچنے دو۔ شور مچادو۔	۱۷۳
۱۱۲۔ کفار مومنین پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے۔	۱۷۴
۱۱۳۔ کفار کے ساتھ مومنین کے دوستداری کے تعلقات نہیں ہوسکتے۔	۱۷۵
۱۱۴۔ اسلام کے اصول بے لچک ہیں۔ اسی لئے ان کیساتھ مفاہمت بھی نہیں ہوسکتی۔	۱۷۸
(۲:۷) ختم اللہ علی قلوبہم وعلی سمعہم وعلی ابصارہم غشاوۃ ولہم عذاب عظیم	۱۷۹
۱۱۵۔ متداول ترجمہ کی رو سے ایک الجھن	۱۸۰
صحیح مفہوم۔	

مضمون	صفحہ
۱۱۶۔ عمل اور اس کے نتیجہ کا باہمی تعلق۔	۱۸۲
۱۱۷۔ خدا اسے اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے۔	۱۸۲
۱۱۸۔ مسئلہ تقدیر کا لبِ لباب۔	۱۸۳
اقبالؒ کی تشریح کے مطابق۔	
۱۱۹۔ اعمال کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے	۱۸۴
اس کی مثالیں۔	
۱۲۰۔ ایسی آیات کا ترجمہ یوں کرو کہ "خدا اپنے قانون کے مطابق یوں کرتا ہے"۔	۱۸۵
۱۲۱۔ دلوں پر مہریں کیسے لگتی ہیں۔	۱۸۶
۱۲۲۔ دل پر خود دل کا تالا۔	۱۸۷
ایک عظیم نفسیاتی حقیقت۔	
ولھم عذاب عظیم	۱۸۸
۱۲۳۔ عذاب کے معنی۔	۱۸۸
۱۲۴۔ فطری حوادث۔ زلزلے، سیلاب، وبائی امراض وغیرہ کا تعلق عذاب سے۔	۱۸۹
۱۲۵۔ عذاب کا قرآنی مفہوم۔	۱۹۰
زندگی کا کسی مقام پر رک جانا	
۱۲۶۔ ذلت و خواری کا الم انگیز عذاب۔	۱۹۱
محکومی اور غلامی	۱۹۲
استبدال قومی	۱۹۲
تفرقہ انگیزی۔ فرقہ بندی۔	۱۹۳
خوف اور حزن	۱۹۴
تنگیٔ رزق۔	۱۹۴
۱۲۷۔ اس جہنم کا آغاز یہیں سے ہو جاتا ہے۔	۱۹۵
۱۲۸۔ جسے زندہ رہنا ہے، علیٰ وجہ البصیرت زندہ رہے۔ جسے ہلاک ہونا ہے، دلائل و براہین کی رُو سے ہلاک ہو۔	۱۹۶
۱۲۹۔ قانونِ مہلت۔ سائنٹیفک اصول۔	۱۹۷
۱۳۰۔ عدالتی سزا کو بھی عذاب کہا گیا ہے۔	۱۹۸
خلاصہ باب دوم۔	۲۰۰
تیسرا باب ـــ منافقین	۲۰۱
آیات ۸ تا ۲۰	
(۲/۸) **ومن الناس من یقول اٰمنا باللہ وبالیوم الاٰخر وما ھم بمؤمنین**	۲۰۱
۱۳۱۔ اجزاء ایمان کے تذکرہ کے سلسلہ میں قرآن کریم کا انداز۔	۲۰۲
۱۳۲۔ ایمان لانے کے باوجود مشرک۔	۲۰۳
۱۳۳۔ ایمان بلا عمل	۲۰۳
۱۳۴۔ منافق کسے کہتے ہیں؟	۲۰۴
۱۳۵۔ خدع کے معنی	۲۰۴
۱۳۶۔ کذب کا قرآنی مفہوم۔	۲۰۵
(۲/۹) **یخدعون اللہ والذین اٰمنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون۔**	۲۰۵

مضمون	صفحہ
۱۳۷۔ منافقت ایک نفسیاتی مرض ہے۔	۲۰۶
۱۳۸۔ ادراک کا مرکز کونسا ہے اور احساسات کا کونسا؟ ایک مشکل مسئلہ جس کا حتمی طور پر فیصلہ نہیں ہو سکا۔	۲۰۶
۱۳۹۔ سائیکلوجی کا (PSYCHE	۲۰۶
۱۴۰۔ قلب اور فؤاد کی بحث	۲۰۶
شعور کا مفہوم۔	۲۰۷
۱۴۱۔ عالم انفس و آفاق کے بے نقاب ہونے سے قرآنی دعاوی کی تصدیق۔	۲۰۸
۱۴۲۔ منافقین کی علامات — کفر مستور	۲۰۹
ان پر کسی کو بھی اعتماد نہیں ہوتا — خود انکی اپنی پارٹی کو بھی نہیں۔	۲۰۹
۱۴۳۔ تخریبی ذہنیت — نقصان پہنچا کر خوش ہونا۔	۲۱۰
چاہتے ہیں کہ تم بھی انہی جیسے کافر ہو جاؤ۔	۲۱۱
۱۴۴۔ سازشیں اور سرگوشیاں	۲۱۱
حتیٰ کہ خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے خلاف الزام تراشیاں۔	۲۱۲
۱۴۵۔ ریاکاری۔ انفاق و صلوٰۃ و جہاد میں۔	۲۱۳
۱۴۶۔ منافقین کی عبودیت "علیٰ حرف"	۲۱۴
۱۴۷۔ تحاکم الی الطاغوت۔	۲۱۵
۱۴۸۔ تفرقہ انگیزی۔ مسجد ضرار۔	۲۱۶
آج ہماری مساجد!	۲۱۷
۱۴۹۔ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ۔	۲۱۸
۱۵۰۔ ان سے معاشرتی تعلقات کا انقطاع۔ جنازہ تک میں شرکت مت کرو۔	۲۱۹
۱۵۱۔ اُخروی زندگی میں منافقین کی حالت۔	۲۱۹
۱۵۲۔ درجات و درکات۔ ایک ضمنی گوشہ	۲۲۱
۱۵۳۔ مدینہ کے یہودی اور اعراب	۲۲۲
۱۵۴۔ ایک عظیم حقیقت۔	۲۲۳
حضورؐ کے برپا کردہ انقلاب میں فوق الفطرت عناصر کا دخل نہیں تھا۔	۲۲۴
۱۵۵۔ حضورؐ کی سیرت بطور اسوۂ حسنہ	۲۲۴
۱۵۶۔ منافقین چھٹ کر الگ ہو گئے تھے۔	۲۲۴
۱۵۷۔ باقی صحابہؓ رہ گئے تھے اور سب کے سب پکے اور سچے مخلص مومن تھے۔	۲۲۵
یخدعون اللہ والذین اٰمنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون	۲۲۸
۱۵۸۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے	۲۲۸
(۲/۱۰) فی قلوبھم مرض ..... یکذبون	۲۲۹
۱۵۹۔ کذب سے نفسیاتی مرض کس طرح بڑھتا ہے۔	۲۲۹
(۲/۱۱-۱۲) واذا قیل لھم لا تفسدوا .... یشعرون۔	۲۲۹
۱۶۰۔ اصلاح اور فساد۔ دو وسیع المعانی اصطلاحات۔	۲۲۹
۱۶۱۔ کیا ہونا چاہیئے، فلسفۂ اخلاق و تمدن کا مشکل ترین مسئلہ	۲۳۰

مضمون	صفحہ
۱۶۲۔ ہونا ویسے چاہیئے جیسے وحی خداوندی کا تقاضا ہو۔	۲۳۱
۱۶۳۔ فساد کے مختلف گوشے۔	۲۳۱
نظامِ حکومت	۲۳۱
۱۶۴۔ ایک ضمنی گوشہ۔ مومنین کو علو فی الارض حاصل ہوگا۔ استکبار بغیر الحق ناجائز ہے	۲۳۴
۱۶۵۔ فساد آدمیت کا دوسرا گوشہ۔ مذہبی پیشوائیت	۲۳۵
۱۶۶۔ تیسرا گوشہ۔ معاشی نظام	۲۳۶
۱۶۷۔ نظامِ سرمایہ داری۔ قارون	۲۳۷
۱۶۸۔ چوتھا گوشہ۔ جنسی بدنہادی۔ قوم لوطؑ	۲۳۸
۱۶۹۔ وحدتِ انسانیت۔ قرآن کا منتہیٰ	۲۳۸
۱۷۰۔ قومیت پرستی۔ فسادِ آدمیت	۲۴۰
۱۷۱۔ خود یہ امت ٹکڑوں میں بٹ گئی۔	۲۴۱
۱۷۲۔ امت مسلمہ، مصلحین کی جماعت تھی۔	۲۴۴
مصلحین اور مفسدین ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔	
(۲/۱۳) واذا قیل لھم ... لیعلمون	۲۴۴
۱۷۳۔ دولتمند طبقہ اپنے آپ کو عقلِ کل کا مالک سمجھتا ہے اور غریبوں کو بیوقوف۔	۲۴۶
۱۷۴۔ معیارِ فضیلت دولت نہیں، حسن کردار ہے	۲۴۶
(۲/۱۴) واذا لقوا الذین ..... مستھزءون	۲۴۶
۱۷۵۔ ہر رسول کے ساتھ استہزاء	۲۴۷
۱۷۶۔ رسول اللہ کو تلقین استقامت	۲۴۷
(۲/۱۵) اللہ یستھزئ ..... یعمھون	۲۴۸

مضمون	صفحہ
۱۷۷۔ طغیان کے معنی۔ حدود و قیود توڑ کر سرکش و بیباک ہو جانا	۲۴۸
۱۷۸۔ میزانِ عدل کو قائم رکھو۔ صحیح توازن ہی میں خیر ہے	۲۴۹
(۲/۱۶) اولٰئک الذین ..... مھتدین	۲۵۰
۱۷۹۔ مسئلہ خیر و شر	۲۵۰
یا نفع اور نقصان کے پیمانے	۲۵۰
۱۸۰۔ مطلق نفع یا نقصان کا علم صرف وحی کی رُو سے ہو سکتا ہے۔	۲۵۱
اس کا حقیقی پیمانہ۔ اقدارِ خداوندی	۲۵۱
۱۸۱۔ انسانی ذات کی مزید تشریح	۲۵۳
۱۸۲۔ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کا مفہوم	۲۵۳
اس کی مثالیں	۲۵۴
۱۸۳۔ مومنین اور خدا کا بیع و شریٰ کا معاہدہ	۲۵۴
۱۸۴۔ مقتولین فی سبیل اللہ کے بلند مقامات	۲۵۵
مذہبی پیشوائیت۔ دنیاوی مفاد کی خاطر آیات اللہ کے بیچنے والے۔	۲۵۶
۱۸۵۔ دنیا کی ہر متاع آخرت کے مقابلہ میں ثمن قلیل ہے	۲۵۷
(۲/۱۷) مثلھم ..... لا یبصرون	۲۵۷
۱۸۶۔ زندگی کے اہم مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے عقل کا تجرباتی طریق۔	۲۵۸
۱۸۷۔ غلامی کا مسئلہ	۲۵۹
۱۸۸۔ عقل اور وحی دونوں کی ضرورت ہے۔	۲۶۱

مضمون	صفحہ
۱۸۹۔ ظلمات کے لفظ میں عمیق حقائق پوشیدہ ہیں۔	۲۶۲
(۲/۱۸) صمٌّ، بکمٌ، عمیٌ .... لایرجعون	۲۶۲
۱۹۰۔ صمٌّ، بکمٌ، عمیٌ۔ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔	۲۶۳
۱۹۱۔ لایرجعون کے معنی	۲۶۳
(۲/۱۹) اوکصیب ..... بالکفرین	۲۶۴
۱۹۲۔ طبیعی دنیا کی کوئی شے نہ خیر ہوتی ہے نہ شر	۲۶۴
اس کا استعمال اسے ویسا بنا دیتا ہے۔	۲۶۵
۱۹۳۔ فکرِ انسانی کوئی نظام ایسا نہیں وضع کر سکی جو تمام انسانوں کے لئے خیر ہی خیر ہو۔	۲۶۵
۱۹۴۔ فطرت کی قوتوں کا غلط استعمال۔	۲۶۸
اس کا نتیجہ — تباہی	۲۶۸
برفو کی شہادت	۲۶۹
(۲/۲۰) یکاد البرق .... قدیر	۲۶۹
۱۹۵۔ خدا غلط کار لوگوں کی طبیعی قوتیں سلب نہیں کرتا۔	۲۷۰
۱۹۶۔ طبیعی مفاد ہر ایک کو بقدرِ طلب و محنت مل سکتے ہیں۔	۲۷۱
۱۹۷۔ ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر کا مفہوم۔	۲۷۲
۱۹۸۔ عالمِ امر۔ یفعل ما یرید	۲۷۳
۱۹۹۔ عالمِ خلق۔ اقدار و قوانین کی دنیا	۲۷۳
۲۰۰۔ خدا نے اپنے اوپر پابندیاں عاید کر رکھی ہیں۔	۲۷۵
انہی پابندیوں کا نام قوانینِ خداوندی ہے	۲۷۵
چوتھا باب — الناس	۲۷۹
آیات — ۲/۲۱ تا ۲/۲۹	
(۲/۲۱) یاایھا الناس اعبدو .... تتقون	۲۸۰
۲۰۱۔ قرآن کریم کا پیغام عالمگیر انسانیت کے لئے ہے	۲۸۰
۲۰۲۔ انسانی تخلیق	۲۸۱
۲۰۳۔ رزاقیت	۲۸۲
۲۰۴۔ عالمِ خلق اور عالمِ امر	۲۸۳
۲۰۵۔ بدیع السمٰوٰت والارض	۲۸۴
۲۰۶۔ مغربی سائنس دانوں کا اعترافِ عجز	۲۸۶
۲۰۷۔ تخلیق کائنات کے متعلق قرآنی تصریحات	۲۸۷
۲۰۸۔ احسن الخالقین	۲۸۷
قوتِ تخلیق انسان کو بھی حاصل ہے	۲۸۷
۲۰۹۔ تخلیق و تولید میں فرق	۲۸۷
۲۱۰۔ مخلوق میں نت نئے اضافے	۲۸۸
۲۱۱۔ کائنات میں زندگی کی نمود	۲۸۹
۲۱۲۔ کان عرشہ علی الماء کا صحیح مفہوم	۲۹۰
۲۱۳۔ انسان کی تخلیق — مختلف مراحل کا بیان	۲۹۱
حوادثِ ارضی و سماوی	۲۹۳
۲۱۴۔ "یوم الست" اور "قالوا بلیٰ" کے افسانے۔	۲۹۳
آیت کا مفہوم	۲۹۴

مضمون	صفحہ
(۲۲/۲) الذی جعل لکم ..... تعلمون	۲۹۴
۲۱۵۔ زمین کے "فراشاً" ہونے کا اعجاز	۲۹۴
۲۱۶۔ سماء سقفِ محفوظ ہے۔ اس کا مفہوم	۲۹۵
۲۱۷۔ قرآن کا معاشی نظام ۔۔ ارض پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔	۲۹۶
۲۱۸۔ انداداً من دون اللہ کی صراحت	۲۹۸
۲۱۹۔ یہی الٰہ الارض ہیں۔	۳۰۰
۲۲۰۔ سیکولرازم میں یا تو سرے سے خدا کا انکار ہوتا ہے، اور یا اسے محض کائناتی خدا مانا جاتا ہے۔	۳۰۱
قرآنِ کریم دونوں کو منکرینِ خدا قرار دیتا ہے۔	۳۰۲
۲۲۱۔ دورِ ملوکیت کے ند ۔۔ بادشاہ	۳۰۴
عصرِ حاضر کا ند ۔۔ اسٹیٹ	۳۰۴
۲۲۲۔ اسٹیٹ کے پردے کے پیچھے وہی برسرِ اقتدار طبقہ۔	۳۰۴
۲۲۳۔ قرآنِ کریم کی تاکید ۔۔ حلال وطیب رزق کھاؤ	۳۰۵
۲۲۴۔ ایسا رزق نظامِ خداوندی ہی میں مل سکتا ہے۔	۳۰۶
۲۲۵۔ قطعاتِ اراضی پر ذاتی ملکیتوں کی تحدید، حضورؐ کے زمانہ ہی میں شروع ہو گئی تھی۔	۳۰۷
۲۲۶۔ یہ نظام، اتباعِ کتاب اللہ سے قائم ہوا تھا۔	۳۰۷

مضمون	صفحہ
(۲۳/۲) وان کنتم فی ریب ...... صدقین۔	۳۰۸
۲۲۷۔ خدا کا عبد ۔۔ حقیقی معنوں میں آزاد	۳۰۸
۲۲۸۔ مدعیٔ نبوت کے لئے مشکل ترین مقام	۳۰۹
۲۲۹۔ وہ معجزات کا مطالبہ کرتے تھے	۳۰۹
(اولیاء اللہ کی کرامات)۔ ایک ضمنی گوشہ	۳۱۰
۲۳۰۔ اور خدا کی طرف سے اس کا انکار ہوتا تھا۔	۳۱۰
۲۳۱۔ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔	۳۱۱
۲۳۲۔ ایمان نہ لانے کی حقیقی وجہ ۔۔ مفاد پرستیاں	۳۱۲
۲۳۳۔ کیا یہ کتاب کافی نہیں؟	۳۱۳
۲۳۴۔ صحابہؓ کا ایمان ۔۔ ایک ضمنی گوشہ	۳۱۳
۲۳۵۔ قرآن کا چیلنج ۔۔ کہ اس جیسی کتاب بنا کر دکھاؤ	۳۱۴
(۲۴/۲) فان لم تفعلوا ..... للکفرین۔	۳۱۵
۲۳۶۔ لفظ سورۃ کے معنی۔	۳۱۶
۲۳۷۔ قرآن کریم کی ترتیب ۔۔ "ترتیب نزولی" کا نظریہ	۳۱۶
۲۳۸۔ عربوں نے اس چیلنج کو قبول نہ کیا۔	۳۱۷
اس کے بعد بھی آج تک کسی نے قبول نہیں کیا۔	۳۱۹
۲۳۹۔ عربی زبان کی کتاب	۳۲۰
۲۴۰۔ حضورؐ دعوائے نبوت سے پہلے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔	۳۲۱
۲۴۱۔ حضورؐ کی سیرت کی پاکیزگی ایسا معجزہ تھی جس سے متعنت سے مخالف تک بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔	۳۲۲

مضمون	صفحہ
۲۴۲۔ قرآن کریم کا ترجمہ بھی نہیں ہو سکتا۔	۳۲۳
۲۴۳۔ النار کے معنی ۔ جہنم کے معنی ۔ (۳۲۷)	۳۲۶
۲۴۴۔ الناس والحجارۃ۔ عوام اور ان کے لیڈر	۳۲۸
(۲/۲۵) وبشر الذین آمنو ..... خلدون	۳۳۱
۲۴۵۔ اعمال صالحہ کا مفہوم	۳۳۲
۲۴۶۔ جنت کے معنی	۳۳۳
۲۴۷۔ جنت کی کیفیات کو تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔	۳۳۳
۲۴۸۔ جنت آدم ۔ یعنی جنت ارضی	۳۳۵
۲۴۹۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے	۳۳۷
جانکاہ تصادمات کے بعد حصول جنت	۳۳۷
۲۵۰۔ جنت اجتماعی زندگی سے حاصل ہو گی۔ خانقاہیت کے خلوت کدوں میں نہیں۔	۳۳۸
۲۵۱۔ ازواج کے معنی ہم آہنگ رفقاء	۳۳۸
۲۵۲۔ حوروں سے مراد	۳۳۹
۲۵۳۔ سامان زیست (رزق) کی کیفیت میں فرق۔	۳۴۰
(۲/۲۶) ان اللہ لا یستحی ..... فاسقین	۳۴۱
۲۵۴۔ مجرد حقائق مثالوں اور تشبیہوں کے ذریعے سمجھائے جا سکتے ہیں	۳۴۱
۲۵۵۔ قرآنی مثالوں کے کچھ نمونے	۳۴۳
۲۵۶۔ فاسق کا مفہوم۔	۳۴۳
(۲/۲۷) الذین ینقضون ..... خاسرون	۳۴۴

مضمون	صفحہ
۲۵۷۔ عہد فراموش اور پیمان شکن کون ہیں۔	۳۴۴
۲۵۸۔ خاسرونا مراد کون ہیں؟	۳۴۵
۲۵۹۔ سورۃ والعصر کا تشریحی مفہوم	۳۴۵
(۲/۲۸) کیف تکفرون باللہ ..... ترجعون	۳۴۶
۲۶۰۔ موت اور حیات کے معنی	۳۴۶
۲۶۱۔ زندگی کیسے پیدا ہو گئی۔ اس کے متعلق عصر حاضر کے	۳۴۷
سائنسدانوں کا عجز فہم۔	-
۲۶۲۔ نمود حیات کی ایک مثال۔	۳۴۸
۲۶۳۔ حیات بعد الممات کی اہمیت۔	۳۴۹
۲۶۴۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کا مفہوم۔	۳۵۰
(۲/۲۹) ھو الذی خلق لکم ..... علیم	۳۵۲
۲۶۵۔ "سبع سموات" کا مفہوم۔	۳۵۲
۲۶۶۔ تخلیق ارض و سماء	۳۵۳
۲۶۷۔ رزق اور رزق کریم میں فرق۔	۳۵۴
رزق کریم مشروط ہے محکومیت خداوندی سے۔	-
۲۶۸۔ ایاک نعبد وایاک نستعین کا باہمی تعلق۔	..
۲۶۹۔ ہر حق مشروط ہوتا ہے ذمہ داری پوری کرنے سے۔	..
خلاصہ باب	۳۵۵-۳۶۰

مے باقی و ماہتاب باقیست
مارا بتو صد حساب باقیست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ سخن

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

میں قرآن کریم کا ادنیٰ طالب العلم ہوں میں نے اپنی ساری زندگی اس کتابِ عظیم کے سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کی ہے۔ جب میں "ساری عمر" کہتا ہوں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں کرتا۔ پانچ چھ برس کی عمر سے، کہ جب مجھے مکتب میں بٹھایا گیا، اس وقت تک، کہ میرا رہروِ عمر بہتر سے بھی زیادہ منازل طے کر چکا ہے، بجز اُن دنوں کے جب میں کسی وجہ سے معذور ہو گیا ہوں، شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب قرآنِ مجید میری نگاہوں کے سامنے نہ رہا ہو۔ عمر کے پہلے حصہ میں اس کا مطالعہ مروجہ قدامت پرستانہ طریق سے کیا۔ اس کے بعد جب حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور پرکھنے کا شعور بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا تھا وہ مجھے حقیقت سے بہت دور لے گیا تھا۔ اس سے خود اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات ابھرنے شروع ہوئے جن کا اطمینان بخش جواب کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔ برسوں تک میں ریب و تشکیک کی انہی پُرخار وادیوں میں، وقفِ کرب و اضطراب، سرگرداں و حیراں پھرتا رہا۔ اسی دشت نوردی میں مجھے اس کا علم و احساس بھی ہوا کہ ہمارا نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ مذہب گریزیدہ کیوں ہو رہا ہے۔ میری قسمت نے یاوری کی، اور، بتائیدِ ایزدی، یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ قرآن مجید کے سمجھنے کا صحیح طریق کیا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو نور (روشنی) کہا ہے۔ اور روشنی اپنے وجود کی دلیل آپ ہوتی ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لئے خارجی چراغوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا، قرآن خود قرآن ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن نازل کرنے والے (خدا) نے کہا ہے کہ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ (۷۵/۱۹) "قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمے ہے۔" اور اسی بنا پر، قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ یہ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ ہے (۱۶/۸۹)۔ یعنی "ہر بات کی وضاحت کرنے والا۔" اس میں کوئی پیچ و خم نہیں (۱۸/۱) کوئی تضاد نہیں، اختلاف نہیں (۴/۸۲)۔ ابہام نہیں، التباس نہیں۔ صاف، نکھری، واضح، روشن کتاب۔

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قرآن مجید، بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیۡنٍ نازل کیا گیا ہے۔ (۲۶/۱۹۵)۔ یعنی واضح عربی

زبان میں. علم اللسانیات کے مطالعہ سے یہ حقیقت مجھ پر واشگاف ہو چکی تھی کہ مرورِ زمانہ سے زبانوں کے الفاظ کے معانی میں کس قدر فرق آجاتا ہے. اس لئے قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے ضروری ٹھہرا کہ یہ دیکھا جائے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں ان الفاظ کے معانی کیا سمجھے جاتے تھے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کا صرف مفہوم منجانب اللہ نہیں، اس کے الفاظ بھی منجانب اللہ ہیں۔ اسی بنا پر اسے کلام اللہ کہا گیا ہے۔ (9/6)

قرآن کریم کا انداز عام کتابوں کا سا نہیں. عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کتاب، مختلف ابواب میں تقسیم کر دی جاتی ہے. ہر باب کا خاص موضوع ہوتا ہے۔ اور اس موضوع سے متعلق تمام مضامین اُس باب میں مربوط طور پر درج کر دیئے جاتے ہیں. قرآن کریم کا یہ انداز نہیں۔ اس کے متعلق یوں سمجھئے جیسے یہ تیئس سال کے عرصہ میں ارشاد فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر آتی ہے تو اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر۔ اضافہ کسی اور جگہ، استثناء کسی اور سورۃ میں۔ نیز، مختلف حقائق کے متنوع گوشوں کو، مختلف موضوعات کے ضمن میں، لوٹا لوٹا کر سامنے لایا گیا ہے. اس اندازِ بیان کو اس نے "تصریفِ آیات" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر سامنے لانا۔ (6/105)۔ اسی طریق سے اس نے اپنی اصطلاحات کا مفہوم بھی متعین اور واضح کیا ہے۔

قرآن کریم کے سمجھنے کی اگلی شرط، تدبر فی القرآن ہے۔ (4/82)۔ یعنی اسے غور و فکر، عقل و بصیرت اور علم و شعور کی رو سے سمجھنا. تدبر فی القرآن کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لئے ہے، نہ کسی خاص زمانے کے لئے. وہ تمام افراد کے لئے ہے، اور ہر زمانے کے لئے۔ اس لئے قرآن مجید کو نہ تو تقلیداً سمجھا جا سکتا ہے، نہ کسی اور کا فکر و تدبر، دوسرے کے لئے سند و حجت ہو سکتا ہے۔ دوسروں کے تدبر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، کہ علم نوعِ انسان کی وراثت ہے. لیکن نہ وہ سند ہو سکتا ہے، نہ حرفِ آخر۔

تدبر فی القرآن کے سلسلہ میں، خدا نے یہ بھی کہا ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (41/53)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں انفس و آفاق (خارجی کائنات اور خود نفسِ انسانی) میں پوشیدہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآنی دعاوی کی صداقت نکھر کر سامنے آتی جائے گی. لہٰذا، قرآن کریم پر غور و تدبر کرنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانے میں علمِ انسانی جس سطح پر پہنچ چکا ہے، اس پر بھی اُس کی نگاہ ہو. قرآن، انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے. اگر کسی کو یہی معلوم نہ ہو کہ اُس کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں، اور انسانی فکر کی کاوشیں ان کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچی ہیں، تو وہ

قرآن سے راہ نمائی کیا حاصل کر سکے گا۔

تدبر فی القرآن کے ضمن میں ایک اور نکتہ بھی سمجھ لینے کے قابل ہے۔ قرآن کریم میں کچھ تو احکام و قوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق۔ احکام و قوانین ایسے الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں جن کے معانی متعین ہیں۔ لیکن حقائق، بالخصوص وہ حقائق جن کا تعلق مابعدالطبیعیات سے ہے۔ انہیں تشبیہات، تمثیلات اور استعارات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مجرد حقائق (ABSTRACT REALITIES) کو بیان ہی اسی انداز میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تشبیہات و استعارات سے ان حقائق سے متعلق، ہر صاحبِ فکر اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق تصور قائم کرسکتا ہے۔ بنابریں، ان تصورات میں فکری اختلاف قابلِ فہم ہے۔ لیکن جہاں تک قرآنی احکام یا راہنمائی کا تعلق ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

قرآنی راہنمائی کی بھی یہ صورت ہے کہ اس میں بعض احکام متعین ہیں اور بعض اصول و اقدار کی شکل میں۔ جہاں تک اصول و اقدار کا تعلق ہے، ان کی عملی جزئیات قرآنِ کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ انہیں اسلامی نظامِ مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق وضع کرے۔ اس طرح امت میں وحدت فی العمل پیدا ہوگی اور برقرار رہے گی۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس اہم حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

تدبر فی القرآن کے سلسلہ میں ایک بنیادی شرط ... ... یہ بھی ہے کہ جب تک آپ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصورات سے پاک نہیں کریں گے قرآنِ کریم کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ (4/82)۔ جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے، قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اُسے اپنے خیال کی سند اور تائید قرآن سے حاصل ہو جائے۔ اس کی رسائی صداقت تک نہیں ہو سکتی۔

یہ تھا قرآن فہمی کا وہ طریق، جو مجھے خود قرآنِ کریم سے سمجھ میں آیا اور اسی کے مطابق میں نے اسے از سرِ نو سمجھنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق بڑا صبر آزما، اور یہ مراحل بڑے ہمت طلب تھے۔ لیکن انہیں طے کئے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میری عمر کا باقی حصہ اسی کوہ کنی اور جوئے شیر براری میں گزرا ہے۔ اور اس احساس سے میری جبینِ تشکر بارگاہِ ایزدی میں بصد عجز و نیاز جھک جاتی ہے کہ اس کی توفیق و تائید نے مجھے اس میں بڑی کامیابی عطا فرمائی ہے۔ جہاں تک قرآنی الفاظ (مفردات) کے معانی اور تصورات متعین کرنے کا مرحلہ تھا، میں نے برس ہا برس کی محنت شاقہ کے بعد قرآنی لغت مرتب کیا جو چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے

اس کے ساتھ ساتھ میں نے تصریفِ آیات کے ضمن میں، تبویب القرآن کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ (اس کا ضخیم مسودہ سالِ گزشتہ کتابت کے لئے دے دیا گیا ہے) ان دونوں بنیادوں پر میں نے پورے کے پورے قرآن کا مفہوم متعین کیا، جو تیس پاروں میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی دوران میں، میں نے قرآنی تعلیم اور حقائق کو مختلف تصانیف کی شکل میں بھی شائع کیا جو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ میں بالخصوص بڑی مقبول ہوتی ہیں ۔ من و یزداں، ابلیس و آدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت، جہانِ فردا، کتاب التقدیر، ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت، شاہکارِ رسالتؐ، اِسی سلسلہ زریں کی مختلف کڑیاں ہیں۔

اس کے ساتھ میں نے ہفتہ واری درسِ قرآن کریم کا سلسلہ بھی جاری کیا جو بحمد اللہ قریب پچیس سال سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ چونکہ درس میں ہر بات بڑی تفصیل سے سامنے آ جاتی ہے اس لئے یہ سلسلہ بڑا مؤثر، بلیغ، اور دلکش ثابت ہوا۔ احباب کا شروع ہی سے تقاضا تھا کہ اِن درسوں کی بنیاد پر قرآنِ کریم کی تفسیر مرتب کی جائے۔ میں اس میں بڑی دشواریاں دیکھتا تھا۔ اگرچہ میرے ایک رفیق عزیز (ملک ظہور احمد) کی برسوں کی خارہ شگافی نے اِن درسوں کو، جو ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لئے جاتے ہیں، صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا تھا، لیکن درس کا انداز تصنیفی انداز سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تفسیر کے لئے اِن درسوں کی تفصیلات کے انبار سے متعلقہ حقائق کو الگ کر کے انہیں از سرِ نو مربوط و مرتب شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے میں اِس سلسلۂ دراز کو شروع کرنے کی اپنے میں ہمت نہیں پاتا تھا۔ لیکن سالِ گزشتہ احباب کے اِس تقاضا نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ مجھے بالآخر سپر انداز ہونا پڑا۔ کچھ وقت تک مسلسل لکھنے سے اب میرا ہاتھ تھک جاتا ہے۔ اِس مشکل کا حل میرے ایک دوسرے رفیق (اخلاق احمد صاحب) نے پیش کر دیا۔ چنانچہ میں تفسیر کو اِملا کراتا گیا اور وہ لکھتے گئے۔ اور قریب تین ماہ کے نہایت قلیل عرصہ میں اس کی پہلی جلد کا مسودہ تیار ہو گیا جو پیشِ خدمتِ قارئین ہے۔ یہ جلد پھیلی ہوئی تو قریب پونے چار سو صفحات پر ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرۃ کی صرف ابتدائی اُنتیس آیات آئی ہیں۔ لیکن تفسیر کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ ابتدائی آیات اِسی تفصیل کی متقاضی تھیں۔ ان سے اسلام کا پورا خاکہ سامنے آ جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھیں گے، اتنی تفصیل کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور آئندہ ایک ایک جلد قرآنِ کریم کے نسبتاً زیادہ حصہ پر مشتمل ہو گی۔ بہرحال آغازِ سفر میں نے کر دیا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ مزید منازل کتنے عرصہ میں طے ہوں گی اور آخری منزل تک کب

پہنچا جائے گا۔ اِس مقام پر تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ۔ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ۔ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۔ (۴۰/۴۴)

اِس تفسیر کے ضمن میں حسبِ ذیل نکات پیشِ نظر رکھیے۔

(۱) میں نے اکثر کہا ہے کہ قرآنِ مجید عام تفاسیر سے سمجھ میں نہیں آسکتا، کیونکہ ان میں بیشتر حصّہ خارج از قرآن ہوتا ہے اور مفسّر کے اپنے اعتقادات و نظریات قرآنی راہنمائی پر غالب آجاتے ہیں۔ زیرِ نظر تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں ہر آیت کے مفہوم کو خود قرآنِ کریم کے دیگر مقامات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ نیز، چونکہ میرا تعلق کسی فرقہ سے نہیں اور میرے اعتقادات و نظریات کی بنیاد قرآنِ کریم پر ہے، اس لئے اِس تفسیر میں آپ فرقہ بندی رنگ کی کوئی آمیزش نہیں پائیں گے۔

(۲) آیات کا لفظی ترجمہ عندالضرورت دیا گیا ہے۔ عام طور پر ان کا مفہوم بیان کیا گیا ہے، کیونکہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا۔

(۳) الفاظ کا لغوی مفہوم اُسی حد تک دیا گیا ہے جس حد تک آیت زیرِ نظر میں اس کی ضرورت ہے۔ باقی مفاہیم لغات القرآن میں ملیں گے۔

(۴) جو آیات کسی آیت کی تشریح میں تائیداً لکھی گئی ہیں، وہاں اُن کا صرف ملخّص بیان کیا گیا ہے۔ انکی توضیح اور تشریح ان کے اپنے مقام پر سامنے آئے گی۔

(۵) چونکہ میں قرآنِ کریم کے متعلق گزشتہ چالیس سال سے مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آرہا ہوں، اس لئے اِس تفسیر میں بہت سے ایسے امور سامنے آئیں گے جنہیں میں نے اپنی سابقہ تصانیف میں کہیں نہ کہیں بیان کیا ہوگا۔

(۶) اس تفسیر میں اُن غیر قرآنی معتقدات اور نظریات کی تردید خود بخود ہوتی گئی ہے جو ہمارے ہاں عام طور پر اسلام کے نام سے مروّج ہیں۔ لیکن اِس ضمن میں، میں نے نہ کسی فرقہ کا نام لیا ہے، نہ شخصیتوں کا، بجز چند ایک ایسے مقامات کے جہاں ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ اِس سے اُن فرقوں یا شخصیات کی کسی قسم کی تحقیر مقصود نہیں، ان کے خلافِ قرآن نظریات کی تردید مطلوب ہے۔

(۷) تفسیر کے ابواب قرآنی تقسیم کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اِس تفسیر کے مضامین کی تقسیم کے اعتبار سے ہیں۔

آخر میں، میں اُن تمام احباب کا دِلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اِس کی ترتیب، تدوین، تحریر، کتابت، طباعت، اشاعت وغیرہ کے سلسلہ میں میری مدد کی۔ اِس ضمن میں رفیقِ عزیز، سراج منیر صاحب کا نام سرفہرست آتا ہے جن کی دیدہ ریزی نے اس کی کتابت کی تصحیح کا مرحلہ آسان کر دیا۔

اور اس آغازِ سخن کے خاتمہ پر اس امر کا اعتراف و اظہار ضروری ہے کہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں، بہرحال یہ ایک انسانی کوشش ہے جسے نہ سہو و خطا سے منزہ قرار دیا جا سکتا ہے نہ حرفِ آخر۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ اس سے زیادہ میں نے اپنی کوئی اور حیثیت نہ پہلے سمجھی ہے، نہ اب سمجھتا ہوں۔　　　والسلام!

۸ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

پرویز

۲۵ بی - گلبرگ ۲ - لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ الفاظ قرآن کریم کی ہر سورۃ (بجز سورۃ التوبہ[1]) کے آغاز میں ملتے ہیں۔ بعض حضرات اُسے ایک آیت قرار دیکر متعلقہ سورۃ کا جزو قرار دیتے ہیں۔ اور اس سورۃ کی آیات کے شمار کرنے میں اُسے بھی شامل کر لیتے ہیں۔ بعض اُسے متعلقہ سورۃ کا جزو قرار نہیں دیتے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ الفاظ شروع میں تبرکاً لکھدیے گئے ہیں۔ یہ فنی یا اصطلاحی بحثیں ہیں۔ جو ہمارے نزدیک چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ سورۃ النمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو جو خط لکھا تو اس کا آغاز اس طرح سے کیا: اِنَّہٗ مِنۡ سُلَیۡمٰنَ وَ اِنَّہٗ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۲۷/۳۰) اس اعتبار سے یہ الفاظ منزل من اللہ، یعنی وحی خداوندی ہیں۔ اور ہمارے لئے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے۔

عام طور پر اس کے معنی کئے جاتے ہیں:

"شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ کے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے۔"

"بِسۡمِ اللّٰہِ" میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کے معنے "شروع کرتا ہوں میں" کئے جائیں۔ ان معانی کے لئے اس سے پہلے "اَبۡتَدِءُ" کا لفظ محذوف مانا گیا ہے۔ جس کے معنے ہیں: "میں شروع کرتا ہوں"۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے "اَقۡرَءُ" کا لفظ محذوف ہے۔ کیونکہ سورۃ اَلۡعَلَق میں آیا ہے "اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ (۹۶/۱)"۔ کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ پر وحی کا آغاز اس آیت سے ہوا تھا۔ جس میں حضورؐ سے کہا گیا تھا کہ "تو پڑھ ساتھ نام اپنے رب کے جس نے پیدا کیا۔" (اس آیت کا صحیح مفہوم اپنے مقام پر آئے گا۔) بسم اللہ کے شروع میں اس قسم کے الفاظ کو محذوف اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ اس میں (بِ) کے معنے "ساتھ" کئے جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس حرف کے معنے "ساتھ" بھی ہیں۔ لیکن اس کے، اس کے علاوہ، اور معانی بھی ہیں۔ یہ حرف "سبب" بیان کرنے کیلئے بھی آتا ہے۔ یعنی یہ کہنے کے لیے کہ جو کچھ یہاں کہا جا رہا یا کیا جا رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے، اس کا مقصد یہ ہے، اس کی وجہ یا علت یہ ہے۔

---

[1] کہا یہ جاتا ہے کہ سورۃ التوبہ کے شروع میں "بسم اللہ" اس لئے نہیں لکھی گئی تھی کہ یہ متعین نہیں تھا کہ یہ ایک الگ سورۃ ہے۔ یا سابقہ سورۃ (سورۃ الانفال) ہی کا حصہ ہے۔

اسم کے معنیٰ

لفظ "اِسم" کا ترجمہ عام طور پر "نام" کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ اس کی صفات کے معنوں میں آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ اسم (مادہ۔ س۔م۔و) کے بنیادی معنیٰ کسی ایسی علامت کے ہیں جس سے متعلقہ چیز پہچانی جائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا تعارف اس کی صفات کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس لئے صفاتِ خداوندی کو اسماء الٰہی کہا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ الحشر میں مختلف صفاتِ خداوندی بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔ لَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی (۵۹/۲۴) "خدا کی تمام صفات حسین ترین اور کامل توازن لئے ہوتے ہیں"۔ اس لئے ہمارے نزدیک "بِسمِ اللہ" میں "اِسم" سے مراد "صفتِ خداوندی" ہے۔

اِس کے بعد "بسم اللہ" میں لفظ "اللہ" آتا ہے جو (یوں کہیئے کہ) خدا کا ذاتی نام ہے۔ اور "رحمٰن" اور "رحیم" اُس کی صفات ہیں۔

بسم اللہ کی غایت

ان معانی کی رُو سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ اس کے بعد کہا جائیگا یا کیا جائے گا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفتِ رحمانیّت اور رحیمیّت کا ظہور اور نمود ہو۔ یعنی یہ صفات محسوس طور پر بروئے کار آجائیں۔ جب قرآنِ کریم کی کسی سورۃ کے آغاز میں آنے والے ان الفاظ کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے (یعنی یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے متعلق ایسا فرمایا ہے) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "خدا کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن، یا قرآن مجید کی اس آیت کو اس لئے نازل کیا ہے کہ ہماری صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کی عام نمود ہو جائے"۔ اور جب ایک عبدِ مومن اپنے کسی کام کی ابتدا ان الفاظ سے کرے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ میں اس کام کو اس لئے ہاتھ میں لے رہا ہوں کہ اس سے خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کی نمود ہو جائے۔ گویا "بِسۡمِ اللّٰہِ" کی غایت خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کو عملاً بروئے کار لانا ہے۔

اب سوال یہ سامنے آئیگا کہ خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت سے مفہوم و مقصود کیا ہے۔ یوں تو خدا کی تمام صفات اپنے اپنے مقام پر یکساں عظمت اور اہمیت کی حامل ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جن صفات کو خدائی پروگرام اور اس کے اتباع میں انسان کے پروگرام کی غرض و غایت بتایا گیا ہے۔ وہ خاص اہمیت کی حامل ہوں گی۔ فلہذا گہرے غور و تدبّر کی مستحق۔ چونکہ یہ دونوں لفظ (الرحمٰن ـــ الرحیم) سورۃ فاتحہ کے آغاز میں آرہے ہیں، اس لیے مناسب یہ سمجھا گیا ہے کہ ان کی تشریح وہاں کی جائے (دیکھئے صفحہ ۲۰) بنابریں آپ تھوڑا سا توقف فرمائیں۔ اور سردست صرف اتنا سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم نازل فرمایا ہے۔ تو اس کا بھی مقصد یہ ہے کہ انسانی دنیا میں اس کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت عام ہو جائے اور اس کے بندے جس پروگرام کو بھی ہاتھ میں لیں، اس کی غرض و غایت بھی یہی ہونی چاہیئے۔ بنابریں اس وقت میں جو (اپنی بصیرت کے مطابق) قرآنِ کریم کے معانی اور مطالب بیان کر رہا ہوں۔ اور آپ انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تو اس سے ہمارا مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ اس کی رحمت کا عام ظہور ہو جائے۔ میرے پیشِ نظر بہر حال یہی مقصد ہے اور یہی میری تمام کوششوں کا منتہٰی اور مطلوب ہے۔ وما توفیقی الّا باللہ العظیم۔

سورۃ الفاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝



(۱/۱) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۔

اس آیۂ جلیلہ سے قرآن کریم کا آغاز ہوتا ہے۔ اور آیت کا آغاز لفظ "حمد" سے۔ عام طور پر اس آیت کے معنی یہ کئے جاتے ہیں :

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو پالنے والا ہے سارے جہانوں کا۔

غیر مسلم بالعموم اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا خدا عجیب ہے جو خود اپنے منہ سے کہتا ہے کہ تمام تعریفیں میرے لئے ہیں۔ کسی کا (بقول ان کے) اپنے منہ سے خود اپنے متعلق ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔ ان کا یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وحیٔ خداوندی کے ذریعے (جو قرآن کے اندر محفوظ ہے) انسانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ایسا کہیں اور ایسا کریں۔ لہٰذا "الحمد" سے مراد یہ نہیں کہ خدا اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔ اس نے انسانوں سے کہا ہے کہ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو اور اُسے ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھو کہ ساری "حمد" خدا کے لئے ہے۔ اگر قرآنِ کریم کے شروع میں لفظ "قُلۡ" کو محذوف تصور کر لیا جائے تو بات واضح ہو جائے گی۔ اس سے مطلب یہ ہوگا کہ خدائے تعالیٰ نے انسانوں کو یہ سکھایا ہے کہ تم ایسا کہو یا ایسا کرو۔

جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے اس آیت میں (اور اسی قسم کے دیگر مقامات میں) لفظ "حمد" کا ترجمہ "تعریف" کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ قرآنی مفہوم کو صحیح طور پر واضح نہیں کرتا۔ "تعریف" کے لئے عربوں کے ہاں اور الفاظ بھی ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں وہ الفاظ خدا کیلئے استعمال نہیں ہوتے۔ اس کیلئے "حمد" کا لفظ ہی آیا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کے بنیادی اور حقیقی مفہوم کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

حمد کا مفہوم | عربوں کے ہاں، کسی نہایت حسین، متناسب، نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دل میں جو جذبات تحسین بے ساختہ بیدار ہوں، ان کے والہانہ اظہار کو حمد کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں :

۱:۔ جس حسن و رعنائی اور شاہکار کی ستائش کی جا رہی ہے۔ وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس

شئے ہونی چاہیئے۔ غیر محسوس اور مشاہدہ میں آنے والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذباتِ تحسین و ستائش پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف اس کی ان تصاویر کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں جو مرئی طور پر ہمارے سامنے آجائیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان نمود و نمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کرنے کے اپنی ستائش چاہتے ہیں۔ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷) وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں۔

۲:۔ کسی کی جس بات یا جس کام کی "حمد" کی جا رہی ہو۔ وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہیئے۔ اضطراری طور پر یا میکانکی انداز سے کسی فعل کا سرزد ہو جانا، حمد کا مستحق نہیں بناتا۔ حتیٰ کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو اس کے لیے بھی "حمد" کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ "مدح" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً "رقصِ طاؤس" میں طاؤس مستحقِ مدح ہوتا ہے۔ اور اس کا خالق (خدا) سزاوارِ حمد۔

۳:۔ "حمد" کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حمد کرنے والے کے دل کی آواز ہو۔ کسی کے دباؤ سے اس کی تعریف کرنا "حمد" نہیں مدح کہلائے گا۔ نہ ہی "حمد" میں طمع کاری، نمائش، منافقت یا کسی کو بنانے کے لئے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ "حمد" میں جذباتِ تحسین بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں۔

۴:۔ جس چیز کی حمد کی جا رہی ہو، اس کا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر "حمد" نہیں کی جا سکتی، مبہم تصورات، دھندلے نقوش اور شکوک و تذبذب پیدا کرنے والے خیالات و معتقدات کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ "حمد" فریبِ تخیل، توہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں اُبھرتی۔ اس کا سرچشمہ وہ یقینِ محکم ہوتا ہے جو علیٰ وجہِ البصیرت حاصل ہو۔

۵:۔ جن نفع بخش، کشش انگیز رعنائیوں اور حسن و تناسب کے شاہکاروں کی "حمد" کی جا رہی ہو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ درجۂ کمال تک پہنچ چکے ہوں، اور ان کی نفع بخشیاں محسوس ہوں جو آرٹ تکمیل تک نہ پہنچا ہو یا جو انسانیت کے لئے نفع بخش نہ ہو وہ مستحق حمد و ستائش نہیں ہوتا۔

"آرٹ برائے آرٹ" موجبِ مدح تو ہو سکتا ہے۔ سزاوارِ حمد نہیں ہو سکتا۔ [1]

حمد کس طرح کی جا سکتی ہے

یہ ہے لفظِ "حمد" کا مفہوم محاورۂ عرب کی رُو سے۔ اور انہی معنوں میں قرآنِ کریم نے اِسے استعمال کیا ہے۔ جب اس لفظ پر "ال" (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ) آجائے تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ ہر قسم کی حمد بہ اپنے انتہائی درجہ میں صرف خدا کے لئے ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات انسان کے قیاس و خیال و گمان و وہم سے ماوراء ہے۔ اس لئے اس کی ذات کا محض ذہنی تصور حمد کے جذبات بیدار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ حمد کی شرطِ اولیں یہ ہے کہ وہ شئے محسوس و مرئی ہو۔ لہٰذا جس طرح کسی تصویر کی تحسین سے درحقیقت مصور کی حمد مقصود ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کی حمد اس کی مخلوق کی رعنائیوں اور نفع بخشیوں کو سامنے لانے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس نے خود کہا ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (۱۷/۴۴) کائنات کی ہر شے اپنے خالق کی "حمد" کی منہ بولتی تصویر ہے۔ (لفظ تسبیح کا مفہوم اپنے مقام پر آئیگا) اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی حمد اس کی پیدا کردہ کائنات پر غور و فکر ہی سے ممکن ہے۔ اس نے مومنین کی ایک صفت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ "حَامِدُوْنَ" ہوتے ہیں (۹/۱۱۲)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب حمدِ خداوندی مظاہرِ فطرت پر غور و تدبّر کی رو سے ممکن ہے تو مومنین کا بنیادی فریضہ یہ ہو گا کہ وہ اشیائے کائنات پر غور و فکر کریں۔ کائنات کے مختلف گوشوں میں تحقیقات کریں۔ اور ان کے محسوس نتائج کی نفع بخشیوں کو نوعِ انسانی کے لئے عام کر کے حمدِ خداوندی کا عملی ثبوت دیں۔ یہی ہیں وہ اربابِ فکر و نظر جن کے لئے خدا نے کہا ہے کہ: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (۳/۱۸۹) یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں۔ وہ صاحبانِ عقل و بصیرت۔ اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (۳/۱۹۰) جو اٹھتے بیٹھتے، لیٹے ہر آن قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳/۱۹۰) تخلیقِ ارض و سماء پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اور جب ان میں ریسرچ کرنے کے بعد خالقِ فطرت کی ندرت کاریاں اور نفع بخشیاں ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آتی ہیں تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ (۳/۱۹۰) اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس سلسلۂ کائنات کو نہ تو بے مقصد پیدا کیا ہے۔ اور نہ ہی تخریبی مقاصد کے لئے۔

یہ ہے خدا کی حمد اور یہ ہیں وہ اربابِ فکر و نظر اور اعیانِ تحقیق و تفحص، جنہیں حَامِدُوْنَ کہا جائے گا۔ اور

[1] لغات القرآن جلد دوم صفحہ ۵۵۰۔

جب ان کی یہ تمام کد و کاوش خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کے عام کرنے کے لئے ہوگی تاکہ تمام نوعِ انسان اس سے بہرہ یاب ہوں، تو ان "حَامِدُوْنَ" کو مؤمن کہا جائے گا۔ انہی کو دوسری جگہ خدا نے "علماء" کہکر پکارا ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (٣٥/٢٧)

علماء کون ہیں

کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا کا نظامِ آب رسانی کس قدر تعجب خیز اور حکمت انگیز ہے! (اس نظام کی تشریح مختلف مقامات پر آئے گی۔ اس جگہ صرف اتنا ہی کہا گیا کہ) وہ فضا کی بلندیوں سے بارش برساتا ہے اور فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا۔ (٣٥/٢٧) اور اس ایک ہی پانی سے طرح طرح کی رنگ برنگی، پھل، پھول، اناج وغیرہ پیدا کرتا ہے۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (٣٥/٢٧) اور کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ پہاڑ جو یونہی جامد مادہ کے ساکت و صامت تودے کھڑے نظر آتے ہیں خدا کے نظامِ ارتقا کی کتنی عظیم نشانیاں اپنے اندر لئے ہیں! ان کی چٹانیں جو کہیں سرخ ہیں، کہیں سفید اور کہیں کالی بھجنگ، ان کی ایک ایک تہہ کتنے کتنے طویل المیعاد ادوار کی تاریخ اپنے دامن میں سمٹائے ہوئے ہے! وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ۔ (٣٥/٢٧-٢٨) اور پھر انسانوں پر، مال مویشی پر اور کرۂ ارض پر موجود دیگر جاندار مخلوق پر غور کرو کہ یہ کس طرح بیشمار انواع میں بٹی ہوئی ہے اور ان میں کی ہر نوع کس طرح جداگانہ خصوصیات کی حامل ہے۔ تم ان اشیائے کائنات کو محض سرسری نظروں سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہو۔ لیکن خدا کے بندوں میں سے اربابِ علم و حکمت جب ان پر غور و فکر کرتے ہیں تو وہ اس کی عظمت و جبروت کے احساس سے لرز اٹھتے ہیں: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (٣٥/٢٨) اور ان کی زبان پر بے ساختہ حمد و تحسین کے یہ الفاظ آجاتے ہیں کہ: اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (٣٥/٢٨) بے شک ان کا خالق، خدائے واحد، بے مثال غلبہ و قوت کا مالک ہے۔ لیکن وہ اس قوت اور غلبہ کو تخریب کے لئے استعمال نہیں کرتا، کائنات کی حفاظت کے لئے عمل میں لاتا ہے۔ یہی ہیں وہ اربابِ علم و تحقیق جنہیں قرآن نے علماء کہہ کر پکارا ہے اور جو عملاً خدا کی صفتِ حمدیت کے مظہر ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ: اِنَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (٤٥/٣)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مؤمنین کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خالقِ کائنات اور اس کے محکم قوانین کے متعلق حتمی یقین رکھتے ہیں۔ وَفِىْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (٤٥/٤) تمہاری اپنی پیدائش اور دیگر جانداروں کی افزائشِ نسل میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو کائنات کے بالحق ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں۔ (٤٥/٤) انہی کو متقی کہا جاتا ہے: اِنَّ فِى اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ٥ (۱۰/۶)۔ نظامِ کائنات پر غور و فکر کی اس قدر تاکید کے بعد کہا کہ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ٥ (۴۵/۶) یہ وہ آیات خداوندی ہیں جنہیں تیرے سامنے حق کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ان سے پوچھو کہ ان کے بعد وہ کون سی بات باقی رہ جاتی ہے۔ جس کی رُو سے یہ ایمان لانا چاہتے ہیں؟

یہاں تک ہم نے مادی کائنات کے مظاہرِ حمدیت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن انسان کو طبعی سامانِ زیست کے علاوہ سفرِ حیات میں صحیح راہنمائی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ راہنمائی وحی کی رو سے ملتی تھی۔ جس کی آخری کڑی قرآن کریم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو بھی مظہرِ حمدیت قرار دیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ٥ (۱۸/۱) یعنی جب تم اس ضابطۂ قوانین پر غور و فکر کرو گے جسے اس نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ تو تمہاری زبان سے بلیساختہ اس حقیقت کا اظہار ہو جائے گا کہ فی الواقعہ مستحقِ حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے اس قسم کا ضابطۂ حیات عطا فرمایا جس میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ وہ کاروانِ انسانیت کو سیدھی راہ (صراطِ مستقیم) پر چلا کر اُسے اس کی منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی یہ حمد قرآنِ کریم پر گہرے غور و تدبر ہی سے ہو سکتی ہے۔ بنا بریں مومن وہ ہیں جو خارجی کائنات میں تحقیق و تفتیش اور قرآنِ مجید پر فکر و تدبر سے اس حقیقت کو دنیا کے سامنے لاتے ہیں کہ مستحقِ حمدیت خدا کی ذات ہے۔

قرآن میں غور و تدبر

جس ذاتِ اقدس و اعظم نے سب سے پہلے اس طرح خدا کی حمد کو عام کیا۔ اسے احمدؐ کہہ کر پکارا گیا (۶۱/۶) یعنی بہت زیادہ حمد کرنے والا اور اسی سے وہ خود محمدؐ قرار پایا (۴۸/۲۹) "جس کی مسلسل و پیہم حمد کی جائے"۔ اسؐ کی حیاتِ طیّبہ کے یہی عظیم کارنامے تھے۔ جن کی بنا پر کہا گیا کہ وہ "مقامِ محمود" پر فائز ہے (۱۷/۷۹) اسؐ کے مقدس ہاتھوں سے وہ نظام قائم ہوا جسے دیکھ کر ساری دنیا پکار اٹھی کہ فی الواقعہ مستحقِ حمد و ستائش ہے وہ خدا جس نے ایسا انقلاب آفریں نظام عطا کیا۔ اور اس کے بعد سزاوارِ حمد ہے وہ پیغامبرِ انقلاب جس نے اس نظام کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔ اس نظام کا اولین نتیجہ یہ تھا کہ ان قوموں کی جڑ کٹ گئی جو کمزور انسانوں پر ظلم و استبداد روا رکھتی۔ اور سلب و نہب سے ان کا استحصال کرتی تھیں۔ اس کا یہ وہ نفع بخش کارنامہ تھا جس سے حمدِ خداوندی اُبھر اور نکھر کر دنیا کے سامنے آ گئی۔ اس کے پیشِ نظر کہا گیا: فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۴۵) ظلم کرنے والی قوموں کی جڑیں کٹ گئیں۔ اور یوں خدائے رب العٰلمین کی حمد صفحۂ عالم پر منقوش ہو گئی۔

احمدؐ و محمدؐ و مقامِ محمود

جمال وجلال

ظاہر ہے کہ اس قسم کے انقلاب کے لیے ذاتِ خداوندی کے جلالی گوشے کی نمود بھی ضروری ہو گی۔ یعنی حسنِ تخلیق کی رعنائیوں کے ساتھ غلبہ اور قوت کا مظاہرہ بھی۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے جلال وجمال دونوں کا سرچشمہ خدا کی ذات کو قرار دیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ: لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (۶۴/۱) حمد و اقتدار دونوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔ اگر کائنات میں جمالیات کے ساتھ جلالیات کی نمود نہ ہو تو یہ نظام تباہ ہو کر رہ جائے۔ اقبال کے الفاظ میں:

حِفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری،

دوسری طرف، جو قوت واقتدار حمدیت کی مظہر نہ ہو وہ فرعونیت اور چنگیزیت بن کر رہ جاتی ہے۔ یعنی:
—— جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی —— اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس نے آسمانی راہنمائی کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف بھی نازل کی ہے۔ (۵۷/۲۵) کہ ان دونوں کے امتزاج سے نظامِ زندگی قائم رہ سکتا ہے۔ "مومناں را تیغ با قرآں بس است"۔ اس لئے کہ "ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند"۔ اگر قوت کا نگران قرآن نہ ہو تو وہ چنگیزیت ہو جاتی ہے۔ اور قرآن کے ساتھ قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ محض وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا جماعتِ مومنین ان دونوں صفاتِ خداوندی کے بروئے کار لانے سے "حَامِدُوْنَ" بنتی ہے۔

ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جب ایک عبدِ مومن (مسلمان) کہتا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے، اور اس کا مقصود کیا؟ اس سے واضح ہے کہ "حمدیت" زبان سے چند الفاظ دہرانے کا نام نہیں یہ ایک نظام کے بروئے کار لانے سے عبارت ہے جس میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں آسمانی راہنمائی کے مطابق نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کے لیے عام کیا جائے۔ اور جو قوتیں اس کی راہ میں حائل ہوں انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔

تفصیل ان امور کی اگلے الفاظ میں ملے گی۔

الله

الحمد کے بعد اگلا لفظ ہے۔ لِلّٰهِ۔ یہ درحقیقت (لِ+اَللّٰه) ہے (لِ) کے معنی ہیں "کے لئے" لہٰذا "لِلّٰه" کے معنے ہوں گے اللہ کے لئے۔ اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰه" کے معنے ہوں گے "حمدیت" اپنی مکمل ترین اور انتہائی شکل میں صرف اللہ کے لئے مختص ہے۔ لہٰذا اب ہمارے سامنے لفظ اللّٰه آتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ (ال+اِلٰه) سے مرکب

(جاری ہے)

ہے، بنابریں اللہ کے معنے ہوں گے اِلٰہِ حقیقی، اِلٰہِ واحد، جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے یہ (اللہ) اسمِ ذات ہے۔ یعنی یہ لفظ ذاتِ خداوندی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور باقی تمام الفاظ اس ذات کی صفات ہیں۔

(اِلٰہ) کے مادہ (ا۔ل۔ہ) میں حسبِ ذیل معانی مضمر ہوتے ہیں۔

۱:۔ گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا پناہ دینا۔

۲:۔ متحیّر ہونا۔

۳:۔ بلند مرتبہ اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا

۴:۔ کسی کی غلامی یا محکومیت اختیار کرنا۔ یعنی کسی کا غلبہ و اقتدار تسلیم اور قبول کرنا

ان معانی کی رو سے اللہ (یعنی قرآنی اِلٰہ) سے مراد وہ بلند و بالا ہستی ہے جو انسانی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ جس کی عظمتوں کے سامنے انسانی عقل و ادراک متحیر رہ جاتے ہیں۔ جس کا اقتدار تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ جس کی اطاعت اور محکومیت ضروری ہے۔ یعنی اُسے الٰہ تسلیم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی اطاعت و محکومیت اختیار کی جائے۔

جیساکہ پہلے کہا جاچکا ہے۔ ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کے متعلق ہم نہ کچھ جان سکتے ہیں نہ بتا سکتے۔ وہ انسانی عقل و شعور اور فکر و ادراک کی حد سے ماوراء ہے۔۔ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (۶/۱۰۴) اس کا ارشاد ہے۔ البتہ ہم اسا ہی جانتے ہیں کہ اس ذات کی صفات کیا ہیں۔ اور یہ صفات بھی خود اسی کی بتائی ہوئی ہیں۔ جو قرآنِ کریم کے اندر مندرج اور محفوظ ہیں۔ لہٰذا ایمان باللہ سے مراد ہوگا اس ذات کی حاکمیت و اقتدار تسلیم اور اختیار کرنا جس کی صفات قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔

اِلٰہ کا عالمگیر تصوّر جیساکہ میں نے اپنی کتاب "من ویزدان" کے شروع میں کہا ہے۔ آپ تاریخِ انسانی کے کسی دور سے گذر جیئے اور روئے زمین کے کسی خطہ پر نگاہ ڈالئے، ایک چیز آپ کو بلالحاظِ زمان و مکان، بالعموم تمام نوعِ انسانی میں مشترک نظر آئے گی۔ یعنی بلند و بالا ہستی کا تصور۔ کسی فوق البشر قوت کا احساس جس کے سامنے جھکا جائے، جس کی پرستش کی جائے۔ جس سے مرادیں مانگی جائیں، جس سے ڈرا جائے، جس کے حضور نذرانے پیش کئے جائیں۔ دنیا کے سیاح اور مغربی محققین اگر کسی ایسے علاقے میں بھی پہنچے ہیں، جہاں ان سے پہلے کسی باہر کے انسان کے نقوشِ قدم تک دکھائی نہیں دیئے۔ اور وہاں کے باشندے، تہذیب و تمدن سے قطعاً ناآشنا، ابتدائی دورِ جہالت کی زندگی بسر کر رہے تھے، تو اگرچہ وہ اپنی طرزِ بود و ماند اور اندازِ معیشت و معاشرت کے ہر گوشے میں باہر کی دنیا سے مختلف تھے، بایں ہمہ ان کے ہاں بھی کسی غیر مرئی، بلند و بالا قوت کا تصور پایا گیا جس کی وہ پرستش

کرتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس قسم کی ہستی کا احساس ہر جگہ موجود ہے۔ اس کا تصور یا تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں۔ اور یہی وہ اختلافات ہیں جہاں ہر قبیلہ کا خدا، دوسرے قبیلہ کے خدا سے مختلف اور ہر مذہب کا معبود دوسرے مذاہب کے معبود سے جداگانہ ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رامؔ بھی وہی اور رحیمؔ بھی وہی۔ یہ حقیقت سے بے خبری کی دلیل، فریب تخیل یا دانستہ تلبیس ہے۔ یہودیوں کا "یہوہ"، عیسائیوں کا "فادر"، ہندو دھرم کا "ایشور" یا ان کے ویدانت کا "پرماتما"، مجوسیوں کا "یزدان"، ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ اور قرآن کا اللہ ان سب سے الگ۔ یہ اس لئے کہ ان مذاہب کے بانیوں نے (جنہیں ہم زمرۂ انبیاء کرامؑ میں شمار کرسکتے ہیں، اگرچہ انبیاء کو دین کا بانی نہیں بلکہ دینِ خداوندی کے پہنچانے والے کہا جائے گا۔) خدا کی وہی صفات بیان کی ہوں گی جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ لیکن بعد میں، اُن میں انسانی خیالات و تصورات کی آمیزش ہوگئی اور اس طرح مختلف مذاہب کے خدا نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے مختلف ہوگئے۔ بلکہ خدا کے حقیقی اور منزہ تصور سے بھی جداگانہ تصور کے پیکر بن گئے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے۔ سُبۡحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۶/۱۰۱﴾

خدائے حقیقی خدائے حقیقی (اللہ) ان صفات سے بلند و بالاتر ہے جنہیں ذہنِ انسانی نے تراش کر اس کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔ خدا کا صحیح تصور انہی صفات کی رو سے سامنے آسکتا ہے جو قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ کیونکہ ان میں انسانی خیالات اور تصورات کی آمیزش نہیں ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ان لوگوں کے ایمان باللہ کو تسلیم ہی نہیں کرتا جو اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور واضح طور پر کہتا ہے کہ۔ فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ﴿۲/۱۳۷﴾ اگر یہ لوگ اس طرح خدا پر ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ جب اس نے کہا ہے کہ:۔ لَیۡسَ کَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ ﴿۴۲/۱۱﴾۔ تو اس کے یہی معنی نہیں کہ ذاتِ خداوندی کو کسی مثال کے ذریعے بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ مثال، بہر حال کسی محسوس اور محدود شے کی دی جائے گی اور اس کی ذات غیر مرئی اور غیر محدود ہے۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ غیر مذاہب کے لوگ جن جن خداؤں کو مانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس خدا کی مثل نہیں جس کا تصور خود خدا نے دیا ہے۔ اور یہیں سے یہ نکتہ بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ لفظ "اللہ" کا ترجمہ کسی اور زبان میں نہیں کیا جا سکتا

اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا ترجمہ جس زبان میں بھی کیا جائے گا تو اس سے اس خدا کا تصور ذہن میں آئے گا۔ جسے اس زبان کے بولنے والے خدا مانتے ہیں۔ مثلاً

(GOD) کے لفظ سے عیسائیوں کے خدا کا تصور ذہن میں آئے گا۔ اور "ایشور" کے لفظ سے ہندوؤں کے تصور کا خدا۔

اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اور اس کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ خدا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ میں اسے نہیں مانتا۔ یا ایک شخص اُس خدا کو مانتا ہے جس کا تصور (مثلاً) عیسائیت پیش کرتی ہے۔ اور دوسرا اُس ذات کو جس کا تصور قرآن میں دیا گیا ہے، تو ان کی عملی زندگی پر اس سے کیا اثر پڑے گا؟ اس لئے کہ اگر کسی عقیدہ یا نظریہ کا اثر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نہیں پڑتا تو اس کا ماننا یا نہ ماننا یکساں ہے۔ اس سوال کا جواب بڑی تفصیل چاہتا ہے جسے میں نے اپنی کتاب "من و یزداں" میں بیان کیا ہے، اس مقام پر اس کا ذکر اختصاراً کیا جاتا ہے۔

خدا پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے

قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے (اور اب دنیائے مذاہب کے علاوہ، علمائے نفسیات بھی اس کی شہادت دینے لگ گئے ہیں) کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں جو دیگر حیوانات کی طرح طبیعی قوانین کے تابع زندہ رہتا اور بالآخر موت کے ہاتھوں ختم ہو جاتا ہے۔ انسان میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات، نفس یا (SELF) کہا جاتا ہے۔ یہ ذات، ہر انسانی بچے کو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے، لیکن غیر نشوونما یافتہ شکل میں۔ موت کے ہاتھوں انسانی ذات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ یہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ بغرضِ تفہیم ہم انسان کی طبیعی زندگی کو "حیوانی سطح کی زندگی" اور اس کی ذات کی حامل زندگی کو "انسانی زندگی" کہہ کر پکاریں گے۔

انسانی ذات

اس غیر نشوونما یافتہ ذات کی نشوونما، انسانی زندگی کا مقصود اور نصب العین ہے۔ نشوونما یافتہ ذات، موت کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ (تفصیل ان امور کی قرآنی آیات کی رو سے اپنے اپنے مقام پر سامنے آئے گی) یہ حقیقت کہ ایک فرد کی ذات نشوونما پا رہی ہے یا نہیں، اس کا صحیح صحیح طور پر علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر انسان غلط فہمی یا فریبِ نفس میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ (تصوف کی ریاضتوں اور مراقبوں کی رو سے "تزکیۂ نفس" کا تصور اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے) ذات اپنی مکمل ترین شکل میں ذاتِ خداوندی ہے، اور قرآنِ کریم میں بیان کردہ اس کی صفات، (یوں کہئے کہ) اس سے منعکس ہونے والی شعاعیں یا اس کے مختلف گوشے (FACETS) ہیں۔ ان صفات کو چھوڑ کر جو صرف ذاتِ خداوندی کا خاصہ ہیں۔ (مثلاً ابدیت اور لامتناہیت وغیرہ) باقی صفات، محدود طور پر انسانی ذات کے اندر بھی مضمر طور پر (POTENTIALLY) رکھ دی گئی ہیں۔ جوں جوں انسانی

ذات نشو و نما پاتی جاتی ہے، یہ صفات (بشری حدود کے اندر) منعکس ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر جس فرد کی ذات نشو و نما پا رہی ہو۔ اس کی سیرت و کردار میں (حدِ بشریت کے اندر) "صفاتِ خداوندی" کی نمود ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ جاننے کے لئے کہ ہماری ذات نشو و نما پا رہی ہے یا نہیں اور اگر پا رہی ہے تو کس حد تک، یہ دیکھنا ہو گا کہ ہماری سیرت و کردار میں "صفاتِ خداوندی" کی جھلک نظر آتی ہے یا نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو صفاتِ خداوندی، ہماری ذات کی نشو و نما ماپنے کے لئے ایک خارجی معیار یا (OBJECTIVE STANDARD) کا کام دیں گی۔ اس سے انسان کسی غلط فہمی یا خود فریبی میں مبتلا نہیں ہو سکے گا۔ یہ ہے اللہ پر ایمان کی اولین ضرورت اور اس کا بنیادی مقصد۔

لیکن انسانی ذات کی نشو و نما ان قوانین و اقدار کی اطاعت کے ذریعے ہی ممکن ہے جو خدا نے وحی کے ذریعے عطا کی ہیں اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ خدا کے اِلٰہ (صاحبِ اقتدارِ مطلق) ہونے پر ایمان سے یہی مقصود ہے

خارجی کائنات میں ہر شے اُس مقصد کے حصول کے لئے جو اُس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے، قوانینِ خداوندی کے تابع سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ کسی شے کو اس اطاعت سے مجالِ انکار نہیں، یا رائے سرکشی نہیں۔ اس لئے کہ انہیں اختیار و ارادہ کی قوت حاصل نہیں ہے۔ انہیں اُن کی اطاعت کیلئے مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ ان کے برعکس انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی پہلی اور بیش پا افتادہ شہادت تو یہ ہے کہ اگرچہ حیوانات کی طرح اس کی طبعی زندگی کا مدار بھی قوانینِ فطرت کی اطاعت پر ہے۔ لیکن یہ ان کی اطاعت سے سرکشی برت کر، خودکشی بھی کر سکتا ہے۔ حیوانات خودکشی نہیں کر سکتے۔

جس طرح انسان کی طبعی (حیوانی سطح کی) زندگی کے لئے قوانین و ضوابط ضروری ہیں، اسی طرح اس کی انسانی زندگی (یعنی وہ زندگی جس میں اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے) کے لئے بھی قوانین و ضوابط لابدی ہیں۔ اس زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو انسان کے لئے دوہرے ضوابط کی پابندی ضروری ہے ـــــ ایک ضابطہ اس کی طبعی زندگی (بدن) کے قیام اور نشو و نما کے لئے اور دوسرا ضابطہ اس کی انسانی زندگی (ذات) کے استحکام اور برومندی کے لئے۔

اجتماعی زندگی

اس کی طبعی (حیوانی) زندگی کا قیام اور نشو و نما تو انفرادی طور پر (اکیلے اور تنہا رہنے سے) بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی ذات کی نشو و نما اجتماعی زندگی ہی میں ممکن ہے، جہاں ایک انسان کا واسطہ دوسرے انسانوں سے پڑتا ہے۔ (یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ انسانی ذات کی نشو و نما ـــ تزکیۂ نفس ـــ غاروں، پہاڑوں، جنگلوں، بیابانوں یا مراقبوں اور ریاضتوں کی خلوت گاہوں میں ممکن ہے، فریبِ نفس ہے۔ اور بہرحال قرآنی تعلیم کے خلاف۔) قرآنِ کریم کا تجویز کردہ پروگرام: وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (۲/۴۳)

قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والوں کے ساتھ مل کر جھکنا۔ اور کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (۹/۱۱۹) سچوں کی کی معیت میں زندگی بسر کرنا ہے۔ وہ "جنت" میں داخلہ کی شرط یہ بتاتا ہے کہ۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ۔ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (۸۹/۲۹-۳۰) میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو کر میری جنت میں داخل ہو جا۔ اسے انسان کی تمدنی زندگی کہا جائے گا۔ لہٰذا انسان کی تمدنی زندگی کے لئے بھی ضابطۂ قوانین کی ضرورت لاینفک ہے۔ اس زندگی کے لئے قوانین وضوابط کی ضرورت دنیا کی ہر قوم تسلیم کرتی ہے۔ انسانوں کے ایک گروہ (جن کی آج کل اکثریت ہے) کا خیال ہے۔ کہ ان قوانین کو انسانی سوسائٹی خود وضع کر سکتی ہے۔ (اس نظریہ کو **سیکولرازم** کہا جاتا ہے) لیکن قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ اس سے انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی میں فساد برپا ہو جائے گا۔ (جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور ہو رہا ہے)۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لئے بھی اسی خدا کی طرف سے قوانین ملنے چاہئیں جس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں۔ اور جن کی رُو سے نظامِ کائنات اس حسن وخوبی سے سرگرم عمل ہے (۶۷/۳-۴) یہ قوانین وحی کی رُو سے ملتے ہیں۔ اور اب اپنی مکمل، غیر متبدّل صورت میں قرآن کے اندر محفوظ ہیں (۱۵/۹، ۶/۱۱۶) سیکولرازم کے حامیوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اتنا تو مانتے ہیں کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا۔ اور اس میں اسی کے قوانین کارفرما ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم اسے ایمان باللہ (خدا پر ایمان) تسلیم نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "اگر ان سے پوچھو، کہ اس زمین اور اجرام فلکی کو کس نے پیدا کیا۔ اور شمس وقمر کس کے قوانین کے تابع سرگرم عمل ہیں تو یہ کہیں گے کہ خدا ہی نے انہیں پیدا کیا اور اسی کے قوانین کے یہ تابعِ تسخیر ہیں"۔ پھر وہ کہتا ہے کہ "اگر ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے۔ جس کے قوانین کے مطابق آسمان سے بارش ہوتی ہے جس سے زمینِ مردہ حیاتِ نو حاصل کر لیتی ہے، تو یہ کہیں گے کہ ایسا خدا ہی کے قوانین سے ہوتا ہے"۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب یہ خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی کو تسلیم کرتے ہیں تو انسانی دنیا میں اس کے قوانین کی ضرورت سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں؟ یہاں پہنچ کر انہیں کونسی بات دھوکہ دیدیتی ہے۔ فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ (۲۳/۸۴-۸۹) ان کی عقل وفکر پر کیوں پردے پڑ جاتے ہیں (۲۹/۶۱-۶۳) وہ کہتا ہے کہ ان سے کہو

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (۲۹/۶۳)

ارض وسما کا الٰہ حمدیتِ خداوندی کی آماجگاہ صرف خارجی کائنات نہیں۔ انسانی دنیا کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی مظہر بنے۔ تم انسانی دنیا کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھو اور اس کے بعد دیکھو کہ یہاں کس طرح مسرتوں اور شادکامیوں کے چشمے اُبلتے اور تحسین وآفرین کے غلغلے بلند ہوتے ہیں! وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ (۴۳)

سما میں بھی وہی اِلٰہ ہے۔ اور ارض میں بھی وہی اِلٰہ۔

کائنات کی فضاؤں میں بھی اسی کا اقتدار کارفرما ہے اور زمین پر بھی اسی کا اقتدار۔ اللہ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں میں اسی کے قوانین کی کارفرمائی کو تسلیم کیا جائے۔ اگر اللہ کو سمٰوٰت (خارجی کائنات) کا اِلٰہ (صاحبِ اقتدار) تسلیم کر لیا جائے اور انسان اپنی تمدنی زندگی میں اور اِلٰہ تجویز کرلے، تو اس سے فساد برپا ہو جائے گا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲-۲۱)

اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا اور اِلٰہ تسلیم کر لیے جائیں تو ان میں فساد برپا ہو جائیگا۔

اپنے جذبات کو الٰہ بنا لینے والے

یہی نہیں کہ قرآن کریم انسانی سوسائٹی کے اپنے وضع کردہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے ہی کو ایمان باللہ کے منافی قرار دیتا ہے۔

وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ:-

"أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ" (۴۵/۲۳)

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے خود اپنے جذبات ہی کو اپنا اِلٰہ بنا لیا۔

ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ۔ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً (۴۵/۲۳)۔ انسان میں سننے، دیکھنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اور یوں وہ علم رکھنے کے باوجود تباہیوں اور بربادیوں کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔

فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ (۴۵/۲۳) ایسے شخص کو تباہی سے صرف خدا کی راہنمائی ہی بچا سکتی ہے۔

اس مقام پر ایک ایسا نکتہ سامنے آتا ہے جسے چھوڑ کر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس کی تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں اجمالاً اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ جب قرآن کا نزول ہوا تو ساری دنیا رہبانیت (خانقاہیت) میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جذبات اور علم و ہدایت

اس مسلک کی رُو سے سمجھا یہ جاتا تھا کہ انسانی جذبات معرفتِ خداوندی کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اور قربِ الٰہی اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو جذبات کو فنا کر دے۔ اسی کا نام نفس کشی تھا۔ یہ مسلک انتہائی مہلک تھا۔ اول تو جذبات ہی وہ قوت ہیں جو انسانی عمل کے محرک بنتے ہیں۔ انہیں فنا کر دیا جائے تو انسان پتھر بن کر رہ جائے۔ دوسرے یہ کہ جذبات کو فنا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ایسا سمجھنا فریبِ نفس ہے۔ جذبات کو صرف دبایا جا سکتا ہے۔ اور دبائے ہوئے جذبات جب اپنی

تسکین دنمود کے لئے صحیح فطری راستے بند پاتے ہیں تو غیر فطری راستوں سے سر نکالتے ہیں۔ اسے علم النفس کی اصطلاح میں بدنہادی یا (PERVERSION) کہتے ہیں۔ جس سے انسان قسم قسم کے نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے آکر اس غلط مسلکِ خانقاہیت کو للکارا اور کہا کہ جذبات کو سرکش اور بیباک بنا دینا، ہلاکت اور تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ (اس کو وہ جذبات کو الٰہ (خدا) بنا لینے سے تعبیر کرتا ہے)۔ انہیں اگر ہدایت خداوندی کے تابع رکھا جائے تو ان سے بڑے تعمیری کام لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ: فَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰) گمراہ اور تباہ کار وہ ہے جو ہدایتِ خداوندی کا بغیر جذبات کا اتباع کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۳۰/۲۹) ظالم وہ ہیں جو بغیر علم اپنے جذبات کا اتباع کرتے ہیں۔

مسلکِ خانقاہیت میں علم و جذبات کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا جاتا ہے۔ اسی لئے قربِ خداوندی کا ہر مدعی عقل کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہتا ہے۔ لیکن قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ جذبات سے علم کی روشنی میں کام لو۔ فکرِ انسانی کو اس (بظاہر متضاد) حقیقت تک پہنچنے کے لئے صدیاں درکار تھیں۔ چنانچہ اب بیسویں صدی میں علم النفس (PSYCHOLOGY) ایک سائنس کی حیثیت سے سامنے آ رہا ہے (اگرچہ یہ ابھی باقاعدہ سائنس بن نہیں سکا۔) اس علم کے ماہرین نے، بڑی گہری تحقیق کے بعد جذبات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی (RATIONAL PASSIONS) اور (IRRATIONL PASSIONS)۔ یہ وہی تقسیم و تفریق ہے جس کی طرف قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے اشارہ کیا تھا۔ اور جسے اس سے پہلے فکرِ انسان اپنا نہیں سکا تھا۔ وہ علم اور جذبات کو نقیضین (متضاد عناصر) قرار دیتا تھا۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں پہنچکر انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قرآن فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں۔

بہرحال قرآن کریم نے خدا کی اُلوہیت (اقتدارِ خداوندی) کو ایسی بلند اور منزہ سطح پر رکھا ہے کہ وہ اور تو اور، انسانی جذبات کو "خدا" بنا لینے کو بھی شرک قرار دیتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی، دونوں کو قوانین خداوندی کے تابع رکھے یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے تھے۔ اور اب اس کی کتاب، قرآنِ مجید کے اندر محفوظ ہیں۔ اسی کو خدا کی حاکمیت تسلیم کرنا کہتے ہیں۔ اور اسی کا نام خدا پر ایمان لانا ہے۔ چنانچہ اس نے نہایت جامع الفاظ میں کہدیا کہ:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۵)

جو اپنے تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتے تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس کی کتاب کے تابع زندگی بسر کریں، وہی خدا کو اللہ ماننے کے مدعی ہو سکتے ہیں۔ اور وہی حقیقی معنوں میں کہہ سکتے ہیں کہ:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (۱/۱)

سورۃ فاتحہ میں ان دو لفظوں کے بعد اللہ تعالےٰ کی تین صفتوں کا بیان متعین طور پر کیا گیا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اس کی حمدیت کا ظہور اور اس کی نمود بنیادی طور پر ان صفات کی رُو سے ہوگی۔ وہ صفات ہیں: رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اور "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ"۔ سب سے پہلے لفظ ربّ کو لیجئے:

ربّ (ر۔ب۔ب) کے بنیادی معنے ہیں "نشو و نُما دینا"، یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اس لئے اور اس طرح گذارنا کہ وہ بتدریج نشو و نما پاتی ہوئی، اپنے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچ جائے۔ یہ "طریق نشو و نما" ربوبیت کہلاتا ہے۔ اور اس طرح نشو و نما دینے والے کو "رب" کہا جاتا ہے۔ اس طریق میں اصلاح، درستگی اور استحکام کے پہلو بھی مضمر ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ نشو و نما کا لازمی نتیجہ شگفتگی اور شادابی ہے اس لئے "اَلرِّبَّةُ"، ان پودوں کو کہتے ہیں جن کی سرسبزی اور تازگی، سردی اور گرمی ہر موسم میں یکساں رہتی ہے۔

تصریحاتِ بالا سے "رَبٌّ" کے بنیادی معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی نشو و نما دینے والا۔ پایۂ تکمیل کو پہنچانے والا۔ اِنتظام کرنیوالا، اصلاح کرنے والا، آگے بڑھانے والا اور استحکام عطا کرنے والا، یعنی ہر شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچانے والا۔

تخلیقِ کائنات یہ محسوس کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی، اس کا جواب فکرِ انسانی سے ممکن نہیں نظامِ فطرت میں قانونِ علت و معلول (LAWS OF CAUSE AND EFFECT) جاری و ساری ہے۔ یعنی یہاں جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ طبیعی سائنس، علت اور معلول کی کڑیوں کے دریافت کرنے کا نام ہے۔ یہ محققین ان کڑیوں کو پیچھے لئے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی اس تحقیق میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو رہے ہیں، لیکن اس میں وہ آخر الامر ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں یہ کائنات تو موجود نظر آتی ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس طرح وجود میں آگئی۔ یعنی وہاں (EFFECT) تو موجود ہوتا ہے۔ لیکن اس کے (CAUSE) کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بڑے سے بڑا سائنس دان بھی اس مقام پر اسی طرح دانتوں میں انگلی دبائے محوِ حیرت کھڑا دکھائی دیتا ہے جس طرح ایک جاہلِ مطلق۔ ہم نے ("اللہ" کے عنوان میں) دیکھا ہے کہ "اِلٰہ" کے معانی میں متحیّر ہو جانا بھی شامل ہے آغازِ

(جاری ہے)

کائنات، وہ مقامِ تحیّر ہے جس کا تعلق خدا کی شانِ ربوبیت سے ہے۔ اسی لئے خدا نے اپنے آپ کو بدیعُ السّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲/۱۱۷) کہا ہے۔ یا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶/۱۴) یعنی اس مادی کائنات کو بغیر کسی سابقہ مسالہ کے وجود میں لانے والا۔ علت کے بغیر معلول کو ظہور میں لے آنے والا۔ آغاز کائنات سے پہلے کے عالم کو اس نے عالمِ امر کہہ کر پکارا ہے۔ اور نمودِ کائنات کے بعد کو عالمِ خلق۔ انسانی علم کا آغاز عالمِ خلق سے ہوتا ہے۔ اور یہیں سے خدا کی ربوبیت کے سمجھ میں آنے کا بھی آغاز ہوتا ہے۔

نظریہ ارتقاء طبعی سائنس کے انکشافات اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ اشیائے کائنات جس شکل میں اس وقت موجود ہیں۔ یہ شروع ہی سے اس شکل میں نہیں تھیں۔ ان میں سے ہر شے کا آغاز (یوں کہیے کہ) ایک نقطہ سے ہوا۔ اس کے بعد یہ شے نشو و نما پاتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی (نقطہ لکیر بنتا گیا) اور مختلف مراحل و مدارج سے گزرتی ہوئی اس شکل میں متشکل ہو گئی جسے ہم آج اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ اسے ان کی اصطلاح میں نظریہ ارتقاء (THEORY OF ORGANIC EVOLUTION.) کہتے ہیں۔ میں نے اس نظریہ کی تفصیل۔ اور قرآنی آیات کی روشنی میں اس کی وضاحت، اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں کی ہے۔ اربابِ ذوق وہاں دیکھ سکتے ہیں۔ اس مقام پر اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی دیکھئے کہ ان الفاظ (حمد، اللہ اور ربّ) کے جو لغوی معنے ہم نے بتائے ہیں۔ اور پھر جن مفاہیم کے لئے قرآنِ کریم نے انہیں استعمال کیا ہے، کیا دنیا کی کسی زبان میں ایسے الفاظ ہیں۔ جن میں ان کا ترجمہ کیا جا سکے۔ اسی لفظِ "رب" کو لیجئے۔ قرآنِ کریم کے انگریزی تراجم میں (خواہ وہ ترجمے غیر مسلموں نے کئے ہیں یا خود مسلمانوں نے) اس کا ترجمہ (LORD) کیا گیا ہے۔ آپ سوچئے کہ اس لفظ (LORD) سے کسی طرح بھی وہ مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے جو لفظِ رب کے اندر پوشیدہ ہے۔ اس مفہوم کا سمجھ میں آنا تو ایک طرف، اس سے خدا کے متعلق جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ لفظِ رب سے پیدا ہونے والے تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ کہاں "اشیائے کائنات کو نشو و نما دیتے ہوئے انہیں ان کے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچانے والا اور اس طرح انہیں ارتقائی مراحل میں سے گزارتے ہوئے ان کی مضمر صلاحیتوں کو مشہود کرنے والا" اور کہاں (LORD)۔ یہ وجہ ہے جو (GIBB) [1] نے کہا ہے کہ قرآنِ مجید کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ اس کا صرف مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے۔ (اور یہی وجہ ہے کہ میں نے بھی لغات القرآن مرتب کرنے کے بعد قرآنِ مجید کا ترجمہ نہیں کیا۔ اس کا مفہوم پیش کیا ہے)۔

---

[1] H.A.R. GIBB IN MODERN TRENDS IN ISLAM (1945 EDITION P. 4)

بہر حال ایک محقق جب، نظامِ کائنات پر غور کرتا ہے۔ اور یہ دیکھتا ہے کہ خدا کی ربوبیت کس طرح ایک قطرہ کو گہر میں تبدیل کرتی ہے اور زندگی کے ایک ناقابلِ ذکر جرثومہ کو کروڑ در کروڑ مراحل سے گزار کر پیکرِ آدمیت تک لے آتی ہے تو وہ بلیساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱/۱)

لیکن خدا کی اس صفتِ ربوبیت کا ظہور کسی ایک شے یا زندگی کے ایک گوشہ تک محدود نہیں۔ یہ عالمین کو محیط ہے۔ یہاں سے اگلی بات ہمارے سامنے آتی ہے۔ یعنی یہ کہ عالمین سے کیا مُراد ہے۔

عَالَمِیْن

اِس کا مادہ (ع۔ل۔م) ہے۔ جس کے معنے ہیں جاننا، پہچاننا۔ چنانچہ عالِم (ل کے زیر کے ساتھ) صاحبِ علم یا کسی بات کے جاننے والے کو کہتے ہیں اور عالَم (ل کے زبر کے ساتھ) اس چیز کو جس کے ذریعے کسی کی پہچان ہو سکے یعنی کسی شے کی علامت یا نشانی۔ جیسے "عَلَم" (جھنڈا) متعلقہ فوج کی نشانی ہوتا ہے۔ آپ رات کے وقت کسی بیابان جنگل سے گزر رہے ہوں جہاں کسی اِنسان کا سراغ تک نہ مل سکتا ہو کہ اتنے میں دور سے آپ کو ایک ٹمٹماتا ہوا دیا نظر آئے۔ اس سے آپ پہچان جائیں گے کہ وہاں کوئی انسان رہتا ہے۔ وہ دیا کسی انسان کی موجودگی کی علامت یا "عَلَم" بن جائے گا۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہ وحقیقت انسان کے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتی لیکن اس کائنات کا وجود اس امر کی علامت ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ لہٰذا یہ محسوس کائنات، خدائے غیر مرئی وغیر محسوس کے پہچاننے کی علامت یا ذریعہ کہلائے گی۔ اس سے ایک بلیغ نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ قرآنِ مجید نے کائنات کو "عالَم" کہا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ کائنات کا وجود مقصود بالذات نہیں بلکہ یہ فقط ذریعہ ہے کسی کے پہچاننے کا — خود انسان کے مقام کے پہچاننے کا۔ اور اس سے آگے بڑھ کر اس امر کے جاننے پہچاننے کا کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جس کی عظیم القدر اسکیم کے تابع یہ سارا نظام سرگرمِ عمل ہے۔ اس مشہود کائنات کو مقصود بالذات نہیں، بلکہ کسی بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ قرار دینا قرآن ہی کا اعجاز ہو سکتا تھا۔ اقبالؔ کے الفاظ میں:

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن ❊ نہ سیرِ گل کیلئے ہے نہ آشیاں کیلئے

عالَمین جمع ہے عالَم کی۔ لہٰذا اس کے معنے ہوتے "کائناتیں"۔ ہم تو اپنی اسی دنیا کو کائنات سمجھتے ہیں۔ لیکن نہ معلوم خدا کی پیدا کردہ کتنی کائناتیں ہیں۔ اور پھر اس لفظ کا مفہوم اور بھی واضح ہو جائے گا جب قرآن میں بیان کردہ اس حقیقت کو سامنے لایا جائے۔ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ۔ (۳۵/۱) اللہ تعالیٰ اپنی مشیت

کے پروگرام کے مطابق اپنی مخلوق میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ کیا معلوم کتنی نئی نئی کائناتیں، نت نئے دن وجود میں آتی رہتی ہیں۔ مخلوقِ خداوندی کی اس تحیر انگیز وسعتوں کو پیشِ نظر رکھیے اور پھر اس حقیقت پر غور کیجئے کہ اس نے اپنے آپ کو "ربّ العٰلمین" کہا ہے۔ یعنی تمام کائناتوں کی ربوبیت کا ذمہ دار۔

عرب) مٹی اور پتھر (کی سی جامد) چیزوں کے متعلق سمجھتے تھے کہ ان میں نشو و نما نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ عالم کا لفظ صرف جاندار یا ذی شعور چیزوں کے لئے بولتے تھے۔ اور اسی نہج سے عالمین سے مراد دنیا کی مختلف قومیں لیتے تھے۔ لیکن اب سائنس کے انکشافات کچھ اور کہتے ہیں جس کی رُو سے جامد اور نامی کی تخصیص ہی مٹتی جا رہی ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ خود مادہ (MATTER) کا قدیم تصور ہی بدل چکا ہے۔ اس لئے خدا کی رب العالمینی صرف جاندار چیزوں تک محدود نہیں رہے گی۔ بلکہ کائناتوں میں بکھری ہوئی تمام اشیاء کو محیط ہو گی۔ لیکن اگر ہم عربوں کے قدیم تصور کے مطابق اسے جاندار اشیاء تک ہی محدود سمجھیں تو بھی قرآن کریم کی رو سے جاندار اشیاء اس کرۂ ارض تک محدود نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ فضائے آسمانی میں پھیلے ہوئے کروں میں بھی

اجرامِ فلکی میں زندگی

ایسے ہیں جن میں جاندار مخلوق موجود ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (۴۲/۲۹) آیاتِ خداوندی میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سمٰوات کو پیدا کیا۔ اور ان میں جاندار مخلوق کو پھیلا دیا۔ اس کے بعد آیت کے آخری الفاظ بڑے گہرے غور و تدبر کے محتاج ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ کسی وقت مختلف کرّوں میں پھیلی ہوئی جاندار مخلوق کو ایک دوسرے سے ملا دے۔ اس وقت جو دوسرے کرّوں تک پہنچنے کی مہم کا آغاز ہوا ہے، شاید ایک دن انسان کا یہی تجسس اور مہم جوئی قرآن میں بیان کردہ اس حقیقت کا ثبوت بہم پہنچا دے۔ قرآن کریم نے احقاقِ حق کے سلسلہ میں یہ بھی تو کہا ہے کہ: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) ہم لوگوں کو ان کی داخلی دنیا اور خارجی کائنات میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے۔ تا آنکہ ہمارا یہ دعویٰ واضح طور پر ان کے سامنے آ جائے کہ قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے ظن و قیاس نہیں۔ اجرام فلکی میں پھیلی ہوئی زندگی کے اس قرآنی تصور کے پیشِ نظر اقبال نے کہا تھا کہ:

نہیں زندگی سے تہی یہ فضائیں ❊ یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

اقوامِ عالم

اگر ہم لفظ "عالمین" کے مفہوم کو سمٹا کر اس دنیا کے انسانوں تک محدود کر دیں تو، اس کا مفہوم "عالمگیر انسانیت"، یا جملہ اقوامِ عالم ہو جائے گا۔ قرآنِ کریم میں اس لفظ کو ان معانی میں بھی استعمال کیا گیا

ہے۔ مثلاً اس نے خود قرآن کو "ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ" (۱۲/۱۰۴) کہا ہے اور دیگر مقامات پر اسے۔ بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (۴۵/۲۰) یا "هُدًى لِّلنَّاسِ" (۲/۱۸۵) کہکر پکارا ہے۔ اسی طرح اس نے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعلمین قرار دیا ہے (۲۱/۱۰۷) اور دیگر مقامات میں ہے کہ حضور کی بعثت كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (۳۴/۲۸) کے لئے ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے رب العلمین کے معنے ہوں گے تمام نوعِ انسان کی نشوو نما کا ذمہ دار (میں عام طور پر اس کے لئے "عالمگیر نظامِ ربوبیت" کی اصطلاح استعمال کیا کرتا ہوں)

اسلامی نظام کی ذمہ داری

عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خدائے حقیقی (جس کا تصور قرآن نے دیا ہے) کسی خاص قبیلہ، خاص نسل، خاص قوم بلکہ کسی خاص اہلِ مذہب کا رب نہیں۔ وہ عالمگیر انسانیت کا رب ہے۔ اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ جب خدا پر ایمان رکھنے والی امت (امتِ مسلمہ یا جماعتِ مؤمنین) کے ہاتھوں وہ نظام متشکل ہو گا، جس کی رو سے خدا کی صفتِ رب العالمین محسوس و مشہود طور پر سامنے آئے گی تو اس کا عملی نتیجہ کیا ہو گا۔ یہ نظام تمام نوعِ انسان کو سامانِ نشوو نما بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر پر لے گا۔ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا" (۱۱/۶) کرہ ارض پر کوئی جاندار ایسا نہیں جسکے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر نہ لے رکھی ہو۔ رزق کے خزانے تو خدا نے مہیا کر رکھے ہیں لیکن اس کی پیدائش اور تقسیم انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ یہ امت سامانِ زیست (رزق) زیادہ سے زیادہ پیدا کرے گی۔ اور اس کے بعد اس کی تقسیم اس انداز سے کرے گی کہ کوئی انسان اس سے محروم نہ رہنے پائے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے مستحقِ حمد و ستائش ہونے کی اولین وجہ اس کی رب العالمینی بتائی گئی ہے۔ بنا بریں دنیا میں وہی نظام مدح و ستائش کا مستحق ہو سکتا ہے جو اس ربوبیتِ عالمینی کی ذمہ داری اپنے سر لے اور اس سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہو۔ یہی قرآن کے معاشی نظام کی اصل و بنیاد اور علت و غایت ہے۔ یہ سامانِ زیست کس کس انداز سے ملے گا یا دیا جائے گا۔ اس کی تشریح ان دو الفاظ سے سامنے آئے گی جو اس کے بعد دیئے گئے ہیں۔ یعنی :

(۱/۲) رَحْمٰن ـــــ رَحِيْم

ان ہر دو الفاظ کا مادہ (ر۔ ح۔ م) ہے۔ یہیں سے لفظ رحمت ہے جس کے معنے ہیں وہ عطیہ جو کسی کے ظاہر و باطن کی کمی کو پیدا کر دے اور جسے ضرورت کے تقاضے کے مطابق دیا جائے۔ اسی سے لفظ "رحم" ہے۔ رحمِ مادر میں جس انداز سے جنین کی پرورش ہوتی ہے وہ رحمت کے مفہوم کو وضاحت سے سامنے لے آتا ہے۔ مرد اور عورت کے جرثومات تولید سے رحم میں نطفہ قرار پاتا ہے۔ اس ممزوج، مخلوط نطفہ کے اندر ایک جیتے جاگتے انسانی بچے کی ممکنات پوشیدہ ہوتی ہیں

وہاں ان مضمرات کو مشہود کرنے کے لئے جس انداز سے سامانِ نشو و نما ملتا ہے وہ اربابِ فکر و نظر کو محوِ حیرت کر دیتا ہے وہاں سب کچھ بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ بچے کے پیدا ہو جانے کے بعد کی حالت سے بالکل مختلف انداز میں ملتا ہے۔ پھر رحمِ مادر میں اتنی لوچ اور لچک، لطافت اور رافت ہوتی ہے کہ وہ جنین کی حرکت کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ یہ ہے خدا کی رحمت کی کارفرمائیوں کی ایک مثال۔

سوال یہ ہے کہ خدا کی اس صفت (رحمت) کی نمود و ظہور کے لئے رحمٰن اور رحیم کے دو الفاظ کیوں آئے ہیں۔ حالانکہ دونوں کا مادہ ایک ہی ہے۔ جیسا کہ ہم "بسم اللہ" کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں یہی الفاظ وہاں بھی آئے ہیں۔ اور ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے "رحم کرنے والا بہت مہربان" آپ نے دیکھا کہ اس ترجمہ سے صرف اتنا ہی نہیں کہ حقیقت سامنے نہیں آتی۔ بلکہ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ "رحم کرنے والے اور بہت مہربان" کا مطلب کیا ہے۔ قرآن کریم کے انگریزی تراجم میں بھی ان کے لئے (BENFICIENT) اور (MERCIFUL) کے الفاظ آتے ہیں۔ بات ان سے بھی نہیں بنتی، نہ ہی صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ عربی زبان بڑی سائنٹیفک زبان ہے۔ اس میں ہر لفظ کا ایک مادہ (ROOT) ہوتا ہے جو درخت کے بیج کی طرح اس کے بنیادی مفہوم کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس زبان میں مختلف ابواب یا اوزان ہوتے ہیں جن کی رو سے ایک ہی مادہ سے مختلف الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں۔ ہر باب یا وزن کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ اس سے، مختلف ابواب میں آنے والے الفاظ کے بنیادی معنے تو ایک ہی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی خصوصیات الگ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ "رَحِیْمٌ" کا لفظ فَعِیْلٌ کے وزن پر ہے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس صفت کا ظہور التزاماً، بتدریج، مسلسل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور رَحْمٰنٌ کا وزن فَعْلَانٌ ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اس صفت کا ظہور شدت کے ساتھ یک لخت ہوتا ہے۔ ان دونوں مفاہیم میں یہ فرق بڑے گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ طبیعیات کے محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اشیائے کائنات میں نشو و نما ارتقائی طریق سے ہو رہی ہے۔ یعنی وہ اپنے نقطۂ آغاز سے بتدریج نشو و نما پاتے ہوئے آگے بڑھتی چلی آتی ہیں تاآنکہ وہ منزلِ تکمیل تک پہنچ جاتی ہیں یہ ارتقائی مراحل کڑی در کڑی مسلسل طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کڑیوں میں کوئی خلا (GAP) نہیں ہوتا۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ شئے ایک ہی جست میں مختلف کڑیاں پھاند کر ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسے ان کی اصطلاح

فجائی ارتقاء

میں (EMEGRENT EVOLUTION) اور فجائی ارتقاء" کہا جاتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے متعلق یہ سائنس دان کچھ نہیں بتا سکتے۔ چنانچہ اس نظریہ کا (یوں کہئے کہ) امام "لائیڈ مارگن" اپنی کتاب (EMERSENT EVOLUTION) میں لکھتا ہے کہ:

"اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم (EMERGENT) کہتے ہو، وہ بالآخر ہے کیا، تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

اسی باب میں وائی کاونٹ سیموئیل کہتا ہے کہ:

عِلّت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنہیں صرف دستِ قدرت ہی ظہور میں لا سکتا ہے۔ [۱] (BELIEF AND ACTION)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اشیائے کائنات کو ان کی نشو و نما کے لیئے جو سامانِ رحمت ملتا ہے اس کی عمومی شکل تو یہی ہے کہ وہ اِلتزاماً مسلسل، کڑی در کڑی ملتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے خدا کو "الرَّحِیْم" کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن جب اس کی نمود فجائی ارتقاء کی شکل میں ہو تو اس کے لئے اس نے "الرحمٰن" کہا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ صِرف اوزان کے فرق سے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ اور یہ بات کس طرح سمجھ میں آگئی کہ قرآن نے ایک ہی مادہ کے دو الفاظ کیوں استعمال کئے ہیں۔ تخلیقِ انسانی کے سلسلے میں قرآنِ کریم کی ایک ہی آیت میں ان دونوں صفات کی نمود بڑے بصیرت افروز اور حقیقت کشا انداز میں بیان کی گئی ہے۔ سورۂ مومنون میں ہے کہ تخلیقِ انسانی کی ابتدا جامد مادہ سے ہوئی۔ پھر رحمِ مادر میں حمل قرار پایا تو نطفۂ تولید نے نشو و نما پانا شروع کیا۔

تخلیقِ انسانی کے مراحل

پہلے اس نے جونک کی سی شکل اختیار کی۔ پھر وہ گوشت کا لوتھڑا سا بن گیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ اُبھرا۔ پھر ان ہڈیوں پر گوشت کی تہہ چڑھا دی گئی۔ یہاں تک کا طریقِ تولید و نشو و نما عام حیوانوں اور انسانوں کے جنین کی صورت میں یکساں ہوتا ہے اور بتدریج عمل میں آتا ہے۔ یہ خدا کی صفتِ رحیمیت کی رو سے ہوتا

---

[۱] نظریۂ ارتقاء اور اس کے تضمنات کی تشریح اور تفصیل کے لیے میری تصانیف۔ "انسان نے کیا سوچا"؟ "ابلیس و آدم" اور "سلسبیل" وغیرہ ملاحظہ فرمایئے۔

یہ نظریہ عصرِ حاضر کا انکشاف نہیں۔ ہمارے متقدمین (مسلمان حکماء) کے ہاں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً ابنِ مسکویہ (المتوفی ۴۲۱ھ) نے اپنی تصنیف "الفوز الاصغر" میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان متقدمین کے ہاں (EMERGENT) کی رُو سے پیدا ہونے والے خلا یا جست کو طفرہ کہا جاتا تھا۔

ہے۔ اس کے بعد انسان اور حیوان میں ایک ایسا بنیادی فرق پیدا ہوتا ہے جو سابقہ کڑیوں کے ارتقاء کا طبیعی نتیجہ نہیں ہوتا وہاں یک لخت ایک تبدیلی ظہور میں آتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳/۱۲-۱۴)۔ یعنی پھر خدا نے اسے ایک نئی قسم کی مخلوق بنا دیا۔ یہ فجائی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ اس "خلقِ جدید" کی رو سے انسان کو اُس کی ذات عطا کر دی جاتی ہے۔ جسکی بنیادی خصوصیت اختیار و ارادہ ہے اور جس کی نشوونما سے یہ مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس فجائی ارتقاء کے لئے "الرحمٰن" کا لفظ آیا ہے۔

وحی کی راہنمائی

انسانی ذات کی نشوونما ان اقدار و احکام کی پابندی سے ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی دئے جاتے ہیں جب خدا نے اپنے متعلق کہا تھا۔ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۵۴) خدا نے سامانِ زیست (رحمت) کا عطا کرنا اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے، تو اس رحمت میں انسان کی طبیعی زندگی کی نشوونما کے سامان کے علاوہ، اس کی ذات کی نشوونما بھی شامل تھی۔ یہاں ہمارے سامنے ایک اور گوشہ آتا ہے۔ جو اس کی صفتِ رحمانیت کا خصوصی مظہر ہے۔

انسان کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" (۹۶/۵) یعنی خدا نے انسان میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھدی۔ حیوانات اپنی جبلّت کی رو سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں خارج سے علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے انہیں اس کی صلاحیت عطا ہی نہیں کی جاتی۔ یہ صلاحیت انسان کے لئے مختص ہے۔ انسان اس علم کو مختلف طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔ یعنی مشاہدات، تجربات، مطالعہ، تعلیم و تعلم، درس و تدریس وغیرہ کے ذریعے۔ ان طریقوں سے علم بتدریج حاصل کیا جاتا ہے۔ اور جو انسان بھی چاہے اُسے حاصل کر سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ اس گوشے میں خدا کی صفتِ رحیمیت کارفرما ہوتی ہے۔

وحی خالصۃً وہبی ہوتی تھی

لیکن علم کی ایک اور قسم بھی ہے جو مندرجہ بالا طریقوں میں سے کسی طریق سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اس میں انسان کی اپنی کوشش یا کسب و ہنر کا کوئی دخل ہوتا ہے۔ یہ خدا کی طرف سے اس کے برگزیدہ انسانوں کو براہِ راست ملتا تھا۔ اسے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کے لئے کہا گیا کہ: وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۲/۱۰۵) اللہ اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق جسے چاہتا ہے اس رحمت کے لئے مختص کر لیتا ہے۔ یہ امر کہ حصولِ وحی میں، انسان کے اپنے کسب و

ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اس حقیقت سے واضح ہے کہ جس برگزیدہ ہستی کو اس کے لئے منتخب اور مختص کیا جاتا تھا۔ اسے وحی ملنے سے ذرا بھی پہلے اس بات کا علم و احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا کہ: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (۴۲/۵۲) تو اس سے پہلے جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی کے عطا ہونے میں خدا کی صفتِ رحمانیت کا ظہور ہوتا تھا۔ اس لئے اس کے متعلق کہہ دیا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (۵۵/۱-۲) قرآن کا علم رحمٰن نے عطا کیا۔ اور اسی بنا پر قرآن کو رحمت کہہ کر پکارا گیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۷/۸۲) اور ہم نے قرآن میں وہ کچھ عطا کیا جو اس کی صداقت پر ایمان لانے والوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔ خدا کی طرف سے یہ علم (وحی) آخری مرتبہ حضور نبی اکرم صلعم کو عطا کیا گیا۔ اس وحی میں دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا اور اُسے قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا۔ اسے ختم نبوت کہتے ہیں۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے راہِ راست علم دیئے جانے کی نہ ضرورت باقی رہی نہ امکان اور گنجائش۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سامانِ نشوونما (رحمت) عطا کرنے کا جو ذمہ لیا تھا (۶/۵۴) وہ خارجی کائنات اور انسانی دنیا دونوں کو محیط ہے۔ اسی بنا پر اس نے کہا ہے: رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (۴۰/۷) "خدا کی رحمت ہر شے کو محیط ہے"۔

بسم اللہ کی مزید تشریح

ہم نے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی تفسیر بیان کرتے وقت کہا تھا کہ رحمٰن و رحیم کا مفہوم سورۃ فاتحہ میں سامنے آئے گا۔ ان دو الفاظ کا جو مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ہم نے یہ پروگرام اس لئے دیا ہے کہ ہماری صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہو تو اس سے وہ سامانِ نشوونما مراد ہوگا جو طبیعی زندگی اور انسانی ذات کی نشوونما کیلئے ضروری تھا۔ اور جب یہ الفاظ انسان کی زبان سے ادا ہوں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے پیشِ نظر ...... پروگرام کو اس لئے ہاتھ میں لے رہا ہوں کہ اس سے خدا کی ان صفات کا ظہورِ عام ہو جائے۔ یعنی وہ نظام قائم ہو جائے جس میں تمام انسانوں کو ان کی طبیعی زندگی کی نشوونما کا سامان بھی میسر آجائے۔ اور ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما بھی ہوتی جائے۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کی طرف اپنے مراسلہ کی ابتداء بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲۷/۳۰) سے کی تھی تو اس سے کس قدر عظیم حقیقت کا انکشاف مقصود تھا۔ تمام بادشاہوں کی لشکر کشی سے مقصود (بالنتیجہ) غارت گری اور تباہ کاری ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ملکہ سبا نے مشیروں سے کہا تھا کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ (۲۷/۳۴) جب بادشاہ کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اسے تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔ اُس ملک کے اربابِ عزت و تکریم ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں۔ اور

یہ چیز کسی خاص بادشاہ تک محدود نہیں۔ ملوکیت کا انداز ہی یہی ہوتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے مراسلہ میں اسی حقیقت کو واضح کیا تھا کہ میرا مسلک دنیاوی بادشاہوں کا سا نہیں۔ میں خدا کا رسول ہوں۔ اور اس کے اقتدار کو بروئے کار لانے کا ذریعہ۔ اس لئے میری یہ لشکر کشائی، تباہی و بربادی کے لیے نہیں بلکہ صفتِ رحمانیت و رحیمیت کو عام کرنے کے لئے ہے۔

حضرت سلیمانؑ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث رسول تھے اور ان کا دائرہ اثر و نفوذ، ایک خاص خطۂ زمین تک محدود۔ اس کے برعکس خدا کے آخری رسول نبیٔ اکرم صلعم تمام نوعِ انسان کی طرف بھیجے گئے رسول تھے (اور ہیں) اور آپ کی تعلیم کا دائرۂ اثر و نفوذ زمان و مکان کی حدود سے ناآشنا تھا۔ (اور ہے) اسی لئے حضور صلعم کو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ کہا گیا۔ (۲۱/۱۰۷)

رحم کا صحیح مفہوم

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور بنیادی نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ خدا کی صفتِ رحیمیت کے اندر "رحم" کا مفہوم بھی شامل ہے۔ لیکن رحم کے قرآنی مفہوم اور دنیا میں رائج مفہوم میں بنیادی فرق ہے۔ اس مروجہ مفہوم کو عیسائیت نے عام کیا اور اسی سے وہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جن کا شکار خود مسلمان بھی ہو گئے۔ ان کے ہاں یہ تصور، تصوف کے ذریعہ پھیلا۔ عیسائیت کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوّا) کے گناہ کی پاداش میں گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ اسے (ORIGINAL SIN) کہا جاتا ہے انسان کے لئے گناہ کی اس آلائش سے پاک اور صاف ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کا منطقی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ کوئی انسان جنت میں جانے کے قابل ہی نہیں رہتا۔

عیسائیت کا نظریہ

عیسائیت کا نظریہ یہ ہے کہ جب خدا نے بیچارے انسانوں کی اس حالت پر غور کیا تو اُسے (معاذ اللہ) بڑا افسوس ہوا۔ اُسے ان پر ترس آیا اور اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تاکہ مخالفین اُسے صلیب دیدیں۔ اور یوں اس کا خون انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ اس سے عیسائیت کا یہ عقیدہ عام ہوا کہ نجات کا مدار انسانی اعمال پر نہیں بلکہ خدا کے رحم پر ہے جو ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو اس کے بیٹے (حضرت مسیحؑ) کے کفارہ پر ایمان لائیں۔ انجیل کے عہد نامہ جدید میں سینٹ پال کے خطوط پڑھئے۔ ان میں اس عقیدہ کو عام کیا گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ :-

> "تم کو ایمان کے وسیلہ ہی سے نجات ملتی ہے۔ اور یہ تمہاری طرف سے نہیں۔ خدا کی بخشش ہے۔ اور نہ اعمال کے سبب سے ہے۔" (افسیون ۲/۸-۹)

ایک اور خط میں لکھا ہے کہ :-

> "ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان شریعت کے اعمال کی رو سے نہیں۔ ایمان کے

سبب سے راست باز ٹھہرتا ہے۔" (رومیوں کے نام ۳/۲۸)

یہی ہے وہ نظریہ جس کی رو سے خدا کے متعلق عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ (GOD IS MERCY) یا (GOD IS LOVE) خدا محبت اور رحم کا مجسمہ ہے۔ اور یہی ہے وہ تصور جس کی رو سے قرآن مجید کے انگریزی تراجم میں رحمٰن اور رحیم کے لئے (MERCIFUL) اور (COMPASSIONATE) رحم کرنے والا، ترس کھانے والا کہا جاتا ہے۔

قرآن کا تصورِ رحم

عیسائیت کے اس نظریہ کے خلاف قرآن کریم کی تعلیم کی ساری عمارت، قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیاد پر استوار ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ انسان کے ہر (انفرادی یا اجتماعی) عمل (کام) کا نتیجہ اس قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔ سنکھیا کھانے کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ صاف اور مصفّٰی پانی ممدِ حیات ہے۔ یہی قانون طبیعی کائنات میں اور خود انسان کی طبیعی زندگی سے آگے بڑھ کر اس کی انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ اسے خدا کے نظامِ عدل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خدا کا یہ نظام غیر متبدل اور اٹل ہے۔

لیکن ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ خدا کی صفتِ رحیمیت میں "رحم" کا تصور بھی شامل ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ عدل اور رحم (بظاہر) دو متضاد تصورات ہیں۔ ان دونوں میں مطابقت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ عدل میں اگر رحم کا جذبہ غالب آجائے تو وہ عدل نہیں رہتا۔ لیکن رحم کے قرآنی مفہوم کی رو سے تضاد باقی نہیں رہتا۔ اس میں عدل بھی رہتا ہے اور رحم بھی۔ اسے ایک مثال کی رُو سے سمجھئے۔ ایک آدمی آگ میں اُنگلی ڈالتا ہے۔ اُنگلی جل جاتی ہے۔ اس سے شدت کی تکلیف ہوتی ہے یہ کچھ خدا کے قانونِ عدل کی رو سے ہوتا ہے۔ جس میں رحم کا کوئی شائبہ نہیں۔ لیکن جس خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ آگ سے انگلی جل جاتی ہے۔ اُس خدا نے ایسی دوائیاں بھی پیدا کر دی ہیں۔ جن کے استعمال سے سوزش کی یہ الم انگیز تکلیف بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اور انگلی کی از سرِ نو نشو و نما کا امکان بھی ہوتا ہے۔ اس قسم کے اسبابِ مدافعت یا علاج کی تخلیق، خدا کی رحمت یا اس کا رحم ہے۔ آپ نے دیکھا کہ رحم کے اس تصور میں قانون کا تصور کارفرما ہے۔ یعنی جس طرح خدا کا یہ قانون (عدل) ہے کہ آگ میں ڈالنے سے انگلی جل جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کا یہ بھی قانون ہے کہ فلاں قسم کی دوائی لگانے سے انگلی اچھی ہو جاتی ہے۔

توبہ کا قرآنی مفہوم

انسانی زندگی میں اسے "توبہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ توبہ کا قرآنی مفہوم بھی ایک مثال سے سمجھ میں آسکے گا۔ آپ نے کسی خاص گاؤں جانا ہے۔ کسی دوراہے پر آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا۔ یہ گمراہی ہے، لغزش ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد آپ کو کسی نے بتایا یا علاماتِ راہ سے آپ نے محسوس کیا کہ میں غلط راستے پر چل رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد آپ اسی راستہ پر آگے قدم نہیں بڑھائیں گے

آپ کو لامحالہ پھر اس دوراہے پر واپس آنا ہوگا جہاں سے آپ اس غلط راستے کی طرف مُڑ گئے تھے۔ لیکن محض اس دوراہے پر واپس پہنچ جانے سے بھی آپ اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ جائیں گے۔ یہاں سے آپ کو صحیح راستہ کی طرف قدم اُٹھانا ہوگا۔ غلط راستہ سے دوراہے پر واپس آنے کو عربوں کی زبان اور قرآنِ کریم کی اصطلاح میں "توبہ" کہا جاتا ہے۔ اور دوراہے سے صحیح راستہ پر گامزن ہونے کو "عملِ صالح" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح انسانی لغزش سے پیدا ہونے والے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں اس طرح کی تلافیٔ مافات اور بازآفرینی کے لئے خدا کے قوانین مقرر ہیں۔ ضابطۂ حیات میں اس قسم کے قوانین کا رکھ دینا قرآنی اصطلاح میں خدا کا رحم کہلاتا ہے اور خدا انہی معنوں میں "رحیم" ہے (تفصیل ان امور کی آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں توبہ سے متعلق آیات کی تشریح کی جائے گی)۔ یہودیوں کے ہاں "توبہ" کا تصور ہی نہیں۔ اسی طرح عیسائیت میں بھی اعمال کے ذریعہ گناہ کی آلائش کو الگ کر دینے کا امکان نہیں۔ ہندو دھرم کی رو سے انسان اپنے سابقہ جنم کے کرموں (اعمال) کے نتیجہ میں جس "جُون" (چُوہا، کُتّا، سؤر، شودر وغیرہ) کی ہیئت میں پیدا ہو گیا ہے، موجودہ جنم میں اس کا بدلنا ناممکن ہے۔ یعنی ان اہلِ مذاہب کے ہاں (قرآنی مفہوم کے مطابق) خدا کی رحمت (بازآفرینی کے امکان) سے انکار کیا جاتا ہے۔ اسے قرآن "کفر" سے تعبیر کرتا ہے۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۱۲/۸۷) اس کے برعکس اس نے کہا ہے۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ (۳۹/۵۳-۵۵)۔ اے رسول! میرے ان بندوں سے، جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہوں، زندگی کے دوراہے سے غلط راستے کی طرف مڑ گئے ہوں، کہدو کہ: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ (ایضاً)۔ وہ خدا کے قانونِ رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ اس کے نظامِ عدل میں غلطیوں کے نقصانات کے ازالہ کا امکان بھی موجود ہے۔ تم میں جب بھی یہ احساس پیدا ہو کہ تمہارا قدم غیر خداوندی راستے کی طرف اُٹھ گیا ہے تو اَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ (ایضاً) تم اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کی طرف رجوع کرو۔ اور۔ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ (ایضاً) اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔ اس سے تم، اپنی لغزش سے پیدا ہونے والے نقصانات سے بچ جاؤ گے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم اس سے پہلے کہ اس لغزش کے تخریبی نتائج تمہارے سامنے آجائیں، قوانینِ خداوندی کی طرف رجوع کرلو۔ اگر اس میں تاخیر کر دی تو پھر ان کا ازالہ ممکن نہیں ہوگا۔ رجوع کرو۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ (۳۹/۵۴-۵۵)۔

اس تمام تفصیل کو قرآنِ کریم نے ان چار الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا جب کہا کہ: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) غلط اقدامات کے تخریبی نتائج کے ازالہ کی صورت یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری کام سرانجام دو۔ برائیوں کے نتائج کو بھلائیوں سے دور کر دو۔ یہ ہے خدا کے رحم کے بروئے کار آنے کی صورت۔

آپ نے دیکھا کہ خدا کا رحم بھی کس طرح اس کے قانونِ مکافات عمل ہی کا ایک گوشہ ہے۔ اس کی وضاحت سورۃ فاتحہ کے اگلے الفاظ میں کر دی ہے، جس میں کہا ہے کہ:

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (۱/۳)

(۱/۳) مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

لفظ مٰلك کا مادہ (م، ل، ک۔ م کی تینوں حرکات زبر، زیر اور پیش کے ساتھ) ہے۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں:

۱:۔ کسی چیز پر قادر اور مستولی ہو جانا

۲:۔ اختیار و ارادہ یا اتھارٹی

۳:۔ بنیادِ محکم، یعنی وہ سہارا، جس پر کوئی چیز قائم ہو۔

۴:۔ جس ذریعہ سے کوئی معاملہ درست ہو جائے اور کمال کو پہنچ جائے۔ اسی لئے "مِلَاکٌ" گارے (یا سیمنٹ) کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے اینٹ اور پتھر آپس میں جڑ کر ایک دوسرے کی قوت کا سہارا بنتے ہیں اور یوں دیوار تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔

جب یہ لفظ عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کا مفہوم (بالعموم) اس قسم کی قوت اور اقتدار ہوتا ہے، جس سے دوسرے انسانوں کو مملوک (غلام) بنایا جائے۔ اسے ملوکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اُسے خدا کیلئے بولا جائے گا تو ظاہر ہے کہ اس سے مستبدانہ اقتدار مقصود نہیں ہو گا۔ خدا ہر چیز کا خالق، قادرِ مطلق اور مالک ہونے کے باوجود مستبد نہیں، لہٰذا جب کہا جائے گا کہ لَہٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲/۱۰۷) تو ہر چند اس کے معنے یہی ہوں گے کہ ساری کائنات میں اقتدار اور اتھارٹی اسی کی ہے۔ لیکن اس میں یہ بنیادی مفہوم بھی مضمر ہو گا۔ کہ اس کا یہ اقتدار اشیائے کائنات کی زندگی اور نشوونما کا سہارا ہے۔ یہ اقتدار وہ (CEMENTING FORCE) ہے جس سے اجزائے کائنات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ وہ گویا ایک وحدت بن گئے ہیں، اور ان کا یہی وہ باہمی امتزاج ہے جس سے نظامِ کائنات اس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے اسے "مودّت"، کہا جاتا ہے۔ اور اسی نسبت سے خدا کی صفت "الودود"، بھی ہے (۱۴-۱۵/۸۵) یعنی کائنات کے ذرات میں باہمی کشش و جذب پیدا کر کے سلسلہ ارتقار کو آگے بڑھانے والا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں خدا کی اس صفت (مالکیت) کا ذکر آئے گا۔ وہاں یہ دیکھنا ہو گا کہ مندرجہ بالا معانی میں سے کون سا معنی اسباق و سباق کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے۔ سورۂ فاتحہ کی اس آیت میں

اس کے معنیٰ اتھارٹی یا اقتدار کے ہوں گے۔

یوم :

اس لفظ کا ترجمہ عام طور پر "دِن" کیا جاتا ہے، یعنی وہ دن جو چوبیس گھنٹے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان میں یہ لفظ ان معانی میں بھی آتا ہے، لیکن اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جسے ہم دَور (PERIOD) یا زمانہ (AGE) یا مرحلہ (STAGE) وغیرہ کہتے ہیں۔ اس کے لئے بھی یہی لفظ (یوم) آتا ہے۔ کائنات جن جن طویل المیعاد مراحل سے گزرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے انہیں بھی "یوم" ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ خدا کا ایک ایک یوم تمہارے حساب وشمار کی رُو سے ہزار ہزار سال (۳۲/۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال (۴/۷۰) کا ہوتا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں "یوم" کے معنی ہوں گے وقت یا دَور۔

الـدّین

قرآن کریم کی یہ ایسی جامع اصطلاح ہے جس کے اندر اس کی ساری تعلیم کا نچوڑ آجاتا ہے۔ یہ اس کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یہ وہ محور ہے، جس کے گرد اس کے تمام احکام واصول واقدار وقوانین گردش کرتے ہیں اور اپنا مقصود سامنے لاتے ہیں۔ اس اصطلاح کا صحیح مفہوم سمجھ لینے سے اسلام سمجھ میں آسکتا ہے اور اگر اس کا قرآنی تصور ذہنوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر اسلام کی کوئی بات بھی صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ نہ اس کے نظریات وتصورات، نہ ارکان واحکام، نہ مقصود ومطلوب، نہ غایت ومنتہیٰ۔ اِن تصریحات سے واضح ہے کہ یہ اصطلاح کس قدر جامع، وسیع اور اہم ہے۔ اور اس کا صحیح طور پر سمجھنا کس قدر ضروری بلکہ لاینفک۔

جیسا کہ کہا گیا ہے یہ لفظ بڑا وسیع المعنیٰ ہے۔ ایک طرف اس کے معنے ہوتے ہیں غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت آئین، قانون، نظم ونسق، فیصلہ، ٹھوس نتیجہ، جزاء وسزا، مکافاتِ عمل۔ لیکن (دوسری طرف) یہی لفظ جب انسانوں کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں: اطاعت، فرماں پذیری، محکومیت۔ اور جب اس کی نسبت، خدا اور انسان دونوں کی طرف جامع طور پر ہوگی تو اس کے معنے ہوں گے، قوانین خداوندی کی اطاعت جس کا نتیجہ خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔

اس مادہ کے جو مختلف معانی اوپر بیان ہوئے ہیں، ان کی تائید میں قرآن کریم کی متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ جس جس مقام پر وہ آیات سامنے آئیں گی، متعلقہ مفہوم کی خود بخود وضاحت ہو جائے گی۔ اس مقام پر سورۃ آلِ عمران کی ایک جامع آیت کا پیش کر دینا ہوگا۔ فرمایا کہ: اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ (۳/۸۲)

کیا یہ لوگ دینِ خداوندی کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتے ہیں، کیا انہیں کسی اور دین کی تلاش ہے۔ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۔ (۳/۸۲) کیا یہ دیکھتے نہیں کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو چیز بھی ہے، طوعاً و کرہاً اس کے قوانین کے سامنے سرِتسلیم خم کئے ہوتے ہے۔ یہ ہے وہ دین جو پوری خارجی کائنات کو محیط ہے۔ یعنی وہ نظامِ خداوندی جس کے مطابق یہ کارگہِ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اس سے دین کا مفہوم واضح ہوگیا یعنی وہ نظام جو قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم ہو۔

اس کے بعد کہا کہ تم بھی اس کا اعلان کردو کہ ہم خدا ہی کے قوانین کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں۔ اور یہ قوانین ہیں جو حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے نوعِ انسان کو ملتے چلے آئے ہیں۔ اور اب قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۳/۸۴) اسی کا نام اسلام ہے۔ لہٰذا اگلی آیت میں کہا گیا "وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ" (۳/۸۵) لہٰذا جو شخص "الاسلام" کے سوا (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے) کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ خدا کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ ایسے لوگ آخرالامر دیکھ لیں گے کہ وہ کس قدر خسارے میں رہے۔

اپنی آزاد مملکت کا تصوّر

اس سے واضح ہے کہ دین نام ہے اس نظام کا جسے قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کیا جائے۔ جس میں ہر فرد خدا اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کرے۔ اور جس میں اس کے ہر عمل کا صحیح صحیح نتیجہ (جسے بدلہ یا معاوضہ کہا جاتا ہے) مرتب ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسا نظام جس میں اطاعت اور محکومیت صرف قوانین خداوندی کی اختیار کی جائے، اسی صورت میں ممکن ہے کہ امتِ مسلمہ (جماعتِ مؤمنین) کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ جس میں وہ ان قوانین کو نافذ کرنے کا پورا پورا اختیار و اقتدار رکھے۔ بالفاظِ دیگر، دین کے تمکن کیلئے مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر "الدّین" یا "الاسلام" کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن ہی نہیں۔ یہ مملکت ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ اور مقصد اس کا ہوتا ہے دین کا تمکن۔ دیکھئے سورۃ نور کی اس آیت میں اس حقیقت کو کیسے واضح اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے۔ "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ" (۲۴/۵۵) وہ لوگ جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور ان کے مطابق ایسے کام کریں جو ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما اور نمود و ظہور کا باعث ہوں، ان سے خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں اس دنیا میں حکومت اور مملکت عطا کرے گا۔ جس طرح اس نے ان سے پہلے اسی قسم کی اقوام کو حکومت اور مملکت عطا کی تھی۔ ایسے

"استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے۔ یہ استخلاف کا ہے کے لئے ہے؟ فرمایا وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (ایضاً) مقصد اس سے یہ ہے کہ وہ دین، وہ نظام زندگی، جسے خدا نے ان کے لئے منتخب کیا ہے، اس کا تمکن ہو جائے۔ وہ عملاً قائم اور نافذ ہو جائے۔ اور اس طرح یہ لوگ، ہر قسم کے خوف اور حزن سے محفوظ ہو کر امن و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ امن و اطمینان بھی مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (ایضاً) مقصد یہ ہے کہ وہ صرف خدا کے قوانین کی محکومیت اختیار کر سکیں بایں نمط کہ اس کی حاکمیت میں کوئی اور شریک نہ ہو۔ خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت۔

یہ ہے "الدّین" یا "الاسلام" اس کے بعد کہا ہے کہ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (ایضاً) دین کا مفہوم اس قدر واضح طور پر سامنے آ جانے کے بعد جو اس سے انکار کرے گا یا سرکشی برتے گا تو سمجھ لیجئے کہ وہ صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستے پر گامزن ہو گیا۔

جیسا کہ آگے چل کر (اس کے مناسب مقام پر) بتایا جائے گا۔ الدّین کے دو اہم گوشے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت کے بعد کہا گیا ہے۔ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ (۲۴/۵۶) یعنی استخلاف فی الارض سے مقصد یہ ہے کہ "الدّین" کا تمکن ہو جائے اس سے تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کر سکو۔ اور رسول کی اطاعت کر سکو۔ اس طرح کا استخلاف فی الارض حضور نبی اکرم صلعم کے عہدِ ہمایوں میں حاصل ہوا تھا۔ اور اس مملکت کے اولین سربراہ یا مرکزی اتھارٹی خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ لہٰذا اس نظام کے قیام و استحکام کی عملی شکل یہی تھی کہ اس کی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت کی جائے۔

اطاعتِ رسول

یہ اطاعت درحقیقت قوانینِ خداوندی ہی کی تھی۔ لیکن چونکہ ان کا نفاذ اس اتھارٹی کے ذریعے ہوتا تھا۔ اس لئے اس کی اطاعت لازمی قرار دی گئی۔ یہ نظام رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ تک محدود نہیں تھا۔ اُسے آگے بھی چلنا تھا (کہ قرآنِ کریم نوعِ انسان کے لئے آخری اور ابدیت درکنار ضابطۂ حیات ہے) اس لئے اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ :-

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝ (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز ایں نیست، کہ خدا کے ایک پیغامبر ہیں۔ اس سے پہلے بھی اس قسم

کے پیغامبر آتے اور اپنا اپنا فریضہ انجام دے کر چلے گئے۔ لہٰذا اگر کل کو یہ
رسول بھی وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام
انہی کی زندگی تک محدود تھا، تم پھر اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟
جو ایسا کرے گا، وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، اپنا ہی نقصان کرے گا۔
لیکن جو اس روش پر قائم رہیں گے، انہیں ان کی سعی و عمل کے بھرپور ثمرات
ملتے رہیں گے۔

دوسرے مقام پر جماعت مومنین کے متعلق فرمایا کہ "اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ، وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ہ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں تمکن حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے۔ ان تمام احکام کو نافذ کریں گے، جنہیں یہ نظام، قوانین خداوندی کی رو سے صحیح تسلیم کرے گا۔ اور ان امور سے قانوناً روکیں گے جو ان احکام کی رُو سے قابل تسلیم نہ ہوں گے۔ غرضیکہ اس میں تمام امور کے فیصلے آخر الامر قوانینِ خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (۱۲/۴۰) اور اس حکومتِ خداوندی کے متعلق یہ کہہ کر وضاحت کر دی کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ہ (۵/۴۴) جو لوگ کتابِ خداوندی کے مطابق حکومت قائم نہیں کریں گے۔ انہی کو کافر کہا جائے گا۔ خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ارشاد فرمادیا، فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (۵/۴۸) اے رسول تم ان کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرو۔

یوم الدّین کی خصوصیّت

ان امور کی روشنی میں سورۃ فاتحہ کی زیرِ نظر آیت "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ دور جس میں الدین کا نظام قائم ہوگا۔ جس میں اسی کے احکام و قوانین کارفرما ہوں گے۔ اس دور کی خصوصیتِ کبریٰ کیا ہوگی، اسے دوسری جگہ ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ "وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ" (۸۲/۱۷) تمہیں خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین کیا ہے۔ یوم الدین وہ ہے۔ یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا (۸۲/۱۹) وہ دور ہوگا جس میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار اور اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ۔ وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ (۸۲/۱۹) اس میں تمام اقتدار و اختیار صرف خدا کو حاصل ہوگا۔ اس میں تمام معاملات خدا کے قانون کے تابع ہوں گے۔ یہ ہے یوم الدین کی بنیادی خصوصیت۔ آپ سوچئے

کہ کسقدر فردوس بداماں ہوگا وہ معاشرہ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کی جائے اور ہر ایک کی سعی و عمل کے نتائج انہی (قوانین) کے مطابق سامنے آجائیں۔ کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو (۳/۴۴) کسی نوع کا سلب و نہب یا ہضم و استحصال نہ ہو (۲۰/۱۱۲)

اِس نظام کی مخالفت

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ دین کے نظام میں کسی انسان کا دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار و اختیار نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام، مفاد پرست گروہوں کے لئے بڑا ناگوار ہوتا ہے۔ اصولی طور پر ان گروہوں کو تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) یعنی اربابِ حکومت (خواہ اس کی شکل کچھ بھی کیوں نہ ہو اور اس کا نام کوئی بھی کیوں نہ رکھ لیا جائے یعنی وہ دورِ قدیم کی بادشاہت یا آمریت ہو یا عصرِ حاضر کی ڈیماکریسی) (۲) سرمایہ دار طبقہ جو دولت کے زور پر محتاجوں اور محنت کشوں کو اپنے زیرِ اقتدار رکھتا ہے۔ اور (۳) مذہبی پیشوائیت، جو خدا کے نام پر اپنی من مانیاں کرتی ہے۔ یہ تینوں گروہ انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ یہ نظام قائم نہ ہونے پائے اور اگر قائم ہو جائے تو باقی نہ رہنے پائے۔

حضرات انبیائے کرامؑ اسی دین کو لے کر آتے تھے۔ اور اسی نظام کا قائم کرنا ان کا فریضۂ رسالت ہوتا تھا۔ وہ ان مفاد پرست گروہوں کی انتہائی مخالفت کے علی الرغم اس نظام کو قائم کر دیتے تھے، لیکن، ان کی تشریف براری کے بعد یہ گروہ پھر سے سر نکالتے اور اسے درہم برہم کرنے کی کوشش شروع کر دیتے۔ اس مقصد کے لیے یہ تینوں گروہ آپس میں گٹھ جوڑ کر لیتے تھے، بایں نمط کہ مذہبی پیشوائیت ان میں آگے آگے ہوتی تھی۔ اس کی خاص وجہ تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جھوٹ اپنی اصلی شکل میں سامنے آکر کامیاب نہیں ہو سکتا اس لئے وہ ہمیشہ سچ کا نقاب اوڑھ کر دھوکہ دیتا ہے۔ اگر یہ لوگ دین کے معتقدین کو، دین چھوڑ دینے کی کھلے الفاظ میں تلقین کرتے تو وہ کبھی ان کی بات نہ سنتے۔ انہوں نے ٹیکنیک یہ اختیار کی کہ دین کی اصطلاحات کو بدستور باقی رکھا، لیکن ان کا مفہوم بدل دیا۔ اس کے عملی پروگرام کے اجزاء اور ان کی شکلوں کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا لیکن ان کی روح سلب کر کے انہیں بے جان مجسمے بنا دیا (تفصیل اس اجمال کی اس سے اگلی آیت اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے تحت سامنے آئے گی) اس کے بعد انہوں نے دنیاوی امور اور دینی امور کو الگ الگ کر دیا۔ دنیاوی امور حکومت کی تحویل میں دیدئے اور "دینی امور" کے مالک خود بن بیٹھے۔ ان امور سے مراد، اعتقادات، عبادات اور شخصی قوانین، مثل نکاح، طلاق وغیرہ ہیں دنیاوی امور میں حکومت کے فیصلے نافذ ہونے لگے۔ اور دینی امور میں ان کے فتوے چلنے لگے۔

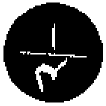
جو کچھ انبیائے سابقہ کے قائم کردہ دینی نظام کے ساتھ ہوا، وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی بیتی۔ صدرِ اول کے بعد ملوکیت نے سر اُبھارا اور اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت وجود میں آگئی۔ دین دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ جس حصہ

دین مذہب میں تبدیل ہوگیا

کو مذہبی پیشوائیت نے اپنی تحویل میں لیا اسے دین کی بجائے مذہب کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جس کا انگریزی زبان میں ترجمہ (RELIGION) کیا جاتا ہے۔ مذہب میں نظامِ حکومت لازمی طور پر سیکولر ہو جاتا ہے۔ اسلام کی یہی شکل اس وقت تک قائم ہے جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ اتباعِ شریعت کیلئے اپنی آزاد مملکت کا وجود ضروری نہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ارکانِ اسلام کا اتباع ہر حکومت کے تابع کیا جا سکتا ہے۔ اس سے اسلام کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ باقی رہا خدا کا اقتدار، سو اس کا دائرہ آخرت کی زندگی ہے، اس دنیا کی نہیں۔ چنانچہ جب مذہب کی رُو سے "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کا ترجمہ (مالک روزِ جزا کا) کیا جاتا ہے تو اس میں "روزِ جزا" سے مقصود قیامت کا دن ہوتا ہے۔ اس دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ وہ فریب ہے جو مذہبی پیشوائیت شروع سے دیتی چلی آرہی ہے۔ اس میں دین مذہب میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت دنیا میں صرف مذاہب باقی تھے۔ دین کا نظام کہیں نہیں تھا۔ اور اب بھی (مسلمانوں سمیت) دنیا میں مذاہب ہی موجود ہیں۔ دین کا وجود کہیں نہیں۔ دیگر مذاہب میں مشکل یہ تھی کہ ان کے ہاں خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں تھی۔ اس لئے ان کے مذہب کا پھر سے دین میں بدل جانا ناممکن تھا۔ ہمارے ہاں خدا کی کتاب (قرآن مجید) اپنی اصلی، غیر محرف شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا مسلمانوں میں پھر سے دین کے نظام کا قیام ناممکن نہیں۔ مسلمانوں کی جو آزاد مملکت یہ فیصلہ کرے کہ وہ اپنا نظام قرآن کریم کے تابع رکھے گی وہ دین کے نظام کے قیام کا موجب بن جائے گی۔ میں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام کو مذہب نہیں کہنا چاہیئے، یہ مذہب نہیں، دین ہے۔ اس لئے اسے دین، کہہ کر ہی پکارنا چاہیئے۔ یوں اسلام ایک طرف دنیا کے مذاہب سے بھی الگ ہو جائے گا اور دیگر نظامہائے حکومت سے بھی الگ اور ممتاز۔

آخر میں اتنی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ یوم الدین سے مراد صرف اس دنیا میں نظامِ خداوندی کا دور نہیں۔ انسانی زندگی مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے اور ہر فرد کا مستقبل (اُخروی زندگی کا مقام) اس کے ان اعمال کے اثرات کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ جو اس سے اس دنیا میں سرزد ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے خدا کے قانونِ مکافات کے دوائر یہ دنیا اور آخرت دونوں ہیں۔ اس لئے خدا کے مالکِ یوم الدین ہونے میں یہ دونوں دائرے شامل ہوں گے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ مذہب کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ دین کی اصطلاحات اور ارکان کو علی حالہ باقی رکھتا ہے لیکن ان کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ اس کی تفصیل عبادت کے مفہوم میں ملے گی جو ہمارے سامنے اب آرہا ہے۔



(۱/۴) اِیَّاکَ نَعۡبُدُ :

سورۃ فاتحہ کی اگلی آیت کا پہلا ٹکڑہ " اِیَّاکَ نَعۡبُدُ " ہے، یعنی ایک عبدِ مومن خدا کی حمدیت، ربوبیت رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت کے صحیح تصور کو سامنے لانے کے بعد اختیار پکار اٹھتا ہے کہ " اِیَّاکَ نَعۡبُدُ " اس " نَعۡبُدُ " میں دین کا سارا نظام سمٹ کر آجاتا ہے۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں"۔ اور اگر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں" تو اس میں بھی عبادت کے معنے پرستش ہی لئے جاتے ہیں۔ عبادت کو پرستش میں بدل دینے سے، دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر مذہب میں خدا کی پرستش، پوجا (WORSHIP) ہوتی ہے لیکن دین میں خدا کی "عبادت" ہوتی ہے۔

عبادت

اس کا مادہ (ع۔ب۔د) ہے جس سے لفظ " عَبۡدٌ " آتا ہے اور، جیسا کہ معلوم ہے، عبد کے معنے غلام اور محکوم کے ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ ٹھیک غلامی اور محکومی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ "الشعرآء" میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دیدے تو اس نے ان سے کہا کہ "موسیٰؑ! ہم نے تم پر اس قدر احسانات کئے اور تم ہمیں ان احسانات کا بدلہ یوں دے رہے ہو"۔ اس کے جواب میں حضرتِ موسیٰؑ نے کہا کہ تمہارے احسانات یہی ہیں ناں اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (۲۶/۲۲) تم نے میری قوم کو اپنی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ (یہاں "عَبَّدۡتَّ" کے معنے واضح ہیں) دوسری جگہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے فرعون اور اس کے اکابرین کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں کہا: اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا وَ قَوۡمُہُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ۝ (۲۳/۴۷) کیا ہم ان کی بات مان لیں، جو ہمارے ہی جیسے دو آدمی ہیں اور ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔ ان مقامات اور انہی جیسے دیگر مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ "عبدیت" کے معنے خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ سورۃ کہف میں محکومیت اور عبادت کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ایک جگہ کہا کہ " وَلَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا " (۱۸/۲۶) خدا اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور دوسری جگہ مستقبل طلب انسان سے کہا کہ۔ وَلَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰) اسے چاہیئے کہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ سورۃ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں سے کہا کہ "اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ" (۱۲/۴۰) یاد رکھو حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ "اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ" (ایضاً) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت (محکومیت) اختیار نہ کرو۔ یہاں بھی خدا کی محکومیت کو اس کی عبادت کہا گیا ہے۔ اور اس کے بعد ہے "ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ" (۱۲/۴۰) یہ ہے دینِ محکم۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن کریم کی رو سے خدا کی عبادت سے مراد ہے اس کی محکومیت اختیار کرنا۔ اس کے قوانین کی اطاعت کرنا۔ اسی کا نام "الدّین" ہے۔ اسی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا کی محکومیت اختیار

کرنے سے مُراد کسی ڈکٹیٹر کی اطاعت نہیں . یہ قانون کی اطاعت ہے کیونکہ دین کے بنیادی معنیٰ قانون کے ہیں.

خود سپردگی

لیکن اس عبدیّت میں ایک اور نکتہ بھی مضمر ہے۔ عربی زبان میں "تَعْبِيْدٌ" کے معنے ہیں اُونٹ یا گھوڑے کو سدھا کر جوتنے کے قابل بنا دینا۔ یعنی اس وحشی جانور کو اس طرح سدھانا کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو خاص قاعدے اور ضابطے کے مطابق صرف کرے ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی صلاحیتیں اور قوتیں عطا کی ہیں۔ اگر انسان ان قوتوں کو سرکش اور بیباک رکھتا ہے۔ (یعنی اپنے جذبات کے مطابق صرف کرتا ہے) تو نتیجہ فساد اور تخریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر انہی صلاحیتوں کو حدود اللہ کے اندر رکھتے ہوئے، اس کے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کے مطابق صرف میں لاتا ہے تو اس کا نتیجہ عالمگیر ربوبیت اور اس کی اپنی ذات کی تعمیر ہوتا ہے۔ اس نہج سے، عبادت کے معنے ہوں گے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ آپ سورۃ "النّور" کی آیت نمبر ۵۵ (۲۴/۵۵) کو جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے، ایک بار پھر سامنے لائیے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں استخلاف فی الارض (آزاد مملکت) اس لئے ملتی ہے کہ اس سے دین کا تمکن ہو۔ اور تم اس قابل ہو جاؤ کہ "يَعْبُدُوْنَنِيْ" تم صرف میری عبودیّت اختیار کرو۔ یہاں سے بھی یہ حقیقت واضح

اپنی آزاد مملکت

ہو گئی کہ خدا کی عبادت صرف اسی صورت میں اختیار کی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کو استخلاف فی الارض حاصل ہو۔ یعنی ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ احکامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں . خدا کی "پرستش" کے لئے اپنی آزاد مملکت کا ہونا ضروری نہیں (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) خدا کی پرستش تو کفار کی حکومت میں بھی کی جا سکتی ہے ۔

قرآن کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور جیسا کہ، پہلے کہا جا چکا ہے، نزولِ قرآن کے زمانے میں دین کہیں باقی نہیں رہا تھا۔ ہر جگہ مذہب ہی مذہب تھا۔ مذہب میں خدا کی محکومیت نہیں بلکہ اس کی پرستش کا تصور ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے عربی بولنے والے اہلِ مذاہب (اور مشرکین عرب) میں اس لفظ (عبادت) کا مفہوم پرستش میں بدل چکا تھا۔ بنا بریں قرآن کریم میں جہاں اس لفظ کی نسبت ان کی طرف کی جائے گی تو ان کے مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنے پرستش ہوں گے لیکن جب یہ قرآن میں پیش کردہ خدا کے تصور اور اس پر ایمان لانے والی جماعت (مؤمنین) کی طرف منسوب ہو گا تو اس سے مراد خدا کی حاکمیت اور اس جماعت کی طرف سے اس کی محکومیت کا مفہوم سامنے آئے گا۔ اس نہج سے جب خدا کے یہ بندے اس امر کا اعتراف اور اقرار کریں گے کہ :

" اِيَّاكَ نَعْبُدُ "

صحیح آزادی

تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہیں کرتے۔ ہم کسی اور کا حقِ حکومت تسلیم ہی نہیں کرتے۔ سوچئے کہ یہ آزادی اور حریت کا کسقدر بلند اور عظیم دعویٰ اور نعرہ ہے۔ ایسا عظیم، کہ اس سے انسان دنیا کی ہر چوکھٹ سے مستانہ وار، انتہائی سرفرازی سے آزادانہ آگے بڑھ جاتا ہے، اور کسی انسان کے سامنے نہیں جھکتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ ہے وہ آزادی جو خدا کی عبودیت سے عباد الرحمٰن کو حاصل ہوتی ہے۔ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ انسان کا صحیح مقام ہی یہ ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکے۔ کسی کی محکومیت اختیار نہ کرے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ۝ (۵۱/۵۶) انسان خواہ وہ تمدنی زندگی بسر کر رہے ہوں یا صحرائی زندگی، انہیں پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کریں۔ یہی وہ اعتراف و اعلان ہے جو اِيَّاكَ نَعْبُدُ، کے نعرۂ حریت میں مضمر ہے۔ اور یہی لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم ہے۔ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں سوائے اللہ کے۔

؎ سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے ✣ حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

لیکن خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا مقصد، خدا کے کسی کام کا سنوارنا نہیں۔ اس سے مقصد انسان کی خود اپنی ذات کی نشوونما ہے۔ اور یہ حقیقت اس سے اگلے دو الفاظ سے ہویدا ہے یعنی:

(۱/۴) وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

ان الفاظ کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے۔ "ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں"۔ مدد کیلئے عربی زبان اور قرآن کریم میں بہت سے اور الفاظ بھی آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں اس لفظ کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے؟ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، عربی زبان بڑی وسیع المعانی ہے۔ اس میں ایک ایک چیز کے لئے سینکڑوں الفاظ آتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اپنے مقاصد اور مطالب کے اظہار کے لئے ان متعدد الفاظ میں سے جن کا انتخاب کیا ہے وہ بجائے خویش قرآن کا اعجاز ہے۔ اس لئے قرآن نے جس مقام پر جس لفظ کو استعمال کیا ہے، دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے وہاں اسی لفظ کو منتخب اور استعمال کیوں کیا ہے۔ اگر یہ حقیقت سامنے آجائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے متعلقہ آیت کا مفہوم واضح ہو جائے گا بلکہ اکثر و بیشتر قرآنِ کریم کی پوری کی پوری تعلیم یا اس کی غرض و غایت و (حکمت) کی ایک جھلک بھی سامنے آجائے گی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کے صحیح مفہوم کا سمجھنا ازبس ضروری ہے۔ ترجمہ سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

مُستعان کے معنی

"اِستعان" کا مادہ (ع۔و۔ن) ہے "عوان" اس جانور یا انسان کو کہتے ہیں جو بھرپور شباب کے عالم میں ہو۔ اس کی توانائیاں نشوونما پا چکی ہوں، اس شرط کے ساتھ کہ ان میں پورا پورا اعتدال بھی ہو۔ لہٰذا "استعان"، کے معنی ہوں گے اپنی ذات کے لئے پوری پوری نشوونما اور اعتدال کی آرزو کرنا اور اس مقصد کے لئے کسی کی مدد طلب کرنا۔ اسی نہج سے اللہ تعالیٰ کو "اَلْمُسْتَعَانُ" (۱۲/۲۱) کہا گیا ہے۔

زیرِ نظر آیت کے پہلے حصہ میں کہا گیا تھا "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" اس میں عبدیّت کے معنے تھے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضابطۂ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ لہٰذا اِیَّاکَ نَعْبُد کے معنےٰ تھے "ہم اپنی تمام صلاحیتوں اور قوتوں کو تیرے ہی احکام و قوانین کے مطابق استعمال کرتے ہیں"۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی صلاحیتیں اور توانائیاں نشوونما پا رہی ہوں۔ اور ان میں پورا پورا اعتدال بھی ہو۔ کیونکہ صلاحیتوں اور قوتوں میں اعتدال اور توازن نہ رہے تو وہ ضائع ہو جاتی، یا تخریبی نتائج پیدا کرتی ہیں۔ تعمیری نتائج پیدا کرنے کے لئے ان میں اعتدال اور توازن کا ہونا ضروری ہے۔ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے معنے یہ ہیں کہ ہم اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں میں اسی قسم کی نشوونما چاہتے ہیں۔ اور یہ مقصد صرف تیرے (اللہ تعالیٰ کے) بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق زندگی بسر کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

دُعا کا مفہوم

"اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" (ہم تجھ سے اس مقصد کے لئے مدد چاہتے یا مانگتے ہیں) میں دُعا کا پہلو سامنے آتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے دعا کا مفہوم کیا ہے، اسے آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ جہاں خدا کو "پکارنے" کی آیات سامنے آئیں گی۔ اس مقام صرف اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ آپ سے کوئی عمل سرزد نہیں ہو سکتا (آپ کوئی کام بالارادہ نہیں کر سکتے) جب تک اس کیلئے پہلے آپ کے دل میں اس کی خواہش یا آرزو پیدا نہ ہو۔ یہ خواہش یا آرزو جس قدر شدید ہوگی اسی قدر اس مقصد کے حصول کے لئے آپ کا ارادہ مستحکم ہوگا۔ اور جس قدر آپ کا ارادہ مستحکم ہوگا اسی قدر قوت و شدت سے آپ اس مقصد کے حصول کے لئے کوشش کریں گے۔ دل میں موجزن ہونے والی شدید آرزو کا بے محابا زبان پر آجانا "دعا" کہلاتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری

بلکہ اکثر اوقات اس آرزو کے، الفاظ کے پیکروں میں، لب پر آنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا دل سے ابھرنا ہی دُعا بن جاتا ہے۔

ہم "بسم اللہ"، کے مفہوم کے سلسلہ میں بتا چکے ہیں کہ عبدِ مومن جس کام کا بھی ارادہ کرتا ہے اس سے اس کی غایت الغایات یعنی منتہائے مقصود یہ ہوتا ہے کہ خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت مشہود اور کارفرما ہو جائے۔

عبدِ مؤمن کی آرزوئیں

بالفاظِ دیگر اس سے "ربوبیتِ عالمینی" مقصود ہوتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ عبدِ مؤمن کی ہر خواہش یا آرزو اقدار و قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے لئے کہا گیا ہے: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۸۱/۲۹) "تم وہی چاہو جو اللہ چاہتا ہے"۔ لہٰذا خدا کا بندہ اپنی خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل یا مقصدِ پیشِ نظر کے حصول کے لئے قوانین و اقدارِ خداوندی کی توفیق طلب کرے گا۔ یعنی وہ چاہے گا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے اس کا ہر قدم انہی قوانین و اقدار کے مطابق اٹھے (اسی کو توفیق طلب کرنا کہتے ہیں یعنی انسانی ارادہ اور عمل کا خدا کی راہنمائی کے مطابق و موافق ہونا) اسے کہا جائے گا "خدا سے مدد چاہنا"۔

دُعا کے ساتھ عمل

دعا کے مفہوم میں بتایا جائے گا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ خدا سے مانگیں گے وہ ہمیں از خود مل جائے گا۔ اس کے لئے خدا کے بتائے طریقہ کے مطابق پوری پوری کوشش کرنی ہوگی۔ بنا بریں خدا سے "استعانت" کے معنے بھی یہ نہیں کہ ادھر ہم نے دعا مانگی اور اُدھر وہ مقصد حاصل ہوگیا۔ اس کے لئے خدا کے بتائے پروگرام کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ سورۃ بقرہ میں ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۲/۱۵۳) اے جماعتِ مؤمنین! تم صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے خدا سے مدد طلب کرو۔ یاد رکھو خدا کی مدد ان لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے پیشِ نظر مقصد کے حصول کے لئے استقامت سے کام لیتے ہیں (صلوٰۃ کا مفہوم سورۃ بقرہ میں سامنے آئے گا۔) یہ کہنے کے بعد کہ تم صلوٰۃ اور صبر کے ذریعے خدا سے مدد طلب کرو۔ اگلی آیات میں بتایا گیا کہ اس کے لئے کس قسم کے لرزہ انگیز اور جاں گسل مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔ ان مراحل میں خوف و خطر کا سامنا ہوگا۔ بھوک اور پیاس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ جان و مال کا ضیاع بھی ہوگا۔ اس میں جان تک بھی دینی ہوگی۔ جو لوگ اس قسم کے صبر آزما مراحل میں ثبات و استقامت کا ثبوت دیں گے، خدا کی مدد انہی کو نصیب ہوگی (۲/۱۵۷-۱۵۴)۔

سورۃ انبیاء میں پہلے اس ابدی اصول کا ذکر کیا گیا ہے کہ وراثتِ ارضی انہی لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جو خدا کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں (۲۱/۱۰۵) اس کے بعد اس کشمکش کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو رحمتِ خداوندی کے عام کرنے کے سلسلہ میں نبی اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے مخالف مفاد پرست گروہوں کے درمیان برپا تھی ازاں بعد حضور نبی اکرم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے کہلوایا گیا کہ اے میرے نشو و نما دینے والے! تو مجھ میں اور ان لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلہ کردے۔ اس کے بعد ہے وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۲۱/۱۱۲) قوم مخالف سے کہا گیا کہ تم جس قسم کی باتیں کرتے ہو ان کے خلاف ہم خدائے رحمٰن سے معاونت کے آرزومند ہیں۔ اسے استعانت کہا گیا ہے اور خدا کو اَلْمُسْتَعَانُ۔ اس سے بھی واضح ہے کہ خدا سے امداد طلبی کا مفہوم کیا ہے۔

آیۂ زیرِ نظر میں "نَعْبُدُ" اور "نَسْتَعِیْنُ" جمع کے صیغے ہیں ——— اور صرف یہی دو مقام نہیں۔ جماعتِ مؤمنین کی تمام دعائیں جمع کے صیغے میں ہیں، یعنی یہ مدد طلبی انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ اس لئے کہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مؤمنین کے تمام مقاصد اس نظامِ اجتماعیت کی رو سے حاصل ہوتے ہیں، جو قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور اسی باہمی ارتباط و تعاون سے نظام متشکل ہوتا اور مستحکم رہتا ہے۔ یہ نظام قائم بھی افراد ہی کے باہمی تعاون سے ہوتا ہے۔ اور اس کا منتہیٰ و مقصود بھی، افراد کی نشو و نما ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا کہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵/۲) تم بِرّ اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ اِثم اور عدوان کے معاملات میں تعاون مت کرو۔ (ان اصطلاحاتِ قرآنیہ کا مفہوم اپنے اپنے مقام پر سامنے آئے گا) اس سے یہ واضح ہے کہ خدا کی استعانت، غاروں، خانقاہوں، حجروں، خلوت کدوں میں حاصل نہیں ہوتی۔ یہ نظامِ خداوندی کے اجتماعی پروگرام میں حاصل ہوتی ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ انسان کی ہر کوشش یا عمل کا آغاز اس کے دل میں پیدا ہونے والی خواہش یا آرزو سے ہوتا ہے یہی آرزو شدید ہو کر ارادہ بنتی ہے اور ارادہ کے مستحکم ہونے کے بعد اس مقصد کے حصول کے لیے قدم اٹھتا ہے۔ قدم اٹھانے کا مرحلہ، بڑا اہم ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بڑا نازک بھی۔ آپ گھر سے کسی جگہ جانے کا ارادہ لیکر نکلتے ہیں۔ اس جگہ پر پہنچنے کے لیے سب سے پہلی اور لاینفک شرط یہ ہے کہ آپ صحیح راستہ پر گامزن ہوں۔ اگر آپ کا قدم غلط راستہ پر پڑ گیا تو آپ مسافت بھی طے کریں گے، اس میں آپ کا وقت اور توانائی بھی صرف ہوگی، لیکن آخر الامر ہوگا یہ کہ، نہ صرف یہ کہ آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچیں گے بلکہ آپ اس سے بہت دور ہٹ چکے ہوں گے۔ لہٰذا جب آپ نے "اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" کہہ کر خدا سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی اعانت طلب کی تو اس کا مطلب تھا کہ آپ نے سب سے پہلے یہ چاہا کہ اس منزل تک پہنچنے کا صحیح یا سیدھا راستہ آپ کے سامنے آجائے۔ اس کے لئے آپ کے دل کی آرزو یہ دعا بن کر آپ کے لبوں تک آئی کہ: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" (۱/۵)

(۱/۵) اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

اس میں پہلا لفظ "اِهْدِنَا" ہے۔ جس سے مقصد ہدایت طلبی ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے قرآن کریم میں ہدایت کا لفظ (مختلف شکلوں میں) بڑی کثرت اور وسعت سے آیا ہے۔ اس لئے کہ ہدایت و ضلالت، حق و باطل اور کفر و ایمان میں حدِّ فاصل ہے۔ لہٰذا اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا نہایت ضروری۔ "رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے

کہ ربوبیت کے معنے ہیں کسی شے کو اس نقطۂ آغاز سے نشو و نما دیتے ہوئے بتدریج تکمیل تک پہنچانا۔ ظاہر ہے کہ اس پروگرام کے مطابق اشیائے کائنات کو ایک سفر اختیار کرنا ہوگا۔ ایک راستہ پر چلنا ہوگا۔ اور یہ راستہ بھی خود خدا ہی کا متعین کردہ ہوگا، کیونکہ اس کے متعین کردہ اور بتائے ہوئے راستے کے سوا کسی راستے پر چل کر بھی یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی راہنمائی کو ہدایت کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ راہنمائی واضح، بیّن، روشن اور نمایاں ہو (یہ خصوصیت خود اس مادہ کے معانی کے اندر مضمر ہے) ظنی، قیاسی، مشکوک، مشتبہ، مبہم راہنمائی کو ہدایتِ خداوندی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ راہنمائی تمام اشیائے کائنات کو خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ سورۃ "اَلْاَعْلٰی" میں ہے کہ "رب" وہ ہے، "اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی، وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (۸۷/۲-۳) جس نے تخلیق کی ابتداء کی، پھر ہر شے کے حشو و زوائد کو الگ کر کے اس میں توازن اور اعتدال پیدا کیا۔ پھر اس کے لئے پیمانے (قوانین) مقرر کئے اور وہ نصب العین متعین کیا جس تک اسے پہنچنا ہے۔ اور اس تک پہنچنے کے لئے اسے راہنمائی دی۔ دوسرے مقام پر اسی کو سمٹا کر یوں کہا گیا ہے کہ "رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی" (۲۰/۵۰) ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خلقت عطا کی اور پھر اس کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے اس کی راہنمائی کی۔ یہ راہنمائی ہر شے کے اندر موجود ہے۔ اسے ان اشیاء کی فطرت یا جبلت کہا جاتا ہے، جس پر چلنے کے لیے یہ اشیاء مجبور رہیں۔ پانی کی فطرت ہے کہ وہ مائع شکل میں نشیب کی طرف بہے۔ ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر منجمد ہو جائے، یا دوسری طرف، بھاپ بن کر اُڑ جائے۔ بکری کی جبلت میں ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ شیر کی جبلت ہے کہ وہ خون پیئے اور گوشت کھائے۔ آپ کسی مرغی کے نیچے مرغی اور بطخ کے انڈے سینے کے لئے رکھدیں۔ جب ان انڈوں سے بچے نکلیں گے تو بطخ کے بچے پانی کی طرف لپکیں گے اور مرغی کے چوزوں کو آپ پانی کی طرف لے جانا بھی چاہیں تو وہ وہاں سے دور بھاگیں گے۔ یہ راہنمائی ان کے اندر پیدائش کے ساتھ موجود ہوتی ہے، کہیں خارج سے حاصل نہیں کرنی پڑتی۔ اسے قرآنِ کریم نے ان کی طرف وحی، کہکر بھی پکارا ہے مثلاً شہد کی مکھی کی طرف وحی (۱۶/۶۸) اجرامِ فلکی کی طرف وحی (۴۱/۱۲)۔ زمین کی طرف وحی (۹۹/۵) وغیرہ۔

انسان بھی مخلوقِ خداوندی میں شامل ہے۔ اسے بھی اپنے ارتقائی منازل طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے۔ اس کے لئے سفر اختیار کرنا اور راستہ طے کرنا ہے۔ اس کے لئے بھی صحیح راہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور اس راہنمائی کا ذمہ بھی اسی خدا نے لے رکھا ہے، جس نے اشیائے کائنات کو راہنمائی عطا کی ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے کہ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْهُدٰی (۹۲/۱۲)

انسان کیلئے راہ نمائی

انسانوں کو راہنمائی دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ دوسری جگہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے یہ کہلایا گیا کہ رب العالمین وہ ہے "اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ (۲۶/۷۸) جس نے

مجھے پیدا کیا اور وہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے میری راہ نمائی کرتا ہے۔ قصۂ آدم کے ضمن میں (جسے قرآنِ کریم نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے اور جس کی تشریح سورۂ بقرہ میں ہمارے سامنے آئے گی) کہا گیا ہے کہ جب آدم سے جنت چھن گئی اور وہ مایوس سا ہو گیا کہ نہ معلوم میری باز آفرینی کا امکان بھی ہے یا نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا کہ تم مایوس نہ ہو۔" فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) میری طرف سے تمہاری جانب راہ نمائی آتی رہے گی۔ تم میں سے جو بھی اس کے مطابق راستہ طے کرے گا وہ بلاخوف و خطر منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔

ان آیات (اور اسی قبیل کی کی متعدد دیگر آیات) سے واضح کہ انسان کی راہ نمائی کا ذمہ بھی خدا نے خود لے رکھا ہے۔ لیکن انہیں اس راہ نمائی کے عطا کرنے کی صورت کچھ اور ہے۔ اشیائے کائنات کی صورت میں یہ راہنمائی ان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ انسانوں کے سلسلہ میں صورت یہ نہیں۔ ان کے لئے طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ خدا کی طرف سے یہ راہنمائی (جسے وحی کہا جاتا ہے) اس کے کسی برگزیدہ بندے کو عطا کی جاتی تھی (اسے نبی یا رسول کہہ کہ پکارا جاتا ہے) اور وہ اس راہ نمائی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ انہیں اس کا اختیار تھا کہ وہ اس راہنمائی کا اتباع کرکے بلاخوف و خطر منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں یا اپنے لئے دوسرے (غلط) راستے اختیار کرکے تباہ و برباد ہو جائیں۔ خدا کی طرف سے یہ راہ نمائی سب سے پہلے نبی کو ملتی تھی۔ چنانچہ خود رسول اکرم ؐ کے متعلق کہا گیا کہ " وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ "(۹۳/۷) ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو صحیح راستہ کی طرف تیری راہنمائی کر دی۔ نبی کی طرف وحی کردہ راہنمائی کو اس کی کتاب کہا جاتا تھا۔ (یعنی اس کی طرف نازل کردہ کتاب اللہ) لہٰذا ہدایتِ خداوندی کی پیروی سے مقصد اس کتاب کا اتباع تھا۔ نبی اکرم ؐ کی طرف جو وحی ہوئی وہ قرآنِ کریم کے اندر درج اور محفوظ ہے۔ یہ وحی مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ چنانچہ اس کتاب کے متعلق فرمایا:

وحیٔ خداوندی

إِنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ۝ (۳۹/۴۱) -

ہم نے اس کتاب کو جو مبنی برحقیقت ہے تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ نوعِ انسانی اس سے ہدایت حاصل کرے۔ ان سے کہہ دو کہ جو یہ ہدایت حاصل کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا۔ جو دوسرے راستے اختیار کرکے گمراہ ہو جائے گا، اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا تیرا کام اس راہنمائی کو ان لوگوں تک پہنچا دینا ہے۔ انہیں زبردستی اس راستے پر چلانا نہیں کیونکہ تجھے ان پر نگران نہیں بنایا گیا۔

یہاں سے دو باتیں واضح ہوگئیں۔ ایک یہ کہ رسول کا فریضہ ہدایتِ خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دینا تھا۔ انہیں اس راستہ پر چلانا اس کی ذمہ داری نہیں تھی۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں کہا ہے کہ اگر انسانوں کو بھی اس راستہ پر اشیائے کائنات کی طرح چلانا مقصود ہوتا تو انہیں بھی ان اشیاء کی طرح مجبور پیدا کر دیا جاتا۔ اسی اختیار و ارادہ کی جہت سے دوسری جگہ کہا کہ: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (۳/۷۶) ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا۔ اب یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ چاہے اسے قبول کرے۔ اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ دوسری جگہ کہا کہ (اے رسول!) یہ تیرے اختیار ہی میں نہیں کہ کسی کو صحیح راستہ پر چلا دے خواہ اس کے لئے تیرا کتنا ہی دل کیوں نہ چاہتا ہو۔ صحیح راستہ پر وہی چلے گا جو اپنے منشا و ارادہ سے اس راستہ کو اختیار کرنا چاہے (۲۸/۵۶) اس میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ راستہ وہی شخص اختیار کرے گا جو کسی منزل تک پہنچنے کے لئے گھر سے نکلے اور پھر دوراہے پر آکر اس کا متلاشی ہو کہ اس کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھے۔ جو شخص سفر ہی اختیار نہ کرنا چاہے اس کے لئے راہنمائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یا جو سفر تو اختیار کرے لیکن بلا تعینِ منزل —— اسے سفر نہیں آوارہ گردی کہا جاتا ہے۔ اور قرآنِ کریم اسے حبطِ اعمال کہکر پکارتا ہے (یعنی بلا نتیجہ حرکت اور عمل) ایسے لوگ کسی راہنمائی کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق رسول اللہ سے کہا ہے کہ: اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴۳/۴۰) کیا تو انہیں سنانا چاہتا ہے جو بہرے بن کر بیٹھے رہتے ہیں اور بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ کیا تو انہیں راستہ دکھانا چاہتا ہے جو اپنی آنکھیں ہی کھولنا نہیں چاہتے اور اس طرح کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ صحیح راہنمائی اسی کو مل سکتی ہے جس کے دل میں منزل تک پہنچنے کی تڑپ ہو اور پھر وہ صحیح راستہ کی تلاش میں جد و جہد کرے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹)۔ جو لوگ ہماری طرف پہنچنے والے راستے کی تلاش میں جد و جہد کرتے ہیں ہم انہیں صحیح راستے دکھا دیتے ہیں اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ صحیح راستہ خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے اتباع سے ملتا ہے، اور کسی طریق سے نہیں مل سکتا۔ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (۲/۱۲۰) (اے رسول) ان لوگوں سے اعلانیہ کہدو کہ حقیقی راہنمائی وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ اس کے سوا کوئی راہنمائی کاروانِ انسانیت کو منزلِ مقصود تک نہیں لے جا سکتی۔ یہی ہے وہ راستہ جسے "صراطِ مستقیم" کہکر پکارا گیا ہے۔

اس مقام پر ایک اور اہم نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ ایک شخص لاہور سے راولپنڈی جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ صبح اٹھ کر ریلوے ٹائم ٹیبل کھولتا ہے۔ اس میں دیکھتا ہے کہ راولپنڈی جانے والی گاڑیاں کس وقت چلتی ہیں۔ وہاں کب پہنچتی ہیں۔ کرایہ کیا ہے۔ گاڑی میں سیٹ ریزرو کرانے کا طریق کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ ان امور کے متعلق نہایت احتیاط سے

ٹائم ٹیبل کا مطالعہ کر کے اپنا اطمینان حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کے بعد اسے سنبھال کر رکھ دیتا ہے۔ وہ ہر روز صبح ایسا ہی کرتا ہے۔ اور ایک فریضہ کی طرح ایسا کرتا ہے۔ لیکن وہ راولپنڈی جانے کے لئے گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ عمر بھر ایسا کرتے رہنے سے راولپنڈی پہنچ جائے گا؟ اور کیا ٹائم ٹیبل کا اسطرح ہر روز مطالعہ کرنا اُسے کچھ فائدہ پہنچا سکیگا؟ جواب واضح ہے۔ لہٰذا کتابِ خداوندی کا پڑھنا اور اسے سمجھنا اُسے ہی فائدہ پہنچا سکیگا جو اس کی راہنمائی میں سفرِ حیات کیلئے عملی قدم اٹھائے۔ منزل پر وہی پہنچ سکیگا جو اس کتابِ عظیم کی راہنمائی میں سفر اختیار کرے۔ یہ کتاب صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرے گی۔ کسی کو اُٹھا کر منزل تک نہیں پہنچاتے گی۔

صِرَاطِ مُسْتَقِیْم ان الفاظ کا عام طور پر ترجمہ "سیدھا راستہ" کیا جاتا ہے۔ 'سیدھا راستہ' صرف لفظ صراط کا ترجمہ ہے۔ لیکن یہاں اَلصِّرَاطَ کے ساتھ اَلْمُسْتَقِیْمَ بھی کہا گیا ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ق۔و۔م) ہے جہاں سے قیام کا لفظ آتا ہے۔ قیام کے معنی کھڑا ہونا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کھڑا وہی شخص ہو سکتا ہے۔ جس کا توازن برقرار ہو۔ ذرا توازن بگڑ جاتے تو نہ کوئی انسان کھڑا رہ سکتا ہے نہ کوئی اور چیز۔ اس نہج سے مستقیم کے معنے ہیں توازن بدوش۔ لہٰذا صراطِ مستقیم کے معنے ہوتے سیدھا اور ہموار راستہ۔ ایسا سیدھا کہ اس میں کوئی پیچ و خم نہ ہو۔ اور ایسا ہموار کہ اس میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو۔

ایک عظیم حقیقت جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، الفاظ کے انتخاب میں بھی قرآنِ کریم کا اعجاز مضمر ہوتا ہے۔ صراط کے معنے تو سیدھا راستہ ہی ہیں لیکن اس راستہ کے سیدھا ہونے میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ جہاں اپنی طرف سے مثبت نظریات پیش کرتا ہے وہاں، ساتھ کے ساتھ غلط اور باطل نظریات کی تردید بھی کرتا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں الصراط کے اندر پنہاں ہیں۔

زندگی کا دَوری تصوّر فکرِ انسانی نے زندگی کے متعلق جو تصور وضع کیا اس میں زندگی کی حرکت کو دَوری (CYCLIC) سمجھا گیا۔ یونان کے مفکرین نے جب اجرامِ فلکی پر غور کیا تو انہیں گول پایا۔ اس سے ان کے ذہن میں گولائی یا دائرے کی عظمت قائم ہو گئی۔ اور انہوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ کائنات اور انسان کی زندگی کی حرکت دَوری ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ دائرے کے اندر گردش کر رہی ہے۔ دائرے کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ جس نقطہ سے کوئی شے حرکت کا آغاز کرتی ہے، پورا دائرہ طے کرنے کے بعد وہ پھر اسی مقام پر آ پہنچتی ہے۔ وہ آگے نہیں بڑھتی، کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی راستہ پر چکر کاٹتی رہتی ہے۔ اس سے فیثا غورث نے تناسخ (TRANS-MIGRATION OF SOUL) کا نظریہ وضع کیا۔ اس نظریہ کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان ایک جنم لے کر اس دنیا میں آیا تو برائیوں (گناہوں) کی آلائش

سے ملوث ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کی روح کو کسی دوسرے پیکر میں پھر سے دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اس آلائش کو دور کر سکے۔ یہ عمل ایک آدھ پیدائشی چکر میں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے کروڑں اربوں چکروں (یعنی نئے نئے جنموں) میں سے گزرنا پڑتا ہے تا آنکہ انسان پھر سے اپنی پہلی ہیئت میں آجاتا ہے۔ اس وقت یہ چکر ختم ہو جاتے۔ یعنی ان تمام گردشوں سے مقصد یہ ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا اسی قسم کا پھر سے بن جائے گویا یہ ہے دوری گردش کا منتہیٰ۔ زندگی کا یہ دوری تصور نظریۂ تناسخ تک ہی محدود نہیں۔ مذاہبِ عالم میں نجات کا نظریہ اسی تصور کا پیدا کردہ ہے۔ عیسائیت نے کہا کہ ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کی آلائش لے کر آتا ہے۔ اس آلائش سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لایا جائے۔ اس ایمان سے انسان پھر سے ویسا ہی پاک اور صاف ہو جاتا ہے جیسا پیدائش سے پہلے تھا۔ یعنی دوسرے الفاظ میں وہی بات جو نظریۂ تناسخ کی بنیاد تھی۔ جن مذاہب نے جہنم کا تصور قائم کیا انہوں نے کہا کہ انسان اس دنیا میں آتا تو پاک صاف ہے لیکن یہاں اس سے ایسے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں جن سے اس کی ذات داغدار ہو جاتی ہے۔ ان داغوں کو دھونے کے لئے اسے اُخروی زندگی میں جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ چنانچہ ان کے ہاں جہنم کی مثال دھوبی کی بھٹی سے دی جاتی ہے۔ اس کے اس طرح پھر سے پاک اور صاف ہو جانے کا نام نجات ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی اسی دوری حرکت کا تصور کارفرما ہے۔ یعنی اس، اتنے طول طویل سفر کے بعد پھر سے وہیں پہنچ جانا، جہاں سے انسان چلا تھا۔

اہلِ تصوّف کا عقیدہ

یہ اہلِ شریعت کا تصور تھا۔ اہلِ طریقت نے اس تصور کو ایک اور رنگ میں پیش کیا۔ ہندوؤں کی ویدانت کی رو سے کہا یہ گیا کہ انسانی روح (آتما) برہما کی روحِ عظیم (پرماتما) کا جزو ہے۔ یہ جزو اپنی اصل سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس گیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اسے اس آلائش سے پاک اور صاف کر دیا جائے تاکہ یہ پھر سے اپنی اصل میں جا ملے۔ اسے نجات کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے بڑے مشقت طلب مراقبوں کی جانکاہ ریاضتوں، ترکِ آرزو کی مشقوں اور ایذائے خویش کی روح فرسا صعوبتوں کی ضرورت ہوتی ہے (بدھ مت کا نروان بھی کچھ ایسا ہی تصور پیش کرتا ہے) ویدانت کا یہی نظریہ یہودی تصوف اور عیسائیت کی رہبانیت میں سامنے آیا۔ اور وہیں سے مسلمانوں نے مستعار لیکر اسے "اسلامی تصوف" کا نام دیا۔ یہی وہ نظریہ ہے جسے مولانا روم نے اپنی مثنوی کے پہلے شعر میں یوں بیان کیا ہے کہ

بشنو از نے چوں حکایت می کند   از جدائی ہا شکایت می کند

یعنی بانسری اس لئے آہ و فغاں کرتی ہے کہ وہ اپنی اصل (نیستان) سے جُدا ہو گئی ہے۔ اس کا یہ آہ و نالہ اس وقت ختم ہو گا جب

پھر سے اپنی اصل سے جا ملے گی۔ یہی زندگی کی تمام تگ و تاز کا ماحصل ہے۔ غالب کے الفاظ میں:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اسی طرح انسانی ذات کے، ذاتِ خداوندی میں پھر سے جذب اور گم ہو جانے کا نام صوفیا کی اصطلاح میں "وصال" کہلاتا ہے۔ یعنی فانی فی اللہ باقی باللہ۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ زندگی کے متعلق دَوری حرکت کا نظریہ کس کس قسم کے عقائد اور تصورات کو محیط ہے اور اس سے انسانی زندگی ہی نہیں بلکہ اس کے پیدا کرنے والے خدا کے متعلق کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟ تخلیق کائنات، انسان کی پیدائش، آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت، حضرات انبیائے کرام کی بعثت، غرضیکہ خدا کی طرف سے اس قدر وسیع و عریض و رفیع پروگرام کی غایت الغایات صرف یہ ہے کہ جیسا کچھ پہلے تھا پھر سے ویسا (As you were) ہو جائے۔ ایسا بے کار بے مقصد پروگرام کسی صورت میں بھی خدا کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے ان تمام باطل تصورات کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ زندگی کی حرکت دَوری نہیں بلکہ "صراطی" ہے۔ زندگی کا کارواں سیدھے راستے پر گامزن ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس سفر کی غایت پھر سے وہیں پہنچ جانا نہیں جہاں سے آغازِ سفر ہوا تھا۔ اس کا مقصد اس منزل تک پہنچنا ہے جو اس کے نقطۂ آغاز سے بہت آگے اور بہت بلند ہے۔

قرآنی نظریہ حیات زندگی کا سفر دوری نہیں، ارتقائی ہے۔ اس تگ و تاز کا مقصد مصیبتوں سے چھٹکارا پا کر آلائشوں سے پاک اور صاف، ہو کر پھر سے ویسا بن جانا نہیں، جیسا یہ پہلے تھا۔ اس کا مقصد پہلے سے کہیں زیادہ بہتر بن جانا، بلند مقام حاصل کرنا ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسانی زندگی کا مقصد نجات (یا SALVATION) نہیں بلکہ فوز (ACHIEVEMENT) قرار دیا ہے۔ قرآن کے تصور کی رو سے، انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں —— ذات ناقابلِ تقسیم وحدت ہوتی ہے وہ اجزاء میں بٹ ہی نہیں سکتی۔ جس شے سے اس کا کوئی جزو الگ ہو جائے وہ شے نامکمل رہ جاتی ہے۔ ناقص ہو جاتی ہے۔ اس سے وہ ذات ذات ہی نہیں رہتی۔ لہٰذا انسانی ذات خدا کی ذات کا الگ شدہ حصہ نہیں۔ خدا نے انسان کو غیر نشو و نما یافتہ شکل میں ذات عطا کی ہے اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اُسے نشو و نما دیتے ہوئے اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ یہ منزل اُخروی زندگی میں سامنے آتی ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم نے جو صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا بتائی ہے تو اس سے اس نے انسانی زندگی کے منتہیٰ اور مقصود کے متعلق باطل نظریات کی بھی تردید کر دی ہے۔ اور انسان کے سامنے ایک مثبت تعمیری پروگرام بھی رکھ دیا ہے جو اُسے آگے بڑھاتے ہوئے بلندیوں کی طرف لے جائے گا۔ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" (۸۴/۱۹) تاکہ انسان درجہ بدرجہ بلندیوں کی طرف اُبھرتا چلا جائے۔ یہ ہے صراطِ مستقیم۔

خدا صراطِ مستقیم پر

سورۃ ہود میں ہے: اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۱/۵۶) اس کے عام معانی تو یہی ہیں کہ خدا بھی صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے، لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ پورا نظام کائنات قوانین خداوندی کے مطابق صراطِ مستقیم پر چلتا ہوا ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں اس سیدھے اور متوازن راستے پر سب سے پہلے خدا کا رسول گامزن ہوتا ہے۔ اسی لئے حضورؐ کے متعلق فرمایا کہ: "اِنَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" (۴۳/۴۳) تو بے شک صراط مستقیم پر چل رہا ہے۔ جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ تم یہ مسلک اختیار کرو کہ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" ہم صرف خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کا آرزومند بنایا گیا۔ اور ان دونوں کو ملا کر کہا گیا "اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ۔ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ" (۳/۵۰) اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ میرا اور تمہارا رب اللہ ہے۔ تم سب اسی کی عبدیت (محکومیت) اختیار کرو۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ اس سے واضح ہے کہ صراطِ مستقیم خدا کی محکومیت اختیار کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن مجید کس طرح خود آپ اپنی وضاحت کرتا چلا جاتا ہے۔

صراطِ مستقیم کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ صراطِ مستقیم (شاہراہِ اعظم) ایک ہی ہے۔ یہی وہ شاہراہِ عظیم ہے جس کی طرف تمام انبیائے کرام کی وساطت سے راہنمائی ملتی چلی آ رہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے متعلق کہا ہے کہ یہ جگمگاتی ہوئی روشنی (نورِ مبین) ہے۔ یَھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ وَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵/۱۶)

سُبُل السلام کیا ہیں؟

اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کے پروگرام کا اتباع کرتے ہیں، سُبُل السلام (سلامتی کے راستوں) کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے اور اس طرح وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ یہاں اس نے "سُبُل" کہا ہے جو سبیل کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں متعدد راستے یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب صراطِ مستقیم ایک ہی ہے تو یہاں قرآنِ کریم نے سُبُل کیوں کہا؟ یہ نکتہ غور طلب ہے۔

الدّین تو شروع سے ایک ہی چلا آتا ہے۔ لیکن اُسے عملاً متشکل کرنے کے لئے مختلف زمانوں میں، اُس زمانے کے تقاضوں کے مطابق) طریق اور پروگرام مختلف رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر، خدا کی طرف سے عطا کردہ اصولی قوانین تو شروع سے غیر متبدل رہے ہیں اور رہیں گے۔ لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طریقے زمانے کے تقاضوں (ضروریات) کے اعتبار سے بدلتے رہیں گے۔ انہی کو "سُبُل" کہا جائے گا۔ یعنی وہ پگڈنڈیاں جو آخر الامر شاہراہِ اعظم میں جا کر مل جاتی ہیں۔ اسی لئے اس آیت (۵/۱۶)

ہیں" سبل السلام" کے بعد کہا: " وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ"۔ اس طرح خدا ان کی راہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کر دیتا ہے۔ یعنی دین کے نظام پر عمل پیرا ہونے کے لیے جو طریقے بھی اختیار کئے جائیں ان کی غایت یہی ہو کہ وہ انسان کو اصل دین کی طرف لے جائیں۔

یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر چلنے کی آرزو قلبِ مومن میں موجزن ہوتی ہے۔ یہاں تک بات نظری سی تھی۔ اگلی آیت میں قرآن کریم اس کا مقصد اور نتیجہ محسوس شکل میں سامنے لاتا ہے، جب کہتا ہے کہ: "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ"۔ یعنی وہ راستہ جس پر اس سے پہلے بھی اسی قسم کے انسان گامزن ہوتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ....

(۱/۶) اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

جس صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کے لئے خدا سے دعا کی گئی تھی اب اس کی وضاحت محسوس انداز میں کی جارہی ہے۔ کہا یہ جارہا ہے کہ یہ ان لوگوں کی راہ ہے جنہیں تو نے اپنی نعمتوں سے نوازا۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی جامع چیز ہے۔ یعنی ایسی چیز جس میں، دین پر عمل پیرا ہونے کے تمام نتائج اور ثمرات آجاتے ہیں، خواہ وہ اس دنیا میں حاصل ہوں اور خواہ اُخروی زندگی میں، لہٰذا نعمت کا صحیح صحیح قرآنی مفہوم سمجھ لینا نہایت ضروری ہے، کیونکہ یہی وہ محسوس معیار ہے جس سے یہ پرکھا جاسکے گا کہ ہمیں نعمائے خداوندی حاصل ہیں یا نہیں۔ اگر حاصل ہیں تو ہمارا ایمان، قرآنی میزان میں ایمان، اور ہمارے اعمال، اعمالِ صالح ہیں۔ اگر یہ حاصل نہیں تو جسے ہم ایمان اور عملِ صالحہ (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے الفاظ میں "خدا پرستی اور نیک عملی") کہہ کر اپنے دل کو جھوٹا اطمینان دلالیں گے وہ خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔

عربوں کے ہاں ایک پودا ہوتا ہے جسے وہ "تَنْعِيْمَةٌ" کہتے ہیں۔ اس کے پتے نرم و نازک اور سرسبز و شاداب ہوتے ہیں۔ وہ پانی پر پیدا ہوتا ہے جس سے اس کی تروتازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس مادہ (ن۔ع۔م) میں بلندی اور سرفرازی کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ "اَلنَّعَمَةُ" اس عمارت کو کہتے ہیں جو پہاڑ پر تعمیر کی گئی ہو۔ نیز کسی اونچے نشان یا جھنڈے کو بھی، جس سے راستے کا پتہ چلایا جائے۔ ان معانی سے واضح ہے کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کا خوشگوار، کشادہ، ملائم، آسودہ، بلند اور سرفراز ہونا، نعمت کا مظہر ہے۔ جن لوگوں کی زندگی اس قسم کی ہوگی انہیں "منعم علیہ" کہا جائے گا۔ یعنی وہ جنہیں خدا کی نعمتیں حاصل ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل قرآن کریم کی مختلف آیات میں ملے گی، جن میں چند ایک درج ذیل ہیں۔

منعم علیہ قومیں:

(۱) کسی قوم کا مستبد حکمرانوں کے پنجۂ استبداد سے رستگاری اور آزادی حاصل کرلینا خدا کی نعمت ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو جس سے اس نے تمہیں نوزا۔ تم قومِ فرعون کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ تمہیں طرح طرح کے عذاب دیتے تھے۔ خدا نے تمہیں اس سے نجات دلائی۔ یہ اس کا بہت بڑا انعام تھا۔ (۲/۴۷-۴۹)

(۲) لیکن یہ صرف منفی پہلو ہے۔ یعنی کسی عذاب سے نجات حاصل کرلینا۔ اس کے بعد اس کا مثبت پہلو سامنے آتا ہے۔ اسی قومِ بنی اسرائیل کو اس کی ان الفاظ میں یاد دلائی گئی کہ: يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۴۷) اے قوم بنی اسرائیل! تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر افضلیت عطا فرمائی۔ بالفاظِ دیگر، منعم علیہ وہ قوم ہے جو اپنی ہم عصر اقوام میں نہایت ممتاز اور بلند و بالا مقام رکھتی ہو۔ یعنی دیگر اقوام کی ہمدوش ہی نہیں، بلکہ ان سے بہت آگے اور سربلند۔ قرآنِ کریم نے جب اُمّتِ مسلمہ (جماعتِ مؤمنین) کے متعلق کہا ہے کہ: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ——— (۳/۱۳۸) تو اس سے یہی مراد ہے یعنی تمام اقوامِ عالم سے بلند و بالا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

مومنے بالائے ہر بالا ترے　∴　غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

یہی وہ شوکتِ داؤدی اور سطوتِ سلیمانی تھی، جس کا شکریہ ادا کرنے کی توفیق حضرت سلیمانؑ نے ان الفاظ میں مانگی تھی کہ: رَبِّ اَوْزِعْنِيٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ (۲۷/۱۹)۔ اے میرے رب! مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کروں جس سے تو نے مجھے اور میرے والدین کو نوزا ہے۔

(۳) سورۃ "النحل" میں پہلے زندگی کے مختلف ساز و سامان کی تفصیل بیان کی گئی ہے ——— رہنے کے لئے مکانات اور خیمے، پہاڑوں میں محفوظ اقامت گاہیں۔ موسم کے اثرات

سے بچنے کے لئے لباس۔ میدانِ جنگ میں حفاظت کے لئے زرہ بکتر وغیرہ)۔
اور اس کے بعد کہا گیا ہے: كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ (۱۶/۸۱)
اس طرح خدا نے تم پر اتمامِ نعمت کیا تاکہ تم اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے رہو۔
لہٰذا زندگی کی تمام ضروریات کا میسر آتے رہنا، خدا کی نعمت ہے۔

(۴) سورۃ لقمان میں اس حقیقت کو دو ایسے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن کے اندر کائنات کی ہر شے سمٹ کر آجاتی ہے۔ فرمایا: اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (۳۱/۲۰) کیا تم نے اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں ـــــ ارض و سمٰوات ـ میں جو کچھ ہے، خدا نے اسے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور اس طرح تمہیں اپنی ظاہر و باطن کی نعمتوں کی فراوانیوں سے بہرہ یاب کیا۔

(۵) سورۃ ابراہیم میں تسخیرِ ارض و سما کے تفصیلی بیان کے بعد کہا کہ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴/۳۲-۳۴)
نعمائے خداوندی اس قدر لاتعداد ہیں کہ گنتی و شمار میں نہیں آسکتیں۔ تم دو لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ زندگی کی برومندی، استحکام اور سرفرازی کے لئے جس جس ساز و یراق کی تمہیں ضرورت تھی، خدا نے وہ سب تمہارے لئے مہیا کر دیا۔ یہ سب نعمائے خداوندی ہیں۔

(۶) یہ تو رہا انسان کی طبیعی زندگی کا ساز و سامان۔ لیکن (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) انسان صرف طبیعی زندگی ہی سے عبارت نہیں۔ اس کی، اس کے علاوہ انسانی زندگی بھی ہے جس کی نشوونما، ان اقدار کی رُو سے ہوتی ہے جو حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں۔ سورۃ مریم میں مختلف انبیائے کرامؑ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ (۱۹/۵۸) یہاں نبوت کو بھی نعمتِ خداوندی قرار دیا گیا ہے، اگرچہ یہ وہ نعمت ہے جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نتیجے میں نہیں ملتی تھی۔ بلکہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی۔ یہ وہ نعمتِ خداوندی ہے جس کا اتمام قرآنِ کریم میں آکر ہو گیا۔ جہاں کہا کہ: وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (۵/۳)

بنا بریں اب تمام نوعِ انسان قیامت تک وحی کی نعمت سے بذریعہ قرآن کریم بہرہ یاب ہو سکیں گے۔ یہ نعمت (وحی) نہ کسی دوسری جگہ موجود ہے اور نہ ہی رسول اللہ کے بعد کسی اور کو مل سکتی ہے۔ غیر متبدل اور محفوظ کتاب اللہ کی موجودگی میں مزید وحی کی ضرورت کیا ہے؟

(۷) جو لوگ اس نعمت (قرآنِ کریم) سے بہرہ یاب ہوتے ہیں ان کی اوّلین نشانی یہ ہے کہ ان میں کسی قسم کا تفرقہ نہیں ہوتا۔ ان کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہوتے ہیں۔ دیکھئے قرآنِ کریم نے اس حقیقتِ کبریٰ کو کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا کہ:

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا. وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۳/۱۰۲)

(اے جماعتِ مومنین) تم خدا کی طرف سے عطا کردہ اس محکم سہارے کو، سب مل کر اجتماعی طور پر، ایک جماعت بن کر تھامے رہو اور آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو۔ تم خدا کی نعمت کو یاد کرو جس سے اس نے تمہیں سرفراز فرمایا، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے (تمہیں محض ظاہرا طور پر متحد نہیں کیا بلکہ) تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر دیا۔ اور اس طرح تمہیں آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ یہ اس کی بہت بڑی نعمت ہے۔ تم تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اس نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ اس طرح خدا اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم صحیح راستہ پر چلتے رہو۔"

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ گئی کہ خدا نے کس کس چیز کو اپنی نعمت کہا ہے اور وہ منعم علیہ لوگ کونسے

ہیں جو خدا کی مقرر کردہ صراطِ مستقیم پر رواں رواں ، ہم سے آگے گئے ہیں اور جن کے راستہ پر چلنے کی ہمیں دعا سکھائی گئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ نعماءِ خداوندی محض دعائیں مانگنے سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ یہ ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں۔ (بجز نبوّت کے، جو وہبی طور پر ملتی تھی) قرآن کریم کی رو سے سفرِ زندگی میں جنت وہ مقام ہے، جہاں یہ نعماءِ

نعماءِ خداوندی کام کرنے سے ملتی ہیں

خداوندی اپنی بلند ترین شکل میں متشکل ہو جاتی ہیں۔ اس جنت کے متعلق کہا۔ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۳۹/۷۴) کام کرنے والوں کا کس قدر نعمت نشان معاوضہ ہے، جس سے انہیں نوازا گیا ہے۔ سورۃ "النسآء" میں اس کے حصول اور استبقا کے لئے ایک تفصیلی پروگرام دیا گیا ہے جسے ہم اس کے مقام پر سامنے لائیں گے۔ یہاں اتنا کہدینا کافی ہے کہ ان "منعم علیہ" حضرات کی رفاقت، نظامِ خداوندی کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ (۴/۶۴-۷۰)

اس سلسلہ میں اگلی بات یہ ہے کہ ان نعماءِ خداوندی کا حاصل ہو جانا ہی مقصود بالذات نہیں۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان نعماء کا استعمال کس طرح سے کیا جاتا ہے۔ اگر انہیں اقدار و قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف میں لایا جائے تو اسے "شکرِ نعمت" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اگر ان کے خلاف استعمال کیا جائے تو قرآن کریم اسے "کفرانِ نعمت" کہکر پکارتا ہے

انہیں کس طرح استعمال کیا تھا؟

اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ "ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے نعماءِ خداوندی کو کس طرح استعمال کیا تھا" — ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (۱۰۲/۸)

اگر ان نعمائے خداوندی کو غلط (غیر قرآنی) طریقہ پر صرف میں لایا جائے تو یہ نعمتیں چھن جاتی ہیں جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ سورۃ "النحل" میں ہے کہ "خدا اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرنا چاہتا ہے۔ ایک بستی تھی جس کے رہنے والوں کو امن بھی نصیب تھا اور اطمینان بھی۔ رزق کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کی طرف چاروں طرف سے کھنچا چلا آتا تھا۔" فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (۱۶/۱۱۲) اس قوم نے ان نعمائے خداوندی سے کفر برتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ یہ عذاب کہیں باہر سے نہیں آیا تھا، خود ان کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ تھا یعنی ان کے خود ساختہ نظام کا نتیجہ۔"

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے خدا کی نعمتوں کو کفر سے بدل دیا اور یوں اپنی قوم کے قافلہ کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اِس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہ تھا — یعنی جہنم میں — کس قدر تباہ کن تھا وہ مقام، جہاں اس قوم کے لیڈر انہیں لے گئے (۱۴/۲۸-۲۹) لیکن

اس کے ذمہ دار قوم کے لیڈر ہی نہیں ہوتے، ساری کی ساری قوم اس کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے اس باب میں اصول یہ بتایا ہے کہ:

قانونِ تغیر ونعماء

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ (۸/۵۳) (۱۳/۱۱)۔

یہ اس لئے کہ جو نعمتیں کسی قوم کو حاصل ہوں، خدا ان میں کبھی تغیر نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر ذہنی اور نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ یاد رکھو اللہ کے فیصلے یونہی اندھا دھند نہیں ہوتے۔ وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اِس سے ظاہر ہے کہ نعمتوں کے ملنے اور ان کے چھن جانے کی بنیادی شرط اس قوم کی نفسیاتی تبدیلی ہے۔ اگر یہ تبدیلی، خدا کی راہنمائی کے مطابق صحیح سمت کی طرف ہوئی ہے تو اسے ایمان کہا جائے گا۔ یعنی ایمان کا نتیجہ ہوگی —— اور اگر یہ غلط سمت کی طرف ہوئی ہے تو اُسے کفر کہہ کر تعبیر کیا جائے گا۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ خدا کے بندے (گروہِ مومنین) خدا کے حضور اس امر کا اقرار اور اعتراف کرتے ہیں کہ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں خدا کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے: وَاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۙ (۱۶/۱۱۴) اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ تم خدا کی محکومیت اختیار کرتے ہو، تو اس کا عملی ثبوت یہ ہوگا کہ تم خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کے قوانین کے مطابق صرف کرو۔ اس سے یہ حاصل شدہ نعمتیں بھی برقرار رہیں گی اور ان میں نت نئے اضافے بھی ہوتے چلے جائیں گے۔ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۙ (۱۴/۷) جب تیرے رب نے اس امر کا اعلان کیا کہ اگر تم نے شکرِ نعمت کیا تو ہم ان نعماء میں اضافہ کرتے جائیں گے لیکن اگر کفرانِ نعمت کیا تو اس کی سزا بڑی سخت ہوگی۔ یہ سزا کیا ہوگی، اس کی تفصیل اگلی آیت میں دیدی گئی۔

(۱/۷) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۙ

ہمارے ہاں سورۃ فاتحہ کی آیات "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۙ کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ "دکھا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تونے اپنا انعام کیا۔ نہ ان کی جن پر تیرا غضب ہوا یا جو گمراہ ہوئے"۔ بظاہر اس ترجمہ میں کوئی بات قابلِ اعتراض دکھائی نہیں دیتی، لیکن ذرا بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو اس سے خدا کے متعلق بڑا غلط تصور سامنے آتا ہے۔ جب ہم خدا

غلط ترجمہ

سے عرض کرتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں کی راہ دکھا جن پر تیرا انعام ہوا. یعنی منعم علیہ افراد و اقوام کی راہ. تو یہاں تک بات صاف اور واضح ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں " نہ ان لوگوں کی جن پر تیرا غضب ہوا یا گمراہ ہوئے" تو اس سے یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ خدا ان لوگوں کی راہ کی طرف بھی راہنمائی کر دیا کرتا ہے جو مغضوب علیہ یا گمراہ ہیں۔ خدا کے متعلق یہ تصور، کہ وہ ان لوگوں کے راستے کی طرف بھی راہنمائی کر دیتا ہے، بڑا قابلِ اعتراض ہے۔ خدا اس سے بلند و بالا ہے کہ اپنے بندوں کی راہنمائی مغضوب علیہ اور گمراہ قوموں کے راستے کی طرف کرے۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے بعض لوگ اس قسم کا مفہوم لے لیتے ہیں کہ " خدا جسے چاہے ہدایت دیدیتا ہے۔ اور جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے" ان آیات کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ ان کا صحیح مفہوم ان مقامات پر سامنے آئے گا جہاں یہ آیات آئی ہیں۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ انسان ہدایت یا گمراہی خود حاصل کرتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ حاصل ہوتی ہے خدا کے متعین کردہ قانون اور ضابطہ کے مطابق، اس لئے اس کی نسبت خدا کی طرف کر دی جاتی ہے (تفصیل ان امور کی میری تصنیف "کتاب التقدیر" میں ملے گی)۔ مندرجہ بالا آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس حقیقت کا سامنے رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم اپنے حقائق اور معارف کو اضداد

اضداد سے وضاحت

کے ذریعے بھی واضح کرتا ہے اور یہ طریق بڑا دلنشین اور مؤثر ہوتا ہے۔ مثلاً وہ "ظلمت اور نور"، ظل (سایہ) اور حرور (دھوپ)، اعمٰی (نابینا) اور بصیر (بینا) جیسے متضاد الفاظ کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر اپنا مفہوم واضح کرتا ہے۔ یہی انداز اس نے مندرجہ بالا آیات میں اختیار کیا ہے۔ ان کے صحیح معانی یہ ہیں کہ ہمیں ان لوگوں کی راہ دکھا جو منعم علیہ تھے۔ مغضوب علیہ اور ضالین نہیں تھے۔ یعنی وہ ایسے تھے، ایسے نہیں تھے۔ یوں اضداد سے (BY CONTRAST) مفہوم واضح تر ہو گیا۔

مَغۡضُوۡبٌ عَلَیۡہِ

غضب کا مفہوم

لفظ غضب کے بنیادی معنوں میں شدت، قوت، حرارت، غلبہ، استیلا اور گرفت کی محکمیت پائی جاتی ہے۔ جب یہ لفظ انسانوں کے لئے بولا جائے گا تو اس میں غصہ اور غضب آلود جذبات کا ہیجان مقصود ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ انسانی جذبات سے بلند اور منزّہ ہے۔ اس لئے جب اس لفظ کی نسبت خدا کی طرف کی جائیگی تو اس سے مراد خدا کے قانونِ مکافات کی محکم گرفت ہوگی۔ وہی مفہوم جو مثلاً اس قسم کی آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ: اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ (۸۵/۱۲)۔ خدا کی گرفت بڑی شدید ہوتی ہے یا: فَاَخَذۡنٰہُ اَخۡذًا وَّبِیۡلًا (۷۳/۱۶)۔ ہم نے اسے (فرعون کو) بڑی محکم گرفت میں لے لیا۔ یہی مفہوم خدا کے غضب کا بھی ہے۔ یعنی وہ تباہی اور بربادی جو اس کے اٹل قانونِ مکافات کی رو سے واقع ہوتی ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے یہاں "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کا مفہوم اس کی ضد کو سامنے لاکر واضح کیا گیا ہے (مثلاً) جب خدا کی ان نعمتوں کا ذکر کیا گیا تھا جن سے قومِ بنی اسرائیل بہرہ یاب ہوئی تھی، تو ان کے متعلق کہا تھا کہ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (2/47) "ہم نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر فضیلت عطا کی۔ لہٰذا اقوامِ عالم پر فضیلت خدا کی نعمت ہے۔ اس کے بعد جب انہوں نے اس راستے کو چھوڑ دیا جس پر چلنے سے یہ سرفرازی حاصل ہوئی تھی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2/61) ان پر ذلت و مسکنت کا عذاب نازل ہوگیا اور یہ خدا کا غضب تھا۔ دوسری جگہ اسے "ذِلَّةٌ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (7/152) سے تعبیر کر کے یہ واضح کردیا کہ ذلت و پستی ان پر اسی دنیا کی زندگی میں طاری ہوگئی تھی۔

ذلت و مسکنت

ذلت کا لفظ ہر قسم کی محتاجی، کمزوری، محکومی، بےکسی، بےبسی، بیچارگی، درماندگی اور پستی کے معنوں میں آتا ہے۔ وہاں "افضلیت" تھی اور یہاں "ذلت اور پستی"۔ اس سے انعامِ خداوندی اور غضبِ الٰہی کا مفہوم واضح ہوگیا۔

دوسرا لفظ مسکنت ہے۔ زندگی حرکت اور حرارت کا نام ہے۔ یعنی شاہراہِ حیات پر مسلسل، رواں، دواں چلتے رہنے کا نام۔ اسی کو سعیٔ پیہم یا جد و جہدِ دوام کہا جاتا ہے۔ جو قوم کسی مقام پر رک کر کھڑی ہو جائے، وہ زندگی کی حرارتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ جامد قوم ایک مقام پر کھڑی ہی نہیں ہوتی، بلکہ غور سے دیکھا جائے تو وہ پیچھے ہٹ رہی ہوتی ہے۔ کیونکہ چلنے والی قومیں اس سے بہت آگے بڑھ جاتی ہیں۔ لہٰذا مسکنت کسی قوم کی ایسی حالت کا نام ہے، جہاں وہ آگے بڑھنے سے رک جائے۔ قرآنِ کریم میں جہنم کو جحیم بھی کہا گیا ہے (2/119) اور جحیم کے معنے ہوتے ہیں، راستے کی روک۔ ہم پہلے، خدا کے اس بیان فرمودہ ابدی اصول کو دیکھ چکے ہیں کہ جو نعماء کسی قوم کو حاصل ہوں وہ ان سے کبھی نہیں چھنتیں جب تک وہ قوم اپنی نفسیاتی (داخلی) دنیا میں تغیر پیدا نہ کرے۔ لہٰذا جو قوم کسی ایک مقام پر رک جاتی ہے اس سے

فکری جمود

یہی مراد نہیں کہ اس کے پاؤں چلنے سے رک جاتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس میں فکری جمود پیدا ہوجاتا ہے، وہ سمجھنا سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔ وہ تقلید کا مسلک اختیار کرلیتی ہے۔ وہ یہ کہہ کہ اپنے آپ کو فریب دے لیتی ہے کہ زندگی کے حقائق اور مسائل کے متعلق جو کچھ سوچا جانا تھا وہ سوچا جاچکا۔ سفرِ زندگی میں جس قدر مسافت طے کرنی تھی وہ طے کی جاچکی۔ یہی ہماری آخری منزل اور منتہائے مقصود ہے۔ اس کے لئے ان کے پاس سند صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ وہ مسلک ہے جسے ہمارے آباؤ اجداد (اسلاف) نے اختیار کیا تھا۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر اس عقیدہ کی تردید کی ہے اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ ایسی قوم موردِ غضبِ الٰہی ہو جاتی ہے، مثلاً سورۃ اعراف میں، قومِ عاد کے متعلق

ہے کہ جب ان کے پیغمبر، حضرت ہودؑ نے، انہیں خدائے واحد کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے اسلاف کا مسلک چھوڑ دیں۔ اس کے جواب میں حضرت ہودؑ نے کہا کہ تمہاری یہ روش اور اس پر قائم رہنے کی ضد اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ۔ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ (۷/۷۱) تم پر خدا کا غضب اور رجس نازل ہو چکا ہے (رجس کا مفہوم اپنے مقام پر بتایا جائے گا) جن معبودانِ باطل کا تم ذکر کرتے ہو، جن نظریات و معتقدات کو تم حق و صداقت کی تعلیم کہہ کر پکارتے ہو، اُن کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ۔ أَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ (۷/۷۱) یونہی کچھ نام ہیں جو تمہارے اسلاف، یا اب تم نے خود رکھ لئے۔ ان کے حق و صداقت ہونے کی کوئی سند خدا نے نازل نہیں کی۔ اس تنبیہہ و تنذیر کے باوجود وہ اپنی ضد پر اڑے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ (۷/۷۲) اُس قوم کی جڑ کٹ گئی کیونکہ، بجائے اس کے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کرتے، انہیں جھٹلاتے رہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ مغضوب علیہ قوم زندگی کی تمام شادابیوں اور سرفرازیوں سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کے شجرِ حیات کی جڑ تک کٹ جاتی ہے۔

منعم علیہ قوم کی ایک علامت یہ بھی بتائی گئی تھی کہ۔ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ (۳/۱۰۲) اس قوم کے افراد کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان میں باہمی محبت و الفت انتہا تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس،

باہمی قتال غضبِ خداوندی ہے

قرآنِ کریم نے کہا کہ اگر کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے کہ وہ ایکدوسرے کا گلا کاٹنے لگ جائیں تو ان پر خدا کا غضب نازل ہو جاتا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے۔ وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (۴/۹۳)۔ یاد رکھو! جو مومن اپنے کسی بھائی کو بالارادہ قتل کر دے تو سمجھ لو کہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت وارد ہوگی اور یوں وہ بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔

سخط اللہ

قرآنِ کریم میں ایک لفظ (سخط) بھی آیا ہے جو قریب قریب غضب کا مرادف ہے۔ جس مقام پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہ بڑا غور طلب ہے۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات مکمل ہوتا ہے اور اس کے اتباع کے معنی یہ ہیں کہ اس پورے کے پورے ضابطہ کی اطاعت کی جائے۔ یعنی ایسا نظام متشکل کیا جائے جس میں تمام معاملات اسی ضابطہ کے مطابق طے ہوں۔ اگر ایسا ہو کہ بعض معاملات

کے فیصلے ضابطۂ خداوندی کے مطابق کئے جاتیں اور بعض کے اپنے وضع کردہ قوانین یا دوسری قوموں کے ضوابط کے مطابق، تو اس ثنویت کا نتیجہ ذلّت اور خواری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے ۸۵/۲)۔ ایسی قوم کے متعلق کہا کہ وہ مغضوب علیہ ہوتی ہے۔ اسی کی وضاحت دوسری جگہ یہ کہکر کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے واضح ہدایت آجانے کے بعد پھر اپنی روشِ کہن کی طرف پلٹ جاتے ہیں (اسے ارتداد کہا جاتا ہے) یعنی وہ بعض معاملات میں ان لوگوں کی اطاعت کرنے لگ جاتے ہیں جن پر ضابطۂ خداوندی گراں گزرتا ہے۔ ان کا انجام بڑا الم انگیز ہوتا ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۔ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷/۲۶-۲۸)

یہ اس لئے کہ وہ، بجائے اس کے، کہ قوانینِ خداوندی کی کامل ہم آہنگی اختیار کریں، اس روش پر چل نکلتے ہیں جو غضبِ خداوندی کا موجب ہوتی ہے یعنی یہ بعض امور میں ان لوگوں کی اطاعت اختیار کر لیتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس سے ان کے تمام اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کے آخری الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ لوگ "بعض امور میں" غیر خداوندی قوانین کا اتباع کرتے ہیں۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جن امور میں وہ ضابطۂ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں ان کا بدلہ تو انہیں ملنا چاہیئے۔ یعنی ان کے تمام اعمال تو ضائع نہیں جانے چاہئیں۔ یہ شبہ سطح بینی پر مبنی ہے۔ اگر آپ بہ نظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی تمام کی تمام سعی و عمل رائیگاں چلی جاتی ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ اگر آپ کسی طبیب کے علاج کے سلسلہ میں یہ کریں کہ بعض اجزا تو اس کے نسخے کے لے لیں اور بعض اجزا کسی ڈاکٹر کے نسخے کے، تو آپ سوچئے کہ کیا یہ مختلف اجزا اپنا اپنا نتیجہ مرتب کریں گے یا آپ کی ساری کوشش ہی رائیگاں چلی جائے گی؟ زندگی کا نظام اسی صورت میں صحیح نتائج مرتب کرتا ہے، جب اس کے تمام اجزا، صحیح، خالص، متناسب اور اپنے اپنے مقام پر فٹ ہوں اور ان میں کسی قسم کی آویزش یا آلائش نہ ہو (اسے توحید کہا جاتا ہے)۔ اگر اس نظام میں کسی دوسرے نظام کے اجزاء کا پیوند لگایا جائے تو اس قسم کا مخلوط نظام کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی پیوند سازی یا آمیزہ کو "شرک" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دین توحید پر مبنی نظام کا نام ہے۔ مذہب میں انسانی نظریات، معتقدات، مشارب و مسالک کی آمیزش کر دی جاتی ہے۔ اس لئے مذہب پرست قوم کے اعمال بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ وہ مذہب کی متعین کردہ رسوم و واجبات کی ادائیگی میں بڑی جانگسل مشقتیں اٹھاتی

اور صعوبت انگیز اور صبر آزما محنتیں کرتی ہے. لیکن ان کا کوئی تعمیری نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا، بلکہ وہ دن بدن ذلت اور پستی کے گڑھوں میں گرتی چلی جاتی ہے۔ اسی قسم کے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲/۱۰۶ نیز ۳۹/۴۵، ۲۲/۳۱، ۴۸/۶) وہ ایمان لانے کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔ دینِ خالص میں تو ذرا سی بھی غیر اللہ کی آمیزش ہو جائے تو وہ شرک ہو جاتا ہے۔

دعوائے ایمان کے باوجود مشرک

قرآنِ کریم نے مغضوب علیہ اقوام کی اور بھی علامات بتائی ہیں لیکن اس مقام پر بغرضِ اختصار ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ جب وہ آیات سامنے آئیں گی تو ان کی وضاحت بھی کر دی جائے گی۔ لیکن آخر میں ہم ایک ایسی علامت کا سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں جس نے ہمارے زمانے میں خاص طور پر اہمیت حاصل کر رکھی ہے، اور وہ ہے معاشی نظام۔ قرآنِ کریم نے بھوک کو خدا کا عذاب بتایا ہے (۱۶/۱۱۲) لیکن دوسری طرف اس نے یہ بھی کہا ہے کہ. وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (۲۸/۵۸) بہت سی ایسی قومیں بھی تباہ ہو گئیں جنہیں بہت زیادہ معاشی فراوانیاں حاصل تھیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب معاشی تنگی خدا کے غضب اور عذاب کی علامت ہے تو معاشی فراوانی کس طرح تباہی کا موجب قرار پا سکتی ہے؟ بات واضح ہے. کسی قوم کی خوشحالی کا موجب وہی معاشی نظام ہو سکتا ہے جس میں تقسیمِ رزق میں توازن ہو جس نظام میں یہ توازن بگڑ جائے اس میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ قوم کا ایک طبقہ بھوک اور تنگدستی کی زندگی بسر کرتا ہے اور دوسرے طبقہ کو سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل ہوتی ہیں. تقسیمِ رزق کے اس عدمِ توازن کا لازمی نتیجہ، اس نظام کی تباہی اور اس قوم کی بربادی ہوتا ہے۔ دیکھئے قرآنِ کریم نے اسے کس طرح خدا کے غضب کا موجب بتایا ہے اس نے کہا ہے۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى (۲۰/۸۱) تم خدا کے عطا کردہ رزق کو حلال اور طیّب طریق سے کھاؤ۔ ایسا طریق اختیار نہ کرو جس سے تقسیمِ رزق غیر متوازن ہو جائے [وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ کا یہ مفہوم سورۃ "الرحمٰن" کی اس آیت سے واضح ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ (۵۵/۸) تم میزان (ترازو) میں عدمِ توازن نہ پیدا کرو] اگر ایسا کرو گے تو خدا کے غضب میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور اسے اچھی طرح سن لو کہ جو قوم خدا کے غضب میں مبتلا ہو جائے وہ ذلتوں اور پستیوں کے عمیق غاروں میں گر کر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ (معاشی نظام کے متعلق تفصیلی بحث اپنے مقام پر کی جائے گی)۔

معاشی عدمِ توازن

قرآنِ کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ تم ایسی روش اختیار نہ کرو جس سے تم پر خدا کا غضب نازل ہو جائے. اس نے یہ بھی

کہا ہے کہ مغضوب علیہ لوگوں کے ساتھ دوستدارانہ تعلقات بھی وابستہ نہ کرو۔ سورۃ مجادلہ میں ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ۔ وَمَا ھُمْ مِّنْکُمْ وَلَا مِنْھُمْ (۵۸/۱۴) کیا تم نے ایسے لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو ان لوگوں سے دوستدارانہ تعلقات وابستہ کرتے ہیں جو خدا کے

مغضوب علیہ سے دوستداری

غضب میں ماخوذ ہیں حالانکہ ان دونوں میں کوئی چیز بھی قدر مشترک نہیں۔ دوسری جگہ جماعتِ مومنین کو اس سے یہ کہہ کر روک دیا کہ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ (۶۰/۱۳) اے جماعت مومنین! تم ان لوگوں کو اپنا دوست مت بناؤ جو غضب خداوندی کے مورد ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جب ایک عبدِ مومن اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہے کہ میں کہیں ان لوگوں کے راستے پر گامزن نہ ہو جاؤں جو مغضوب علیہ ہیں تو اس سے اس کا مقصود کیا ہوتا ہے۔ اور قرآنِ کریم کا اس باب میں منشا کیا ہے اس کے بعد اس آیت کا اگلا ٹکڑا لیجئے۔ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔

(۱/۷) وَلَا الضَّآلِّیْنَ

قرآن کریم جس طرح منعم علیہ کے مقابلے میں مغضوب علیہ لایا ہے، اسی طرح اس نے ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بنیادی طور پر اس کے معنی حیران و پریشان ہونا، یا سرگرداں پھرنا ہیں۔ نیز کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہو جانا، مختلف چیزوں کا اس طرح مل جانا کہ پھر انہیں الگ الگ نہ کیا جا سکے، جس طرح دودھ میں پانی مل جاتا ہے۔ چونکہ صحرا میں راستہ کھو دینے والا اپنی تمام تگ و تاز کے باوجود منزل تک نہیں پہنچ سکتا، اس لئے محنت اور کوشش کے ناکام رہ جانے اور رائیگاں چلے جانے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسے سورۃ کہف میں ضَلَّ سَعْیُھُمْ (۱۸/۱۰۴) آیا ہے۔ یعنی ان کی تمام کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔ غلط راستے پر چلنے والا اس خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہا ہے، اس لئے سراب کو "اَلْمُضِلُّ" کہا جاتا ہے۔

ایک، ہونے والا نبی، نبوت سے پہلے، اپنی بصیرت کی بنا پر اسی نتیجہ پر تو پہنچ جاتا ہے کہ اس کا معاشرہ جس راستہ پر چل رہا ہے وہ صحیح نہیں، لیکن صحیح راستہ اس کے سامنے نہیں ہوتا۔ اس سے اس کے دل میں تلاشِ حقیقت کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ صحیح راستہ کی جستجو میں سرگرداں پھرتا ہے، تا آنکہ اُسے خدا کی طرف سے صحیح راہنمائی مل جاتی ہے۔ قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق جو آیا ہے کہ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی (۹۳/۷)۔ ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو تیری راہنمائی صحیح راستہ کی طرف کر دی[1]۔ یہ بات تو ایک نبی کے متعلق کہی گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر متلاشیِ حقیقت کو یہی طریق

[1] واضح رہے کہ نبوت، ہونے والے نبی کی ان فکری کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہوتی وہ تو خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی جس میں انسانی کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ جسے نبوت کے لئے منتخب کیا جاتا تھا وہ کس طرح از خود حاضر و موجود سے غیر مطمئن ہوتا تھا

تلاشِ حقیقت میں سرگردانی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے معاشرہ (یا دنیا) کے مروجہ نظریات و مسالک سے (بلا تحقیق و تفتیش) مطمئن ہو جاتا ہے تو نہ اس کے دل میں صحیح روشِ زندگی کی تلاش کے لئے تڑپ پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی وہ صحیح راستہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ ہر موجود کو غور و فکر سے پرکھنا نہایت ضروری ہے۔ عصرِ حاضر کے مشہور فلاسفر (WHITE-HEAD) نے کہا ہے کہ اپنے دور کے مروجہ معتقدات و نظریات کو علیٰ حالہٖ تسلیم کرکے ان پر جم کر بیٹھے رہنا بُت پرستی ہے۔[1] یہ عجیب بات ہے کہ خود عربوں کے ہاں بھی بت پرستی میں یہ مفہوم مضمر تھا۔ ان کی زبان میں بُت کے لئے "وثن" کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا اور "وثن" کے معنی ہیں غیر متحرک اور جامد۔ اسی کو تقلیدِ جامد کہا جاتا ہے۔ اس روش کا پیرو کبھی صحیح راستہ اختیار نہیں کرسکتا اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

چہ خوش بودے اگر مردِ نکو پے　　ز بندِ پاستاں آزاد رفتے

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب　　پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

تقلید کی تباہ کاریاں قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ کبھی صحیح راستہ پر نہیں چل سکتے ان کا مآل جہنم ہوتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۷:۱۷۹) دنیا میں تمہیں ایسے لوگ ملیں گے جن کی روش یہ بتا رہی ہو گی کہ وہ جہنمی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کونسے لوگ ہیں جن کی روشِ زندگی ان کے جہنمی ہونے کی غماز ہوتی ہے؟ فرمایا۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (ایضاً)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سینے میں دل (سمجھنے سوچنے کی صلاحیت) تو رکھتے ہیں لیکن اس سے غور و فکر کا کام نہیں لیتے۔ جن کی آنکھیں ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں جن کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (ایضاً) یہ لوگ انسانی نہیں، حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ حیوانوں سے بھی پست سطح پر، کیونکہ حیوان عقل و فکر سے کام نہیں لیتے (کہ انہیں اس کی صلاحیت ہی نہیں دی گئی) تو کم از کم اپنی جبلت کے مطابق تو زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے برعکس یہ لوگ اپنے مقام سے بھی بے خبر ہوتے ہیں اور منزلِ مقصود کی طرف سے بھی غافل۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے نبی اکرمؐ سے کہا کہ تم نہ مُردوں کو سُنا سکتے ہو اور نہ ایسے لوگوں کو، جن سے تم کچھ بات کرنا چاہو تو وہ منہ پھیر کر چل دیں اور بات سننا ہی نہ چاہیں۔ نہ ہی تم اندھوں کی صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کر سکتے ہو۔ فَاِنَّكَ

[1] ADVENTURES OF IDEAS

لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ. وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ (۳۰/۵۲-۵۳)

عقل و فکر سے کام لینے والوں کو قرآن کریم نے اصولی طور دو شقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ، جو زندگی کے دوراہے پر پہنچ کر نہ یہ دیکھنے کی ضرورت سمجھیں کہ انہیں کس راستہ کی طرف مڑنا چاہیئے، نہ کسی سے ایسا پوچھنے کی حاجت۔ جس راستہ پر ہجوم چلا جا رہا ہو، وہ بلا سوچے سمجھے، انہی کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ سند اس کی، ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ وہ راستہ ہے جسے ہمارے اسلاف نے اختیار کیا اور وہ ہم تک متواتر چلا آ رہا ہے۔ قرآن کریم ان کے متعلق کہتا ہے کہ جب وہ اس راستے پر چلتے چلتے جہنم میں جا پہنچیں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا تھا تو وہ کہیں گے۔ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (۳۳/۶۷) اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہمارے ان بڑے بڑے بزرگوں، مذہبی راہنماؤں اور لیڈروں نے گمراہ کیا اور ہمیں صحیح راستہ سے بھٹکا دیا۔

جذبات سے مغلوب

دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جو صحیح راستہ کو جانتے تو ہیں لیکن ان کی مفاد پرستیاں انہیں اس راستہ پر آنے نہیں دیتیں۔ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اندھے ہو جاتے ہیں اور ان کی عقل و فکر اور علم و بصیرت ان کے کسی کام نہیں آتے۔ سورۃ جاثیہ میں ہے:

"اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً. فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ. اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ" (۴۵/۲۳)

کیا تو نے ایسے شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات اور جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس کی سماعت اور بصیرت پر مہریں لگ گئیں۔ اس کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور یوں وہ علم و عقل رکھنے کے باوجود غلط راستہ پر چل نکلا۔ جو شخص اس طرح غلط راستہ پر گامزن ہو جائے اس کے صحیح راستہ کی طرف آ جانے کا طریق اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے جذبات سے الگ ہٹ کر خدا کی راہنمائی اختیار کرے۔

واضح رہے کہ [جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے دیکھئے آیت (۴)] انسانی خواہشات اور جذبات، قابلِ نفرت نہیں ان کا غلط استعمال انسان کو تباہ کر دیتا ہے، اگر انہیں خدا کی راہنمائی کے تابع رکھا جائے تو ان سے عظیم تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ

سورۃ قصص میں کہا گیا ہے کہ۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰)۔ جو شخص خدا کی راہنمائی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اس سے زیادہ راہ گم کردہ اور کون ہو سکتا ہے۔

ہمارے زمانے میں گمرہی کی ایک اور شکل بھی ہے، جو اس وقت ساری دنیا میں عام ہو رہی ہے اور اسے عصرِ حاضر کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ روش ہے جسے ڈیماکریسی یا جمہوریت کہکر پکارا جاتا ہے اور جس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے، اسی کا اتباع کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم،

نظامِ جمہوریت کی ضلالت

اس کے برعکس کہتا ہے کہ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ٥ (۶/۱۱۶) اگر تو انسانوں کی اکثریت کا اتباع کرے گا تو وہ تجھے خدا کی طرف لے جانے والے راستے سے گمراہ کردے گی۔ یہ لوگ ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور قیاسات پر چلتے رہتے ہیں۔ ان کے برعکس۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۶/۱۱۸) غلط اور صحیح، حق اور باطل کا معیار صرف خدا کی راہنمائی ہے۔ یہی وہ راہنمائی ہے جس کے متعلق نوعِ انسان سے کہا گیا تھا کہ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۲۰/۱۲۳) جو میری راہنمائی کا اتباع کرے گا تو نہ وہ صحیح راستہ سے بھٹکے گا اور نہ ہی جگر پاش مشقتوں میں مبتلا ہو کر سعادتوں سے محروم رہ جائے گا۔

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ جب دو چیزیں اس طرح آپس میں مل جائیں کہ انہیں الگ الگ کرنا ممکن نہ رہے تو اُسے بھی ضلالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ [جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ دیکھئے آیت (۱)] جب حضرات انبیائے کرامؑ کا پہنچایا ہوا دینِ خداوندی، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں تلبیسِ حق و باطل کی یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ ان کا الگ الگ کرنا تو ایک طرف، ان کی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر، جس طرح ایک فریب کار گوالا پانی ملے ہوئے دودھ کو خالص دودھ کہکر بیچتا ہے، مذہبی کاروبار کرنے والے مذہب کی

مذہب کو دین بتا کر بیچنے والے

خود ساختہ متاعِ کاسد کو دین کا زرِ خالص بتا کر بیچتے اور اس کی بڑی بڑی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۳۱/۶) یہ لوگ اپنے وضع کردہ افسانوں اور خواب آور داستانوں سے لوگوں کو مبتلائے فریب رکھتے ہیں تاکہ انہیں خدا کے راستے سے گمراہ کئے رکھیں۔ یہ ہوتے تو ہیں جاہل لیکن اپنے آپ کو بہت بڑے عالم کہکر لوگوں کے مقتدا بن جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ روٹی کی خاطر کرتے ہیں۔ جس خود ساختہ مذہب کو وہ دین کا نقاب اوڑھا کر پیش کرتے ہیں وہ بڑا مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔ نتیجہ

یہ کہ دنیا اس حقیقی دین ہی کو، جس کی طرف یہ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں، مذاق سمجھنے لگ جاتی ہے۔ جو قوم دین کے ساتھ اس قسم کا کھیل کھیلے وہ بڑے ہی ذلّت آمیز عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

آپ اقوامِ عالم پر پھیلتی ہوئی نگاہ ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ جس قدر کوئی قوم "مذہب" میں ڈوبی ہوئی ہوگی وہ اسی قدر جاہل اور پسماندہ ہوگی۔ یہی خدا کا عذاب ہے۔ "مذہب" توہّم پرستیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور توہّم پرستی کا لازمی نتیجہ نکبت اور زبوں حالی۔

ہم نے سابقہ صفحات میں "مغضوب علیہ" کی تشریح کو قرآنِ مجید کی اس آیت پر ختم کیا تھا جس میں غیر متوازن معاشی نظام کا نتیجہ جہنم بتایا گیا تھا۔ ضلالت کے سلسلہ میں بھی ہمارے سامنے ایک ایسی ہی آیت آتی ہے، سورۃ یٰسین میں ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ (۳۶/۴۷) جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ رزق ہوتا ہے، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس فاضلہ رزق کو ان لوگوں کے لئے کھلا رکھو

رزق خدا کے ہاتھ میں ہے؟

جنہیں اس کی احتیاج ہے، تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تم ہمیں کس قدر غلط راستہ اختیار کرنے کی تلقین کر رہے ہو۔ خدا نے رزق کی تقسیم اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ جو لوگ مفلس اور نادار ہیں وہ مشیّتِ خداوندی کی رو سے ایسے ہیں۔ خدا چاہتا ہی یہ ہے کہ وہ ایسے رہیں۔ اب یہ کہنا کہ ان کے افلاس اور ناداری کو ختم کرنے کے لئے ہم انہیں فاضلہ رزق دیدیں، خدا کے خلاف جنگ کرنے کے مرادف ہے۔ اگر خدا چاہتا تو انہیں خود ہی رزق دیدیتا۔ قرآن کے الفاظ میں۔ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ (۳۶/۴۷) خدا کی طرف سے ان کے اس اعتراض کا جواب یہ ملتا ہے۔ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (ایضاً) ان سے کہو کہ تم کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔ خدا کسی کو براہِ راست رزق نہیں دیا کرتا۔ رزق کی تقسیم اسلامی نظام کے ہاتھوں سے ہوتی ہے، اور وہ نظام جس میں اس قسم کی طبقاتی تفریق نہیں رہتی، خدا کی راہنمائی کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ یہ منعم علیہ لوگوں کی راہ ہے۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں قرآن کے معاشی نظام کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔)

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے جب جماعتِ مومنین کو یہ دعا سکھائی تھی کہ ہم ان لوگوں کے راستے پر نہ چلیں جو ضآلین ہیں تو اس سے کیا مقصود تھا۔ اسی بنا پر اس نے تاکید کی۔ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ (۵/۷۷)۔ تم ان لوگوں کے جذبات کا اتباع مت کرنا جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہو گئے اور انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور اس طرح یہ تابع اور متبوع، دونوں، خدا کی طرف لے جانے والے سیدھے اور متوازن راستہ سے بھٹک گئے۔

یہ کوئی خاص قومیں نہیں تصریحاتِ بالا سے یہ بھی واضح ہے کہ مغضوب علیہ اور ضالین سے مراد کوئی خاص قومیں نہیں۔ اس کا اطلاق ان تمام قوموں پر ہوگا جو غلط راستوں پر چلنے کی وجہ سے نعمائے خداوندی سے محروم ہوگئیں اور اسطرح تباہی اور بربادی کے جہنم میں جاگریں، خواہ وہ زمانہ نزولِ قرآن سے پہلے کی قومیں تھیں، خواہ خود اُس زمانہ کی قومیں، اور خواہ قیامت تک آنے والی قومیں۔ لیکن ہمارے ہاں عام طور پر سمجھا اور سمجھایا یہ گیا ہے کہ مغضوب علیہ یہودیوں کی قوم ہے اور ضالین سے مراد عیسائی ہیں۔ ہم نے اس طرح اپنے آپ کو فریب دے دیا کہ مغضوب علیہم اور ضالین اور قومیں ہیں۔ ہمارا شماران میں نہیں ہوتا۔ اتنا ہی نہیں ہم نے تو پورے کے پورے قرآن کو اسیطرح مختلف شقوں میں بانٹ رکھا ہے۔ جہاں جہاں تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر آتا ہے ہم یہ کہکر خود فریبی میں بتلا ہو جاتے، اور مبتلا رہتے ہیں کہ یہ یہود کے متعلق ہے، یہ نصاریٰ کے۔ یہ مشرکینِ مکہ کے متعلق ہے، یہ کفارِ عرب کے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب جہنمی ہیں اور جنت صرف ہمارے لئے تیار کی گئی ہے۔ لیکن خود فریبی سے حقیقتیں تو بدل نہیں جایا کرتیں۔ ہم اس خود فریبی سے اسی صورت میں نکل سکتے کہ ہم خدا کی کتاب کو معیار قرار دے کر یہ دیکھیں، سمجھیں اور پرکھیں کہ ہمارا شمار منعم علیہ کے زمرہ میں ہوتا ہے یا مغضوب علیہ اور ضالین کے گروہ میں۔

زقرآں پیشِ خود آئینہ آویز دگرگوں گشتۂ۔ از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

خلاصہ

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر کتاب کے شروع میں مقدمہ یا پیش لفظ لکھا جاتا ہے۔ اس سے اس کتاب کے موضوع یا مندرجات کا تعارف کرانا مقصود ہوتا ہے۔ موزوں ترین مقدمہ یا پیش لفظ اسے سمجھا جاتا ہے جو نہایت مختصر لیکن جامع الفاظ میں اس حقیقت کو سامنے لے آئے کہ کتاب کا مقصود و مطلوب کیا ہے۔

سورۃ فاتحہ کو "فاتحۃ الکتاب" کہا جاتا ہے، جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ سورۃ، الکتاب، یعنی قرآنِ کریم کا (یوں سمجھئے کہ) پیش لفظ یا تعارف ہے۔ اختصار کو دیکھئے تو یہ سات آیات پر مشتمل سورۃ ہے اور آیات بھی ایسی مختصر کہ دو دو چار چار الفاظ پر مشتمل۔ لیکن اس کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم اور دین کے نظام کا ملخص اس کے اندر یوں سمٹ کر آگیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ یہ قرآنِ کریم کے ایجاز اور اعجاز کی نمایاں شہادت ہے۔

سورۃ فاتحہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ سامنے آتے ہیں۔ اگر انہیں خدا کی طرف منسوب کیا جائے (یعنی

اس میں متکلم خود خدا تعالیٰ سمجھا جائے) تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ اس کتاب کو اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ نوعِ انسان کی نشوونما کی جو ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی تھی وہ پوری ہو جائے یہ نشوونما وحی کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہ تھی۔

اور اگر اسے انسانوں کی طرف منسوب کیا جائے (یعنی یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو یہ تعلیم دی ہے) تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہر عبدِ مومن اس کا اعتراف و اعلان کرتا ہے کہ میں جس پروگرام کو ہاتھ میں لے رہا ہوں اس سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کی نمود عام ہو جائے۔

اس کے بعد سورۃ فاتحہ ہمارے سامنے آتی ہے۔ میں اس کے ملخص کے لئے مناسب الفاظ و بیان کی فکر میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ اس کا جو مطلب میں نے "مفہوم القرآن" میں بیان کر دیا ہے وہ اس کا موزوں ترین خلاصہ ہے۔ اس لئے میں اسی کو یہاں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے:

جب انسان اس کارگہِ کائنات کے نظم و نسق پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر آجاتی ہے کہ اس میں ہر شے کو وہ سامانِ نشوونما کس طرح بلا مزد و معاوضہ ملتا چلا جاتا ہے جس سے وہ، اپنے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ عام حالات میں تدریجاً اور عندالضرورت فجائی عملِ ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کی رُو سے۔ اس حیرت انگیز نظامِ ربوبیت کو دیکھ کر، ہر صاحبِ بصیرت کی زبان پر بے اختیار کلماتِ تحسین و آفرین آ جاتے ہیں اور وہ بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کائنات کی کسی شے کو نہ بیکار پیدا کیا اور نہ ہی تخریبی نتائج کے لئے" ($\frac{3}{190-189}$)۔ یہی وہ اربابِ علم و ایقان ہیں جو صحیح معنوں میں خدا کی حمد کرنے والے ہیں۔ ($\frac{9}{112}$) انہی کو علماء کہا جاتا ہے ($\frac{35}{28-27}$)۔

خدا کے اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ جو مستبد قوتیں دوسروں کی نشوونما کی راہ میں حائل ہوں، انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ حمدیت کا قدمِ اول ہے ($\frac{6}{45}$)۔

ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹانے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک ایسا نظام قائم ہو جائیگا جس میں نہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج ہو گا نہ محکوم۔ اس میں تمام امور کے فیصلے خدا کے قوانین کے مطابق ہوں گے۔ ($\frac{82}{18-19}$ ؛ $\frac{17}{111}$ ؛ $\frac{43}{84}$)

یہی وہ نظام ہے، جسے آخر الامر انسانوں کے تمام خود ساختہ نظامہائے حیات پر غالب آ کر رہنا ہے ($\frac{9}{33}$)۔

یہ نظام ان افراد کے ہاتھوں متشکل ہو گا جو اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان، اور عملاً اس اعلان کی تصدیق کریں گے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی کسی غیر خدائی نظام سے خواستگارِ معاونت ہوتے ہیں ($\frac{12}{40}$ ؛ $\frac{3}{78}$) اس کا عملی طریق اس کی کتابِ عظیم (قرآنِ مجید) کے احکام و اصول کی اطاعت ہے ($\frac{5}{48-44}$)۔

یہ افراد (جماعتِ مومنین) جب سفرِ حیات کے لئے قدم اُٹھاتے ہیں تو یہ حسین تمنائیں اور مقدس آرزوئیں دُعا بن کر ان کے لبوں تک آجاتی ہیں کہ بارِالٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ اُبھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آجائے جو ہمیں بلا خوف و خطر، ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے۔

یعنی وہ راستہ جس پر چل کر، سعادتمند اُممِ سابقہ، زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوئیں۔ اس لئے انہوں نے، کائنات کی قوتوں کو مسخر کرکے، اپنی ہم عصر اقوام میں امتیازی حیثیت حاصل کرلی (۳۱/۲۰ ز ۲/۱۴)۔

جب تک یہ قومیں، تیرے متعین کردہ راستے پر چلتی رہیں، زندگی کی شادابیوں سے بہرہ یاب رہیں۔ جب اُن کے نظریۂ حیات میں تبدیلی آگئی تو یہ نعمتیں ان سے چھن گئیں (۸/۵۳) اور وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوگئیں (۲/۶۱ ز ۷/۱۵۲) ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھُلس کر راکھ کا ڈھیر بن گئیں، اور چونکہ صحیح راستہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوچکا تھا اس لئے ان کا کاروانِ حیات اپنی قیاس آرائیوں کے پیچ و خم میں کھو کر رہ گیا۔ وہ کبھی آنکھیں بند کرکے، اپنے آباؤ اجداد کی فرسودہ راہوں پر چلتے رہے (۳۷/۶۹-۷۱) اور کبھی انہوں نے خود اپنے جذبات ہی کو اپنا راہ نما بنا لیا (۴۵/۲۳) جب اس سفرِ بے منزل کی بھول بھلیوں میں کھو کر مایوس ہوگئے تو یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ خدا کو منظور ہی نہ تھا کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھاتا (۶/۱۴۹)

بارِالٰہا! ہم تجھ سے، تیرے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی توفیق طلب کرتے ہیں تاکہ ہمارا حشر بھی اُن سوختہ سامانوں کا سا نہ ہو جائے، کہ ہم جانتے ہیں کہ جو قوم تیری راہنمائی سے منہ موڑ لے، اُسے کوئی صحیح راستہ نہیں دِکھا سکتا (۶۱/۵)۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ راستہ انہی کے سامنے آسکتا ہے جو اس کی تلاش کے لئے جد و جہد کریں (۲۹/۶۹) — ہم تجھ سے اس جد و جہد کی بھی توفیق طلب کرتے ہیں۔

بِاسْمِہٖ تَعَالٰے

پہلا پارہ　　　دُوسری سورۃ

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ (۲)

پہلا باب

آیات ــــ ۱ تا ۵

متّقین

۱ ــــ حروفِ مقطعات۔

۲ ــــ قرآن کریم رسول اللہ کے زمانہ ہی میں مرتب کتاب کی شکل میں تھا۔

۳ ــــ متقین کی خصوصیات۔

۴ ــــ ایمان اور (FAITH)

۵ ــــ مؤمن اور مسلم　پیدائشی مسلمان۔ برہمو سماجی اسلام۔ مولانا آزاد (مرحوم) کی غلط نگہی۔

۶ ــــ غیب کا علم ــــ پیش گوئیاں۔

۷ ــــ صلوٰۃ　اور　الصلوٰۃ۔

۸ ــــ نماز　اور　الصلوٰۃ۔

۹ ــــ قرآن کا معاشی نظام۔

۱۰ ــــ نظام سرمایہ داری ــــ قارونی ذہنیت۔

۱۱ ــــ کارل مارکس کا اعترافِ عجز ــــ کمیونزم اور سوشلزم۔

۱۲ ــــ الصلوٰۃ اور معاش کا باہمی تعلق۔

۱۳ ــــ نماز کی جزئیات ــــ اجتماعاتِ صلوٰۃ کی اہمیت۔

۱۴ ــــ مَآ اُنۡزِلَ پر ایمان۔

۱۵ ــــ آخرت کا مفہوم ــــ قانونِ مکافاتِ عمل

۱۶ ــــ اس ایمان و عمل کا نتیجہ ــــ اِستخلاف فی الارض۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البقرۃ (۲)

پس منظر اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر، نبی اکرم (صلعم) کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے: وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّہُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ (۲/۱۸۶)۔ اے رسول! جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہدو کہ میں ان کے بالکل قریب ہوں۔ جب بھی کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے۔ میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ سو انہیں بھی چاہیئے کہ، ان کی پکار کے جواب میں، میں انہیں جو کچھ کہوں، اسے دل کے کانوں سے سنیں، اور اس کی صداقت پر یقین رکھیں تاکہ اُنہیں سفرِ حیات میں صحیح راہنمائی مل جائے۔

خدا سے "دُعا مانگنے" کے متعلق مختصراً سورۃ فاتحہ، آیت نمبر ۴ (۱/۴) میں لکھا جا چکا ہے۔ تفصیل متعلقہ مقامات پر بعد میں سامنے آ جائے گی۔ لیکن اتنی بات تو بالکل واضح ہے (اور یہ ہمارا ذاتی تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی) کہ جب ہم اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے خدا سے دُعا مانگتے ہیں تو اس کی طرف سے ہمیں براہ راست جواب نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ جو اس نے کہا ہے کہ، "میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں" تو اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اُسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص کسی خاص مقام تک پہنچنے کے لئے مصروفِ سفر ہے۔ راستہ میں ایک دوراہا آ جاتا ہے جہاں اسے پتہ نہیں چلتا کہ ان دو راستوں میں سے کونسا راستہ اس کی منزلِ مقصود کی طرف جاتا ہے۔ وہاں اُسے ضرورت پڑتی ہے کہ کسی جاننے والے سے صحیح راستے کے متعلق دریافت کرلے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور اس کا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا بلکہ اس کا وقت اور توانائی سب ضائع ہو جائیں گی۔

زندگی کے راستے ہیں، انسان کے سامنے (انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں) قدم قدم پر دوراہے آتے ہیں۔ "دوراہے" سے مفہوم یہ ہے کہ ہر معاملہ کے متعلق اس کے سامنے ایک سے زیادہ ممکنات (POSSIBILITIES) ہوتی ہیں جن میں سے وہ، بیک وقت، صرف ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔ ایک سے زیادہ ممکنات صرف انسان کے سامنے ہوتی ہیں کیونکہ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ حیوانات کے سامنے ایک سے زیادہ ممکنات ہوتی ہی نہیں کیونکہ انہیں اختیار و ارادہ کی صلاحیت نہیں دی گئی۔ بکری کے سامنے کبھی یہ سوال نہیں آتا کہ وہ گھاس کھائے یا گوشت۔ اس کے لئے ایک ہی راہِ عمل یا فیصلہ ہوتا ہے اور وہ اس کی فطرت کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اس لئے اسے کسی خارجی راہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ضرورت انسان ہی کو ہوتی ہے۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے لئے سابقہ سورۃ (الفاتحہ) میں اس نے خدا کو پکارا اور کہا تھا کہ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵)۔ "ہمیں سیدھا اور ہموار راستہ بتا دے، دکھا دے"۔ خدا نے کہا کہ ہم نے تمہاری پکار کو سن لیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲/۲)۔ یہ رہنمائی تمہیں ہماری اس کتاب (GUIDE BOOK) میں ملے گی۔ ہم نے اس میں صحیح اور غلط راستوں کی نشاندہی واضح اور بیّن انداز میں کر دی ہے (۲/۲۵۶)۔ یہ ہے تمہاری پکار کا جواب۔ یوں تمہاری دعا مستجاب ہو گی۔

یہ ہے ربط اِس سورۃ کا، سابقہ سورۃ کے ساتھ۔

۲/۱ (۲/۱) الٓمّٓ

اس سورۃ (اور بعض دیگر سورتوں) کے آغاز میں اس قسم کے حروف آتے ہیں، جنہیں الفاظ نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے تو ہر لفظ حروف ہی کا مرکب ہوتا ہے، اور عربی زبان میں تو ہر لفظ کا مادہ، حروف ہی ہوتا ہے، لیکن حروف مل کر لفظ بنتے ہیں اور لفظ اپنے متعین معانی دیتا ہے۔ لیکن یہ حروف (جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے) الفاظ نہیں بنتے، حروف ہی رہتے ہیں، اور انہیں پڑھا بھی الگ الگ حروف ہی کی طرح جاتا ہے۔ مثلاً الٓمّٓ کو اَلَمْ نہیں پڑھا جائیگا۔ اسے الف۔ لام۔ میم الگ الگ پڑھا جائیگا۔ الگ الگ حروف ہونے کی جہت سے انہیں مقطّعات کہتے ہیں۔ یعنی قطع کئے ہوئے حروف۔ ان حروف کے مفہوم کے سلسلہ میں (متقدّمین سے لیکر متاخرین تک.....) اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ کثرتِ تعبیر سے یہ خواب ہی پریشاں ہو گیا ہے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ ہم نے اپنی بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھا ہے اسے مختصر الفاظ میں بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

مُقطّعات | انگریزی زبان میں جنہیں مخففات (ABBREVIATIONS) کہا جاتا ہے وہ مختلف الفاظ سے لئے گئے حروف ہوتے ہیں جنہیں الگ الگ لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ جیسے (R.S.V.P)؛ (P.S.)؛ (e.g)

وغیرہ۔ یہ عربوں کے ہاں بھی اس کا رواج تھا۔ عربوں کے ہاں ہی نہیں، بلکہ عبرانی زبان میں بھی یہ چیز ملتی ہے۔ قرآن کریم چونکہ عربوں کی زبان میں نازل ہوا، لہٰذا اس میں اسلوبِ بیان بھی وہی اختیار کیا گیا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ قرآن کا اسلوب بجائے خویش ایک معجزانہ حیثیت رکھتا ہے)۔ ان کے اسلوبِ بیان کے تتبع میں قرآنِ کریم میں بعض حروفِ مقطعات آئے ہیں۔ چونکہ ان کے ہاں یہ اسلوب عام طور پر رائج تھا اس لئے (قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا کہ) انہوں نے پوچھا ہو کہ ان حروف سے مقصود کیا ہے (اگرچہ ان کی طرف سے پوچھے گئے کئی ایک سوالات کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے)۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کیا چیز ہے۔

جہاں تک میری بصیرت، میری راہنمائی کرتی ہے، یہ (باستثنائے چند) خدا کے اسم ذات (اللہ) یا اس کی صفات (الاسماء الحسنیٰ) کے الفاظ سے تراشیدہ حروف ہیں۔ مثلاً الٓمٓ میں الف، اللہ کے لئے ہے۔ لام، علیم کے لئے اور میم، حکیم کے لئے۔ ان میں یہ ضروری نہیں کہ یہ ان الفاظ کے پہلے حروف ہی ہوں۔ تعینِ مفہوم کے لئے ان الفاظ میں سے کوئی سا حرف بھی لیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے صوتی اعتبار سے بھی انسان کے ذوقِ لطیف کی رعایت رکھی ہے، اور (میرے احساسِ لطیف کا اشارہ ہے کہ) ان حروف کے انتخاب میں یہ امر بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بہرحال یہ ہے وہ انداز، جس کی رُو سے میں نے (مفہوم القرآن میں) حروفِ مقطعات کا مفہوم متعین کیا ہے۔ اس اعتبار سے الٓمّٓ کا مفہوم ہوگا:

اللہ علیم و حکیم کا ارشاد ہے کہ ....

(۲/۲)

(۲) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

قرآن کریم نے اپنے آپ کو "الکتاب" کہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ک۔ ت۔ ب) ہے، جس کے بنیادی معنے حکم دینے، یا کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳)۔ تم پر روزے فرض قرار دیتے گئے ہیں۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (۲/۲۱۶)۔ تم پر (عند الضرورت) جنگ کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ جب کوئی فیصلہ یا حکم ابدی اور غیر متبدل ہو تو اُسے قانون کہہ کر پکارا جاتا ہے[1]۔ قرآنِ مجید میں جو احکام آتے ہیں وہ ابدی بھی ہیں اور غیر متبدل بھی۔ اس لئے انہیں، عام اصطلاح کے اعتبار سے، قانون کہا جائے گا۔

---

[1] ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ جب قانون کا لفظ کسی خاص اصول کے لئے آئے تو جہاں اس اصول کی یہ خصوصیت ہوگی کہ وہ ابدی اور غیر متبدل ہے وہاں اس سے یہ مراد بھی ہوگی کہ اس کے مطابق عمل کرنے سے ایک خاص نتیجہ مرتب ہوگا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ جیسے قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کی صورت میں ظاہر ہے۔ اس اعتبار سے قانون (LAW) کی تعریف یہ بتائی گئی ہے (IF—THEN—ALWAYS) یعنی اگر ایسا کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ قرآنی قوانین کا بھی یہی خاصہ ہے۔

(اگرچہ خود یہ لفظ قرآن میں نہیں آیا)۔ قرآنِ کریم نے لفظِ "کتاب" کو انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النسآء میں پہلے تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے کون کون سے رشتے تم پر حرام ہیں، اور اس کے بعد کہا گیا ہے۔ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (۴/۲۴) یہ تمہارے لئے خدا کا قانون ہے۔ اسی جہت سے خود، قرآن کے متعلق کہا گیا ہے کہ۔ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸/۳)۔ اس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔

عربوں کے ہاں جب منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کر لی جاتی تھی تو اس وقت اُسے کتاب کہکر پکارا جاتا تھا۔ اور چونکہ منتشر خیالات کو لکھ کر ایک جگہ محفوظ کیا جاتا ہے اس لئے کَتَبَ کے معنے ہیں "اس نے لکھا" لہٰذا "کتاب" ان لکھے ہوئے اوراق کو کہتے تھے جن کی شیرازہ بندی کر لی جاتے۔ قرآن کریم کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے:

وَالطُّوْرِ۔ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ۔ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲/۱-۳)

عربوں کے ہاں، ہرن کی کھال کو چھیل کر اُسے (PARCHMENT) کی شکل میں قرطاس بنا لیتے۔ اُسے رقّہ کہا جاتا تھا۔ جن تحریروں کو محفوظ رکھنا مقصود ہوتا انہیں ان پر قلمبند کر لیتے اور ان، رقّ منشور، کی جب شیرازہ بندی ہو جاتی تو اسے کتاب کہہ کر پکارا جاتا۔ جہاں تک کاتبینِ وحی کا تعلق ہے، خود قرآنِ کریم کی شہادت موجود ہے کہ وہ بڑے باعزت اور قابلِ اعتماد تھے (۸۰/۱۵-۱۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم خود رسول اللہ کے زمانے میں، رقّ کے اوراق پر لکھی ہوئی مرتب اور مدوّن کتاب تھی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں، قرآنِ مجید جمع اور مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تدوین بعد میں، منتشر ٹھیکریوں، ہڈیوں اور پتوں کی مدد سے حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی تھی، صحیح نہیں۔ اس کے مرتب کتاب ہونے کی شہادت خود قرآن کریم میں موجود ہے (اسے، الفاتحہ کے بعد، شروع ہی میں کتاب کہہ کر پکارا گیا ہے۔ بلکہ (مفتی محمد عبدہٗ کے قول کے مطابق) کتاب بمعنی مکتوب ہے۔ یہ اسم جنس ہے ان چیزوں کے لئے جو لکھی جائیں۔ اور ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے اشارہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ رسول اللہ نے صرف قرآن حکیم کے لکھنے کا حکم فرمایا تھا، قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ لکھنے کا حکم نہیں تھا۔[1] بنا بریں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا مفہوم یہ ہوا کہ:

> تم نے ہمیں پکارا تھا اور کہا تھا کہ تمہاری راہنمائی اُس سیدھے اور
> ہموار راستے کی طرف کر دی جائے جو تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔
> یہ راہنمائی تمہیں اس کتاب میں ملے گی۔

---

[1] تفسیر المنار۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۲۳۔

الکتاب کہکر اِسے دنیا کی باقی تمام کتابوں سے مختص اور متمیز کر دیا۔ اس سے مراد القرآن ہے۔

(۲/۲) لَا رَیْبَ فِیْہِ

اِس کتاب کی پہلی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں کسی قسم کا رَیب نہیں۔ عام طور پر ریب کے معنے "شک" کئے جاتے ہیں، لیکن، شک خود عربی زبان کا لفظ ہے اور اِسے قرآن کریم نے بھی استعمال کیا ہے۔ بلکہ ایک جگہ تو اس نے : شَکٍّ مُّرِیْبٍ (۵۴/۳۴) بھی کہا ہے۔ لہٰذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شک اور ریب میں کیا فرق ہے، اور قرآن کریم نے اس آیت میں ریب کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے ؟

دنیا کی ہر زبان میں مرادفات ہوتے ہیں۔ یعنی ایسے الفاظ جو ہم معنی ہوں۔ جہاں تک مرادفات کی تعداد کا تعلق ہے دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر (BUCKE) نے مختلف زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے، مشہور

مُرادِفات مستشرق (MAX MULLER) کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس زمانے میں سنسکرت زندہ زبان تھی اس میں، اگنی دیوی (آگ) کے لئے پینتیس[۲۵] الفاظ تھے، اور سوریہ دیوتا (سورج) کے لئے سینتیس[۳۷]۔ لیکن عربی زبان میں، مثلاً سانپ کیلئے دو سو، شیر کے لیے پانچ سو، تلوار کے لیے ایک ہزار اور اونٹ سے متعلق ۵۷۴۴ الفاظ ہیں[۱]۔ اس سے آپ، عربی زبان میں مرادفات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن مرادفات کی اس کثرت کے باوجود اس زبان میں کوئی دو لفظ بھی ایسے نہیں جنکے معانی یکسر ایک جیسے ہوں۔ ان مرادفات کے معانی میں لطیف سا فرق ضرور ہوتا ہے، اور یہ لطیف سا فرق، آگے چلکر بعض اوقات بڑی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔

ریب اور شک قرآن کریم نے جو مرادفات استعمال کئے ہیں، ان کا صحیح مفہوم اسی صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ہم اُن کے معانی کے اس لطیف سے فرق کو پیشِ نظر رکھیں۔ ریب اور شک کے اس فرق کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ میں نے فلاں جگہ ۔۔۔ زمین پر ایک لکیر سی دیکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سانپ کی لکیر ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے اس میں شک ہے، وہاں سانپ ہو نہیں سکتا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس شک کا تعلق آپ کے ذہن سے ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ دوسری طرف، آپ رات کو اندھیرے میں اپنے کمرے میں سرسراہٹ سی محسوس کرتے ہیں جس سے آپ کو شک گزرتا ہے کہ کہیں یہ سانپ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے آپ کو ایک پریشانی سی لاحق ہو جائے گی۔ اور جب تک آپ اپنے شک کو رفع نہ کر لیں گے، اطمینان سے سو نہیں سکیں گے۔ اس قسم کے شک کے لئے ریب کا

---

[۱] COSMIC CONSCIOUSNESS, BY- RICHARD MAURICE BUCKE (P.P. 310-31)

لفظ آتا ہے یعنی ایسا شک، جس سے نفسیاتی الجھن اور اضطرابِ نفس لاحق ہو، جس سے آپ کے دل میں بے چینی پیدا ہو۔ بالفاظِ دیگر، لفظ شک کا اثر آپ کے ذہن اور ادراک تک محدود رہتا ہے اور ریب کا نتیجہ، ذہنی شک کے علاوہ قلبی اضطراب بھی ہوتا ہے۔ (اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات مرادفات ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہو جاتے ہیں لیکن عام طور پر ان کے بنیادی معنوں میں اس قسم کے فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے)۔

ریب کا لفظ سورۃ التوبہ میں ایسے انداز میں آیا ہے جس سے اس کا یہ مفہوم واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ منافقین نے مدینہ میں ایک مسجد تعمیر کی۔ اس سے ان کا دلی مقصود تو مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا تھا۔ لیکن ظاہر انہوں نے یہی کیا کہ انہوں نے اُسے لِوَجْهِ اللهِ تعمیر کیا ہے۔ وحیٔ خداوندی نے ان کی اس منافقت کا پردہ چاک کر دیا اور رسول اللہؐ سے فرمایا کہ تم اِس مسجد میں قدم تک نہ رکھنا۔ اس سے ان منافقین کی قلبی کیفیت کیا ہوئی ہوگی، وہ ظاہر ہے۔ اسے بیان کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے کہا ہے لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ (۹/۱۱۰)۔ یعنی یہ عمارت جو انہوں نے تعمیر کی ہے ان کے لئے (ریب) قلبی اضطراب کا موجب بنی رہے گی تا آنکہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس سے ریب کے معنے واضح ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا کتاب اللہ کے متعلق جب کہا گیا کہ لَا رَيْبَ فِيهِ، تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ اس میں کوئی بات مشکوک اور غیر یقینی نہیں۔ اس سے وہ تمام شکوک و شبہات دور ہو جائیں گے جو حقائق کا صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے ذہنِ انسانی میں اُبھرتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی اُن نفسیاتی الجھنوں اور قلبی اضطرابات کا بھی ازالہ ہو جائے گا جو ان شکوک سے پیدا ہوتے ہیں جن سے انسانی قلب متاثر ہوتا ہے۔ اس (کتاب) سے فکری سکون اور قلبی اطمینان دونوں حاصل ہو جائیں گے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ایک لفظ (ریب) کے استعمال سے قرآنِ کریم نے ادراک و جذبات دونوں کو کس طرح اپنے دامن میں سمیٹ لیا!

(۲/۲) هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

اس کتابِ عظیم کی بنیادی خصوصیت (لا ریب فیہ) بتانے کے بعد، اس کا اساسی مقصد هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ بتایا گیا ہے۔ ہدایت کے معنے سورہ فاتحہ (۱/۵) میں واضح کئے جا چکے ہیں۔ جیسا کہ وہاں بتایا گیا ہے، اس کے معنے ایسی راہنمائی کے ہیں جو ابھر اور نکھر کر سامنے آجائے۔ وہاں یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ راہنمائی کی ضرورت اسے ہی لاحق ہوتی ہے، یا اس سے وہی مستفید ہو سکتا ہے جو کہیں جانے کا عزم کرے اور پھر اس کے لئے آمادہ بہ سفر ہو۔ جو شخص کہیں جانا ہی نہیں چاہتا اُسے راہنمائی کیا فائدہ دے سکتی ہے؟ جیسا کہ وہاں تمثیلاً بتایا گیا ہے، آپ گھر میں بیٹھے ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ کرتے رہیں ——— صرف مطالعہ ہی نہیں، اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح بھی کرتے رہیں۔ اس سے آپ کو کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ اِس کا

فائدہ اسی کو ہوگا جو عزم سفر رکھتا ہو۔ لیکن سفر کے لئے ایک اور احتیاط کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اور اس کی وضاحت متقین کہکر کر دی گئی ہے۔

ہمارے ہاں "متقی پرہیزگار" اسے کہتے ہیں جو نہ صرف عام معیار کا مسلمان ہو بلکہ دینداری میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہو۔۔۔ ایسا مقام کہ جسے، یوں کہیئے کہ خدا پرست ہونے کی آخری منزل سمجھا جائے۔ اگر کسی شخص کے متعلق یہ کہدیا جائے کہ وہ بڑا متقی پرہیزگار ہے، تو اس کی بابت کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اس مفہوم کے اعتبار سے، عام طور پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ ہدایت (راہنمائی) کی ضرورت تو اس کے لئے ہوگی جو آغازِ سفر کر رہا ہو یا راستہ بھول جائے۔ جو شخص پہلے ہی صحیح راستہ پر چل رہا ہے۔۔۔ بلکہ یوں کہیئے کہ منزلِ مقصود پر بھی پہنچ چکا ہے۔۔۔ اُسے ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ (بالفاظِ دیگر ہدایت کی ضرورت گمراہوں کو ہوگی۔ متقین کو اس کی کیا ضرورت ہے) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ اعتراض اس لفظ کا صحیح قرآنی مفہوم سامنے نہ ہونے سے اُبھرتا ہے۔

تقویٰ اور متقین قرآنِ کریم کی جامع اصطلاحات ہیں۔ ان الفاظ کا مادہ (و۔ق۔ی) ہے جس کا بنیادی مفہوم ایک مثال سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ عربوں کا لباس بڑا ڈھیلا ڈھالا اور لمبا چوڑا ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی نے پوچھا کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں تو جواب میں کہا گیا کہ جب تمہیں کسی ایسے راستہ سے گزرنا پڑے جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں تو تم اس میں سے کس طرح گزروگے؟ اس نے کہا کہ میں کبھی ایک طرف سے اپنا دامن سمیٹوں گا کہ وہ کسی جھاڑی میں نہ الجھ جائے، کبھی دوسری طرف سے۔ اور اسطرح ان جھاڑیوں سے بچتا بچاتا، اس راہ گزر سے محفوظ آگے بڑھ جاؤں گا۔ کہا گیا کہ اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

تقویٰ کا بنیادی مفہوم

چنانچہ (و۔ق۔ی) کے بنیادی معنے ہوتے ہیں کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ اسے مضر اور تکلیف دہ چیزوں سے بچانا اور اس مقصد کے لئے صحیح تدابیر کی پوری پوری نگہداشت کرنا۔ بنابریں متقین وہ راہرو ہوں گے جو راستہ کے خطرات سے محفوظ رہتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی آرزو اور عزم رکھیں۔ لہٰذا اس کتابِ عظیم سے مستفید ہونے کے لئے پہلی بنیادی شرط تو یہ ہوئی کہ انسان، زندگی کے راستوں کو عملاً قطع کرنا چاہے، گھر میں بیٹھے نہ رہنا چاہے۔ اور دوسری شرط یہ کہ وہ محفوظ راستوں سے سفر کرنا چاہے اور اس مقصد کے لئے راستے کے خطرات سے بچنے کے طرق و اسباب سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ یہ بات بھی ایک مثال سے سمجھ میں آئے گی۔ ایک شخص دریا میں کودنا چاہتا ہے۔ آپ اس سے کہتے ہیں کہ یہاں پانی بہت گہرا ہے، چھلانگ نہ لگاؤ، ڈوب جاؤ گے۔ اگر وہ ڈوبنے کے خطرہ سے بچنا چاہتا ہے، وہ آپ کی اس راہنمائی سے فائدہ اُٹھائے گا۔ لیکن اگر وہ خودکشی کے ارادے سے دریا میں کودنا چاہتا ہے تو آپ کا، اُسے خطرہ سے آگاہ کرنا، نہ کرنا برابر ہے۔ وہ

بلا تامل چھلانگ لگادے گا۔ اس سے سفر حیات کے دونوں قسم کے راہروؤں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ چند ہی آیات آگے جا کر اس کی قرآنی وضاحت سامنے آتے گی۔

لہٰذا متقین وہ ہیں جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہنے کی آرزو رکھیں اور اس کے لئے اس راہنمائی کی نگہداشت کریں جو انہیں اس کتاب سے حاصل ہو۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں اگر کسی چیز کو رکھدیا جائے تو وہ بالکل محفوظ رہتی ہے۔ انہیں (PRESERVATIVES) کہا جاتا ہے۔ اس مادہ سے اس کے لئے "وِقَايَةٌ" کا لفظ آتا ہے۔ قرآنی تعلیم و ہدایت کا ماحصل انسانی ذات کی اس طرح نشوونما اور برومندی ہے جس سے یہ اس دنیا میں بھی صحیح، متوازن طریق پر زندگی بسر کر سکے اور اس کے ساتھ ہی ایسی مستحکم ہو جائے کہ یہ، زندگی کی اگلی ارتقائی منازل (حیاتِ اُخروی) طے کرنے کے بھی قابل ہو جائے۔

انسانی ذات کا تقوٰی | انسانی ذات کے متعلق قرآن کریم میں ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۹۱/۸)۔ اس میں دونوں طرح کے ممکنات رکھ دیئے گئے ہیں۔ فجور یعنی (DISINTEGRATION) کا امکان بھی، اور محفوظ و مستحکم ہونے (INTEGRATION) کا امکان بھی۔ اس کے محفوظ و مستحکم رہنے کے لئے لفظ تقوٰی آیا ہے۔ اس سے بھی اس لفظ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

تقوٰی ——— متقین - وغیرہ الفاظ قرآن کریم میں شروع سے آخر تک بکثرت آئے ہیں، اور اس نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے متقین کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور ان خصوصیات کے نتائج و اثمار کیا۔ ہم اس مقام پر ان کی صرف دو ایک ایسی خصوصیات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو ہمارے نزدیک بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے، ہمارے ہاں متقی، پرہیزگار کے الفاظ اکٹھے بولے جاتے ہیں اور متقی کے معنے ہی پرہیزگار کئے جاتے ہیں۔ اس لفظ "پرہیزگاری" کے بطن میں ایک بڑا گہرا تصور پوشیدہ ہے۔ عیسائیت کی رہبانیت ہو یا ہندوؤں کی ویدانت مجوسیوں کی خانقاہیت ہو یا بدھ مت کا نروان۔ ان سب کا بنیادی تصور یہ ہے کہ مادی دنیا (PHYSICAL WORLD) قابلِ نفرت ہے اور دنیاوی جاذبیتوں سے ملوث ہو جانے والا خدا کا مقرب نہیں بن سکتا۔ ان آلائشوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا قربِ خداوندی کے حصول کی بنیادی شرط ہے۔ (دین کے "مذہب" میں تبدیل ہو جانے کے بعد) خانقاہیت کا یہی تصور جب تصوّف کی شکل میں مسلمانوں کے ہاں آیا اس کی رو سے انہوں نے بھی دنیا اور اس کی جاذبیتوں کو قابلِ نفرت قرار دیا اور ان کے ترک کرنے کو وجہِ قربِ خداوندی ٹھہرایا۔ یہیں سے "پرہیزگار" کی اصطلاح ہمارے ہاں رائج ہوئی چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جس شخص کے متعلق کہا جائے کہ وہ بڑا متقی اور پرہیزگار ہے اس کا تصور کچھ اس طرح سامنے آئے گا

متقین کی خصوصیات

کہ وہ دنیا کی زیب و زینت کی چیزوں سے دور رہتا اور انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ تصور، متقی کے قرآنی مفہوم کی ضد ہے۔ متقیوں کے متعلق سورۃ یونس میں ہے۔ ھُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِیَآءً وَّ الۡقَمَرَ نُوۡرًا وَّ قَدَّرَہٗ مَنَازِلَ (۱۰/۵)۔ خدا وہ ہے جس نے سورج کو روشنی کا سرچشمہ اور چاند کو عکسِ نور بنا دیا، اور اس کے لئے منازل مقرر کر دیں۔ اس کے بعد ہے مَا خَلَقَ اللّٰہُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالۡحَقِّ (ایضاً) خدا نے ان عناصرِ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا، بالحق پیدا کیا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔ اِنَّ فِی اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ (۱۰/۶)۔ یقیناً رات اور دن کی گردشوں میں، بلکہ جملہ کارگاہِ کائنات میں، خدا نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے ان میں حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ لیکن یہ نشانیاں کن لوگوں کے لئے ہیں؟ ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ شعار ہوں۔ یعنی متقیوں کے لئے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جہاں تک اس مادی کائنات کا تعلق ہے اس میں متقین کا مقام کیا ہوگا؟ تمام کائنات پر غور و فکر کرنے اور (جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا) فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے والے۔

اس سے ایک سوال سامنے آئے گا کہ فطرت کی قوتوں کو تو ہر وہ قوم مسخر کر سکتی ہے جو قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرے۔ اس میں مومن اور کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ آج یورپ کی خدا فراموش قومیں اس باب میں بہت آگے بڑھ گئی ہیں، تو کیا انہیں، قرآن کی اصطلاح میں، متقین کہا جائے گا۔ نہیں، ایسا سمجھنا غلط ہے، اور اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن کی کسی ایک آیت سے مفہوم اخذ کر کے جھٹ سے نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان نتائج تک پہنچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کے ان تمام مقامات کو سامنے رکھا جائے جن میں اس موضوع کے متعلق گفتگو کی گئی ہے (اسے تصریفِ آیات کہتے ہیں)

قرآنِ کریم نے انسانی جذبات کو، جب وہ وحی کی پابندیوں سے آزاد ہو کر قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتیں، شیطان کہہ کر پکارا ہے، اور مومن ان لوگوں کو کہا ہے جو وحی کی عائد کردہ پابندیوں کے مطابق زندگی گزاریں۔ اس سلسلہ میں وہ تقویٰ کا مفہوم بھی پیش کرتا ہے، جب کہتا ہے کہ: اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّہُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ (۷/۲۰۱) مومن وہ ہیں جو دانستہ سرکش جذبات (شیطان) کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ اس قسم کا خیال یونہی گھومتے گھماتے ان کے دل میں آ جائے تو وہ فوراً قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اس سے یک لخت اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ ان کی بصیرت میں جلا پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ پہچان لیتے ہیں کہ یہ ابلیسی فریب ہے۔ اور اسے اپنے دامنِ نگاہ سے جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں۔ کہا کہ ایسے لوگوں کو متقی کہا جاتا ہے۔

کم از کم ان دو آیات سے یہ مفہوم ہمارے سامنے آ گیا کہ متقی وہ ہیں جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیِ خداوندی

کے مطابق صرف میں لاتے ہیں۔ اور اگر کبھی ان کے دل میں، بھولے بھٹکے اس کے خلاف کوئی خیال اُبھرتا ہے تو وہ اُسے جھٹک کر الگ کردیتے ہیں۔ ایسے ہی وہ خطرناک مقامات تھے جو ان کے راستے میں، یہاں وہاں، آتے تھے۔ ان مقامات سے اسطرح احتیاط اور حفاظت سے گزرنے کی آرزو اور عزم رکھنے والوں کو متقین کہا گیا ہے۔ بنا بریں سورۃ بقرۃ کی پہلی آیت کے ان چند الفاظ کا مفہوم یہ ہوا کہ:

> تم نے ہمیں پکارا تھا اور کہا تھا کہ تمہیں زندگی کی مسافت طے کرنے کے لئے صحیح راہنمائی دی جائے۔ یہ راہنمائی تمہیں اس کتاب کے اندر ملے گی جو تمہارے ذہن سے شکوک و شبہات کے کانٹے بھی نکال دی گی اور تمہارے دل سے نفسیاتی اُلجھنوں اور اضطراب انگیزیوں کی خلشوں کا بھی استیصال کردے گی۔ لیکن اس راہنمائی سے وہی لوگ استفادہ کرسکیں گے جو عازمِ سفر ہوں اور یہ چاہیں کہ وہ راستے کی تمام خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔

۲/۳

(۲/۳) اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ

اس مقام پر قرآنِ کریم نے متقین کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے منفرد اسلوب کے مطابق اس اصطلاح کی وضاحت کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ متقین سے مراد کون لوگ ہیں اور ان کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟ فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں: اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ ، وہ لوگ جو، غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس میں پہلا لفظ ایمان ہے اور یہ وہ بنیاد ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کا شاید ہی کوئی ورق ایسا ہو جس میں یہ لفظ (کسی نہ کسی شکل میں نہ آیا ہو) یہ ہو تو اسلام ہے، یہ نہ ہو تو اسلام بھی نہیں۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ جسقدر یہ لفظ یا یہ تصوّر اہمیت رکھتا ہے، اس کا مروجہ غلط مفہوم اُسی قدر ہمیں اسلام سے دور لے گیا ہے۔ اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ پہلے اس لفظ کے لغوی یا بنیادی معانی سمجھ لینے چاہئیں۔

ایمان کے معانی

ایمان کا مادہ (ا۔م۔ن) ہے اور، جیساکہ معلوم ہے، اَمن کے معنے بے خوفی، اطمینان یا خطرات سے محفوظ ہونے کی حالت کے ہیں۔ آمَنَ کے معنے ہیں کسی کو بے فکر اور مطمئن کردینا۔ دوسرے کو امن دیدینا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لے لینا۔ عربوں کے ہاں نَاقَةٌ اَمُوۡنٌ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جو قویٰ اور عادات کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہو۔ جس کے متعلق یہ اطمینان ہو کہ وہ بہیم سفر سے کمزور نہیں ہو جائے گی اور راستہ میں ٹھوکر کھا کر گر نہیں پڑے گی۔ لہٰذا مُؤۡمِنٌ کے معنے ہوں گے وہ، جو خود بھی امن و اطمینان

ہیں ہو اور دوسروں کو بھی امن کی ضمانت دے۔ جس پر بھروسہ کر کے انسان بے فکر اور مطمئن ہو جائے۔ خود اللہ تعالیٰ کی ایک صفت "اَلْمُؤْمِنُ" ہے (۵۹/۲۳)۔ جس کے معنی ہیں امنِ عالم کا ذمہ دار۔

جب آمَنَ کا صلہ (لَ) ہو تو اس کے معنے بات ماننے کے ہوتے ہیں (۵۵/۲)۔ اور جب اس کا صلہ (بِ) ہو تو اس کے معنے ایمان لانے کے ہوتے ہیں۔ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ (۲/۲۸۵) کے معنے ہوتے "سب ایمان لائے اللہ پر"۔ یہی ایمان وہ بنیاد ہے جس پر (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) دین کی پوری کی پوری عمارت اُستوار ہوتی ہے اور اس کا غلط مفہوم بے شمار اُلجھنیں پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے: (FAITH) اور (FAITH) کے معنے ہوتے ہیں کسی بات کو بلا دلیل و برہان، بلا علم و بصیرت، بلا فکر و تدبر، بلا (REASON) آنکھیں بند کر کے مان لینا۔ اور اس قسم کے ایمان کو بڑا قابلِ قدر سمجھا جاتا ہے۔ جس قدر کوئی شخص کسی بات کو بلا دلیل و حجت مانے اسی قدر اس کے ایمان کو محکم اور مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عقل اور ایمان کو ایک دوسرے کی ضد سمجھا جاتا ہے۔ اور عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم خدا کو بلا دلیل مانتے ہیں۔ ایمان کا یہ مفہوم، اس کے قرآنی مفہوم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے ایمان نام ہے حقیقت کو علم و بصیرت، دلائل و براہین، غور و فکر کے بعد، قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ صحیح تسلیم کرنے کا۔ اسے انگریزی زبان میں (CONVICTION) کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے مومنین کے متعلق کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) کہ اور تو اور، جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں تو وہ ان کے سامنے بھی، بہرے اور اندھے بن کر نہیں جھک جاتے۔ وہ انہیں آنکھیں بند کر کے تسلیم نہیں کر لیتے۔ یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے مومن کی بنیادی خصوصیت۔

مومن اور عقل و بصیرت

دوسری جگہ ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۶۵/۱۰) اے اربابِ عقل و بصیرت جو خدا پر ایمان رکھتے ہو! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس طرح خطرات سے محفوظ ہو جاؤ۔ یہاں کہا گیا ہے کہ ایمان وہی لوگ لاتے ہیں جو اربابِ علم و بصیرت ہوں۔ سورۃ حج میں ہے: وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ (۲۲/۵۴)۔ تاکہ وہ لوگ جو اس بات کا علم رکھتے ہیں کہ یہ قرآن تیرے خدا کی طرف سے حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یہاں بھی ایمان کو "علم" کے ساتھ مشروط قرار دیا گیا ہے (اس آیتِ جلیلہ کا اگلا حصہ ایک عظیم حقیقت کا آئینہ دار ہے لیکن اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔ یہاں ہم اپنے آپ کو موضوعِ زیرِ نظر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں)۔

قرآن کریم کی رُو سے، علم و عقل، کو کس قدر اہمیت حاصل ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے جسے ضمناً بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت ہم قرآنِ کریم کی دو ایک آیات کو سامنے لانے کے بعد آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

علم وبصیرت کی اہمیت

(جیسا کہ سورۃ فاتحہ، آیت نمبر ۷ کے تحت بھی لکھا جا چکا ہے) سورۃ الاعراف میں ہے: وَلَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ (۷/۱۷۹) - دنیا میں تم ایسے مہذب اور غیر مہذب انسانوں کو چلتے پھرتے دیکھو گے جن کا کردار اس حقیقت کا مظہر ہوگا کہ یہ لوگ اہل جہنم ہیں. یقیناً ہر شخص معلوم کرنا چاہے گا کہ ایسے کون لوگ ہیں جن کا جہنمی ہونا ان کی صورت سے عیاں ہوگا. کہا یہ وہ لوگ ہیں: لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا. وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا. وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا (ایضاً) جو مجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود، سمجھ سوچ سے کام نہیں لیتے. جو آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے. جو کان تو رکھتے ہیں لیکن اُن سے سننے کا کام نہیں لیتے. اُولٰٓئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ. اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ (ایضاً) یہ لوگ انسان نہیں حیوان ہیں. بلکہ حیوانوں سے بھی زیادہ راہ گم کردہ، کہ حیوان اپنی جبلت کے مطابق تو کام کرتے ہیں اور یہ انسان ہونے کے باوجود اپنی انسانی صلاحیتوں سے بے خبر رہتے ہیں. دوسری جگہ ہے کہ جہنم کے داروغے، جہنم میں داخل ہونے والوں سے پوچھیں گے کہ تم نے کونسا ایسا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے تم اس عذابِ الیم میں گرفتار ہوگئے ہو. وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم، تفصیل میں گئے بغیر، صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ: لَوۡ كُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡ نَعۡقِلُ مَا كُنَّا فِىۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِيۡرِ (۶۷/۱۰). اگر ہم دعوتِ خداوندی کو گوش ہوش سے سنتے اور پھر عقل وفکر سے کام لیتے تو ہم آج جہنم میں نہ ہوتے. انہی آیات سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے علم وعقل اور غور وفکر کی کسقدر اہمیت ہے. کیا اس کے بعد یہ بات حیطۂ تصور میں بھی آسکتی ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے ایمان کے معنے ہوں گے بلا علم وعقل اور بلا غور وفکر کسی بات کو مان لینا؟ یہ تصور درحقیقت تصوف کا پیدا کردہ ہے. جس کی تلقین یہ ہے کہ ـــــ گوش بند ولب ببند وچشم بند ـــــ ان کے ہاں علم وعقل اور دلیل وبرہان سے کام لینا "ابلیسی مسلک" ہے. ان کا عقیدہ یہ ہے کہ "اَوَّلُ مَنۡ قَاسَ اِبۡلِيۡسُ" جس نے سب سے پہلے عقل ودلیل سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا. (جیسا کہ سورۃ فاتحہ آیت نمبر ۷ کے تحت بتایا گیا ہے) قرآنِ کریم

مسلکِ تقلید کی تباہ کاریاں

تقلید کی سخت مذمت کرتا ہے. تقلید کے معنے یہ ہیں کہ جو نظریات وتصورات، اسلاف سے وراثتاً منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں انہیں آنکھیں بند کرکے تسلیم کرنا، اور دلیل وبرہان اور عقل وفکر کی رو سے ان کی پرکھ نہ کرنا. قرآنِ کریم کفار کے متعلق کہتا ہے: وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (۲/۱۷۰) - جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے تم اس کا اتباع کرو. قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا (ایضاً) تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اپنے اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے. ان کی تردید میں قرآنِ کریم نے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی سمجھا ہے کہ: اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ

شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (ایضاً) یہ لوگ اپنے اسلاف کے راستے پر چلتے جائیں گے خواہ ان کے اسلاف نے کبھی عقل و فکر سے کام لیا ہو اور نہ ہی وہ ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں جادہ پیما ہوئے ہوں ـــــ یہ اس کے باوجود انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے تاکہ جس جہنم میں وہ جا کر گرے ہیں اسی میں یہ جا گریں!

یہاں یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم لوگ جو پیدائشی مسلمان کہلاتے ہیں، ہماری کیا پوزیشن ہے۔ پیدائشی مسلمانوں کی یہ پوزیشن تو واضح ہے کہ یہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوگئے تو مسلمان کہلائے۔ ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہو جاتے تو ہندو کہلاتے

پیدائشی مسلمانوں کی پوزیشن

نہ انہوں نے اپنے انتخاب اور فیصلے سے اسلام قبول کیا، نہ انہوں نے اپنے فیصلے سے کفر اختیار کیا۔ آپ قرآن کریم کو دیکھئے۔ وہ ہر جگہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یا يُؤْمِنُوْنَ وغیرہ کہتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں، جو ایسا کرتے ہیں۔ یہ "فعل" (VERB) کے صیغے ہیں۔ اور فعل کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کا کرنا۔ لہٰذا ایمان اسی کا ایمان ہوگا جو حق و صداقت کو قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ خود تسلیم کرے۔ پیدائشی طور پر مسلمان ہونے میں، اور مسلکِ تقلید میں کچھ فرق نہیں۔ ایک بچہ پیدائشی طور پر اس لئے مسلمان کہلاتا ہے کہ اس کے ماں باپ مسلمان ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر اس کے ماں باپ (مثلاً) سُنّی ہوں تو وہ سُنّی مسلمان ہوتا ہے شیعہ ہوں تو شیعہ مسلمان۔ اس کو مسلکِ تقلید کہتے ہیں۔

یہاں سے یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح جو مسلمان قوم وجود میں آتی ہے ان کی پوزیشن کیا ہے؟ اسے خود قرآن کریم نے واضح کر دیا ہے۔ وہ انہیں من حیث القوم مسلمان قرار دیتا ہے ـــــ یعنی امتِ محمدیہ کے افراد ـــــ اور اُن کا غیر مسلموں سے جداگانہ اور الگ تشخص تسلیم کرتا ہے۔ خود رسول اللہؐ کے زمانے میں ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ابتدائی مسلمان (صحابہ کبارؓ) تو عقل و فکر کی بنا پر سوچ سمجھ کر ایمان لائے تھے اس لئے ان کا شمار صحیح قرآنی مؤمنین کی صف میں ہوتا ہے جب مدینہ میں اسلامی مملکت کی شان و شوکت ابھری تو بہت سے اعرابی قبائل نے اس مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس طرح حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر اپنے آپ کو مؤمن سمجھنے اور کہنے لگ گئے۔ قرآن کریم نے انہیں تنبیہہ کی کہ تم ایسا مت سمجھو اور مت کہو۔ سورۂ حجرات میں ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا (۴۹/۱۴)۔ یہ بدوی قبائل کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا. وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (ایضاً) ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ کیونکہ ایمان تمہارے دل میں داخل نہیں ہوا۔ تم صرف اس مملکت کے سامنے جھک کر اس قوم کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہو۔ لیکن اس سے تمہارے دل میں یہ خیال نہ گزرے کہ ہمارے اسلام لانے سے فائدہ کیا ہوا۔ تم اگر خدا اور رسول کی اطاعت کرو گے تو تمہیں اپنے اعمال کا اسی طرح بدلہ ملے گا جس طرح مؤمنین کو ملتا ہے (ایضاً)۔ تم اسلام کی صداقت میں

کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اس طرح جب ایمان تمہارے دلوں میں داخل ہو جائے تو اس وقت کہو کہ تم مؤمن ہو گئے ہو۔ اس سے ان لوگوں میں جو قلب و دماغ کے اطمینان کے بعد ایمان لائے ہوں اور ان میں جو پیدائشی مسلمان ہوں، یا جو کسی اور وجہ سے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے ہوں، خطِ امتیاز کھینچ دیا گیا ہے۔ امتِ مسلمہ ہونے کی جہت سے تو مؤمن اور مسلمان ایک ہی قوم کے افراد ہوتے ہیں، لیکن ایمانی مدارج کے اعتبار سے ان میں فرق ہو گا۔

آگے بڑھنے سے پہلے، اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ مجید اکثر و بیشتر، مؤمن اور مسلم کے الفاظ ہم معنی استعمال کرتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات، مسلم کو مؤمن پر ترجیح دیتا ہے۔ اسی اعتبار سے کہ مؤمن صداقت کا اقرار کرتا ہے اور مسلم اس کے سامنے عملاً سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اس کی اطاعت کرتا ہے ۔۔۔ اس اعتبار سے وہ مؤمن اور مسلم کے الفاظ الگ الگ بھی لاتا ہے۔ مثلاً اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ..... (۳۳/۳۵) کہیں وہ کہتا ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (۴۳/۶۹)۔ وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور مسلم ہیں یعنی ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ ایسے مقامات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلم ہونا مؤمن ہونے ہی کی ایک خصوصیت ہے۔

مؤمن اور مسلم

یعنی قرآنی مفہوم کے مطابق، مؤمن وہ ہے جو آیاتِ خداوندی پر ایمان لاتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے۔ یعنی وہ مؤمن بھی ہوتا ہے اور مسلم بھی۔ یہی کیفیت مسلم کی ہے کہ وہ مسلم بھی ہوتا ہے اور مؤمن بھی ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر (قرآنی مفہوم کی رو سے) مؤمن مسلم بھی ہوتا ہے اور مسلم مؤمن بھی۔ (مسلمان کا لفظ قرآن مجید میں نہیں آیا)۔ اس مقام پر ہم جس نکتہ کی وضاحت کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم مسلمانوں کو امّتِ محمدیہ کے افراد قرار دیتا ہے۔ یعنی انہیں غیر مسلموں سے الگ اور متمیز قوم تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ قرآنی معیار کے مطابق مؤمن نہیں ہوتے تو انہیں زمرۂ "مومنین" میں شمار نہیں کرتا۔ اگرچہ مخاطب انہیں بھی "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کہہ کر ہی کرتا ہے قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں اس فرق کا سمجھنا اور ملحوظ رکھنا ضروری ہو گا کہ وہ ان الفاظ سے کہاں "قرآنی مؤمن" مراد لیتا ہے اور کہاں محض اصطلاحی مسلمان۔ "مسلمان قوم" کے افراد کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم نے جو کچھ کہا ہے، اُن (مسلمانوں) میں سے اگر کوئی شخص، اس میں سے کسی ایک بات کی صداقت سے بھی انکار کرتا ہے، یا قرآنِ مجید کے بعد اور وحی بھی تسلیم کرتا ہے، تو مسلمان قوم (اُمّتِ محمدیہ) کا فرد بھی نہیں رہ سکتا۔

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد آپ اُن آیات پر غور کیجئے جن میں قرآنِ مجید مسلمانوں کو "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کہہ کر ان سے ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں ہے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (۴/۱۳۶)۔ اے ایمان والو! (ظاہر ہے

کہ یہاں ان سے مراد مسلمان قوم کے افراد ہیں)۔ تم ایمان لاؤ، اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر، جسے خدا نے اپنے رسول پر نازل کیا اور ان کتابوں پر، جنہیں اس نے اس سے پہلے نازل کیا (نیز ۵/۶۸)۔ غور کیجئے! یہاں "یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے خطاب ہے اور ان سے کہا یہ جا رہا ہے اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ۔ تم ایمان لاؤ اللہ پر ۔۔۔۔۔۔

"ایمان والو"، سے یہ کہنا کہ تم ایمان لاؤ، بظاہر سمجھ آنے والی بات نہیں لیکن جب اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے گا جسے ہم نے اُوپر بیان کیا ہے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آجائے گی۔ اسی ضمن میں اس آیت کو بھی دیکھئے جس میں کہا گیا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۶۲ نیز ۵/۶۹) اس کا صاف اور سلیس ترجمہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی یا نصاریٰ یا صابی ہیں، ان میں سے جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور اس کے ساتھ عملِ صالح کرے گا تو ان لوگوں کا بدلہ ان کے خدا کے ہاں سے ملے گا اور وہ بدلہ یہ ہوگا کہ ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ یہاں دیکھئے! جس طرح یہود و نصاریٰ و صابئین کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اسی طرح اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کو بھی ایمان لانے کے لئے کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بھی مراد وہ مسلمان ہیں جو خود ایمان نہیں لائے لیکن جن کا شمار مسلمانوں کی قوم میں ہوتا ہے۔

اہلِ کتاب سے ایمان کا مطالبہ

ضمناً، یہاں یہود و نصاریٰ، سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان لائیں حالانکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ خدا پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور آخرت پر بھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن ان کے اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ ایمان کے یہ معنی نہیں کہ کوئی شخص یہ کہدے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ ایمان اسی کا ہے جو خدا کو اُس تصوّر کے مطابق مانے، جسے خدا نے (قرآن مجید میں) پیش کیا ہے۔ اور اسی لئے اس نے کہا کہ: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷) اگر یہ لوگ جو اپنے آپ کو خدا پرست کہتے ہیں، اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین!) تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ فی الحقیقت خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مغالطہ کو بھی دور کر دیا جائے جو اس سورۃ کے محولہ بالا آیت (۲/۶۲) سے پیدا کیا جاتا ہے۔ گذشتہ (انیسویں) صدی عیسوی میں بنگال (ہندوستان) کے ایک ہندو راہنما، راجہ رام موہن رائے نے ایک تحریک اُٹھائی جو "برہمو سماج" کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس تحریک کی بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ کہ حقیقت اور صداقت

برہمو سماجی تحریک

صرف ان کے پاس ہے، کسی اور مذہب میں نہیں، باطل ہے اور ان کے باہمی اختلافات و نزاعات کا موجب۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ ان سچائیوں کو یکجا کرکے انہیں صحیح تسلیم کر لینے سے تمام مذہبی نزاعات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس تحریک کا نام " برہمو سماج " تھا۔

کچھ عرصہ تک اس تحریک کا چرچا رہا لیکن یہ آگے نہ بڑھ سکی۔ ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی مشہور تفسیر، ترجمان القرآن، کی پہلی جلد شائع کی تو اس میں اس نظریہ کو دُہرایا گیا۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ:-

(۱) اسلام نے نہ صرف یہی بتلایا ہے کہ ہر مذہب میں سچائی ہے بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔

(۲) اس نے کہا کہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین ایک ہی ہے۔ وہ دینِ حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لئے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ۔

(۳) اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام مذاہب اپنی مشترکہ اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں۔

(۴) اس نے کہا کہ اصلِ دین (یعنی ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی) کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جلد اول ۱۹۴۷ء ایڈیشن ص ۲۱۴-۲۱۳ و ص ۱۸۹ و ص ۲۶۶ کا تشریحی نوٹ)

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی غلط فہمی

مولانا آزاد (مرحوم) مسلمانوں میں ایک عالمِ دین اور مفسرِ قرآن کی حیثیت سے امتیاز حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان اور قلم کا لوگوں کے دلوں پر بڑا گہرا اثر تھا اور ان کی اس تفسیر کا مدتوں سے انتظار تھا۔

چنانچہ جب یہ شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ اس کا استقبال ہوا اور مختلف گوشوں سے اس کی تعریف و توصیف میں غلغلے بلند ہوئے۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ اس میں کس قسم کا "برہمو سماجی اسلام" پیش کیا گیا ہے اور اس کے مضرت رساں اثرات کیا نتائج پیدا کر سکتے ہیں تو میں نے اس پر مبسوط تنقید کی جو دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے مشہور مجلہ معارف کی جنوری ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔ اس تنقید کو اربابِ نظر کے حلقہ میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور مختلف گوشوں سے مولانا آزاد کی تفسیر کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں۔ میں نے اس میں اصولاً دو نکات پیش کئے تھے:-

(۱) یہ کہنا تو صحیح ہو گا کہ عالمگیر سچائیاں ہر ربانی "مذہب" (نبی یا رسول) کو وحی کی رو سے یکساں

طور پر ملی تھیں لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ وہ سچائیاں آج بھی تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں، اس لئے کہ وہ دین جو ان انبیاء کرامؑ کو اپنے اپنے وقت میں ملا تھا کسی اہل مذہب کے ہاں اصلی، حقیقی اور غیر محرف شکل میں موجود نہیں۔ یہ صرف قرآن کریم کے اندر موجود اور محفوظ ہے۔ اور

(۲) یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تمام اہل مذاہب کو رسول اللہ کی رسالت اور قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور برملا کہتا ہے کہ اس کے سوا نجات وسعادت کی کوئی راہ نہیں۔ [1]

اس کے بعد مسلمانوں میں تو مولانا آزاد (مرحوم) کے اس نظریہ کا اثر کم ہوتا چلا گیا، لیکن ہندوؤں نے اسے بہت اچھالا چنانچہ جون ۱۹۴۱ء میں، شولاپور، کے مقام پر "تمام مذاہب کی کانفرنس" منعقد ہوئی تو اس کے صدر پنڈت سندر لال جی نے مولانا آزاد کی تفسیر کی تائید سے اس نظریہ کو ابھارا۔ اور جب (تحریک پاکستان کے دوران) ہندوؤں کے سب سے بڑے لیڈر، مسٹر گاندھی نے تمام ملک کے لئے ایک مشترکہ تعلیمی اسکیم کا منصوبہ تیار کیا تو اس میں اس نظریہ کو خاص اہمیت دی گئی ــــ للہ الحمد کہ اس زہر آلود اور اسلام کش اسکیم کے بت کو پاش پاش کرنے کی سعادت بھی اسی ہیچمیرز کے حصہ میں آئی اور اس دور کے مجلہ طلوع اسلام میں شائع شدہ) ایک ہی مقالہ نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ [2]

ان حقائق سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ (غیر منقسم) ہندوستان میں اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑنے کے لئے کس کس قسم کی سازشیں ہوتی تھیں۔ پاکستان کے مطالبہ کا جذبۂ محرکہ یہی تھا کہ اسلام کو اس قسم کی دستبرد سے بچا لیا جائے اور اسے پھر سے ایک جیتے جاگتے نظام کی شکل میں متمکن کیا جائے جو صرف اپنی آزاد مملکت میں ممکن تھا۔ اس تحریک کے ساتھ میری وابستگی کی وجہ بھی یہی تھی۔ یہ میرے ایمان کا تقاضا اور دین کا مطالبہ تھا۔

اس ضمنی گوشہ کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹئے۔

تفصیل میں جائیے تو، قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو مبنی بر حق وصداقت سمجھنا ایمان کہلاتا ہے۔ اگر اس میں بیان کردہ کسی ایک بات کے سچا ماننے سے بھی انکار کر دیا جائے، یا اس کے مبنی بر حقیقت ہونے میں شبہ لاحق ہو جائے، تو اس

---

[1] میرا یہ مقالہ، میرے مجموعۂ مضامین، "فردوس گم گشتہ" میں شامل ہے جس کا عنوان ہے "کیا تمام مذاہب یکساں ہیں"۔

[2] یہ مقالہ "واردھا کی تعلیمی اسکیم" کے عنوان سے چھپا تھا اور اس کے بعد (متعدد زبانوں میں) اس کا پمفلٹ ہزارہا کی تعداد میں سارے ہندوستان میں تقسیم ہوا تھا۔ اس سے یہ فتنہ فرو ہوا تھا۔

شخص کا ایمان، ایمان ہی نہیں رہتا۔ لیکن اجمالاً قرآنِ کریم نے پانچ اجزائے ایمان قرار دیئے ہیں۔ یعنی اللہ — آخرت — ملائکہ — کتب اور انبیاء (۲/۱۷۷) اور ان کے، یا ان میں سے کسی ایک کے انکار کو کفر قرار دیا ہے (۴/۱۳۶)۔ لیکن جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے، ان پر ایمان کے معنے ہوں گے ان تفصیلات، امتیازات اور خصوصیات کے مطابق ایمان، جو ان کے متعلق قرآنِ کریم میں بیان کی گئی ہیں۔ اگر وہ ایمان، قرآنی تصوّرات کے مطابق نہیں تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ ایمان لانے کے لئے، قرآنِ کریم نے طریق یہ بتایا ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)۔ جو شخص "طاغوت" سے انکار کرے اور خدا پر ایمان لائے تو اس کے متعلق سمجھو کہ اس نے ایک ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

لَا و اِلَّا دیکھئے! اِس میں ایمان باللہ تک پہنچنے سے پہلے کفر بالطاغوت کی شرط ضروری قرار دی ہے۔ تفصیل میں گئے بغیر، الطاغوت کے متعلق یوں سمجھ لیجئے کہ اس سے مراد ہر وہ نظریہ، تصور، عقیدہ، منہاج، مسلک ہے جو خلافِ قرآن ہو۔ لہٰذا قرآنی صداقتوں کو تسلیم کرنے کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ ذہن کو تمام غیر قرآنی تصورات و تخیلات سے پاک اور صاف کیا جائے، اس طرح جب ذہنِ انسانی کی لوح پاک اور صاف (CLEAN SLATE) ہو جائے گی تو پھر اس پر ایمان کے حروف و نقوش ثبت ہو سکیں گے۔ پہلے سے لکھی ہوئی سلیٹ پر نئی تحریر نہیں لکھی جا سکتی۔ انکار و اقرار کے اس عمل کو اس کلمہ کے دو اجزاء قرار دیا گیا ہے جسے تسلیم کرنے کے بعد انسان ایمان لاتا ہے یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اس کلمہ کے جزوِ اوّل کی رو سے یہ ضروری ہے کہ انسان، ہر غیر خداوندی اِلٰہ سے انکار کرے اور اس کے بعد خدا کے اللہ ہونے کا اقرار کرے۔ اِس حصہ لَآ کے بغیر اِلَّا کی منزل تک پہنچا نہیں جا سکتا۔ جب تک کعبہ سے ان بتانِ آذری کو نکال باہر نہ کیا جائے، اس میں (استعارۃً) "خدا داخل نہیں ہو گا"۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآنِ کریم کے متعلق کہا ہے: لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹) تو اس سے یہی مراد تھی کہ جب تک ذہنِ انسانی غیر قرآنی تصورات سے پاک اور صاف نہ ہو اسے قرآن سے مس نہیں ہو سکتا۔ اس کا عملی طریق یہ ہو گا کہ انسان مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، علم، بصیرت، غور و فکر کے بعد اس حقیقت تک پہنچے کہ ذہنِ انسانی کے تراشیدہ نظریات و معتقدات (خواہ وہ غیر مسلموں کے ہوں اور خواہ یہاں خود اپنے ہاں سے وراثتاً ملے ہوں اور ہم نے تقلیداً اختیار کئے ہوں) حق و صداقت کے معیار پر پورے نہیں اُترتے لہٰذا اس قابل نہیں کہ انہیں ضابطۂ ہدایت تسلیم کیا جائے۔ اس منفی عمل کے بعد اسی طرح غور و فکر کے ساتھ حقائقِ قرآنی کی صداقت پر ایمان لائے — خود بھی اسی طرح ایمان لائے اور دوسروں کو بھی اسی طرح ایمان لانے کی دعوت دے۔ یہی وہ مسلک ہے جسے اختیار کرنے کے لئے رسولُ اللہ کی زبانِ مبارک سے کہلایا گیا کہ: اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ

عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲/۱۰۸)۔ یعنی تمہیں علم و بصیرت کی بنا پر خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں ۔۔۔ میں بھی یہی کرتا ہوں اور جو میرے راستے پر چلے گا وہ بھی یہی طریق اختیار کرے گا۔ یہی فرمانِ خداوندی ہے اور اسی کا نام اتباعِ سنتِ رسول اللہ ہے ۔۔۔ دعوت الی القرآن علیٰ وجہ البصیرت۔

شروع میں بتایا گیا ہے کہ المؤمن کے معنے ہیں امن کی ضمانت دینے والا۔ جہاں تک مومنین کے باہمی روابط کا تعلق ہے ان کے، ایک دوسرے کے، امن و سلامتی کے ضامن ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ قرآنِ کریم نے انہیں بھائی بھائی قرار دیا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ان کی خصوصیت رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (۴۸/۲۹) بتائی گئی ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمخوار۔ واضح طور پر کہا گیا ہے کہ وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا (۴/۹۳) جس نے کسی مومن کو عمداً قتل کر دیا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ وہ خدا کے غضب اور لعنت کا مورد ہے۔ اس نے اس کے لئے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے"۔ ہمارے معاشرے کا شعار یہ ہے کہ جب ایک مومن دوسرے سے ملے تو اُسے کہے "السلام علیکم" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُسے یقین دلائے کہ وہ اس کے امن و سلامتی کا خواہاں اور ضامن ہے۔ اور اُس کے جواب میں دوسرا بھی اسے امن و سلامتی کی ضمانت دے۔ لہٰذا افرادِ مومنین کا باہمی امن و سلامتی کا ذمہ دار ہونا، ان کے مومن ہونے کی بنیادی شرط ہے۔

مومنین کے باہمی تعلقات

جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے، جماعتِ مومنین ان کے لئے بھی امن کی ضامن ہوتی ہے۔ اقوامِ عالم کے تعلقات باہمی معاہدات کی رو سے استوار ہوتے ہیں، لیکن پھر عصرِ حاضر کی میکیاولی (سیکولر) سیاست میں معاہدات کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اول تو وہی حکومت، جس نے دوسری قوم کے ساتھ معاہدہ کر رکھا ہے، اپنے عہد سے پھر جاتی ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہ بھی کرے تو اس کی جانشین حکومت اپنے آئین میں ایسی تبدیلی کر لیتی ہے جس کی رو سے سابقہ معاہدہ خود بخود کالعدم ہو جاتا ہے بنابریں موجودہ نظامِ سیاست میں کوئی قوم بھی کسی دوسری قوم کی طرف سے امن و سلامتی کے سلسلہ میں مطمئن نہیں ہوسکتی یہی باہمی خدشات بین الاقوامی نزاعات اور بالآخر جنگوں کا موجب بن جاتے ہیں۔

غیر مسلموں کو امن کی ضمانت

لیکن اگر ایک ایسی قوم ہو جس کا آئین اور ضابطۂ قوانین ساری دنیا کے سامنے ہو۔ اس آئین میں اس امر کی ضمانت موجود ہو کہ یہ قوم باہمی معاہدات میں کبھی دھوکہ نہیں دے گی، اور یہ ضمانت بھی کہ حکومتیں آئیں اور حکومتیں جائیں، لیکن اس آئین میں کوئی حکومت تبدیلی نہیں کرے گی؛

توسوچئے کہ ایسی قوم کی طرف سے اقوامِ عالم کس قدر مطمئن رہیں گی۔ اس قوم کا نام جماعتِ مومنین ہے۔ یعنی دنیا کو امن کی ضمانت دینے والی قوم۔ قرآنِ مجید کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل ہونا، امنِ عالم کی ایسی قابلِ اعتماد ضمانت ہے کہ دنیا کی کوئی اور قوم اس کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔

یہاں سے ہمارے سامنے ایک اور عظیم حقیقت آتی ہے۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ خدا کا جس قسم کا تصور قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ "مذاہبِ عالم" میں کسی کے ہاں بھی اس قسم کا تصور نہیں تھا (نہ ہے) ان کے ہاں خدا کا تصور "بادشاہ" کا تصور تھا جو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ جس وقت، جس قسم کا جی چاہے حکم دے سکتا ہے۔ کسی کو اس حکم کی خلاف ورزی تو ایک طرف یہ پوچھنے کی بھی مجال نہیں ہو سکتی کہ حضور ملکِ معظم نے ایسا حکم کیوں دیا ہے۔ اس کے فیصلے، اس کی مرضی اور منشاء کے مطابق ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔

جب محدود قوتوں کے مالک بادشاہ کی مطلق العنانی کا یہ عالم ہوتا ہے تو لامنتہیٰ قوتوں کا مالک، قادرِ مطلق، خدا کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند کس طرح ہو سکتا ہے؟ وہ جو جی میں آئے کہے، اور جو جی میں آئے کرے، کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کہا اور ایسا کیوں کیا ہے!

قانون کی حکمرانی

خدا کا یہ تصور ہر مذہب میں بطور قدرِ مشترک چلا آ رہا تھا کہ قرآن کریم نے آکر اس کی تردید کی۔ اس نے کہا کہ خدا بیشک قادرِ مطلق ہے، لیکن تخلیقِ کائنات کے بعد اس نے، اپنی اس قدرتِ کاملہ کی رُو سے، ایسے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہِ کائنات اِس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے ایسے قوانین مقرر کئے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ہم، لا انتہا قوتوں کے مالک ہونے کے باوجود ان میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے۔

پھر، اللہ تعالیٰ نے جس قسم کے غیر متبدل قوانین، خارجی کائنات کے لئے مقرر کئے ہیں، اسی قسم کے قوانین انسانی زندگی کے لئے بھی متعین کر دیتے ہیں۔ یہ قوانین قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں، غیر متبدل ہیں اور اپنی نتیجہ خیزی میں اٹل ہیں بالفاظِ دیگر کلمات اللہ (LAWS IN THEORY) بھی غیر متبدل ہیں (۶/۱۱۴) اور سنت اللہ (LAWS IN PRACTICE) بھی غیر متبدل (۳۳/۶۲)۔ اسی کو قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہے (سورۃ فاتحہ میں بھی ان امور پر قدرے گفتگو کی جا چکی ہے)۔

خدا کا یہ وہ منفرد تصور ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے اور جو مذاہبِ عالم میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ یعنی آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کی بجائے قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) کا ضامن خدا۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قانون کی تعریف (DEFINITION)

یہ کی جاتی ہے۔ (IF-THEN-ALWAYS) "اگر ایسا کروگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا"۔ آپ قرآنی احکام کے سلسلہ میں دیکھیں گے کہ کہا یہ گیا ہے کہ تم ایسا کرو، تاکہ ایسا ہو جائے۔۔ اسی کو قانون کی کارفرمائی کہتے ہیں۔ اس خدا پر ایمان رکھنے والا پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ "تم اپنی جگہ کام کرو، مجھے اپنی جگہ کام کرنے دو، نتائج خود بتادیں گے کہ کس کا دعویٰ سچا ہے اور کس کا جھوٹا"۔ (۶/۱۳۶)۔ کہا جاتا ہے کہ نظری دعاوی کے پرکھنے کے لئے، استنتاجی طریق۔۔۔۔۔ (PRAGMATIC TEST) دورِ حاضرہ کی خصوصیت ہے۔ آپ قرآنِ کریم کے قانونِ مکافاتِ عمل پر غور کیجئے اور سوچئے کہ نتائج سے دعاوی پر پرکھنے کا طریق، دورِ حاضرہ کی تخلیق ہے یا چودہ سو سال پہلے قرآن کریم کا پیش کردہ طریق! کیا اس کے بعد بھی کہا جا سکے گا کہ قرآن اپنے دعاوی پر بلا علم و دلیل، آنکھیں بند کرکے، ایمان کا مطالبہ کرتا ہے؟ بہر حال، اب آگے بڑھئے:

جزا اور سزا

جزا اور سزا کا فلسفہ ایک مستقل موضوع ہے جو اپنے مقام پر سامنے آئے گا۔ اس جگہ اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کسی کام کا جو نتیجہ کسی قانون کے مطابق مرتب ہو، اُسے خارج سے عائد کردہ "سزا" نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً آگ میں انگلی ڈالنے کا لازمی نتیجہ کرب و اذیت ہے۔ یہ اذیت خارج سے عائد شدہ سزا نہیں یہ آگ میں انگلی ڈالنے کا فطری نتیجہ ہے۔ خارج سے عائد کردہ سزا اور عمل کے فطری نتیجہ کے اس فرق کو ایک اور مثال کی رُو سے سمجھئے۔ آقا اپنے ملازم سے کہتا ہے کہ اگر تم نے پھر برتن توڑا تو تمہیں پیٹوں گا۔ اور ایک ڈاکٹر مریض سے کہتا ہے کہ اگر تم نے پرہیز نہ کیا تو پھر بخار ہو جائے گا۔ دونوں مستقبل کے متعلق کہہ رہے ہیں اور دونوں میں تکلیف کا پہلو مضمر ہے۔ لیکن آقا جو کہہ رہا وہ اس کا حکم ہے اور ڈاکٹر نے جو کچھ کہا ہے وہ عمل کے فطری نتیجہ کی پیش گوئی ہے۔ قرآن کریم افراد یا اقوام کی مختلف روشوں کے بعد جہاں کہتا ہے کہ "وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ" (وغیرہ) انہیں الم انگیز عذاب ہوگا۔ تو یہ آقا کا حکم نہیں، غلط عمل کے فطری نتیجہ کی پیش گوئی (PREDICTION) ہے جو مستقبل میں سامنے آئے گا۔ "مستقبل" کی اہمیت آیت کے اگلے حصہ میں سامنے آئے گی۔ یہ ہے خدا کا وہ تصور جو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔

بات یوں شروع ہوئی تھی کہ (اللہ تعالیٰ نے کہا تھا) تم نے ہمیں پکارا اور کہا کہ سفرِ زندگی طے کرنے کے لئے صحیح راستہ کی طرف تمہاری راہنمائی کی جائے۔ تمہیں یہ راہنمائی اس الکتاب میں ملے گی جو تمہارے شکوک و شبہات اور ظن و تخمین کی پیدا کردہ الجھنوں کو دور کرکے تمہارے قلب میں اطمینان پیدا کر دے گی۔ لیکن اس راہنمائی سے وہی لوگ مستفید ہو سکیں گے جو یہ چاہیں کہ وہ راستہ کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس وضاحت کے بعد بھی سفر کے لئے قدم اُسی کا اُٹھ سکے گا جسے یہ یقین حاصل ہو کہ راستہ کے متعلق جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے وہ بالکل صحیح اور سچ ہے۔ جب تک اسے یہ یقین حاصل نہ ہو وہ

سفر کے لئے قدم نہیں اٹھائے گا۔ اس راستہ کو کبھی اختیار نہیں کرے گا۔ مستقبل کے متعلق اس طرح یقین حاصل کرنے کا نام ایمان رکھا گیا۔ لیکن اس ایمان کے متعلق کہا گیا کہ

(۲/۳) اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ

سوال یہ ہے کہ غیب کیا ہے؟ ایمان کے معنی (FAITH) کرنے سے جس دشواری کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں وہ اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب اس کے ساتھ غیب کا اضافہ کر دیا جائے۔ ایمان بالغیب کا عام طور پر مفہوم لیا جاتا ہے "ان دیکھے خدا یا ایسے ہی دیگر حقائق پر ایمان"۔ اس کے بعد کہا یہ جاتا ہے کہ جس خدا (یا حقائق) پر ان دیکھے ایمان لایا جائے اُن میں علم و عقل، دلیل و برہان اور غور و فکر کی کہاں گنجائش ہو سکتی ہے؟ لہٰذا سچا اور پکا ایمان وہی ہے جو بلا ثبوت بلا دلیل لایا جائے۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ تصور قرآن کریم کے پیش کردہ تصوّر کے خلاف ہے۔ بنا بریں ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ ایمان بالغیب کا صحیح قرآنی مفہوم کیا ہے

غیب کے بنیادی معنی ہیں، وہ جو نگاہوں سے پوشیدہ ہو۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ شے یا حقیقت، کہیں موجود ضرور ہو۔ لہٰذا غیب ان اشیاء یا حقائق کے متعلق کہا جائے گا جو کہیں موجود تو ہوں لیکن انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہوں۔ قرآن کریم نے اس کی مزید وضاحت، اس کے بالمقابل اس کی ضد لفظ "شہادت" لا کر خود ہی کر دی ہے۔ اس میں خدا کو عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ (۵۹/۲۲) کہا گیا ہے۔ مشہود کے بنیادی معنی تو یہی ہیں کہ وہ شے سامنے موجود ہو، لیکن اس مفہوم میں وسعت پیدا کر کے ان حقائق کو بھی مشہود کہا جاتا ہے جو انسانی حواس کی زد میں آ جائیں۔ اس ذریعۂ علم کو ادراک بالحواس (SENSE PERCEPTION) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو غیب اور شہود کے مختلف مدارج ہوں گے، مثلاً:

خارجی کائنات کی قوتیں

(۱) کائنات میں بے شمار ایسی اشیاء یا قوتیں ہیں جو علم انسانی کی کسی ایک سطح پر مشہود نہیں ہوتیں۔ یعنی ادراک بالحواس کی زد میں نہیں آتیں۔ لیکن جب اس سے اگلے دور میں انسانی معلومات کا دائرہ وسیع اور اس کے علم کی سطح بلند ہو جاتی ہے تو ان میں سے کئی ایسی قوتیں جو پہلے غیب تھیں مشہود ہو کر سامنے آ جاتی ہیں۔ مثلاً: ایٹم اور اس کی بے پناہ قوتیں تخلیقِ کائنات کے پہلے دن سے اسی فضا میں موجود تھیں لیکن وہ انسانی حواس سے اوجھل تھیں۔ ہمارے زمانے میں وہ مشہود ہو کر سامنے آ گئی ہیں یا آ رہی ہیں۔

قرآن کریم نے اپنے دعاوی کے ثبوت کے اثبات کے سلسلہ میں یہ بھی کہا ہے کہ: سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَلَمْ یَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ (۴۱/۵۳)

ہم، عالم انفس و آفاق میں چھپی ہوئی آیات (نشانیوں) کو رفتہ رفتہ سامنے لاتے جائیں گے تاآنکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت ثابتہ ہے۔ واضح رہے کہ غیب اور شہادت کے امتیازات انسان کے محدود علم کی بنا پر ہیں۔ ورنہ علم خداوندی میں تو کوئی شے غائب ہے ہی نہیں، ہر شے اور حقیقت مشہود ہے —— وہ جب کہتا ہے کہ خدا کو غیب کا علم بھی ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے ان اشیاء یا حقائق کا علم جو انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ قرآن کریم نے اس آیت میں کہا ہے کہ جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائیگا، کائنات کے غیاب ایک ایک کرکے مشہود ہوتے جائیں گے اور وہ اس امر کی شہادت دیں گے کہ قرآن مجید نے اس باب میں جو دعویٰ کیا تھا وہ مبنی بر حقیقت تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ قرآن کریم کے ہر دعوے کا مشہود ثبوت انسانوں کے سامنے آجائے گا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ قرآنی دعاوی اور حقائق کے متعلق جو کچھ سمجھا جاسکتا تھا وہ علم انسانی کے کسی ایک دور میں سمجھا جاچکا ہے اور اس کے ماحصل میں نہ کوئی تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ، خود انسانی علم اور قرآنی شہادات کے خلاف ہے۔ ایک چیز ہے انسانی زندگی کے لئے راہنمائی اور قرآنی قوانین و اقدار۔ انہیں قرآن نے محکمات کہکر پکارا ہے (۳/۷) یہ نہایت واضح اور متعین ہیں۔ اس لئے یہ تو ہر دور میں بخوبی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ لیکن دوسری چیز ہے قرآن کریم میں پیش کردہ حقائق جنہیں اس نے متشابہات کہا ہے (۳/۷) یعنی وہ مجرد حقائق جنہیں تشبیہات کے ذریعہ ہی سمجھایا جاسکتا ہے[1] ان کے متعلق کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ کسی ایک دور میں یا کسی ایک فرد یا افراد نے ان پر کاملاً احاطہ کر لیا ہے۔ رموز و اسرار فطرت کے متعلق سائنسدانوں کا اعتراف و اعلان ہے کہ اس باب میں "حرف آخر، آخری انسان کے لئے چھوڑ دینا پڑتا ہے"[2] سائنس کے متعلق تو یہ کہہ نہیں سکتا، لیکن قرآنی حقائق کے متعلق تو اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کا کاملاً احاطہ نوع انسان کے دور آخر پر ہی رکھا جاسکتا ہے۔

(۲) بعض ایسے حقائق بھی ہیں جنکا انسانی حواس کی زد میں آنا ممکن ہی نہیں۔ مثلاً ذات باری تعالیٰ کی کنہ و حقیقت یا مرنے کی بعد کی زندگی کی کیفیات۔ قرآن کریم نے جب خدا کے متعلق کہا ہے کہ: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (۶/۱۰۳) انسانی نگاہیں خدا کا ادراک نہیں کرسکتیں، لیکن علم خداوندی، ہر شے کا احاطہ کئے ہوتے ہے" تو اس سے یہی بتانا مقصود تھا۔ حتّٰکہ اس نے یہاں تک کہدیا ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (۴۲/۱۱) تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ذات خداوندی

---

[1] تفصیل ان کی اپنے مقام پر آئے گی۔

[2] THE GREAT DESIGN (P. 52)

کی کنہ دحقیقت کو کسی شئے کی مثال دیکر بھی سمجھایا نہیں جا سکتا، کہ شئے کوئی بھی ہو، بالآخر محسوس ہو گی اور ذاتِ خداوندی محسوسات کی حد سے ماوراہے۔ لہ

ماورائے سرحدِ ادراک لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان حقائق نامشہود وغیر محسوس کے متعلق غور و فکر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے کارگہِ کائنات اور اس میں کارفرما عناصر و قوانین کو آیات اللہ کہکر پکارا ہے۔ آیت کے معنے ہوتے ہیں ایسی علامت یا نشانی جس سے کسی شئے کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔ لہٰذا اشیاءِ فطرت اور نظامِ کائنات ایسی علامات ہیں جن پر غور و فکر سے ہستیِ باری تعالیٰ کے متعلق فکری طور پر اندازہ ہو سکتا ہے۔ کائنات میں (بالخصوص مابعدالطبیعات سے متعلق) کتنے بسیط حقائق (ABSTRACT TRUTHS & REALITIES) ہیں جنہیں غور و فکر کی رو سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حیاتِ آخرت کا تعلق یکسر مابعدالطبیعاتی حقائق سے ہے۔ اسی سورۃ بقرۃ کی آیات (۲/۲۱۹-۲۲۰) میں کہا گیا ہے کَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ "ہم اس طرح آیات کو واضح کئے چلے جاتے ہیں تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کر سکو"۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں، اس دنیا اور اس دنیا کی زندگی کے ساتھ آخرت پر غور و فکر کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ اس زندگی کی کنہ دحقیقت تو سمجھ میں نہیں آسکتی لیکن (قرآنی روشنی میں) غور و فکر کے بعد اس کا اثبات اور اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ یہ حقائق محسوس طور پر تو نگاہوں کے سامنے نہیں آسکتے لیکن ایمان بالغیب کا یہ گوشہ بھی علم و بصیرت اور تفکر و تدبر کے احاطہ سے باہر نہیں۔

(۳) ایمان بالغیب کی ایک اور شکل بھی ہے۔ ایک کسان کے پاس تھوڑا سا گندم رکھا ہے جو اس کی اور اس کے بچوں کی پرورش کے کام آسکتا ہے۔ وہ گندم کی بوری کو اٹھاتا ہے اور اسے اپنے کھیت کی مٹی میں ملا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہر روز صبح کے وقت اٹھتا ہے۔ سارا دن اس کھیت میں جان مار کر محنت کرتا ہے اور شام کو خالی ہاتھ واپس آجاتا ہے۔ وہ ایسا ایک دن، دو دن نہیں کرتا، مسلسل اور متواتر مہینوں تک، اسی طرح کرتا رہتا ہے۔ اس کے اس پروگرام اور اس کے نتائج

اَن دیکھے نتائج کو نہ جاننے والے اسے یقیناً پاگل کہیں گے کہ یہ کسی دیوانے ہی کا کام ہو سکتا ہے کہ وہ مہینوں صبح سے شام تک جان مارے اور اس سے اُسے حاصل کچھ نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس کے لئے اس کا جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ اس کا جواب بڑا آسان ہے، اور وہ یہ کہ اگرچہ سرِدست اس کی محنت کے محسوس نتائج

لہ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ذاتِ خداوندی کی معرفت (پہچان لینے) کا مطالبہ نہیں کیا۔ اسپر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ معرفتِ ذاتِ خداوندی انسان کے لئے ممکن ہی نہیں۔

سامنے نہیں آرہے لیکن اسے یقین ہے کہ یہی چند دانے جنہیں اس نے مٹی میں ملا دیا ہے، ایک دن، پختہ گندم کی شکل میں بوریاں بھر کر اس کے گھر میں آجائیں گے۔ کسی پروگرام کے ان دیکھے نتائج پر اس طرح یقین کرنا بھی ایمان بالغیب کہلاتا ہے۔

اس کسان کے متعلق تو پھر بھی کہا جائے گا کہ وہ اس پروگرام کے محسوس نتائج کو اس سے پہلے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس سلسلہ میں اسے صرف اس یقین کی ضرورت تھی کہ اگر اس پروگرام پر صحیح طریق سے عمل کیا جائے تو اس کے محسوس نتائج سامنے آکر رہتے ہیں۔ لیکن ایسے پروگرام بھی تو ہوتے ہیں جنہیں پہلی بار شروع کرنا ہوتا ہے۔ اس کے محسوس نتائج کی کوئی نظیر یا مثال اس سے پہلے سامنے نہیں ہوتی۔ اس قسم کے پروگرام کے لئے آمادہ بہ عمل ہونے کے لئے ایک ہی جذبۂ محرکہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ جو شخص اس پروگرام کو پیش کر رہا ہے اس کی باتوں کی صداقت پر کامل یقین ہو۔ اسے ایمان بالرسالت کہا جاتا ہے۔ اس کی صداقت کی شہادت اُس شخص کی سابقہ زندگی ہوتی ہے۔ جب قریش عرب نے رسول اللہ سے کہا کہ جس پروگرام پر عمل کرنے کے لئے آپ ہم سے کہتے ہیں اور اس کے درخشندہ نتائج کے متعلق اس قدر حزم و اعتماد کے ساتھ یقین دلاتے ہیں، ہم کس طرح مان لیں کہ یہ صحیح اور سچ ہے۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے صرف ایک فقرہ کہا اور وہ یہ کہ:-

خود داعی کی زندگی

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)۔

میں تم میں کوئی اجنبی نہیں، نو وارد نہیں کہ تمہیں میرے ماضی کے متعلق کچھ علم نہ ہو۔ میں نے اس سے پہلے اپنی پوری زندگی تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ جس قسم کی زندگی میں نے بسر کی ہے کیا اس سیرت و کردار کے انسان کے متعلق ایسا باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ بولنے لگ جائے ـــ کہنے والےؐ نے انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ یہ کہا اور سننے والوں میں سے کسی ایک نے بھی اس کی بات کو نہ جھٹلایا۔ وحیِ خداوندی نئے پروگرام پیش کرتی ہے اور یہ راستے ہوتے بھی بڑے کٹھن ہیں۔ اس وحی کو پیش کرنے والے کی بات کو سچا ماننے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ پہلے خود اس کے سچا ہونے پر یقین ہو۔ اسے ایمان بالرسالت کہا جاتا ہے۔

لیکن وہ اپنی بات کو بھی بلا دلیل و حجت نہیں منواتا۔ اپنے پیش کردہ نظام کی نتیجہ خیزی کے ثبوت کے لئے وہ سابقہ اقوام کی تاریخ پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ تم تاریخ کے ان شواہد پر غور کرو۔ ان سے یہ حقیقت واضح طور پر تمہارے سامنے آجائے گی کہ وہ نظام جسے میں پیش کر رہا ہوں، پہلی بار دنیا کے سامنے نہیں آیا، اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کیا جا چکا ہے۔ جس قوم نے اس نظام پر عمل کیا اُسے دنیا بھر کی سرفرازیاں اور خوشحالیاں نصیب ہو گئیں۔ جنہوں نے اس کے خلاف

تاریخی شواہد

اپنے خود ساختہ نظاموں پر عمل کیا وہ تباہی اور بربادی کے عمیق غاروں میں جا گریں۔ تم جاؤ اور ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کو دیکھو۔ ان پر ان کے مآل اور نتائج کے نقوش ابھرے ہوئے الفاظ میں مرتسم ملیں گے، اور میرے دعویٰ کا ثبوت بن کر سامنے آجائیں گے۔

دیکھئے یہاں پھر ایمان بالغیب کے لئے غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے۔ کتابِ خداوندی نے متقین کے اولین گروہ کے لئے جس راستے کی نشاندہی کی تھی وہ ان کے لئے بالکل نیا راستہ تھا۔ اس پر گامزن ہونے کے لئے اسی قسم کے ایمان بالغیب کی ضرورت تھی جس کا تذکرہ ان سطور میں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مخالفین اس راستہ میں حائل ہونے والی ہزار قسم کی مشکلات اور خطرات کی نشاندہی کرتے ہوں گے۔ اسے غلط ثابت کرنے کے لئے سینکڑوں باتیں کرتے ہوں گے۔ اس سے ہو سکتا تھا کہ

السابقون الاوّلون

اُن کے دل میں بھی وساوس ابھریں۔ لہٰذا اس کے لئے بڑے ہی پختہ عزم اور محکم ایمان کی ضرورت تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں قرآنِ کریم نے اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (۹/۱۰۰)۔ کہہ کر پکارا ہے اور ان پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے ہیں (۵۶/۱۰-۲۶) یہ حقیقت ہے کہ (PIONEERS) کا مقام بڑا بلند ہوتا ہے۔ جب ان کا بویا ہوا کھیت، پکی ہوئی فصل سامنے لے آتا ہے تو اسے دیکھ کر دوسرے لوگ فوج فوج اس نظام کی طرف لپک کر آجاتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اسے جماعتِ مومنین کی از بس جانکاہ کوششوں اور قربانیوں کا فطری نتیجہ بتایا ہے (۱۱۰/۱-۲)۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعد میں آنے والوں کے لئے اس نظام کے محسوس نتائج، اس کی طرف کشاں کشاں چلے آنے کا جذبۂ محرکہ بن جاتے ہیں لیکن انہیں بھی ایک اور یقین اور ضمانت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جس قانون کے مطابق اس نظام نے ایک دفعہ یہ نتائج پیدا کر دیئے ہیں وہ قانون اٹل ہے، غیر متبدل ہے۔ اس کی رو سے جو نتائج ایک دفعہ پیدا ہو چکے ہیں، جب بھی اس کے مطابق عمل کیا جائے گا وہی نتائج پیدا ہو جائیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم بار بار سامنے لاتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲ و ۳۵/۴۳) کائنات میں یہی قانون شروع سے کارفرما چلا آ رہا ہے، یہی آج بھی نافذ العمل ہے، اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تم کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ سارا قرآن اسی حقیقت کا مظہر ہے کہ قوانینِ خداوندی

قانون کی محکمیت

کی نتیجہ خیزی میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی خواہ وہ خارجی کائنات میں کارفرما قوانینِ فطرت ہوں یا انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی سے متعلق قوانینِ قرآنی۔ یہ تمام نظامِ کائنات اس حسن و خوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ جن قوانین پر اس کی بنیادیں استوار ہیں ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ انہی قوانین کے غیر متبدل ہونے پر یقینِ محکم تھا جس کی بنا پر (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) نبی اکرم صلعم نے اپنے مخالفین سے کہا

کہ اگر اس قدر نظری دلائل و براہین کے بعد بھی تم اس کی صداقت کے قائل نہیں ہوتے تو اس کے بعد ایک ہی طریقہ باقی رہ جاتا ہے کہ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ (۶/۱۳۶)۔ تم اپنے نظام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ میں اپنی جگہ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں نہ میں تمہارے پروگرام میں دخل دوں گا نہ تم میرے پروگرام میں رکاوٹ ڈالو۔ اس کے بعد تھوڑا سا انتظار کرو ـــــ اتنا سا انتظار جتنا بیج بونے اور فصل کے پکنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ ـــــ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (ایضاً) تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ کامیابی کس کے حصہ میں آتی ہے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (ایضاً) ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی، تم کہتے ہو کہ یہ غلط ہے۔ دنیا میں قومیں ہر قسم کا ظلم و استبداد کرتی ہیں اور پنپتی چلی جاتی ہیں۔ یہ ہمارا اپنا بھی تجربہ ہے۔ اس کے جواب میں کہا کہ تھوڑا سا انتظار کرو۔ یہ حقیقت مشہود و محسوس طور پر تمہارے سامنے آجائے گی کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ یہ خدا کا وہ قانون ہے جس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔

(۴) غیب و شہادت کی ایک صورت اور بھی ہے۔ علم الافلاک کے ماہرین نہایت حتم و یقین کے ساتھ بتا دیتے ہیں کہ آج سے سو سال کے بعد فلاں دن، فلاں وقت، سورج کو گہن لگے گا۔ اور ٹھیک اس دن، اسی وقت، سورج کو گہن لگ جاتا ہے۔ توہم پرستی کے زمانے میں اس قسم کی پیش گوئیاں کرنے والوں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ مافوق الفطرت قوتوں کے مالک ہیں۔ اس لئے ان کی پرستش ہوتی تھی۔

پیش گوئیاں

لیکن علمِ انسانی کی وسعت کے بعد آج یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح سامنے آگئی ہے کہ اس میں فوق الفطرت عنصر کوئی نہیں۔ یہ صرف اِس علم کا نتیجہ ہے کہ چاند سورج کی گردشیں کس قانونِ فطرت کے تابع ہیں اور یہ کہ وہ قانون غیر متبدل ہے جو شخص بھی اس قانون کا علم حاصل کرلے، سو کیا، ہزاروں سال پہلے، اس قسم کی پیش گوئیاں کر سکتا ہے۔

لیکن اس قسم کی پیش گوئیاں ان اشیاء کے متعلق تو کی جا سکتی ہیں جو صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں۔ جو قوانینِ فطرت کے تابع چلنے کے لئے مجبور ہیں اور جنہیں اپنی مرضی سے کچھ کرنے کا اختیار ہی حاصل نہیں۔ جو مخلوق اپنے فیصلے آپ کرنے کا اختیار رکھتی ہے اس کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی (انسان تو بہت بڑی صاحبِ اختیار مخلوق ہے۔ آپ ایک چھوٹی سی مخلوق کے ضمن میں مثال کے طور پر اس حقیقت کو سامنے لائیے) دنیا کے دس عظیم القدر سائنٹسٹ میز کے گرد بیٹھے تحت الثریٰ سے اوجِ ثریا تک اشیائے فطرت کے مستقبل کے متعلق پیش گوئیاں کرنے میں مصروف ہیں، اور وہ ایسی پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔ اُن کے سامنے میز پر ایک مکھی آکر بیٹھ جاتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک تو کجا، دس کے دس مل کر بھی یہ نہیں بتا سکیں گے کہ وہ مکھی وہاں سے اڑ کر اسی میز پر کہاں جا بیٹھے گی! آپ سوچئے کہ جب مکھی جیسی "صاحبِ ارادہ" جاندار کے متعلق اتنا بھی نہیں

بتایا جاسکتا کہ وہ مستقبل میں کیا کرے گی تو انسان جیسے صاحبِ اختیار و ارادہ کے مستقبل کے متعلق کوئی پیش گوئی کیسے کی جا سکتی ہے؟ انسانوں کے مستقبل کے متعلق پیش گوئیاں کرنے والے باطل کے دعویدار ہیں۔ کوئی دوسرا تو ایک طرف، قرآن کریم تو یہاں تک کہتا ہے کہ ایک فرد خود اپنے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور اس کی موت کس سرزمین میں واقع ہوگی:

مَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ (۳۱/۳۴) [1]

یہی وہ غیب ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں (۲۷/۶۵) اس غیب کی چابیاں اسی کے پاس ہیں (۶/۵۹)۔ اور تو اور خدا کے رسول تک کو بھی از خود غیب کا علم نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ نے بھی (بزبانِ وحی) اپنے متعلق فرمایا لَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶/۵۰)۔ غیب کا علم میں بھی نہیں جانتا۔ امورِ غیبیہ میں سے رسول کو بھی انہی باتوں کا علم ہو سکتا تھا جو اُسے خدا کی طرف سے بذریعہ وحی بتائی جاتی تھیں۔ چنانچہ ایسے علم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح کر دی کہ ذٰلِكَ مِنْ أَنۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ (۳/۴۳)۔

اس قسم کے غیب کا علم صرف خدا کو حاصل ہے

یہ وہ غیب کی باتیں ہیں جنہیں ہم بذریعہ وحی تمہیں بتا رہے ہیں۔ اور چونکہ وحی کا سلسلہ ذاتِ رسالت مآب پر ختم ہو گیا اس لئے اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے غیب کا علم نہیں مل سکتا۔ یہ جو نام نہاد "روحانیت" کے مدعی آئے دن دعوے کرتے رہتے ہیں کہ ہمیں غیبی امور کا علم خدا کی طرف سے حاصل ہوتا ہے اور اُن کے متعلق ہم پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں، یہ بالفاظِ دیگر، دعوائے نبوت ہے، کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ اس قسم کا غیب کا علم، وحی کے ذریعے صرف رسولوں کو دیا جاتا تھا۔ اس قسم کی پیش گوئیاں کرنے والوں کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ ان کے یہ دعاوی رَجْمًا بِالْغَيْبِ (۱۸/۲۲) سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ یعنی اندھیرے میں تیر تکے چلانے والے، یونہی قیاس آرائیاں کرنے والے ہیں۔ اگر اس قسم کی قیاس آرائیاں کرنے والے خدا کی طرف سے علم پانے کا دعویٰ نہیں کرتے تو ہمیں ان سے کچھ تعرض نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم اتنا ہی کہیں گے کہ یہ غیب کا علم نہیں، محض انسانی قیاسات ہیں۔ لیکن جو یہ کہیگا کہ اُسے یہ علمِ غیب خدا کی طرف سے ملتا ہے (اور اسے کشف و الہام کہا جاتا ہے) تو ہم بلا تامل کہدیں گے کہ وہ اپنے اس دعوے میں سچا نہیں، کیونکہ خدا کا ارشاد ہے کہ اس قسم کا علم صرف وحی کی رو سے حضراتِ انبیاء کرام ؑ کو حاصل ہو سکتا تھا اور سلسلۂ وحی ختم ہو چکا ہے۔ قرآن کریم نے صرف وحی کا ذکر کیا ہے۔ کشف و الہام کا اس میں کہیں ذکر نہیں۔

---

[1] اس پوری آیت کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ جو حضرات مسئلہ تقدیر سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ میری تصنیف "کتاب التقدیر" کا مطالعہ فرمائیں، جس میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ جو لوگ عزمِ سفر رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں اس راستہ کا پتہ نشان دے دیا جائے جو انہیں بلاخوف وخطر ان کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے، تو یہ "الکتاب" انہیں اس قسم کی راہنمائی دے سکتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کتاب کا بتایا ہوا راستہ وہ ہوگا جس پر یہ اس سے پہلے گامزن نہیں ہوتے، اس لئے وہ اسی صورت میں اس راستہ کو عزم اور یقین کے ساتھ اختیار کر سکیں گے جب انہیں اس راستے کے صحیح اور بے خطر ہونے پر پورا پورا یقین ہو۔ لہٰذا متقین کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس اَن دیکھے راستے کی صحت (یعنی اس نئے نظام کے اَن دیکھے نتائج) پر یقینِ کامل رکھتے ہوئے عازمِ سفر ہوں۔ اس کے بعد انہیں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کیا کرنا ہوگا، اس کے متعلق کہا:

(۲/۳) وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ

"يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ" کا ترجمہ کیا جاتا ہے "وہ نماز قائم کرتے ہیں" "نماز پڑھتے ہیں" کا تو مطلب سمجھ میں آسکتا ہے لیکن "نماز قائم کرتے ہیں" سے بات واضح نہیں ہوتی۔ یقیمون کا مادہ (ق-و-م) ہے۔ قَامَ، قِيَامًا کے معنے ہوتے ہیں کھڑا ہونا، متوازن ہونا، کسی معاملہ کا اعتدال اور توازن پر ہونا، محکم اور استوار ہونا۔ ثابت اور دائم رہنا اَقَامَ کے معنے ہیں اُسے درست اور سیدھا کیا۔ اس کا توازن قائم رکھا۔ ان معانی کو سورۃ فاتحہ میں اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اقامتِ صلٰوۃ کے معنے ہوں گے الصلٰوۃ کو محکم اور استوار کرنا۔ متمکن کرنا۔ (ESTABLISH) کرنا۔ مار ماڈیوک پکتھال نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن مجید میں یقیمون کے یہی معنے لکھے ہیں (اگرچہ اس کے ساتھ الصلٰوۃ کا ترجمہ روشِ عامہ کے تتبع میں (WORSHIP) ہی کیا ہے) اس سے واضح ہے کہ "الصَّلٰوۃ" کوئی ایسی چیز ہے جس کا متمکن اور مستحکم کیا جانا مطلوب و مقصود ہے۔ نماز کے متعلق آگے چل کر گفتگو کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ دین کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ قرآنِ کریم کی اصطلاحات کو علیٰ حالہٖ رکھا جائے ان کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ ان کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی جگہ کسی دوسری زبان کے الفاظ رکھ دینے سے نہ صرف یہ کہ اُن کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ وہ مفہوم مسخ ہو جاتا ہے۔ الصلٰوۃ کو الصّلٰوۃ ہی کہنا چاہئے اور اس کا مفہوم عربی لغت اور قرآنِ کریم سے متعین کرنا چاہئے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم میں اقامتِ صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کی اصطلاحات دین کے بنیادی ارکان (عماید اور ستون) کی حیثیت سے بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اس سے ان کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔

لغت اور قرآن کریم کی رُو سے مفہوم متعین کرنے کے سلسلہ میں اس اہم نقطہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ لغت سے وہ بنیادی تصوّر (CONCEPT) سامنے آجاتا ہے جو اس لفظ کے مادہ میں مضمر ہوتا ہے اور جس کے لئے اُسے عرب

استعمال کرتے تھے۔ (اسے محاورۂ عرب کہا جاتا ہے) لیکن جب ان الفاظ میں سے کسی لفظ پر (الْ) داخل کرکے، اُسے

قرآنی اِصطلاحات کا مفہوم

معرفہ بنا لیا جائے تو وہ قرآنی اصطلاح ہو جاتا ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم قرآن کریم سے متعین کیا جائے گا۔ اس کا ذریعہ "تصریفِ آیات" ہے۔ یعنی قرآن کریم جس جس مقام پر اس اِصطلاح کو لایا ہے وہاں سے یہ اخذ کرنا کہ اس کا اس باب میں مقصد و مطلب کیا ہے۔ محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات سے (غور و تدبر کے بعد) قرآنِ مجید کے مفردات و اصطلاحات کا مفہوم واضح طور پر سامنے آجاتا ہے مثلاً لفظ صلٰوۃ کے بنیادی معانی محاورۂ عرب کی رُو سے متعین کئے جائیں گے۔ اور جب اَلصَّلٰوۃ کہا جائے گا تو یہ قرآنی اصطلاح ہوگی۔ اس پر دیگر قرآنی اصطلاحات کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ (قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہمنے بہر حال یہی طریق اختیار کیا ہے)۔

صلٰوۃ کے لغوی معنی

صلٰوۃ کا مادہ (ص۔ل۔و) ہے۔ ویسے اس کا مادہ (ص۔ل۔ی) بھی ہو سکتا ہے (لیکن یہ فنی بحث ہے جسے میں نے "لغات القرآن" میں بیان کیا ہے۔ اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں)۔ بنیادی طور پر اِس کے معنے ہوتے ہیں، کسی کے پیچھے پیچھے چلتے جانا۔ چونکہ عرب، نظری اور تجریدی حقائق کا مفہوم محسوسات کے ذریعہ واضح کیا کرتے تھے اس لئے ان کے ہاں گھُڑ دوڑ میں جو گھوڑا دوسرے نمبر پر اس طرح مسلسل دوڑتا جائے کہ اُس کی کنوتیاں پہلے نمبر والے گھوڑے کی سُرین سے مِل رہی ہوں تو وہ آگے جانے والے گھوڑے کو "سَابِقْ" کہتے تھے اور اس دوسرے نمبر والے گھوڑے کو اَلْمُصَلِّیْ۔ اسی بنا پر امام راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (۷۴/۴۳)۔ ہم مصلین میں سے نہیں تھے۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے۔ لغت کی اہم کتاب تاج العروس میں ہے کہ اس مادہ کے معنوں میں لزوم (وابستگی) یعنی کسی کے ساتھ لگے رہنے اور چمٹے رہنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس جہت سے قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ صلٰوۃ کے معنے ہوں گے نظامِ خداوندی سے وابستگی۔ حدود اللہ کے اندر رہنا۔ کتاب اللہ سے چمٹے رہنا۔ اس بنا پر صلٰوۃ کے معنے خدا کی طرف سے متعین کردہ فرائضِ منصبی کے بھی آتے ہیں۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ "اَلصَّلٰوۃ" سے مفہوم صِرف نماز نہیں۔ اس میں پورے کے پورے قوانین و احکامِ خداوندی اور اس کے عائد کردہ فرائضِ منصبی آجاتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں ہم نے دیکھا ہے کہ مؤمنین کی دعا ہوتی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵)۔ اور سورۂ ہود میں ہے اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱/۵۶)۔ میرا رب صراط مستقیم پر ہے۔ نظر بظاہر یوں دکھائی دے گا گویا خدا صراطِ مستقیم پر آگے آگے جا رہا ہے اور مومنین اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی دعا مانگ رہے ہیں۔

(صلوٰۃ میں یہی مفہوم مضمر ہے) لیکن اسطرح کا تشبیہی مفہوم خدا کے تنزیہی تصور کے خلاف ہے اس لئے اس کا مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ وہ نظامِ کائنات، جو قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہوئے اپنے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ یہ مفہوم سورۃ "النور" کی اس آیت سے نکھر کر سامنے آجاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۲۴/۴۱) "کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ ارض و سمٰوٰت کی ہر شے اور فضائے سماوی میں پرفشاں پرندے خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کو جانتا ہے۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب خدا کے علم میں ہے"۔ لفظِ تسبیح کی تشریح تو آگے چل کر اپنے مقام پر آئے گی یہاں مجملاً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ اس کے معنے ہوتے ہیں، مقصدِ پیشِ نظر کے حصول کے لئے بھرپور کوشش کرنا اور اس کے لئے اپنی بھرپور توانائیاں صرف کر دینا۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کو جانتی ہے۔ بات واضح ہے کہ کائنات کی ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائضِ منصبی کیا ہیں۔ اور یہ بھی کہ ان کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہے جس کے لئے انہیں مصروفِ جد و جہد رہنا ہے۔ یہاں سے صلوٰۃ کا بنیادی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

دوسرے مقام پر قرآنِ کریم نے خود انسانوں کے متعلق وضاحت کر دی ہے کہ الصلوٰۃ کا مفہوم کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا۔ اس کے قیام سے کیا حاصل ہوتا ہے اور اس کے ضائع کر دینے سے کیا تباہی آتی ہے۔ سورۃ مریمؑ میں پہلے مختلف انبیائے کرامؑ کا تذکرہ آیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہیں خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ (۱۹/۵۹)۔ ان کے بعد، ان کی امتوں میں ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے الصلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ انہوں نے کیا کیا جس سے الصلوٰۃ کا ضیاع ہو گیا۔ کہا وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (۱۹/۵۹)۔ وہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور اتباعِ جذبات دو متضاد چیزیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے [دیکھئے (۱/۲)] انسانی جذبات کی تسکین بُری چیز نہیں بشرطیکہ ان کا اتباع حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے۔ یہ تباہیاں اس وقت لاتے ہیں جب یہ سرکش اور بیباک ہو جائیں لہٰذا

ضیاعِ صلوٰۃ

الصلوٰۃ کے معنے ہوئے انسانی خواہشات و جذبات کی، قوانینِ خداوندی کے مطابق تسکین و بر و مندی۔ اُن سے، حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کام لینا۔ انہیں قوانینِ الٰہیہ کے پیچھے پیچھے چلانا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اجتماعی نظام کے تابع ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ نظام جس میں مختلف افراد اپنے اپنے مفادات کے پیچھے بھاگنے کی بجائے خدا کے متعین کردہ نصب العین کی طرف بڑھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اقامتِ صلوٰۃ کو

ایک اجتماعی فریضہ قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے یہ بھی بتایا کہ الصلوٰۃ کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے جب جماعتِ مومنین کو تمکن فی الارض حاصل ہو۔ ان کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ چنانچہ سورۃ الحج میں ہے: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوگا، ان کی اپنی مملکت قائم ہوگی (۲۲/۵۵) تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ معروف احکام نافذ کریں گے اور منکر سے روکیں گے۔ بہ ظاہر ہے کہ نماز پڑھنے اور (ڈھائی فیصد) زکوٰۃ دینے کے لئے اپنی حکومت کی ضرورت لاحق نہیں ہوسکتی۔ مروجہ طریق پر یہ فرائض ہر حکومت میں ادا کئے جا سکتے ہیں۔ ہمیں انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں بھی نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حق حاصل تھا۔ اور آج ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا وہ مفہوم نہیں جو آج کل لیا جاتا ہے۔ یہ وہ فرائض ہیں جو صرف اپنی آزاد مملکت میں ادا کئے جا سکتے ہیں (زکوٰۃ کے متعلق گفتگو اپنے مقام پر آئے گی یہاں ہم صرف صلوٰۃ تک محدود رہنا چاہتے ہیں)۔

اپنی آزاد مملکت کی ضرورت

اسلامی مملکت کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں ہے کہ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۴۲/۳۸) "مومنین وہ ہیں جو خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ یعنی اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں اور اپنے تمام معاملات کو باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔ اور جو رزق خدا نے انہیں دیا ہوتا ہے اسے نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ہیں"۔ (یہی ایتائے زکوٰۃ کا مفہوم ہے) یہاں سے بھی ظاہر ہے کہ الصلوٰۃ وہ نظامِ مملکت ہے جس میں تمام امور جماعتِ مومنین کے باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں اور جس کا بنیادی فریضہ نوعِ انسان کی ربوبیت ہے۔ چونکہ اسلامی نظام کتاب اللہ کے کے قوانین و اقدار کے عملی نفاذ کے لئے قائم ہوتا ہے اس لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۷/۱۷۰)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں اور اس طرح اقامتِ صلوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ الصلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہے، اسے قرآن کریم نے حضرت شعیبؑ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں واضح کر دیا ہے۔ سورہ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کے سامنے دعوتِ خداوندی کو پیش کیا تو حسبِ معمول انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ شدید کشمکش کے بعد قوم نے حضرت شعیبؑ سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ آپ بالآخر چاہتے کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں صلوٰۃ کی آزادی چاہتا

الصلوٰۃ اور معاشیات

ہوں (کہ اس میں آپ لوگ مخل نہ ہوں) اس مذہب پرست قوم نے اپنے خیال کے مطابق سمجھا کہ یہ اپنے طریق پر خدا کی پرستش کی اجازت چاہتے ہیں اس میں کونسی حرج کی بات ہے۔ یہ جسطرح جی چاہے پوجا پاٹ کر لیا کریں۔ چنانچہ وہ اس پر رضامند ہو گئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انہوں نے دیکھا کہ صلوٰۃ سے حضرت شعیبؑ کا مطلب وہ نہیں تھا جسے وہ سمجھے بیٹھے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷)۔ اے شعیبؑ! یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور یہ کہ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف نہ کریں۔ اس صلوٰۃ کی تو ہم اجازت نہیں دے سکتے۔

آپ اس آیۂ جلیلہ کے آخری حصہ پر غور کیجئے، جس سے واضح ہے کہ صلوٰۃ صرف نماز کا نام نہیں۔ اس کا دائرہ معاشیات تک کو بھی محیط ہوتا ہے۔

ہم نے سورۂ حج کی آیت (۲۲/۴۱) میں دیکھا ہے کہ کہا یہ گیا ہے کہ جب جماعتِ مومنین کی اپنی مملکت قائم ہو گی تو وہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض سرانجام دیں گے۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵)۔ یہ حقیقت ہے کہ الصلوٰۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ فحشاء کی تفصیلی بحث تو آگے چل کر سامنے آئے گی۔ یہاں ہم اپنے آپ کو منکر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے، نہی عن المنکر، مملکت کا فریضہ بتایا گیا اور یہاں یہ کہا گیا کہ یہ کام الصلوٰۃ کرے گی۔ یہاں سے بھی ظاہر ہے کہ الصلوٰۃ اس نظام ہی کا نام ہے جس کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ جہاں تک ہماری نمازوں کا تعلق ہے یہ واضح ہے کہ ان سے فحشاء اور منکرات نہیں رکتے۔ بے نمازوں کو تو چھوڑیئے، کتنے نمازی ہیں جو بڑی باقاعدگی سے نمازیں پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود منکرات کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا منکرات، نظامِ صلوٰۃ (اسلامی نظامِ مملکت) ہی سے رک سکتے ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ کا قیام کسقدر عظیم انقلابی مہم چاہتا ہے، اس کی وضاحت قرآن کریم نے صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعون کی داستانِ تصادم میں نہایت دلنشین انداز میں بیان کی ہے۔

انقلابِ عظیم

بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ جب حضرتِ موسیٰؑ طور کی چوٹیوں پر گئے اور وہاں خدا نے انہیں پکارا تو سب سے پہلے یہ کہا۔ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (۲۰/۱۳)۔ اے موسیٰؑ! یہ یونہی کوئی اتفاقی حادثہ نہیں کہ تم یہاں آ گئے ہو اور ہم نے تم سے باتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔ ہم نے تمہیں ایک خاص مقصد اور اپنے ایک عظیم پروگرام کی سرانجام دہی کے لئے منتخب کیا ہے۔ دوسری جگہ کہا کہ یہ انتخاب بھی یونہی عمل میں نہیں آ گیا۔ اس کے لئے تمہیں بڑی جانکاہ کٹھالیوں میں سے گزارا گیا ہے۔ جب تم ان پیمانوں پر پورے اترے تو ہم نے تمہیں اپنے لئے منتخب کیا ہے (۲۰/۴۱)

لہٰذا تم ہماری بات دل کے کانوں سے سنو۔ پہلی بات تو یہ یاد رکھو کہ اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ (۲۰/۱۴) ہمارے سوا، کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اس لئے محکومیت صرف ہماری اختیار کی جا سکتی ہے، کسی اور کی نہیں۔ فرعون نے تمہاری قوم کو اپنی غلامی اور محکومی کے شکنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ اس قوم کو اس کی غلامی کی زنجیروں سے چھڑا کر خدا کی محکومیت اختیار کرنے کے لئے آزاد کرانا ہے۔ اس کے لئے وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ (ایضاً) تمہیں نظامِ صلوٰۃ قائم کرنا ہے تاکہ ہمارا شرف بلند ہو۔ ہمارے نام کا ڈنکہ بجے۔ اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا (۲۰/۱۵)۔ فرعون جیسے مستبد سرکش حاکم کے نظامِ حکومت کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ صلوٰۃ (نظامِ خداوندی) کا قیام ایک عظیم انقلاب ہے۔ یہ انقلاب ابھی تک غیر محسوس طور پر پختگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ محسوس طور پر سامنے آجائے۔ وہ غیب سے مشہود ہو جائے۔

یہاں قرآنِ کریم انقلاب آفرینی کے سلسلہ میں ایک عظیم حقیقت کو چلتے چلتے دو لفظوں میں بیان کر گیا ہے۔

اِنقلاب کس طرح آتا ہے

اس نے کہا یہ ہے کہ جسے انقلاب کہا جاتا ہے وہ یونہی شباشب، یک لخت نہیں آجاتا۔ اس کے لئے ایک عرصہٴ دراز درکار ہوتا ہے (فساد تو راتوں رات برپا کیا جا سکتا ہے انقلاب اس طرح نہیں لایا جا سکتا) زمانے کے تقاضے اس کے لئے فضا ہموار کرتے ہیں۔ انسانی شعور میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ کچھ ایسے غیر محسوس انداز میں ہو رہا ہوتا ہے کہ نگاہیں اُسے بھانپ نہیں سکتیں غلط نظام کے تخریبی اثرات آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جب ان کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے تو اس نظام کا تختہ اُلٹنے کا وقت قریب آجاتا ہے۔ اس کے بعد ایک ہی جھٹکے سے اس نظام کی فلک بوس عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تبدیلی یک لخت واقعہ ہو گئی۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو سورۃ انبیاء میں نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ اس سورۃ کی آیات نمبر ۱۶ — ۱۱ (۲۱/۱۱-۱۶) کو سامنے لائیے اور ان کے اس مفہوم پر غور کیجئے جسے میں مفہوم القرآن سے پیش کر رہا ہوں۔ کہا گیا ہے:

> یاد رکھو! اگر تم قوانینِ خداوندی کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے جس طرح ہم نے تم سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ اور پھر اُن کے بعد ان کی جگہ دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔
>
> اُن کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔
>
> اُنہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس روش سے باز آجائیں لیکن وہ اِس

تنبیہہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ جب وہ محسوس طور پر سامنے آ گئے تو وہ لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت بھاگنے کا کونسا موقعہ تھا۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ اب واپس چلو، اپنی ان عیش سامانیوں کی طرف، جن کی سرشاریوں نے تمہیں اس طرح مدہوش کر رکھا تھا۔ تم اپنے ان محلات کی طرف پلٹو جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ سمجھا کرتے تھے وہاں چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ تم نے کن لوگوں کی محنتوں کے استحصال سے بنایا تھا اور اس پر تمہارا کیا حق تھا۔

اس وقت انہیں اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے اور اپنے کئے پر سخت متاسف۔

لیکن اُس وقت اس تاسف سے کیا فائدہ تھا۔ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آ جائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ برابر چلاتے رہے کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں ان پر وہ بیحد متاسف ہیں۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ایسے کر دیا جیسے کٹا ہوا کھیت، جس میں نشوونما کی صلاحیت باقی نہ رہے، یا بجھا ہوا شعلہ جس میں زندگی کی حرارت ختم ہو جائے۔

وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اس کارگہِ کائنات کو محض کھیل تماشہ کے طور پر پیدا کر رکھا ہے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ ہم نے اسے ویسے ہی پیدا نہیں کیا۔ اس کا ایک عظیم مقصد ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ کسی کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ افراد ہوں یا اقوام سب کے اعمال صحیح صحیح نتیجہ مرتب کر کے رہیں۔ (۲۱ / ۱۶-۱۱)

اس وضاحت کے بعد پھر آیئے اصل موضوع کی طرف۔ حضرتِ موسیٰؑ سے کہا یہ گیا کہ وہ انقلاب جو اس وقت تک ضمیرِ کائنات میں پہلو بدل رہا تھا، وقت آ گیا ہے کہ اب وہ محسوس طور پر سامنے آ جائے تاکہ ——— اور یہ "تاکہ" بڑا اہم ہے۔ اسے غور سے سنئے۔ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى (۲۰ / ۱۵) تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ مل سکے۔ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۲۰ / ۱۱۲)۔ کسی کو کسی قسم کے سلب و نہب اور ظلم و استحصال کا خطرہ نہ رہے۔

اس کے بعد کہا :

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴)

جاؤ فرعون کی طرف۔ وہ بڑا سرکش اور حدود فراموش ہوگیا ہے۔

جاؤ اور وہاں وہ انقلاب برپا کرو جس سے ظلم و استبداد مٹ جائے اور بنی اسرائیل ملوکیت کے فولادی شکنجوں سے آزادی حاصل کرلیں ـــــ یہ ہے مفہوم اقامتِ صلوٰۃ کا (۲۰/۱۴)۔

انقلابِ صلوٰۃ کی بنیادی شرط

لیکن اس قسم کی انقلاب آفرینی کے لئے سب سے پہلی اور بنیادی شرط وحدتِ امت اور اطاعتِ مرکز ہے۔ اگر امت میں تفرقہ پیدا ہوجائے اور اس کی مرکزیت باقی نہ رہے تو باطل کے نظام کی جگہ حق کے نظام کا قیام تو ایک طرف، قائم شدہ نظام بھی باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے جماعتِ مومنین سے یہ کہہ دیا تھا کہ اس مقصدِ عظیم کے حصول کا پروگرام یہ ہے فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا (۳۰/۳۰) تم اس نظام (دینِ خداوندی) کے قیام کے لئے اپنی تمام توجہات کو ایک مرکز پر مرکوز کردو۔ مُنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ (۳۰/۳۱) ہر طرف سے کٹ کر اسی کو اپنا نصب العینِ حیات قرار دے لو۔ وَاتَّقُوۡهُ، اس کے لئے راستے کی خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے رہو اور اس طرح اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ (ایضاً) نظامِ صلوٰۃ قائم کردو۔ یاد رکھو! اس کیلئے وحدتِ امت نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا تم توحید پرست ہوکر پھر سے مشرکین میں سے نہ ہوجانا (وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ (۳۰/۳۱)) یعنی مِنَ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزۡبٍۢ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ (۳۰/۳۲)۔ ان لوگوں میں سے نہ ہوجانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کردیا اور وہ گروہ گروہ ہوگئے، فرقوں میں بٹ گئے۔ اور اس کے بعد ان میں سے ہر فرقہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہوگیا کہ ہم حق و صداقت پر ہیں اور باقی سب گمراہ ہیں۔ حالانکہ جو امت فرقوں میں بٹ جائے اس میں حق و صداقت کہیں بھی باقی نہیں رہتا۔ حق و صداقت کا امین اجتماعی نظامِ حیات ہوتا ہے جس کی بنیاد وحدتِ امت و مرکزیت پر ہوتی ہے۔ یہ تھی قیامِ نظامِ صلوٰۃ کی اولین شرط۔ (آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ جب ہم نے صلوٰۃ کو نماز میں بدل دیا تو خود نماز ہی ہماری فرقہ بندی کی مظہر اور علامت بن گئی)۔

صلوٰۃ کے متعلق ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے (جیسا کہ ہم داستانِ حضرت شعیبؑ کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں) اس کے ڈانڈے اقتصادی نظام سے جاملتے ہیں اس لئے نظامِ صلوٰۃ کی مزید وضاحت کے لئے ہم اس آیت (۲/۳) کے باقی حصہ ـــــ یعنی وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ کو ساتھ ہی لیتے ہیں تاکہ صلوٰۃ اور انفاق کے امتزاج

سے پورے نظام کا نقشہ ہمارے سامنے آ جائے۔

(۲/۳) وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔

اسے متقین کی اگلی خصوصیت بتایا گیا ہے۔ ان الفاظ کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ "جو روزی ہم نے انہیں دی ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے مال و دولت کو خرچ کرتا ہے۔ لہٰذا اس میں متقین کی کیا خصوصیت ہے جو ان کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت پڑی کہ متقی وہ ہیں جو اپنے مال و دولت کو خرچ کرتے ہیں۔ اس کیلئے زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ وہ اپنے روپے پیسے کو احتیاط سے خرچ کرتے ہیں، اور فضول خرچی (اسراف و تبذیر) سے بچتے ہیں۔ اس کا حکم دیگر مقامات میں دیا گیا ہے (۲۷/۱۷، ۷/۳۱) لہٰذا متقین کی جو خصوصیت بتائی گئی ہے وہ یہی نہیں کہ وہ فضول خرچی سے بچتے ہیں۔ یہ خصوصیت اس سے کہیں بلند اور منفرد ہے۔

رِزق کا مفہوم

اس کے لئے پہلے لفظ رِزق کو لیجئے۔ ہر وہ شے، جس پر زندگی کا دار و مدار ہو اور جو اس کے لئے وجہ پرورش قرار پائے، رزق کہلاتی ہے۔ اس اعتبار سے آپ رزق کو سامانِ زیست کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ قرآن کریم کی رُو سے انسانی زندگی، اس کے طبعی جسم تک محدود نہیں۔ اس کے علاوہ انسانی ذات بھی ہے، جس کی نشوونما بہت ضروری ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے رزق میں وہ تمام سامان شامل ہوگا، جو انسانی جسم کی پرورش اور اس کی ذات (انسانی صلاحیتوں کے سرچشمہ) کی نشوونما کیلئے ضروری ہو۔ انسانی ذات کے نشوونما کے لئے رزق کے سلسلہ میں سورۃ الحج میں ہے کہ "جو لوگ خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے عندالضرورت اپنا گھر بار تک چھوڑ جائیں (یعنی ہجرت کریں) اور پھر وہ راستے ہی میں دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے قتل ہو جائیں یا ویسے ہی کسی حادثہ کی وجہ سے وفات پا جائیں تو لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا (۲۲/۵۸)۔ انہیں خدا رزقِ حسنہ عطا کرے گا۔" ظاہر ہے کہ انسانی موت کے بعد اسے جسم کی پرورش کے لئے غذا اور خوراک کی ضرورت نہیں رہتی۔ لہٰذا اس رزقِ حسنہ سے مراد وہ سامان ۔۔۔۔ ہے جس سے انسانی ذات کی نشوونما ہو۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے رزق میں وہ تمام سامانِ زیست شامل ہوگا جس سے اس کے جسم کی پرورش اور اس کی انسانی صلاحیتوں (ذات) کی نشوونما ہو سکے۔

عربوں کے ہاں رزق کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بروقت دیا جائے۔ یعنی جس وقت جس قسم کے سامانِ زیست کی ضرورت ہو، وہ میسر ہو۔

اِنفاق کے معنی

اب لفظ يُنْفِقُوْنَ کی طرف آیئے، جس کا مادہ (ن۔ف۔ق) ہے۔ نَفَقٌ اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں۔ جنگلی چوہا اپنے رہنے کے لئے جو بل بناتا ہے اس میں داخل ہونے کے راستے کے علاوہ، اگلی طرف باہر نکلنے کے لئے متعدد راستے بنا چھوڑتا ہے

اور انہیں باریک مٹی سے ڈھانپ دیتا ہے کہ جب کوئی اُسے پکڑنے کی کوشش کرے تو وہ ان راستوں سے باہر نکل جاتے۔ اس قسم کی سرنگ کو "نفق" کہتے ہیں۔ بنابریں منافق، اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی نظام میں داخل ہونے سے پہلے دل میں یہ سوچ لے کہ مجھے اس سے نکلنا پڑا تو اس کے لئے کون کون سے راستے اختیار کرنے ہوں گے۔ بہر حال، اس مادہ کے بنیادی معنی خرچ کرنا نہیں کھلا رکھنا ہیں۔ یہ لفظ روک رکھنے کے مقابلہ میں آتا ہے۔ جیسا کہ (۱۷/۱۰۰) سے واضح ہے۔ آج سے ذرا پہلے زمانہ میں، جب نوٹ نہیں چلے تھے اور دولت چاندی اور سونے کے سکوں کی شکل میں ہوتی تھی، تو روپوں کو ایسی تھیلیوں میں رکھا جاتا تھا جن کا اُوپر کا منہ تو کھلا ہوتا تھا لیکن، دوسرا منہ بند ہوتا تھا۔ دولت رکھنے کا یہ انداز بھی "انفاق" کی ضد کہلاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ "معارج" میں ہے کہ جہنم آوازیں دیکر بلائے گا اس شخص کو جو جَمَعَ فَاَوْعٰی (۷۰/۱۸)۔ دولت جمع کرتا ہے اور پھر تھیلی کا منہ کس کر باندھے رکھتا ہے۔ اسی طرح سورۃ "توبہ" میں انفاق کا لفظ اکتناز کے مقابل آیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ جو لوگ چاندی اور سونے کے سکوں کو روک لیتے ہیں اور اپنی تجوریوں کا منہ کھلا نہیں رکھتے انہیں ایک دردناک عذاب کی "بشارت" دیدو۔ یعنی اس عذاب کی جس میں ان سکوں کو جہنم میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا اور ۔۔۔ کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے صرف اپنے لئے جمع کر کے روک رکھا تھا اور اُسے خدائی پروگرام (ربوبیتِ عالمینی) کے لئے صرف کرنے کی غرض سے کھلا نہیں رکھا تھا (۹/۳۴-۳۵)۔ سورۃ محمد میں ہے کہ اگر تم یہ روش اختیار کرو گے تو یاد رکھو، تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لیگی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی (۴۷/۳۸)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انفاق کے معنے خرچ کرنے کے نہیں بلکہ یہ ایک ایسی روش، نظریہ یا معاشی نظام کی اصطلاح ہے جس میں سامانِ زیست کو روک کر نہیں رکھا جاتا بلکہ اسے عالمگیر ربوبیت انسانیہ کے لئے کھلا رکھا جاتا ہے۔ (سورۃ فاتحہ میں رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور رحمٰن و رحیم کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک مرتبہ پھر سے سامنے لائیے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی)۔

رزق خدا کی ذمہ داری ہے

قرآن کریم نے کہا ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)۔ صفحۂ ارض پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر نہ لے رکھی ہو۔ اس سے ذہن میں ایک اہم سوال اُبھرتا ہے کہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے (جس پر نوعِ انسان کی تاریخ بھی شاہد ہے) کہ انسان بھوکے مرتے رہتے ہیں۔ زمانۂ قحط ہی میں نہیں بلکہ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ دنیا کی قریب آدھی آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے۔ ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ جب زمین پر چلنے والے ہر متنفس کے رزق

کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے، تو یہ ذمہ داری کس قسم کی ہے جس میں آدھی آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کے لئے اصل حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ۔

اللہ تعالیٰ نے انسان (بلکہ اپنی دیگر مخلوق) کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی، بلکہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے وہ تمام سامان، جس پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا، پیدا کر دیا ــــــ ہوا، پانی، روشنی، حرارت ــ یہ سب صفحۂ ارض سے باہر موجود ہیں، اور زمین کے اندر خوراک کے ذخائر، جنہیں تھوڑی سی محنت سے، باہر نکالنا ہوتا ہے ۔ خدا نے اپنی اس ذمہ داری کو اس طرح پورا کر دیا ۔ اسی جہت سے اس نے اپنے آپ کو رازق اور رزّاق کہا ہے ۔ اس کے بعد سوال

اصل سوال تقسیمِ رزق کا ہے

اس رزق کی تقسیم کا سامنے آتا ہے ۔ سطح بیں لوگوں نے یہ کہا کہ یہ تقسیم بھی خدا کو اپنے ہاتھ میں رکھنی چاہیئے تھی تاکہ وہ ہر ضرورت مند کو براہِ راست رزق پہنچاتا رہتا ۔ خدا نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ نظریہ غلط ہے ہم نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے، اس لئے، رزق کی تقسیم کا نظام اس کے ہاتھ میں دیدیا ہے، اور ہم اس میں مداخلت نہیں کرتے ۔ تقسیم کے اس نظام کے لئے ہم نے واضح ہدایات دے دی ہیں ۔ ان میں سرفہرست ہدایت "انفاق" کی ہے، جس کے معنے یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی ضرورت سے زائد رزق کو روک کر نہ رکھے ۔ اسے دوسروں کی ضرورت پورا کرنے کے لئے کھلا رکھے ۔ اس نظریہ کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ سامانِ رزق ــــــ خواہ وہ زمین کے باہر ہو یا زمین کے اندر ــــــ کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا ۔ اس کا حقِ ملکیت صرف خدا کو حاصل ہے جس نے اسے اپنی مخلوق کی پرورش عامہ کے لئے پیدا کیا ہے ۔ رزق کی غلط تقسیم، اس غلط اور باطل نظریہ پر متفرع ہوتی ہے کہ وسائلِ پیداوار پر انسانوں کو حقِ ملکیت حاصل ہو سکتا ہے ۔ یہ نظریہ نظامِ سرمایہ داری کی اساس و بنیاد ہے اور تمام تباہیوں اور بربادیوں کی جڑ ۔ صاحبِ اقتدار گروہ (خواہ وہ عہدِ قدیم کی ملوکیت کی شکل میں ہو یا عصرِ حاضر کے جمہوری ہیکر میں) وسائلِ پیداوار اپنی ملکیت میں لے لیتا ہے اور پھر دوسرے انسانوں کو روٹی کا محتاج بنا کر ان سے اپنا ہر حکم منواتا ہے ۔ جب بھوکے انسان اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں تو مذہبی پیشوائیت انہیں یہ کہہ کر سلا دیتی ہے کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے ۔ وہ جسے چاہتا ہے امیر بنا دیتا ہے، جسے چاہتا ہے غریب رکھتا ہے جسے چاہتا ہے رزق فراواں عطا کر دیتا ہے ۔ جسے چاہتا ہے بھوکا رکھتا ہے ۔ کوئی انسان اس فرق کو مٹا نہیں سکتا ۔ کیونکہ یہ خدا کا پیدا کردہ ہے ۔ اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ تم بھوکے نہ رہو تو وہ تمہیں خود روٹی کیوں نہ دیدیتا ۔ قرآنِ کریم نے اس دلیل کو باطل ہی نہیں بلکہ کفر قرار دیا ہے ۔ سورۃ "یٰسین" میں ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ (۳۶/۴۷) جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے نہیں

جو سامانِ زیست عطا کر رکھا ہے اسے نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھو تو کفر کا شیوہ اختیار کرنے والے، ایمان والوں سے کہتے ہیں (قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (ایضاً) کہ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ (ایضاً) کیا تم چاہتے ہو کہ ہم انہیں روٹی دیں جنہیں خدا بھوکا رکھنا چاہتا ہے۔ یہ تو خدا کے خلاف جنگ ہوگی۔ اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ یہ بھوکے نہ رہیں تو وہ انہیں خود روٹی کیوں نہ دیدیتا۔ قرآنِ کریم نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہنا کافی سمجھا ہے کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (ایضاً) یہ ایسی کھلی ہوئی گمراہی ہے جس کے لئے کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں۔ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی۔ یہ مذہبی پیشوائیت کی فریب کاری ہے جو عوام کو اس غلط عقیدہ کی افیون دے کر نظامِ سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط کرتی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) اور سرمایہ داروں کو ایک ہی زمرہ میں شمار کیا ہے (دیکھئے $\frac{9}{34\text{-}35}$)۔

نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت

قرآنِ کریم کے معاشی نظام کی اصل و بنیاد "رَزَقْنٰهُمْ" کے (نَا) میں مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے ——— یعنی رزق خدا کی ملکیت ہے۔ اسی نے اسے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ آپ قرآنِ کریم میں یہاں سے وہاں تک دیکھ جائیے رزق کے متعلق، رَزَقْنٰهُمْ، رَزَقْنٰكُمْ وغیرہ الفاظ ملیں گے۔ یعنی رزق خدا کی طرف سے دیا گیا۔ سوال صرف اس کی تقسیم کا ہے۔ زمین، رزق کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اس کے متعلق اس نے بار بار کہا ہے کہ یہ خدا کی ملکیت ہے۔ ارض، ارض اللہ ہے ($\frac{4}{97}$) اس میں انسانوں اور ان کے مال مویشی کے لئے سامانِ زیست ہے ($\frac{79}{33}$؛ $\frac{20}{54}$)۔ تمام انسانوں کے لئے سامانِ زیست ہے ($\frac{15}{20}$) اسے پیدا ہی مخلوق کے فائدے کے لئے کیا گیا ہے ($\frac{55}{10}$)۔ اسے تمام ضرورتمندوں کیلئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے ($\frac{41}{10}$)۔ سورۂ حدید میں اس حقیقت کو نہایت اختصار لیکن بڑے ہی دلنشین انداز میں بیان کیا گیا ہے جب کہا: وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ($\frac{57}{10}$)۔ جب حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے تو پھر تم کون ہوتے ہو جو رزق کے ان ذرائع کو روک رکھو اور انہیں بنی نوعِ انسان کی منفعت کے لئے کھلا نہ رکھو۔ زمین سے رزق حاصل کرنے کے لئے تم کچھ محنت ضرور کرتے ہو۔ تم زیادہ سے زیادہ.... اپنی اس محنت کے معاوضہ کے حقدار ہو سکتے ہو نہ کہ ساری کی ساری پیداوار کے۔

رزق خدا کا ہے

تم اپنی محنت کا معاوضہ لے لو۔ باقی، زمین کے مالک (خدا) کو دیدو۔ اس نے سورۃ واقعہ کی آیات ($\frac{56}{63\text{-}74}$) میں اس حقیقت کو بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ ذیل میں ان آیات کا مفہوم از روئے مفہوم القرآن

بیان کیا جاتا ہے۔ (بہتر ہو کہ آپ قرآن مجید کے کسی نسخہ سے ان آیات کو بھی سامنے رکھ لیں) :

اس مقصد کے لئے، تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشو و نما ہوتی ہے اور سوچو کہ کیا یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ (مثلاً) تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر، اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا یہ تم ایسا کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ایسا ہوتا ہے ؟

اس کے بعد کہا :۔

پھر کھیتی اُگنے کے بعد، اس کی حفاظت کون کرتا ہے ؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آجائے جس سے اُگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے ——— اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلہ ملنا تو ایک طرف، ہماری محنت اور بیج بھی بیکار میں گئے۔

اس کے بعد ہے :۔

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے ؟۔
(یہ بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آسکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے) ذرا سوچو کہ اگر بادلوں کا پانی (بارش) بھی ویسا کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کرتے ؟ حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج غور کر کے، صحیح نتیجہ تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشو و نما کے متعلق خدا کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے۔

اس کے آگے ہے :۔

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے، اس سے اتنے کام لیتے ہو؟

کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھدینا ـــــ رگِ خس میں
شعلے کو نہاں کر دینا ـــــ تمہاری کاریگری سے ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟

اِن حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ :۔

(رزق پیدا کرنے کی اِس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس تمام پروگرام میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کسقدر؟ تم کسی نہج سے بھی غور کرو، بہرحال اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے ماحصل (سامانِ زیست) میں بھی تمہارا حصہ بقدر تمہاری محنت کے ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے مالک نہیں بن سکتے)۔ یہ تمام ذرائع پیداوار ازخود موجود رہتے ہیں ـــــ یہ نہ تمہارے بنائے ہوتے ہیں، نہ خریدے ہوتے۔ یہ تمہیں اس حقیقت کی یاددہانی کراتے ہیں کہ انہیں خدا نے بھوکوں کے لئے سامانِ زندگی بنایا ہے۔

یعنی اس کاروبار میں محنت تمہاری ہے اور ذرائع پیداوار ہمارے۔ لہٰذا، تم اس میں سے اپنی محنت کا معاوضہ، اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں، اپنے پاس رکھ لو اور "ہمارا حصہ ہمیں دیدو"۔ سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ کو کس طرح پہنچائیں؟ جواب دیا کہ۔ مَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِيۡنَ (۵۶/۷۳) یہ ان تک پہنچا دو جو اپنے لئے سامانِ پرورش حاصل کرنے کے قابل نہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو یہ سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔ اسی حقیقت کو (۶۷/۲۱؛ ۶۷/۳۰؛ ۸/۴۴) میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

ہمارے ہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے الفاظ عام طور پر دہرائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں حقوق کی

حقوق اللہ اور حقوق العباد

یہ تقسیم کہیں مذکور نہیں۔ صرف ایک مقام پر "اللہ کے ایک حق" کا ذکر ہے۔ وہ وہی "حقِ مالکانہ" ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے

سورۃ انعام میں ہے: وَهُوَ الَّذِيۡۤ اَنۡشَاَ جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ وَّغَيۡرَ مَعۡرُوۡشٰتٍ وَّالنَّخۡلَ وَالزَّرۡعَ مُخۡتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسۡرِفُوۡا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ (۶/۱۴۲)۔ "خدا وہ ہے جس نے (تمام انسانوں کی پرورش کیلئے) باغات کا سلسلہ پھیلا دیا ہے۔ بعض بڑے بڑے تناور درخت جو بغیر کسی سہارے

کے کھڑے ہیں۔ بعض نرم ونازک (انگوروں کی سی) بیلیں سہاروں سے کھڑی کی جاتی ہیں۔ نیز سربفلک کھجوروں کے پیڑ اور مختلف پیداوار والی کھیتیاں۔ اور زیتون اور انار کے پھل — ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی اور الگ تھلگ بھی — جب یہ درخت یا کھیتیاں ثمربار ہوں تو ان کے پھل اور اناج شوق سے کھاؤ لیکن ان میں سے "خدا کا حق" دیدیا کرو۔ اس باب میں اپنی حد سے تجاوز نہ کرو (کہ "خدا کا حق" بھی خود ہی سنبھال کر بیٹھ جاؤ) تمہاری یہ روش خدا کے ہاں پسندیدہ نہیں قرار پائے گی"۔

"حقوق" کا یہ معاملہ عام انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن مومنین، خدا کے ساتھ معاملہ میں اور روش اختیار کرتے ہیں۔ ان کا ایمان ہوتا ہے کہ زمین (وسائل پیداوار) ہی نہیں بلکہ خود ان کی (رزق پیدا کرنے کی) صلاحیتیں بھی بنیادی طور پر خدا ہی کی عطا کردہ ہوتی ہیں —

مومنین کا معاملہ خدا کے ساتھ

وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ...... (۱۶/۵۳)۔ ہمیں یہ نعماء اس لئے دی جاتی ہیں کہ ہم انہیں خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق صرف کریں۔ اس لئے ہم ان کے لئے خدا کے حضور جوابدہ ہوں گے کہ ہم انہیں کس طرح صرف میں لاتے تھے۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (۱۰۲/۸)۔ خدا کے ساتھ ان کا معاملہ ایک باہمی معاہدہ کی رو سے طے پاتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے،

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)۔

وہ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور اس کے عوض خدا انہیں جنت عطا کر دیتا ہے — "جان" میں انسانی زندگی اور اس کی تمام صلاحیتیں آجاتی ہیں۔ جو خدا کی طرف سے بلا مزد ومعاوضہ عطا ہوئی ہیں اور مال میں وہ سب کچھ شامل ہو جاتا ہے جسے انسان اکتساباً (اپنی محنت سے) حاصل کرتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ "خدا کے ہاتھ" بیچ دیتے ہیں اور خدا انہیں الجنۃ عطا کر دیتا ہے۔ الجنۃ کی تفصیلات تو طول طویل ہیں لیکن (جہاں تک انسان کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے) اس کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)۔ "جب اور جہاں بھوک لگے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے"۔ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرٰى وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ کوئی بھوکا رہے گا نہ ننگا۔ نہ کسی کو پیاس کا خطرہ ہوگا نہ مکان کا۔ اس الجنۃ میں (کم از کم) زندگی کی ان بنیادی ضروریات کی طرف سے ہر فرد معاشرہ مطمئن ہوگا۔

یہ بھی واضح رہے کہ اس معاشرہ میں خدا اور مومنین کا یہ باہمی معاہدہ یونہی نظری اور عقائدی حد تک نہیں ہوگا۔ عملاً ایسا ہوگا — "مذہب" میں چند الفاظ دُہرا لینے سے سمجھ لیا جاتا ہے کہ فریضہ ادا ہو

اس کا عملی مفہوم

گیا، لیکن دین میں جو کچھ زبان سے کہا یا مانا جاتا ہے اسے عملاً کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہ "مذہب" ہے جس میں مکان کی پیشانی پر یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ :

در حقیقت مالکِ ہر شے خدا است — ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست

یہ لکھ دیا جاتا ہے اور عملاً اس مکان کے جملہ حقوقِ ملکیت اپنی اور اپنی اولاد کے نام محفوظ کر لئے جاتے ہیں، اور "مالکِ حقیقی" کو اس میں جھانکنے تک بھی نہیں دیا جاتا۔ لیکن دین میں بیع و شریٰ کا وہ معاملہ جس کا اوپر ذکر آیا ہے، عملاً طے پاتا ہے۔ مؤمن اپنی جان اور مال، اس نظام کے سربراہ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے جو خدا کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے۔ بیچا اس کے ہاتھ جاتا ہے اور خدا اس کی تصدیق کر دیتا ہے کہ ہاں، ہم نے خرید لیا۔ اسی کو بیعت (بیع کا معاملہ) کہا جاتا ہے۔ سورۃ الفتح میں ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ. یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (۴۸/۱۰) اے رسول! جو مؤمنین اپنی جان اور مال کو تیرے ہاتھ فروخت کرتے ہیں وہ درحقیقت انہیں خدا کے ہاتھ بیچ رہے ہوتے ہیں۔ اس معاملہ کی توثیق کے لئے ان کے ہاتھ پر، تیرا ہاتھ نہیں ہوتا، خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ تو خدا کی طرف سے (ON HIS BEHALF) یہ معاملہ طے کر رہا ہوتا ہے۔" مؤمنین اپنی ہر متاعِ حیات کو اس نظام کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں یہ نظام ان کی طبیعی زندگی اور انسانی ذات کی پرورش اور نشو و نما کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے۔ یہ ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ کا عملی مفہوم۔

واضح رہے کہ یہ نظام ایک دن میں متشکل نہیں ہو جاتا۔ تقسیمِ رزق کے (انسانوں کے خود ساختہ) غلط نظام کی جگہ یہ نظامِ خداوندی آہستہ آہستہ، بتدریج عمل میں آتا ہے۔ قرآنِ کریم میں انفرادی صدقہ، خیرات وغیرہ کے ضمن میں جو احکامات نظر آتے ہیں وہ اسی عبوری دور سے متعلق ہیں۔ جب یہ پروگرام اپنی آخری منزل میں پہنچ جاتا ہے تو اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) "اے رسول! یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہمیں اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلا رکھنا (نظام کی تحویل میں دے دینا) ہوگا۔ کہا۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہو سب کا سب۔" اس میں "دوسروں" سے مراد صرف اپنی جماعت کے افراد نہیں، تمام نوعِ انسان کے ضرورتمند افراد ہیں۔ اس میں ابتدا تو بے شک اپنے معاشرہ ہی سے ہوگی لیکن اس کی وسعتیں پھیلتے پھیلتے عالمگیر انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیں گی۔ یہ اس لئے کہ خدا نے تمام دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ (۱۱/۶)۔ تمام ذی حیات — کی ربوبیت

تدریجاً

کا ذمہ اپنے سر لے رکھا ہے اور اس کی یہ ذمہ داری اس نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس کے متعلق کہا وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) استحکام اور بقا صرف اس نظامِ تقسیم کے لئے ہوگی جس کے پیشِ نظر کسی خاص فرد، خاص گروہ، خاص ملک یا خاص قوم کا مفاد نہیں، بلکہ تمام نوعِ انسان کی منفعت ہو۔ یہی وہ نظام ہے جسے قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کو متقین کا فریضہ بنایا گیا ہے۔

خیر الرّازقین

آپ نے کبھی اس حقیقت پر بھی غور کیا کہ خدا نے اپنے آپ کو خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۵/۱۱۴ و ۳۴/۳۹) کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نظر بظاہر تمہیں یہ رزق، ان انسانوں کے ہاتھوں سے مل رہا ہے۔ اس اعتبار سے انہیں رازق کہا جاسکتا ہے لیکن اس رزق کا مالک ہونے کی حیثیت سے، خیر الرازقین خدا ہی ہے۔ خدا کی طرف سے رزق کی اس طرح تقسیم کرنے والے کارندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جنہیں رزق دیتے ہیں انہیں واضح الفاظ میں کہدیتے ہیں: اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (۷۶/۹)۔ اس تقسیمِ رزق میں، ہم صرف منشائے خداوندی کو پورا کر رہے ہیں۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں دے رہے۔ اور جب ہم اپنی طرف سے کچھ دے ہی نہیں رہے تو اس کے معاوضہ میں کچھ لینا تو ایک طرف، ہم شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔ یہ کارندے اس سامانِ زیست میں سے اپنے لئے صرف اتنا لیتے ہیں جتنے کی انہیں ضرورت ہوتی ہے۔ باقی سب دوسرے ضرورتمندوں کے لئے دیدیتے ہیں بلکہ اُن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کبھی صورت ایسی ہو جائے کہ رزق کم ہو اور حاجتمند زیادہ، تو يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ یہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس معاشی نظام کی عمارت اس ایمان کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶/۵۳)۔ ہمیں جس قدر نعماء حاصل ہیں خواہ وہ وسائلِ پیداوار کی شکل میں ہوں اور خواہ اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں کی شکل میں وہ سب خدا کی طرف سے عطا شدہ ہیں اس لئے انہیں خدا ہی کے مقرر کردہ اصول اور پروگرام کے مطابق صرف کیا جائے گا۔ اس کے برعکس نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد یہ (باطل) ذہنیت ہے کہ وسائلِ پیداوار پر بھی افراد کی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے اور اکتسابِ رزق کی صلاحیتیں بھی اپنی اپنی ہیں۔ ان کی بناء پر جو جتنا کما لے وہ اس کی ملکیت ہے۔ اس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم نے اس باطل ذہنیت اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کو سورۃ نحل ہی کی ایک آیت میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے:

نظامِ سرمایہ داری کی بنیادی ذہنیت

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ۔ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ

رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۔
اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶/۷۱)

مفہوم اس کا یہ ہے:

یہ حقیقت ہے کہ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ — یہ اس لئے کہ دنیا میں مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں جن کے لئے مختلف قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے (۴۳/۳۲)۔ جن لوگوں میں اکتسابِ رزق کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے وہ اپنی ساری کمائی اپنے لئے سمیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کی ضروریات سے جو کچھ زیادہ ہے وہ ان لوگوں کا حق ہے جن کی ضروریات اُن کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں (۲۴/۴۷)۔ سو یہ لوگ اپنی فاضلہ کمائی ان لوگوں کو واپس کیوں نہیں دے دیتے جو ان کے زیرِ ہدایت کام کرتے ہیں اور جن کا یہ درحقیقت حق ہے، تاکہ اس طرح سب لوگ خدا کی عطا کردہ معاشی سہولتوں میں برابر کے شریک ہو جائیں (۲۸/۳۰)

جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ درحقیقت اس سے انکار کرتے ہیں کہ ان کی صلاحیتیں انہیں خدا کی طرف سے بطورِ نعمت عطا ہوئی ہیں۔

اس سے اگلی آیت میں ہے: اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ (۱۶/۷۲) یہ ایمان بالباطل ہے اور نعماءِ خداوندی سے کفر۔ اس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ قارون (جسے قرآن کریم نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے) کی بھی یہی ذہنیت تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸)۔ میری دولت میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے اس لئے اس میں کوئی دخل انداز نہیں ہو سکتا۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ یہ ذہنیت قارون ہی سے مختص نہیں۔ جو انسان بھی وحی کی اقدار کو چھوڑ دیتا ہے اس کی یہی ذہنیت ہو جاتی ہے (۳۹/۴۹)۔ اسی کا نتیجہ وہ تباہی ہے جس نے دنیائے انسانیت کو جہنم بنا رکھا ہے۔

قارون

آپ نوعِ انسان کی تاریخ پر غور کیجئے۔ تقسیمِ رزق کے مسئلہ نے (جسے اب معاشی یا اقتصادی نظام کہہ کر پکارا جاتا ہے) ہر زمانے میں انسان کو وقفِ اضطراب رکھا ہے۔

اِس کی غلط تقسیم سے جو تباہ کن نتائج مرتب ہوتے، بہت سے دردمند قلوب ان سے متاثر ہوئے اور انہوں نے (وحی کی روشنی کے بغیر) اس اہم اور مشکل ترین مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لئے فکری کاوشیں کیں۔ افلاطون سے لے کر کارل مارکس تک کے مفکرین اور علماء اقتصادیات کے نظریات، انسان کی اسی فکری کاوش اور سعیٔ ناکام کی عبرت آموز داستان کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں (انہیں میں نے اپنی کتاب — انسان نے کیا سوچا؟ — میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کر دیا ہے)۔ اس مقام پر اتنا بتا دینا ہی کافی ہوگا کہ اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی — فکرِ مارکس — نے اس کا کیا حل پیش کیا ہے۔

کارل مارکس کا نظریہ

لیکن اس سے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔ وحیٔ خداوندی، انسانی زندگی کے اہم مسائل کا حتمی اور یقینی حل پیش کرتی ہے جو خوش بخت اقوام انہیں قبول کر لیتی ہیں وہ راستے کے خطرات سے مامون و مصئون، شاداں و فرحاں، منزلِ مقصود تک پہنچ جاتی ہیں۔ جو انہیں اس طرح اختیار نہیں کرتیں وہ فکری طور پر ان کا حل دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ عقل (فکرِ انسان) کا طریق جستجو تجرباتی ہے، جسے (TRIAL AND ERROR) کہا جاتا ہے۔ عقلِ انسانی ایک حل تجویز کرتی ہے اور اس پر گامزن ہو جاتی ہے۔ وہ راستے کے سینکڑوں کٹھن اور پُرخطر منازل طے کرتی، خون کے دریا پیرتی، اور آگ کی خندقیں پھاندتی، ہڈیاں تڑواتی اور صعوبتیں اُٹھاتی آگے بڑھتی ہے تو اُسے نظر آتا ہے کہ اس نے غلط راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ اُسے چھوڑ کر دوسرا حل سوچتی ہے اور اس نئے راستے پر گامزن ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے متعدد ناکام اور جانکاہ تجارب کے بعد کہیں جا کر اس کے سامنے وہ حل آتا ہے جسے وحی نے روزِ اول پیش کر دیا تھا۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

> عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں ہر دو بہ منزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں

عقل کا تجرباتی طریق

قرآن کریم نے اس نکتہ کی وضاحت جس انداز سے کی ہے اسے یوں سمجھئے کہ وحی کی پیش کردہ ابدی حقیقتیں زمانے کی لہروں میں لپٹی ہوتی ہیں۔ جب علمِ انسانی اُبھر کر ان لہروں کو چھوتا ہے تو اس میں پوشیدہ حقیقت نقاب اُلٹ کر سامنے آ جاتی ہے۔ سورۃ حٰمٓ میں ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔ ($\frac{41}{53}$)۔ اس طرح ہم عالمِ انفس و آفاق میں مضمر حقائق کو بے نقاب کرتے جائیں گے تاکہ یہ حقیقت مشہود طور پر سامنے آ جائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔

نزولِ قرآن کے بعد عقل کے اس تجرباتی طریق کے ساتھ ایک اور عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ وسائلِ نشر و اشاعت کی ہمہ گیریت کی وجہ سے، قرآنی حقائق بھی فضائے عالم میں عام ہو چکے، اور ہوتے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی فکر شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سے بھی متاثر ہو رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عقل اپنے تجربات سے پہلے، جس مقام

تک صدیوں میں جاکر پہنچتی تھی اب وہ نسبتاً قلیل ترین عرصہ میں پہنچ جاتی ہے۔ لہٰذا (جیسا کہ میں نے حضور نبی اکرمؐ کی سیرۃِ طیبہ پر مشتمل اپنی تصنیف ــــ معراجِ انسانیت ــــ میں لکھا ہے) علیٰ رؤس الاشہاد کہا جا سکتا ہے کہ بزمِ ہستی میں جہاں کوئی روشنی کی کرن نظر آتی ہے وہ اُسی آفتابِ جہاں تاب کی ضیا باریوں کا تصدّق، اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول مہکتا دکھائی دیتا ہے وہ اُسی جانِ بہار کی نکہت بیزیوں کا رہینِ منّت ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو — آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

کارل مارکس (۱۸۸۳ — ۱۸۱۸) نے اپنی مدت العمر کی فکری کاوشوں کے بعد کہا کہ اس مسئلہ کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایسا معاشی نظام قائم کیا جائے جس میں :۔

"ہر فرد سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اسے اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے۔"

نظری طور پر اس مشکل ترین مسئلہ کا حل بڑا اطمینان بخش تھا لیکن سوال یہ تھا کہ آیا یہ طریق ممکن العمل بھی ہو گا۔ اس کے خلاف اعتراض یہ پیدا ہوتا تھا کہ جو شخص اپنی استعداد کی رو سے کمائی بہت زیادہ کرے لیکن اس کی ضروریات مختصر ہوں، اس لئے اس میں سے اُسے ملے بہت کم، تو اس کے لئے کون سا جذبہ محرکہ ہو گا کہ وہ جان مار کر محنت کرے، اور اپنی محنت کا حاصل دوسروں کو دیدے! کارل مارکس، اپنے فلسفہ کی رو سے، خدا — وحی — رسالت — مستقل اقدار — حیاتِ آخرت — سب کا منکر تھا۔ وہ انسانی زندگی کو اس کی طبیعی زندگی ہی قرار دیتا تھا اور بس — اس فلسفہ زندگی کی رو سے، اسے اس اعتراض کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل پاتا تھا۔ چنانچہ اس نے کہہ دیا کہ اس مسئلہ کا حل تو یہی ہے جسے میں نے پیش کیا ہے، لیکن اس پر عمل کیسے ہو سکے گا، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے جو لوگ اس کے جواب کے لئے مصر ہیں وہ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ سرِدست اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے یہ کہا، اور اس کے جانشین لینن نے یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ :۔

> نوعِ انسانی کن مراحل سے گزر کر اور کن عملی اقدامات کی رُو سے اس بلند مقصد کو حاصل کر سکے گی، اس کی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی مواد ایسا نہیں جس سے اِن سوالات کا جواب دیا جا سکے۔

(MARX-ENGELS-MARXISM, P.P. 355 : 358)

مارکس نے کہا کہ جب تک انسان اس، آخری منزل تک نہ پہنچے، عبوری دور میں، بر سبیل تنزل، سوشلزم کا نظام رائج کرلینا چاہیئے۔ یعنی وسائل پیداوار، انفرادی ملکیت سے نکال کر مملکت کی ملکیت میں دیدینے چاہیئں۔ چنانچہ اس وقت سوشلسٹ ممالک میں نظام سرمایہ داری کی جگہ سوشلزم کا نظام رائج ہے۔

لیکن یہ نظام اس مشکل کا کچھ بھی حل پیش نہیں کرسکا۔ پردہ اٹھا کر دیکھئے تو اس کے پیکر میں سرمایہ داری ہی کی روح کارفرما نظر آئے گی، فرق صرف اصطلاحات کا ہوگا۔ نظام سرمایہ داری میں، وسائل پیداوار افراد کی ملکیت میں رہتے ہیں، سوشلزم میں یہ وسائل، افراد کے اس گروہ کے ہاتھ میں آجاتے ہیں جو مملکت کے اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے۔ غریب محنت کش ویسے کا ویسا ہی محتاج و محکوم رہتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

نظام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

پہلے ایک فرعون یہ نعرہ بلند کرتا تھا کہ اَلَیۡسَ لِیۡ مُلۡکُ مِصۡرَ وَھٰذِہِ الۡاَنۡھٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ (۴۳/۵۱) کیا یہ ملک اور اس میں بہنے والے دریا اور نہریں میری ملکیت نہیں؟ اب یہ اعلان، "فراعنہ کے گروہ" (ارباب اقتدار) کی طرف سے ہوتا ہے جنہوں نے ابلہ فریبی کے لئے اپنا نام مملکت (STATE) رکھ لیا ہے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے: اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی۔ (۷۹/۲۴) تمہارا رزق ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم ہی تمہارے پروردگار ہیں۔ اس لئے تم ہماری محکومیت اختیار کرو۔

سوشلزم کی ناکامی

نظام سرمایہ داری میں محنت کشوں کی اجرت (WAGES) زمین یا کارخانہ کا مالک مقرر کرتا تھا۔ اب ان کی اجرت "مملکت" مقرر کرتی ہے۔ اور اجرت مقرر کرنے کا معیار یہ نہیں کہ اس سے کام کرنے والے کی ضروریات زندگی بھی پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اس کا معیار کام لینے والوں کے مفاد یا مصالح ہوتے ہیں۔ رزق کی ذمہ داری، نہ اس نظام نے اپنے سر لی تھی، نہ یہ نظام اپنے سر لیتا ہے اس نظام (سوشلزم) میں محنت کش کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہوگئی ہے۔ پہلے اگر اس کی کسی ایک مالک سے نہیں بنتی تھی تو وہ اسے چھوڑ کر، کسی اور کی ملازمت اختیار کرلیتا تھا ــــ اب چونکہ وسائل رزق پر، کلی اجارہ داری "اسٹیٹ" کی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کا دروازہ چھوڑ کر کہیں اور جا ہی نہیں سکتا۔ یہ ملوکیت کی بدترین شکل ہے۔ یہی وہ جہنم ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ: کُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡھَا مِنۡ غَمٍّ اُعِیۡدُوۡا فِیۡھَا۔ (۲۲/۲۲) جب وہ غم و اندوہ کے اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو نہیں پھر اسی میں دھکیل دیا جائے گا۔

یہ ہے اس مشکل ترین مسئلہ کا وہ حل جس تک، عقلِ انسانی (وحی کی روشنی کے بغیر) اس وقت پہنچی ہے۔ نظری طور پر تو کارل مارکس اس کے حل تک پہنچ گیا لیکن چونکہ اس کا فلسفۂ زندگی اسے وہ بنیاد مہیا نہیں کر سکتا تھا جس پر اس نظام کی عظیم عمارت استوار ہو سکے اس لئے عملاً وہ وہیں رہا جہاں نظامِ سرمایہ داری تھا — بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر — اس کا حل صرف ایمان بہم پہنچا سکتا ہے۔ یعنی یہ ایمان کہ:

(۱) وسائلِ رزق ہی نہیں، بلکہ انسانی صلاحیتیں بھی میری ملک نہیں۔ خدا کی ملک ہیں اور اس کی عطا کردہ۔

(۲) میرا فریضہ یہ ہے کہ میں پوری پوری محنت سے ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر رزق پیدا کروں اور اُسے اس نظام کی تحویل میں دیدوں جو اُسے (مجھ سمیت) تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تقسیم کرے۔ (محنت کا معاوضہ، اُجرت (WAGES) نہیں بلکہ ضروریات زندگی پوری کرنا ہے۔ جو نظام اس کی ذمہ داری نہیں لیتا اسے وسائلِ رزق کو اپنے قبضے میں لینے کا کوئی حق نہیں)۔

(۳) اگر میں، یا وہ نظام ایسا نہ کرے تو اس کی ہم سے باز پُرس ہو گی۔

اِسے اللہ اور آخرت پر ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور متّقین کا فریضہ بتایا گیا ہے۔

ہم نے بات اقامتِ صلوٰۃ سے شروع کی تھی اور انفاق کو اس لئے درمیان میں لے آئے تھے کہ یہ واضح ہو جائے کہ ان دونوں کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس ضمن میں چند ایک ایسی آیات سامنے لائی جاتی ہیں جن میں مصلّین کا فریضہ انفاق بتایا گیا ہے اور اس نہج سے انہیں مُنْفِقِيْنَ کہکر پکارا گیا ہے۔ (۳/۱۶)۔

قرآنِ کریم نے "الصلوٰۃ" کا متعین اور محسوس نتیجہ یہ بتایا ہے کہ "اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵)۔ الصلوٰۃ، فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے۔ لفظ فحشاء کا مادہ (ف۔ ح۔ ش) ہے جس میں ہر امرِ شنیع (قابلِ نفرت) آجاتا ہے۔ لیکن عربوں کے ہاں، جب فحش لفظ بولا جاتا تھا تو اس کے معنے عام طور

صلوٰۃ اور معاشی نظام کا تعلق

پر بے حیائی کے لئے جاتے تھے لیکن فحشاء کے معنے بخل کے تھے، کیونکہ ان کے ہاں بخل انتہائی درجہ کی قابلِ نفرت خصلت تھی۔ جہاں تک منکر کا تعلق ہے اس میں بھی ہر معیوب بات آجاتی ہے لیکن بنیادی طور پر اس کے معنے ہوتے ہیں عقلِ خود بیں (یعنی صرف اپنا ہی مفاد سوچنے والی عقل) کی حیلہ جوئیاں اور فریب کاریاں۔ عقل کو اگر وحی سے آزاد کر دیا جائے تو اس کا

منصب یہ رہ جاتا ہے کہ وہ انسان کو اس کے ہر فعل اور فیصلہ کیلئے جواز کی دلیلیں سجھاتی اور سمجھاتی رہے۔ بنابریں الصلوٰۃ کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وہ انسان کے دل سے بخل کے جذبات نکال دیتی ہے اور عقل خود بیں کو اس کے جواز کی راہیں سجھانے کے راستے میں روک بن جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ غایت کے اعتبار سے الصلوٰۃ اور معاشی نظام میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس بنیادی نکتہ کو سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھیئے۔

سورۃ الماعون، (۱۰۷) میں کہا گیا ہے: اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (۱/۱۰۷)۔ تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں جو دین کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ذکر ان کا ہے جو دین سے متمسک ہونے کے مدعی ہیں (یعنی ہماری طرح اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں) لیکن عملاً دین کو جھٹلاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں جس سے دین کو جھٹلاتے ہیں۔ فرمایا: فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۰۷/۲-۳) یہ وہ ہے کہ جو، اس شخص کو، جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے، دھکے دیتا ہے (لفظ یتیم میں وہ بچے بھی آجاتے ہیں جن کے ماں باپ مرچکے ہوں اور وہ بھی جو معاشرہ میں تنہا — کسی مپرسی کے عالم میں رہ جائیں)۔ ان لوگوں کو دھکے دینے کا مفہوم سورۃ الفجر کی اُن آیات سے واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ انسان کی حالت یہ ہے کہ اگر اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو چلا اٹھتا ہے کہ رَبِّىْٓ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶)۔ دیکھئے! خدا نے مجھے یونہی ذلیل وخوار کر دیا۔ میں نے تو کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جس کی مجھے اس طرح سزا ملتی۔ کہا کہ یہ غلط ہے کہ ہمارے ہاں سے کسی پہ ذلت وخواری کا عذاب یونہی مسلط کر دیا جاتا ہے۔ یہ تمہاری ذلت وخواری، تمہارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور وہ اعمال یہ تھے: كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹/۱۷)۔ تم ان لوگوں کو مستحقِ تکریم واحترام نہیں سمجھا کرتے تھے جو معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے۔ تمہارے نزدیک واجب التکریم وہی لوگ قرار پاتے تھے جن کا جتھہ (پارٹی) بڑا ہو۔ تمہارا دوسرا جرم یہ تھا وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۸۹/۱۸)۔ جو لوگ کام کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے (جن کی حرکت رُک جاتی تھی)، تم ایسا انتظام نہیں کرتے تھے جس سے انہیں سامانِ زیست میسر آجائے۔ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹) تم باپ دادا کی میراث ہڑپ کر جاتے تھے۔ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۲۰) اور چاہتے یہ تھے کہ ساری دنیا کی دولت سمٹ سمٹا کر تمہارے پاس جمع ہو جائے۔

تکذیبِ دین

اس کے بعد آپ پھر سورۃ الماعون کی طرف آجائیے جہاں کہا گیا کہ تکذیب دین وہ کرتا ہے جو معاشرہ میں تنہا رہ جانے والوں کی عزت وتکریم کرنے کی بجائے انہیں دھکے دیتا ہے اور وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۰۷/۳)

معذور لوگوں کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔ اس کے بعد ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ (۱۰۷/۴)۔ یہ وہ مصلّین (نمازی) ہیں جن کی نمازیں ان کے لئے تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔ اَلَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ۔ اَلَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ۔ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (۱۰۷/۵-۷)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کی مرئی اور محسوس حرکات ہی کو صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی روح اور غرض وغایت کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔ یعنی نمازیں تو پڑھتے ہیں لیکن رزق کے ان سرچشموں کو، جنہیں نوعِ انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے رواں دواں بہتے رہنا چاہیئے تھا، ان کے سامنے بند لگا کر انہیں اپنے لئے روک لیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مصلّین جن کی نماز ان پر تباہیاں لاتی ہے اور یہی ہیں وہ لوگ جو دین کی تکذیب کرتے ہیں۔

سورۃ المدثر میں ہے کہ جہنم کے داروغے مجرمین سے پوچھیں گے کہ تم کون سے ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے جن سے تم داخلِ جہنم ہو رہے ہو۔ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ۔ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ۔ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ (۷۴/۴۳-۴۶)۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم مصلّین میں سے نہیں تھے۔ ہم معذوروں اور مجبوروں کی روٹی کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔ ہم ان امور کے متعلق باتیں تو بہت بنایا کرتے تھے لیکن عملاً کچھ نہیں کیا کرتے تھے۔ اور یوں ہم دین کی تکذیب کرتے تھے۔

یہ تو دین کی تکذیب کرنے والے مصلّین تھے۔ اس کے مقابلہ میں سورۃ المعارج میں قرآن کریم نے اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں کہا ہے کہ تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ (۷۰/۱۷) جہنم آوازیں دیدے کر بلائے گی ان لوگوں کو جن کا شیوہ یہ تھا کہ جب انہیں دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بلایا جاتا تو وہ بانو بیٹھ موڑ کر چل دیتے، اور اگر بات سن لیتے تو گریز کی راہیں نکالتے۔ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ (۷۰/۱۸)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دولت جمع کرتے تھے اور اپنی تھیلیوں کا منہ کس کر بند کر لیتے تھے۔ اس کے بعد کہا۔ إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا۔ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا (۷۰/۱۹-۲۱)۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر وحی کی اقدار سے بے نیاز ہو جائے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ وہ بڑا بے صبرا ہو جاتا ہے۔ ایسا بے صبرا کہ ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے (کسی سودے میں گھاٹا پڑ جاتا) تو واویلا مچا دیتا ہے اور جب خوشحالی آتی ہے تو مال و دولت کو روک کر رکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد کہا: إِلَّا الْمُصَلِّينَ (۷۰/۲۲)۔ لیکن مصلین ایسے نہیں ہوتے یعنی وہ لوگ جو الصلوٰۃ کی التزاماً پابندی کرتے ہیں۔ اَلَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ۔ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ۔ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ (۷۰/۲۳-۲۶) یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کے مال و دولت میں ان لوگوں کا حق ہے

جن کی ضروریات ان کی محنت کے ماحصل سے پوری نہیں ہوتیں یا وہ بالکل معذور ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان آیات میں "حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ" کے الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ یعنی سائل و محروم، نہ تو ان سے خیرات مانگتے ہیں نہ یہ انہیں بطورِ خیرات کچھ دیتے ہیں۔ یہ دونوں جانتے ہیں کہ ان کے مال میں ہر ضرورت مند کا حق ہے۔ وہ اُسے بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) طلب کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ نظام انفرادی زکوٰۃ اور خیرات کا نہیں۔ وہ نظام ہے جس کا فریضہ تمام افرادِ انسانیہ کی ربوبیت ہے۔ اس نظام میں ہر ضرورت مند کو سامانِ زیست اس کے حق کے طور پر ملتا ہے۔

ہم اوپر (سورۂ ماعون میں) دیکھ چکے ہیں کہ تکذیبِ دین کرنے والے وہ لوگ ہیں جو نماز کی محسوس اور مرئی حرکات ہی کو الصلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں اور اس کی روح، مقصد اور غرض و غایت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ سورۂ نساء میں ان لوگوں کو منافقین کہا گیا اور ان کی حالت یہ بتائی گئی ہے کہ: وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ (۴/۱۴۲) جب وہ الصلوٰۃ کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسالٰی کی کیفیت لئے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں یعنی وہ انہی حرکات و سکنات کی ادائیگی سے سمجھ لیتے ہیں کہ صلوٰۃ کا فریضہ پورا ہو گیا۔ وہ حرکات و سکنات، جنہیں لوگ دیکھ سکیں اور اس طرح ان کی تعریف کریں کہ یہ بڑے پکے نمازی ہیں۔ اس آیت میں لفظ کُسَالٰی کے اندر ایک لطیف نکتہ مضمر ہے۔ رُوئی دھننے والے کے پاس دھنک ہوتی ہے جس میں کمان کے ساتھ تانت لگی ہوتی ہے۔ ان دونوں کے یکجا ہونے سے روئی دھننے کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اگر تانت اور کمان کو الگ الگ کر دیا جائے تو یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا "الکسل" اس تانت کو کہتے ہیں جو کمان سے الگ کر دی گئی ہو۔ آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ وہ صلوٰۃ جس میں اس کی محسوس حرکات سے اس کے مقصد و غایت کو الگ کر دیا جائے، میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہے۔

سورۃ التوبہ میں منافقین کی یہ کیفیت بتائی گئی ہے: وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (۹/۵۴)۔ وہ صلوٰۃ کی طرف آتے ہیں تو کسالٰی کی کیفیت لئے ہوئے اور اگر دین کی خاطر کچھ دیتے ہیں تو بیگار سمجھتے ہوئے!

ان آیات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ قرآن کی رو سے صلوٰۃ اور نظامِ انفاق کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اور جس صلوٰۃ سے معاشی نظام کو الگ کر دیا جائے یا جس معاشی نظام کو نظامِ صلوٰۃ سے جدا کر دیا جائے، قرآن کریم کی رو سے ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

نماز

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اگرچہ قرآنِ کریم کی رو سے اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم وہ نظام قائم کرنا ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں، لیکن قرآنِ کریم میں یہ لفظ (صلوٰۃ) اس شکل کے لئے بھی آیا ہے جسے نماز کہکر پکارا جاتا ہے۔ نماز قدیم فارسی (پہلوی) زبان کا لفظ ہے۔ ایران کے مجوس (جنہیں ہمارے ہاں پارسی کہا جاتا ہے) اپنے طریقِ پرستش کو نماز کہا کرتے تھے۔ انہی کے ہاں سے یہ لفظ ہمارے ہاں (ہندو پاک میں) آیا اور ایسا عام ہوا کہ اب صلوٰۃ کی جگہ یہی لفظ استعمال ہوتا ہے، حالانکہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔[1] بایں ہمہ، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، الصلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں اب نماز کہکر پکارا جاتا ہے۔

خیالات اور جسمانی حرکات کا تعلق

انسان کی کیفیت یہ ہے کہ جب اس کے دل میں کوئی جذبہ اُبھرتا ہے تو اس کا اظہار زبان کے ذریعے بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے دیگر اعضائے بدن سے خود بخود ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں جو اس جذبہ یا خیال کا مظہر بن جاتی ہیں۔ (مثلاً) جب آپ کے دل میں جذباتِ مسرت موجزن ہوتے ہیں تو اس کی لہریں مسکراہٹ کی شکل میں آپ کے چہرے پر پھیل جاتی ہیں۔ جب آپ کسی کو سلام کرتے ہیں تو آپ کا ہاتھ خود بخود ماتھے کیطرف اُٹھ جاتا ہے۔ جب آپ کسی کی تعظیم کرتے ہیں تو آپ کا سر جھک جاتا ہے، اور خود سپردگی کے عالم میں یہ جھکاؤ انتہائی شکل اختیار کر لیتا ہے جسے سربسجود ہونا کہتے ہیں۔ اصطلاح میں خیالات اور اعضاء کی اس یکبارگی ہم آہنگی کو متوازیت یا (PARALLELISM) کہکر پکارا جاتا ہے۔ اعضاء کی ان حرکات کا تقاضا ایسا غیر شعوری اور بلا ساختہ ہوتا ہے کہ آپ اُسے روک نہیں سکتے۔ اگر آپ کسی مقرر پر پابندی لگا دیں کہ وہ تقریر تو جیسی جی چاہے کرے لیکن دورانِ تقریر وہ ساکن کھڑا رہے۔ اس سے نہ کسی قسم کی حرکت ظہور میں آئے نہ چہرے پر خاص علامات کی نمود ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اوّل تو وہ تقریر ہی نہیں کر سکے گا اور اگر بندھے رندھے الفاظ بولے گا بھی تو اس کی تقریر بالکل غیر مؤثر اور بے نتیجہ رہ جائے گی۔ اعضائے جسمانی کی ان محسوس اور مرئی حرکات کو (FORMALISM) — شعائر و مناسک —

---

[1] اسی طرح درود کا لفظ بھی قدیم پہلوی زبان کا ہے اور قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا۔ صلوٰۃ بمعنی درود کے متعلق گفتگو اپنے مقام پر آئے گی۔

کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان کے اس داخلی تقاضہ کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ اس کے ظہور و نمود کی اجازت دی ہے صلوٰۃ (نماز) میں قیام و رکوع و سجود، اور مناسکِ حج میں طواف وغیرہ انسان کے اسی تقاضہ کی تسکین کی شکلیں ہیں۔ اگر ان مرئی شکلوں کو ترک کر دیا جائے تو باقی یا تو فلسفیانہ تخیلات رہ جاتے ہیں۔ یا خانقاہیت کی کیفیات، جن کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ:

ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نچشی

یہ فلسفہ کے تصورات ہوں یا تصوّف کی کیفیات، بہر حال انفرادی ہوتی ہیں۔ اجتماعیت سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن اسلام تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ لہٰذا اس میں یہ محسوسات بھی باقی رہتی ہیں اور ان میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ان کی ہم آہنگی اُمّت میں وحدتِ عمل کا مظہر ہوتی ہے۔

ظواہر پرستی

دوسری طرف، جب ان محسوسات سے غرض و غایت مفقود ہو جاتے اور ظواہر کی ادائیگی کو مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو اسے پرستش کہا جاتا ہے۔ جو ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ملتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی چونکہ اسلام "مذہب" بن کر رہ گیا ہے۔ اس لئے اس میں بھی الصلوٰۃ کو نماز کے محسوس ارکان تک محدود سمجھ لیا گیا اور عبادت کا مفہوم پرستش قرار دیا گیا ہے۔ اور انہی ظواہر کو اسلام کی غایت سمجھ لیا گیا ہے۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد اب آیئے قرآنِ کریم کی روشنی میں صلوٰۃ کے اجتماعات کی طرف۔ اسلامی نظام کے متعلق سورۃ الشوریٰ میں ہے: وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۴۲/۳۸)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو احکامِ خداوندی کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں اور اپنے معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ فریضۂ انفاق کی ادائیگی کے لئے کس قسم کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ صدرِ اول کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب مملکت کے کسی اہم معاملہ کے لئے مشاورت کی ضرورت لاحق ہوتی تو حکومت کی طرف سے ان الفاظ میں منادی کرائی جاتی کہ اَلصَّلٰوةُ الْجَامِعَةُ۔ اس پر لوگ اس اجتماع میں شرکت کیلئے جمع ہو جاتے تھے[1] چونکہ

[1] میں نے اس تاریخی شہادت کو صحیح سمجھ کر اس لئے یہاں درج کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے، قرآنِ کریم کے اصولی حکم "نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ ـــ صلوٰۃ کے لئے منادی ـــ کی عملی شکل کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ صدرِ اول کی تاریخی شہادت کی صحت و سقم کے متعلق میرا یہی مسلک ہے۔ یعنی جو واقعہ قرآنِ کریم کے خلاف نہیں جاتا میں اسے صحیح تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا جو اس کے خلاف جاتا ہو اسے ناقابلِ تسلیم

مشاورت کی غایت، قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا تھا اس لئے اس کی ابتداء نماز کی شکل میں ہوتی (جس طرح اب ہمارے ہاں رسمی طور پر جلسہ کا آغاز تلاوتِ قرآنِ کریم سے کیا جاتا ہے) اس سے ظاہر ہے کہ اجتماعات وقتِ مقررہ پر ہوتے تھے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴/۱۰۳) - یاد رکھو! صلوٰۃ - مومنین کے لئے ایک مؤقت فریضہ ہے یعنی ایسا فریضہ جس کی وقتِ معیّن پر ادائیگی کی جائے گی - بالفاظِ دیگر جو وقت اس کے لئے مقرر کیا گیا ہو اس وقت اس اجتماع میں شرکت لازمی ہوگی۔

اگر ان اوقات کو خود خدا نے مقرر کر دیا ہے تو ان میں ردوبدل نہیں ہو سکے گا۔ البتہ ہنگامی ضرورت کے وقت (مقررہ اجتماعات کے علاوہ) ہنگامی اجتماع منعقد کئے جا سکیں گے۔ اگر ان کے اوقات خدا نے مقرر نہیں کئے، تو انہیں باہمی مشاورت سے مقرر کر لیا جائے گا۔ ان میں (باہمی مشاورت سے) ردوبدل ممکن ہوگا۔ (کیا ان اجتماعات کے لئے اوقات کا تعین خدا نے کر دیا ہوا ہے؟ اس کی بحث ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

اِن اجتماعات کے لئے یہی وہ بلاوا ہے جسے قرآن نے ندائے صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ جمعہ میں ہے:
يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (۶۲/۹) اے افرادِ جماعتِ مومنین! جب تمہیں یوم الجمعۃ کو صلوٰۃ کے لئے آواز دی جائے تو سب کام کاج چھوڑ کر مقامِ اجتماع کی طرف لپک کر آجایا کرو کیونکہ وہاں "اللہ کی باتیں" ہوں گی (ان آیات کا پورا مفہوم اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا)۔ دوسری جگہ ہے وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا (۵/۵۸) مخالفین کی حالت یہ ہے کہ جب تم الصلوٰۃ جیسے اجتماع کے لئے منادی کرتے ہو تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ صلوٰۃ کے بعد مسجد میں جملہ معاملات طے پاتے تھے۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے کہ جب وصیت کے معاملہ میں کوئی متنازعہ فیہ امر فیصلہ طلب ہو تو صلوٰۃ کے بعد متعلقہ پارٹیوں کو وہاں روک لیا کرو تاکہ اس معاملہ کا قانون کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے (۵/۱۰۶) اِن اجتماعات میں شرکت کے لئے صفائی کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے مختلف مقامات پر غسل، وضو، اور تیمم وغیرہ کے احکامات دیئے ہیں (۵/۶ و ۴/۴۳) یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم ان اجتماعات میں پورے ہوش وحواس کے عالم میں شریک ہوا کرو کیونکہ وہاں بڑے اہم امور زیرِ بحث آئیں گے۔ جب تم اتنا بھی نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو تو ان اجتماعات میں شرکت فائدے کے بجائے اُلٹا نقصان کا موجب ہوگی (۴/۴۳)۔

جس شکل میں ہم نماز ادا کرتے ہیں اس کی جملہ جزئیات اور تفاصیل کا ذکر قرآنِ کریم میں نہیں آیا - ان میں سے صرف چند ایک کا اجمالی طور پر ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، ان جزئیات کا تعیّن قرآنِ کریم میں نہیں کیا گیا۔

اور یہاں سے ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال، سامنے آتا ہے جس کا تعلق خود دین کی اصل سے ہے۔

اُصول اور اُن کی جزئیات

ایک چیز ہوتی ہے اصول اور دوسری چیز ہوتی ہے اس اصول کو بروئے کار لانے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے۔ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے طُرق و اسالیب میں حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ طبیعی زندگی سے متعلق ایک مثال کی رو سے اسے یوں سمجھئے کہ انسانی زندگی کا مدار غذا پر ہے یہ ناقابلِ تغیر اُصول ہے جو شروع سے آج تک یکساں چلا آرہا ہے۔ لیکن غذا کی نوعیت اور کیفیت بدلتی چلی آئی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں غاروں کے رہنے والے انسانوں کی غذا اور تھی اور آج کے انسان کی اور ہے۔ پھر، آج بھی مختلف ممالک کے باشندوں کی غذا میں فرق ہے اور یہ فرق بیشتر آب و ہوا کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ آگے بڑھئے تو ایک فرد کی زندگی کے مختلف ادوار اور حالات ہیں، غذا میں فرق ہوتا ہے۔ بچہ کی غذا اور ہوتی ہے جوانی کے زمانے کی اور، اور بڑھاپے میں اس سے بھی مختلف۔ تندرست کی غذا اور مریض کی غذا میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اگر قاعدہ یہ ٹھہرالیا جائے کہ غذا میں کسی حالت میں بھی تبدیلی نہیں ہوسکتی تو زندگی دو قدم بھی نہ چل سکے۔ یہی کیفیت ان اصول و اقدار کی ہے جو خدا کی طرف سے انسانی راہنمائی کے لئے ملے ہیں۔ ان اصولوں کو الدِّین کہا جاتا ہے جو شروع سے آخر تک یکساں چلا آیا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے: شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (۴۲/۱۳)۔ تمہارے لئے بھی دین کا وہی راستہ تجویز کیا گیا ہے جس کا حکم نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا اور جسے اب (اے رسولؐ!) تیری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ ان سب سے یہی کہا گیا تھا کہ اس دین کو ہمیشہ برقرار رکھنا اور اس میں کوئی اختلاف اور تفرقہ پیدا نہ کرنا۔ یہ، الدّین وہ اصول تھے جنہیں شروع سے آخر تک غیر متبدل رکھا گیا تھا لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریقوں میں حالات کے مطابق فرق ہوتا رہنا تھا۔ انسانوں کی ابتدائی زندگی میں ان کے علم کی محدودیت کا یہ عالم تھا کہ حضرت نوحؑ کو یہ بھی وحی کے ذریعہ سکھایا گیا کہ کشتی کس طرح بنائی جاتی ہے (۱۱/۳۷) اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں دین پر عمل پیرا ہونے کے چھوٹے چھوٹے قواعد و ضوابط بھی وحی کے ذریعے بتائے جاتے تھے۔ جوں جوں علمِ انسانی میں وسعت ہوتی جاتی تھی، ان جزئیات میں کمی اور تبدیلی کردی جاتی تھی۔ سورۃ البقرۃ میں اسی حقیقت کی ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے کہ مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ

ناسخ ومنسوخ

نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (۲/۱۰۶) وحی کا طریق یہ رہا ہے

ایک رسول کی وساطت سے کچھ قوانین دیئے جاتے۔ اس رسول کے بعد، ان میں سے بعض قوانین کو ان کے نام لیوا بدل دیتے (اسے تحریف کہا جاتا ہے)۔ بعض، انہی کی سازشوں سے۔ یا حوادثِ ارضی وسماوی کی وجہ سے ضائع اور فراموش ہو جاتے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے کہ رہنے تو وہ علیٰ حالہٖ، لیکن تغیرِ حالاتِ زمانہ کی وجہ سے ان میں تبدیلی ضروری سمجھی جاتی۔ اس وقت ایک دوسرا رسول آتا۔ اس کی وساطت سے الدّین کے اصول وہی دیئے جاتے جو سابقہ رسول کی وساطت سے دیے گئے تھے۔ جہاں تک ان کی جزئیات کا تعلق تھا، ان میں سے جنہیں علیٰ حالہٖ رکھنا مقصود ہوتا، اُنہیں دُہرا دیا جاتا (انہیں مِثْلِهَا، کہا گیا ہے) اور جنہیں قابلِ تغیر سمجھا جاتا انہیں منسوخ کرکے اس کی جگہ ایسے احکام دے دیئے جاتے جو اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہوتے۔ اس لحاظ سے یہ جدید احکام سابقہ احکام سے بہتر ہوتے (بِخَيْرٍ مِّنْهَا) اُسے دوسری جگہ تبدیلِ آیات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (۱۶/۱۰۱)

سورۃ الحج میں اس حقیقت کو ان جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ. فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۲۲/۵۲)۔ اے رسول! ہمارا انداز یہ رہا ہے کہ ہماری طرف سے انبیاء و رُسُل کی طرف جو وحی کی جاتی (رسول کے بعد) جب شیطان اس میں کچھ آمیزش کر دیتا تو ہم ایک اور رسول بھیج دیتے اور اس کی طرف نازل کردہ وحی کے ذریعے شیطانی آمیزش کو مٹا کر (منسوخ کرکے) اپنے قوانین کو بارِ دیگر محکم کر دیتے یہ سب کچھ خدا کے علم و حکمت کی بنا پر ہوتا۔ سابقہ رسول کے نام لیوا اس لئے رسول سے جھگڑتے اور کہتے کہ جو جزئی احکام تم پیش کرتے ہو وہ ہماری شریعت سے مختلف ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ تم خدا کے رسول نہیں۔ خود احکام وضع کرتے ہو اور انہیں خدا کی طرف منسوب کرکے وحیٔ الٰہی بتاتے ہو۔ ان کے اس قسم کے اعتراضات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر کسی نئے رسول کی طرف سے ایسے احکامِ شریعت پیش ہوں جو سابقہ رسول کو عطا کردہ احکام سے مختلف ہوں تو یہ بھی خدا کے پروگرام کے مطابق ہوتا ہے۔ منہاج و شرائع (جزئیات) قابلِ تغیر و تبدل ہوتی ہیں اور اصلِ دین غیر متغیر۔ اس لئے منہاج و مناسک کی تبدیلی کی بنا پر اصلی دین میں جھگڑے نہیں پیدا کرنے چاہئیں۔ لِّكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ. فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ (۲۲/۶۷ ؛ ۵/۴۸) ہم نے ہر قوم کے لئے (ان کے حالات کے مطابق) دین کے مختلف طور طریقے دیئے تھے۔ لیکن اصل دین (الامر) ہر جگہ ایک ہی رہا ہے۔ انہیں یہ نہیں چاہئے کہ ان جزئی احکام کے اختلاف کو بطورِ دلیل پیش کرکے اصل دین کی بابت ہی جھگڑنا شروع

کر دیں. (مثلاً) یہودی شریعت میں، ناخن دار جانور (ذی ظُفُرٍ) اور گائے بکری کی (مخصوص) چربی حرام قرار دیدی گئی تھی ($\frac{6}{147}$) لیکن قرآنِ کریم نے اسے حرام قرار نہیں دیا۔

آخری ضابطۂ ہدایت

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا، تاآنکہ انسانیت اس دور تک آپہنچی جس میں انسانی علم کی ترقی اور وسعت کی رفتار بڑی تیز ہو جاتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق ایک آخری رسول کو بھیجا اور انسان کو قیامت تک کے لئے جو راہنمائی دینی تھی اسے اس رسول کی طرف نازل کردہ کتاب میں مکمل اور محفوظ کر دیا۔ اس کتاب کی صورت یہ تھی کہ اس میں :

۱:- دین کے اصول تو وہی تھے جو شروع سے چلے آرہے تھے۔

۲:- جہاں تک احکام کا تعلق ہے ان میں بہت تھوڑے ایسے تھے جن کی تفصیلات بھی خدا نے خود متعین کر دیں۔ یہ وہ تفصیلات تھیں جن کا غیر متبدل رکھا جانا مقصود تھا۔ اور

۳:- دیگر احکام صرف اصولی طور پر دیئے گئے۔ یعنی ان کی جزئیات خدا نے خود متعین نہیں کیں کیونکہ ان (جزئیات) کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھا جانا مقصود نہیں تھا۔ ان میں اقتضائے حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہنی تھیں۔

مندرجہ بالا تینوں شقوں کی مثالیں یوں سمجھئے کہ :

۱:- محکومیت (عبودیت) صرف خدا کی اختیار کی جا سکتی ہے کسی انسان کی نہیں۔ یہ دین کا ابدی اصول تھا شروع سے غیر متبدل چلا آرہا تھا اور جسے غیر متبدل رہنا تھا۔

۲:- (احکام میں) جن رشتوں کو نکاح کیلئے حرام قرار دیا گیا ہے قرآن نے ان کی جملہ تفاصیل خود بیان کر دی ہیں (دیکھئے $\frac{4}{23}$)۔ اسی طرح وراثت کے حصے بھی خود ہی متعین کر دیئے ہیں ($\frac{4}{11-12}$ وغیرہ)

۳:- ا۔ جرائم بیشمار قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کی سزائیں تو قرآنِ کریم نے خود متعین کر دی ہیں (سرقہ، زنا، تہمت، بغاوت)۔ اور باقیوں کی سزا خود متعین نہیں کی۔

ب۔ اور بعض احکام ایسے ہیں جنہیں صرف اصولی طور پر دیا گیا ہے مثلاً مشاورت کا حکم ($\frac{42}{38}$) تو دیا گیا ہے لیکن مشاورت کی مشینری خود تجویز نہیں کی۔

ان مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآنِ کریم کے اصول و احکام کی کیفیت کیا ہے۔ جہاں تک ان اصول و

تفاصیل کا تعلق ہے جو قرآن کریم میں دے دیئے گئے ہیں ان میں نہ حک و اضافہ ہوسکتا ہے نہ تغیّر و تبدّل۔ باقی رہے وہ احکام جن کی جزئیات خود قرآن نے متعین نہیں کیں ان کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جزئیات کس طرح متعین ہوں گی۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت کردی کہ ان کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ ہم سے بھول ہوگئی ہے کہ ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ انہیں دانستہ ایسا چھوڑا گیا ہے۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۔ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ۔ (۵/۱۰۱-۱۰۲)

اے جماعتِ مومنین! جن امور کو ہم نے بتایا نہیں، انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو۔ اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے اگر (بالفرضِ محال) ان امور کو بھی قرآن میں دیدیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دیدینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکے گی اور جب تغیرِ حالات کی بنا پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائیں گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے لبادہ ہی کو اُتار پھینکا۔ لہٰذا جن جزئیات کا تعین ہم نے نہیں کیا انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے

تعینِ جزئیات کا طریق

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سابقہ رسولوں کے سلسلہ میں تو یہ ہوتا تھا کہ اس قسم کی نئی جزئیات نئے رسول کی وساطت سے ملتی تھیں۔ اب جب کہ وحی کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا اور حضورؐ کے بعد کسی اور رسول نے آنا ہی نہیں تو جزئیات کے تعین اور ان میں عند الضرورت تغیر و تبدل کے لئے طریق کیا بتایا گیا؟ مندرجہ بالا آیت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ نزولِ قرآن کے دوران بھی ان جزئیات کا تعین وحی کی رو سے کیا جانا مقصود نہیں تھا۔ لہٰذا ان جزئیات کے تعین و تبدّل کے لئے جو طریق حضورؐ کے بعد تجویز کیا گیا تھا اُسے خود رسول اللہؐ کی زندگی ہی میں اختیار کرلیا گیا تھا۔ اس کے لئے رسول اللہؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۸)

یہ اُمور اپنے رُفقاء کے مشورہ سے طے کیا کرو۔

یعنی ان جزئیات کا تعین و تغیر و تبدل، باہمی مشاورت سے ہوگا وحی کی رو سے نہیں۔ قرآن کریم کے ارشاد فرمودہ اِس

طریق (شورائیت) کے مطابق ان جزئیات کا تعین خود رسول اللہ کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد اس کے لئے کیا طریق تجویز کیا گیا۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو اس حقیقت کو واضح کیا گیا کہ جو نظامِ شورائیت (اسلامی نظامِ مملکت) رسول اللہ کے زمانے میں قائم ہوا تھا، اسے، حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں رہنا تھا۔ اسے آپ کے بعد بھی علیٰ حالہٖ قائم رکھا جانا مطلوب تھا۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۗ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۗ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (۳/۱۴۳)

محمدؐ بجز این نیست، کہ خدا کے ایک رسول ہیں۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول آئے اور (اپنا اپنا مشن پورا کر کے) دنیا سے چلے گئے۔ اگر کل کو یہ رسولؐ بھی وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ بس دین کا نظام ختم ہو گیا، اور اس کے بعد تم پھر اپنی روشِ کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے! یاد رکھو! جو ایسا کریگا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور جو لوگ اس نظام کو قائم رکھیں گے ان کی محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں گی۔

یعنی جو نظامِ مملکت حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں قائم ہوا تھا اسے حضورؐ کے بعد بھی جاری رہنا تھا۔ اور تعین و تغیرِ جزئیات کے لئے جو حکم حضورؐ کو دیا گیا تھا اس کے مطابق آپ کے بعد بھی عمل ہونا تھا۔ چنانچہ (جس طرح رسول اللہ سے کہا گیا تھا کہ ان امور کا تعین باہمی مشاورت سے کیا کر د، اسی طرح) جماعتِ مومنین کے متعلق کہا گیا:۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔

اُن کے معاملات بھی باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ الدّین کے اصول و قوانین، اقدار و احکام، جو قرآنِ کریم کے اندر موجود و محفوظ ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور جو تفاصیل اس میں نہیں دی گئیں ان کا تعین، اور حالات کی تبدیلی کے مطابق ان میں تبدیلی، اسلامی نظامِ مملکت کے ذریعہ ہوگی۔

ثبات و تغیر کا امتزاج

ثبات (PERMANENCE) اور تغیر (CHANGE) کے اس حسین

اِمتزاج سے کاروانِ انسانیت، شاداں و فرحاں اپنی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی خود انسانی زندگی کا تقاضہ ہے۔ اگر اس میں کوئی اصول ناقابلِ تغیر نہ ہو تو اس کی مثال اس کشتی کی سی ہو جائے گی جسے لنگر کے بغیر حوادثِ زمانہ کی طغیانیوں میں چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر اس میں کوئی شے قابلِ تغیر نہ ہو تو وہ جامد اور متحجر بن کر رہ جائے۔ اس کی نمو اور ارتقاء ختم ہو جائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور حضورؐ کے بعد جب تک قرآنی نظام قائم رہا (جسے خلافت علی منہاج رسالت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ثبات و تغیر کا یہ امتزاج بھی باقی رہا۔ اس نظام کا یہی وہ زور دروں تھا جس کی وجہ سے اِس امت نے چند برسوں میں وہ وسعتیں اور بلندیاں حاصل کر لیں جن کی نظیر تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی۔ لیکن وائے بدقسمتی، کہ اس کے بعد یہ نظام قائم نہ رہا، اور جب یہ نظام ہی باقی نہ رہا تو اصولی احکام کی جزئیات کے تعین اور تغیر کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اُس وقت دین "مذہب" میں تبدیل ہو گیا (اور جیسا کہ ہر مذہب میں ہوا)

بعد میں کیا ہوا؟

جو جزئیات اس زمانے میں رائج تھیں ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ (دین کے اصولوں کی طرح) ہمیشہ کے لئے ناقابلِ تغیر رہیں گی۔ اِس سے زندگی ساکت اور جامد ہو کر رہ گئی۔ اس سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ وہ جزئیات رفتہ رفتہ ناقابلِ عمل ہوتی گئیں بلکہ خود دین کے اصولوں پر بھی عمل کرنا ممکن نہ رہا۔ اس لئے کہ اصولوں پر اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب ان پر عمل کرنے کے طور طریق زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔ اگر یہ طریق جامد ہو جائیں تو دین پر عمل کرنا بھی ممکن نہیں رہتا — جس طرح (مثلاً) اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سفر کرنے کا ناقابلِ تغیر طریق بیل گاڑی ہے تو چاند تک پہنچنا ناممکن ہو جائے، خواہ اصولی طور پر آپ کو کتنا ہی یقین کیوں نہ ہو کہ چاند تک پہنچ جانا ممکن ہے۔ ان حالات میں "مذہب" یہ کرتا ہے کہ ان جزئیات کے ظواہر پر عمل پیرا رہنے کو دین کی غایت قرار دیدیتا اور ان پر شدت کے ساتھ پابند رہنے پر زور دیتا رہتا ہے لیکن یہ ٹیکنیک بھی زیادہ عرصہ تک کارفرما نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کہ انسان اسی عمل پر بطیب خاطر التزاماً کاربند رہ سکتا ہے جس کے نتائج اس کے سامنے آتے جائیں۔ ظواہر پرستی سے کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ اس لئے اعمال کو نتائج کی رُو سے پرکھنے والے لوگ اس ظواہر پرستی پر قائم نہیں رہتے۔ یہ جو ہمارے زمانے میں عام شکایت ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل مذہب سے بے گانہ ہوتی چلی جا رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ یہ نسل (یعنی تعلیم یافتہ نوجوانوں کا طبقہ) نہ تو کسی دعوے کو بلا دلیل و برہان ماننے کے لئے تیار ہے، نہ کسی ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ جس کے واضح نتائج سامنے نہ آئیں۔ اگر دین کا صحیح نظام اور اس کے انسانیت ساز نتائج ان کے سامنے ہوتے تو نہ صرف یہ کہ یہی نوجوان

جانِ مدعا بنا لیتے بلکہ (قرآنِ کریم کے الفاظ میں) دوسری اقوام بھی فوج در فوج، کشاں کشاں اس کی طرف چلی آتیں (۲/۱۱۰)۔ اور یوں قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آجاتا کہ هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹/۳۳)۔ خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو واضح ہدایت اور مبنی بر حقیقت نظام دیکر بھیجا تاکہ یہ نظام دیگر نظامہائے عالم پر غالب آجائے، خواہ مشرکین کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

اِن تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ قرآنِ مجید نے اپنے جملہ احکام کی تمام تر تفصیلات خود متعین کیوں نہیں کر دیں۔ اس کے بعد آپ پلٹئے زیرِ نظر موضوع کی طرف۔ یعنی صلوٰۃ (نماز) کی جزئیات اور تفاصیل کی طرف۔ دین کے نظام میں صلوٰۃ کو جسقدر اہمیت حاصل ہے اس کے متعلق دو آرا ہو ہی نہیں سکتیں، لیکن اس کے باوجود، آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم نے اس کے اوقات، رکعات، ارکان و اذکار وغیرہ تفاصیل کو متعین طور بیان نہیں کیا۔ ان میں سے بعض کے متعلق اس میں (قرآن مجید میں) کچھ اشارات ملتے ہیں اور باقیوں کے متعلق اتنا بھی نہیں۔ سب سے پہلے صلوٰۃ کے اوقات کو لیجئے۔ ان کے متعلق حسب ذیل مقامات پر اشارے ملتے ہیں۔

صلوٰۃ کے اوقات

(۱) اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (۱۷/۷۸)۔

اِس آیت کا رواں ترجمہ یہ ہے کہ صلوٰۃ قائم کرو "دلوکِ شمس" سے لیکر "غسق لیل" تک اور قرآن الفجر۔ یاد رکھو قرآن الفجر بڑا مشہود ہوتا ہے۔ اس میں "دلوکِ شمس" اور "غسق لیل" کے الفاظ غور طلب ہیں۔ دلک کا لفظ بڑا وسیع المعنی ہے۔ اس کے بنیادی معنے حرکت کرنے کے ہیں۔ جب آفتاب بلندی کی طرف حرکت کرے تو اس کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے اور جب وہ رو بہ انحطاط ہوکر غروب ہو جائے تو اس کے لئے بھی۔ اور غسق لیل، ابتدائے شب کی تاریکی کو کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے طلوعِ آفتاب سے لیکر غروبِ آفتاب بلکہ غروب کے کچھ عرصہ بعد (غسق) تک کا سارا وقت اس میں آجاتا ہے۔ کتب تفاسیر میں، اس آیت کی تشریح میں اس قدر طول طویل لیکن باہمدگر متضاد باتیں کہی گئی ہیں کہ انہیں اختصاراً پیش کرنے کی بھی یہاں گنجائش نہیں۔ ہم نے آیت بھی پیش کر دی ہے اور ان الفاظ کے لغوی معانی بھی۔ آیت سے کم ازکم اتنا تو واضح ہے کہ اس میں اوقات کا تعین نہیں کیا گیا۔ حالانکہ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جب اسے کسی بات کو متعین طور پر پیش کرنا مطلوب ہوتا ہے، تو وہ اشارات اور کنایات سے کام نہیں لیتا اسے واضح، غیر مبہم، متعین (SPECIFIC) انداز سے بیان کرتا ہے لیکن

اِس آیت میں وہ متعین انداز اختیار نہیں کیا گیا۔

(۲) سورۃ ہود میں ہے وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ (۱۱/۱۱۴)۔ اس کے عام معانی یہ ہیں کہ تم صلوٰۃ قائم کرو دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے پہلے حصے میں۔ اسی طرح سورۃ طٰہٰ میں ہے وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوۡبِهَا وَمِنۡ اٰنَآئِ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّهَارِ (۲۰/۱۳۰) اس میں صلوٰۃ کا لفظ تو نہیں آیا تسبیح کا لفظ آیا ہے۔ لیکن عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس سے بھی صلوٰۃ ہی مقصود ہے۔ اس میں طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے، دن کے دونوں اطراف اور رات کی گھڑیوں کا ذکر ہے۔ بات یہاں بھی متعین طور پر نہیں کہی گئی۔

یہ اور اس قسم کی چند ایک اور آیات سے عام طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ نماز کے مروجہ پانچ اوقات خود قرآن نے متعین کئے ہیں، لیکن عام دعویٰ یہی ہے کہ یہ اوقات رسول اللہ نے مقرر فرمائے تھے۔

(۳) سورۃ النور میں مجلسی آداب کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ تمہارے گھروں میں کام کرنے والے بچے، بے محابا گھر میں گھوم پھر سکتے ہیں، بجز ان تین اوقات کے۔ یعنی مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوۃِ الۡفَجۡرِ وَحِیۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِیَابَكُمۡ مِّنَ الظَّهِیۡرَۃِ وَمِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ۔ ثَلٰثُ عَوۡرٰتٍ لَّكُمۡ (۲۴/۵۸) صلوٰۃ الفجر سے پہلے اور صلوٰۃ العشاء کے بعد اور دوپہر کے وقت، کیونکہ ان اوقات میں تم بے تکلف کپڑے وغیرہ اُتار کر بیٹھے یا لیٹے ہوتے ہو۔ اس آیت میں فجر اور عشاء کی نمازوں کا ذکر بالتصریح آیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں دو نمازیں اسی طرح متعارف تھیں۔ اگرچہ قرآنِ کریم میں حکم کے طور پر ان کا بھی ذکر نہیں آیا۔

(۴) سورۃ بقرۃ میں، پہلے طلاق وغیرہ کے مسائل کا ذکر ہے اور اس کے بعد ہے حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی۔ وَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِیۡنَ (۲/۲۳۸)۔ تم اپنی صلوٰۃ (بصیغہ جمع) کی حفاظت کرو اور "صلوٰۃ الوسطیٰ" کی۔ اس میں "صلوٰۃ الوسطیٰ" کے معنی درمیانی نماز کئے جاتے ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے کیونکہ وہ ایک طرف فجر اور ظہر اور دوسری طرف مغرب اور عشاء کے درمیان آتی ہے۔ (میرے نزدیک اس آیت کا کیا مفہوم ہے، اسے اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا)

رکعات

جہاں تک رکعات کا تعلق ہے انہیں بھی قرآنِ کریم نے متعین طور پر بیان نہیں کیا۔ سورۃ النساء میں اتنا بتایا گیا ہے کہ جنگ کی حالت میں، جب تمہیں دشمن کی طرف سے خطرہ لاحق ہو تو نماز کو اس طرح ادا کر لینا چاہیئے کہ مجاہدین کا ایک گروہ امام (یعنی رسول اللہ) کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار سنبھالے رکھے۔ جب یہ

سجدہ کر چکیں تو پیچھے ہٹ جائیں اور دوسرا گروہ جس نے ابھی تک صلوٰۃ ادا نہیں کی۔ امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔ یہ بھی اسی طرح اپنے ہتھیار سنبھالے رکھیں ---- (۴/۱۰۲-۱۰۱) سورۃ بقرۃ میں کہا گیا ہے فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۲/۲۳۹)۔ یعنی جب تم حالتِ خوف میں ہو تو پھر پاپیادہ یا گھوڑوں کی پشت پر بیٹھے ذکر کر لیا کرو۔ اور جب تم حالت امن میں ہو تو پھر جس طرح تمہیں سکھایا گیا ہے اس طرح کرو۔

رکعتوں کے متعلق قرآنِ کریم کی انہی آیات میں اشارات ملتے ہیں۔ میں ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ کیونکہ ان کے متعلق مختلف فرقوں میں اختلاف ہے ---- یعنی ہر نماز میں اتنی رکعتیں فرض، اتنی سنت، اتنی نفل وغیرہ میں ان اختلافات کو بھی بڑا دخل حاصل ہے [میں ان آیات کی تشریح (اپنی بصیرت کے مطابق) متعلقہ مقامات پر کروں گا]

اذکارِ صلوٰۃ جہاں تک نماز میں کچھ پڑھنے کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کی بھی صراحت نہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت (۱۷/۱۱۰) میں کہا گیا ہے کہ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا۔ تم اپنی صلوٰۃ میں نہ تو بلند آواز اختیار کرو اور نہ بالکل خاموشی۔ بلکہ ان دونوں کی درمیانی راہ اختیار کرو۔ بعض لوگ یہاں صلوٰۃ سے مراد نماز لیتے ہیں اور بعض عام دُعا۔ (کیونکہ صلوٰۃ کے معنے دُعا بھی ہیں)۔

سورۃ التوبہ میں منافقین کے متعلق حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ (۹/۸۴) تم ان میں سے کسی کی میت پر بھی دعا نہ کرو اور نہ ہی ان کی قبر پر کھڑے ہو۔ اس آیت سے نمازِ جنازہ مُراد لی جاتی ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ (۱۷/۷۹)۔ اے رسولؐ! تم رات میں بھی کچھ وقت کے لئے جاگا کرو لیکن یہ حکم صرف تمہارے لئے ہے۔ اس سے تہجد کی نماز مراد لی جاتی ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ رسولؐ اللہ کے لئے مخصوص تھی، اور وہ بھی فریضہ کے طور پر نہیں بلکہ نفل کے طور پر۔

میری بصیرت کے مطابق، قرآنِ کریم میں نماز کی تفاصیل کے متعلق یہی کچھ آیا ہے۔ میں نے تعیینِ جزئیات کے جس اصول کا پہلے ذکر کیا ہے اس کی رو سے میرے لئے اس باب میں مزید کاوش کی ضرورت نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ صلوٰۃ کا اصولی حکم وحی کی رو سے حضورؐ کو دیا گیا تو آپؐ نے قرآنی اصول کے مطابق باہمی مشاورت سے اس

کے لئے مکمل پروگرام متعین فرمایا ہوگا۔[1] قرآن کریم کے یہ ارشادات اسی پروگرام کے تضمنات نظر آتے ہیں۔ جس حکم کی جزئیات قرآن کریم خود متعین کرتا ہے اس میں اس کا انداز کیا ہوتا ہے اس کی کچھ مثالیں پہلے پیش کی جا چکی ہیں (دیکھئے صفحہ ۱۲) اس وقت میرے سامنے سورۃ بقرۃ کی آیات (۲/۲۸۲-۲۸۳) ہیں (اور آیت ۲۸۲ تو غالباً قرآن کریم کی سب سے لمبی آیت ہے) اس میں کہا گیا ہے کہ جب تم باہمی قرض کا معاملہ کرو تو اس کے لئے کیا طریق اختیار کرو۔ آپ دیکھئے قرآن کریم نے اس پروگرام کو کس وضاحت اور تصریح کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جب لین دین کے معاملات کی جزئیات میں اس کا یہ انداز ہے تو صلوٰۃ جیسے بنیادی فریضہ کے سلسلہ میں جزئیات کے تعین کے لئے اس نے ایسا ہی انداز کیوں نہ اختیار کیا؟ تعجب ہے کہ اس نے وضو کے متعلق تو ایسا تفصیلی حکم دیا کہ منہ دھوؤ۔ کہنیوں تک ہاتھ دھوؤ۔ سر کا مسح کرو، پاؤں ٹخنوں تک دھوؤ، جُنبی حالت میں یوں کرو۔ مسافر اور مریض ہونے کی صورت میں ایسا کرو۔ پانی نہ ملے تو کیا کرو۔ (۵/۶)۔ تمہیدِ صلوٰۃ کے متعلق تو اس قدر تفصیلی احکام آئے لیکن خود صلوٰۃ کے سلسلہ میں اس طرح متعین طور پر کوئی حکم نہیں دیا اِس سے نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ... ان جزئیات کو (دانستہ) غیر متعین رکھنا چاہتا تھا۔

متقدمین میں سے جن فرقوں نے نماز کی جزئیات کا تعین کیا، انہوں نے ان کی بنیاد احادیث یا فقہ پر رکھی۔ لیکن ان جزئیات میں جسقدر اختلاف ہے وہ مختلف فرقوں کی نماز سے ظاہر ہے۔ اس مقام پر ایک اور حقیقت بھی قابلِ غور ہے۔ قرآن کریم نے الصلوٰۃ کو امت میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ اس نے سورۃ روم میں کہا کہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱-۳۲) تم صلوٰۃ قائم کرنا اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا، فرقوں میں بٹ گئے اور پھر کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ یہ سمجھنے لگ گیا کہ میں حق پر

موجودہ نماز تفرقہ کا مظہر ہے

ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں۔ گویا قرآن کریم نے صلوٰۃ کو اُمت میں.... وحدت پیدا کرنے اور وحدت برقرار رکھنے کا ذریعہ بتایا تھا لیکن وائے بدنصیبی کہ اب وہی صلوٰۃ (نماز کی شکل میں) امت کے تفرقہ کا مظہر قرار پا گئی ہے۔ کسی جلسہ میں دس ہزار مسلمان بیٹھے ہوں

---

[1] عام عقیدہ تو یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے ان جزئیات کا تعین وحی خفی کی رُو سے کیا تھا جو قرآن کریم کے اندر نہیں ہے۔ قرآن صرف وحی جلی ہے لیکن قرآن کریم سے وحی کی ان دو قسموں کا ثبوت نہیں ملتا۔ وحی ایک ہی قسم کی تھی جو سب کی سب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے وحی کی ان دو قسموں کا عقیدہ یہودیوں کے ہاں تھا۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر ملے گی۔

ان میں فرقہ بندی کی کوئی محسوس علامت سامنے نہیں آئے گی، سب ایک امت کے افراد دکھائی دیں گے لیکن اس دوران میں اگر نماز کی اذان سنائی دے تو ان میں سے ایک ٹولی ایک مسجد کا رُخ کرے گی دوسری ٹولی دوسری مسجد کا۔ اور اس طرح ان کے گروہ مندانہ اختلافات اُبھر کر سامنے آجاتیں گے اور ان اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہوگا کہ ایک فرقہ سے متعلق مسلمان کو دوسرے فرقہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اگر وہ بھولے بھٹکے دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز پڑھ لے گا تو دہائی مچ جائے گی کہ اس کی نماز نہیں ہوئی۔

لیکن چونکہ یہ فرقے اس امر کے مدعی ہیں کہ نمازوں کی یہ باہمدگر مختلف جزئیات احادیث یا فقہ کی رو سے متعین ہوئی ہیں اس لئے اس اختلاف کی زد قرآن کریم پر نہیں پڑتی، لیکن ہمارے دور میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا ہے جس نے براہِ راست قرآن کریم کو اس طرح اپنا ہدف بنایا ہے کہ اس کا یہ دعویٰ، کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (معاذ اللہ) باطل ہو کر رہ گیا ہے۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲) کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں کئی اختلافی باتیں پاتے۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کے دعویٰ کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

فرقہ اہلِ قرآن

اِس فرقہ کا، جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جو برعکس نہند نام زنگی کافور، اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہکر پکارتا ہے) دعویٰ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے تمام احکام کی جملہ تفصیلات و جزئیات خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے سب سے پہلے نماز کی جزئیات کو لیا ہے۔ میں کسی لمبی چوڑی بحث میں پڑے بغیر صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ان کی اس سعی نامشکور کا نتیجہ کیا نکلا۔ اس فرقہ کے بانی تھے (مولانا) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم)۔ اور ان کے متبعین کا ایک گروہ لاہور میں مقیم ہے۔ ان دونوں نے نماز کی جزئیات (اپنے دعویٰ کے مطابق) قرآنِ کریم سے متعین کی ہیں اور ان کی دریافت کردہ جزئیات کی کیفیت یہ ہے:-

مولانا چکڑالوی		لاہوری فرقہ	
۱:-	پانچ وقت کی نماز	۱:-	تین وقت کی نماز
۲:-	نماز میں دو، تین، چار رکعتیں	۲:-	نماز کی صرف دو رکعتیں
۳:-	ہر رکعت میں دو سجدے	۳:-	ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ

جہاں تک اذکارِ صلوٰۃ کا تعلق ہے وہ بھی بالکل نرالے ہیں، اگرچہ وہ مشتمل ہیں قرآنی آیات ہی پر۔

اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جس قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں نماز کی جزئیات تک میں اس قدر اختلاف ہے تو اسے مُنزل مِنَ اللہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے ؟ تو سوچئے کہ اس کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے ؟ اور اگر یہ دونوں گروہ (مقتدی اور مقتدی) آپس میں جھگڑنے لگ جائیں اور ایک دوسرے پر الزام دھریں کہ اس نے قرآن کو صحیح نہیں سمجھا تو اس سے ایک اور اعتراض وارد ہوگا جو پہلے اعتراض سے زیادہ نہیں تو کم سنگین بھی نہیں ہوگا۔ معترض کہے گا کہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ کتاب مبین (روشن کتاب) ہے اور اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ لیکن عملاً اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اپنے حکم میں تعداد تک کو بھی غیر مبہم انداز سے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ جس انداز سے تعداد بتاتا ہے اس سے ایک شخص پانچ وقت سمجھتا ہے تو دوسرا تین وقت۔ کوئی دو ــــ تین ــــ چار رکعتیں سمجھتا ہے، کوئی صرف دو رکعت ــــ کوئی دو سجدے سمجھتا ہے کوئی ایک۔ بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) کے متعلق تو انسانوں کا فکری اختلاف قابلِ فہم ہوتا ہے کیونکہ انہیں تشبیہی انداز میں بیان کیا جاتا ہے، لیکن جس کتاب کا متعین احکام و قوانین کے متعلق یہ انداز ہو، اسے خدا کی کتاب سمجھنا تو درکنار (معاذ اللہ) انسانی تصانیف میں بھی قابلِ قدر مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے قرآن کریم پر کتنی بڑی زد پڑتی ہے۔ انتہائی صدمہ اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں نے قرآن کا نام لے کر قرآن کے ساتھ کس قدر دشمنی کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجھے خصوصیت سے ان کے نظریہ اور مسلک کی تردید کرنی پڑی۔

لیکن یہ سب کچھ کہہ سن چکنے کے بعد عملی زندگی کی طرف آئیے۔ آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان کے مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقے کی نماز کی جزئیات میں اختلاف ہے اور یہی اختلاف ان کی فرقہ بندی کا آئینہ دار ہے۔ دوسری طرف قرآنِ کریم نے وحدتِ امت کو دین کی اساس قرار دیا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں؟ اور کیا اس امت میں پھر سے وحدت پیدا ہو سکتی ہے ؟۔

پس چہ باید کرد

ان اختلافات کی سند یا تائید میں ہر فرقہ اپنے اپنے ہاں کی روایات یا فقہی فیصلے پیش کرتا ہے۔ یہ روایات یا فقہی اجتہادات اس اختلاف کی سند تو قرار پا سکتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اس نظام کا موجود نہ رہنا ہے جس سے دین کا قیام اور امت کی وحدت وابستہ تھی۔ جب ان اختلافات کی بنیادی وجہ یہ ہے تو پھر ان کے رفع ہونے کی بھی اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہو سکتی کہ اس نظام کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ اس مقام پر اکثر کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ محض خوابوں کی دنیا میں بسنا ہے۔ وہ نظام دوبارہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کہنا، یا تو خود فریبی ہے اور یا فریب دہی۔ خود فریبی ہو یا فریب دہی، قرآن کریم نے بہرحال اس کے متعلق

پہلے ہی وارننگ دیدی تھی کہ اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ یہ نظام رسول اللہ کی زندگی تک قائم رہ سکتا ہے، اس کے بعد نہیں تو اس کا مطلب دین سے ارتداد ہوگا (۳/۱۴۴، تفصیل پہلے گذر چکی ہے) اس نظام کا دوبارہ قائم کیا جانا ممکن بھی ہے اور آسان بھی۔ جو مملکت ایمان کی بنیادوں پر، یہ فیصلہ کرے کہ اس کے جملہ امور (جن میں مذہبی اور غیر مذہبی کی کوئی تمیز و تفریق نہ ہوگی) قرآن مجید کے مطابق سرانجام پائیں گے، اور اس کے بعد وہ اس پر عمل کرنا بھی شروع کر دے، تو وہ مملکت علیٰ منہاج رسالت کہلائے گی۔ اس کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ جن ذمہ دار افراد کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار ہو وہ خود اقدارِ خداوندی کے پابند ہوں اس مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ جو کچھ اس وقت اسلام کے نام سے مروج ہے، وہ اُسے قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھے۔ جو اس پر پورا اترے اسے اختیار کرے۔ جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی راہنمائی ایسی واضح ہے کہ اس قسم کی پرکھ ناممکن تو ایک طرف، چنداں مشکل بھی نہیں۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اربابِ مذہب کے پاس اس وقت بھی قرآن موجود ہے تو اس کے باوجود ان میں وحدت پیدا کیوں نہیں ہوتی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ان امور کی پرکھ کے لئے قرآن کریم کو کسوٹی نہیں بنایا جاتا۔ بہت کچھ خارج از قرآن ہے جسے سند اور معیار تسلیم کیا جاتا ہے اور یہی ان اختلافات کی وجہ ہے۔ جب قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں تو اسے معیار قرار دینے سے اختلافات کس طرح باقی رہ سکتے ہیں؟

جہاں تک قرآنی اصول و احکام کی جزئیات کا تعلق ہے، وہ نظام، ان کی بھی جانچ پڑتال کرے گا۔ جو جزئیات ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کریں گی انہیں علیٰ حالہ رہنے دے گا، جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہوگی، انہیں تبدیل کریگا اور عندالضرورت ان میں نئی نئی جزئیات کا اضافہ بھی کرنا جائے گا۔ اس طرح ثبات و تغیر کے امتزاج کا قرآنی پروگرام پھر سے بروئے کار آ جائے گا۔

جب تک یہ نظام قائم نہیں ہوتا، میرا مسلک یہ ہے کہ امت کے مختلف فرقے، جس جس انداز سے ان پر کاربند ہیں وہ ان پر اسی طرح کاربند رہیں۔ لیکن ان میں ایسی شدت نہ برتی جائے کہ وہ باہمی نفرت اور عداوت کا موجب بن جائیں نیز کسی فرد یا فرقہ کو اس کا حق نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ مروجہ ارکان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے اس سے امت میں مزید تفرقہ اور انتشار پیدا ہوگا، ان جزئیات میں حک و اضافہ یا تغیر و تبدل کا حق صرف اسلامی نظام کو حاصل ہوتا ہے ختم نبوت کے بعد نہ ہی کسی شخص کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ امت سے آ کر کہے کہ خدا نے مجھ سے یوں کہا ہے اس لئے تم اب ایسا ہی کرو۔ ایسے شخص کا یہ دعویٰ ہی باطل ہے کہ "خدا نے اس سے یوں کہا ہے"۔ خدا نے انسانوں سے جو کچھ کہنا تھا اسے اس نے آخری بار قرآن کریم میں کہہ دیا اور بس۔

مروجہ عقائد و نظریات میں البتہ جو امور ایسے ہیں جو قرآن کریم کے خلاف ہیں، قرآنی بصیرت رکھنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان کی نشاندہی کرتے ہوئے قرآنی تعلیم و تصورات کو قوم کے سامنے پیش کریں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس امر کی وضاحت کر دیں کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اُن کی اپنی انسانی بصیرت پر مبنی ہے جس میں سہو و خطا کا امکان ہے۔ (میرا اس باب میں یہی مسلک ہے۔ میں موجودہ ارکانِ اسلام میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا، نہ ہی کوئی نیا طریقہ وضع یا اختیار کرتا ہوں۔ اور جو قرآنی مفہوم پیش کرتا ہوں اس کے متعلق بھی وضاحت کر دیتا ہوں کہ وہ میری اپنی بصیرت کا نتیجہ ہے جو سہو و خطا سے منزہ نہیں ہو سکتی)۔

آخر میں اس حقیقت کا دھرا دینا ضروری ہے کہ اجتماعاتِ صلوٰۃ کو دین کے نظام میں بڑی اہمیت حاصل ہے قرآن کریم دین کے قیام کے لئے ایک امت (پارٹی۔ حزبُ اللّٰہ) کی تشکیل کرتا ہے جو باقی دنیا سے بالکل الگ اور منفرد ہوتی ہے، اور چونکہ یہ انقلابی جماعت ہوتی ہے جس کا نصب العین خدا کے تجویز کردہ نظام کو نظامہائے انسانی پر غالب کرنا ہوتا ہے، اس لئے دیگر جماعتوں (اقوام یا پارٹیوں) کے ساتھ اس کا تصادم لازمی ہوتا ہے۔

تشکیل و استحکامِ امت کیلئے صلوٰۃ کے اجتماعات ضروری ہیں

تشکیل و استحکامِ جماعت کے لئے دو بنیادی عناصر لاینفک ہیں۔ (۱) بے ہمگی (EXCLUSIVENESS) اور باہمدگر پیوستگی (GREGARIOUSNESS) یہ "بے ہمگی" (دوسروں سے علیحدگی) تھی جس کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے اعلان کیا تھا کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ۔ ہم تم سے، اور جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر محکومیت اختیار کر رکھی ہے ان سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں۔ ان سے بیزار ہیں۔ كَفَرۡنَا بِكُمۡ وَبَدَا بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا۔ ہم تمہارے نظام کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس سے یکسر انکار کرتے ہیں۔ اور اس حقیقت کو چھپا کر نہیں رکھنا چاہتے۔ اس کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتے ہیں کہ عداوت اور بغض کھلا ہوا ہے۔ اور یہ کیفیت اس وقت تک رہے گی حَتّٰى تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗ (۶۰/۴)۔ جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ — انہوں نے اس کا اعلان کیا اور قرآنِ کریم نے ان کے اس مسلک کو اُمتِ مسلمہ کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا (۶۰/۴)، یہ ہے وہ بے ہمگی، علیحدگی جس کی تلقین و تاکید سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ اس اصول میں کسی مفاہمت یا لچک کی گنجائش نہیں۔ یہی لاالٰہ کا عملی مفہوم ہے۔

جہاں تک اساسِ اُمت کے دوسرے جزو یعنی باہمدگر پیوستگی (رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ (۴۸/۲۹) کا تعلق ہے اجتماعِ صلوٰۃ اس کا عملی مظاہرہ ہے۔ اس اجتماع کی آواز پر افرادِ اُمت بحکمِ خداوندی فَاسۡعَوۡا اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ (۶۲/۹)۔

اجتماع گاہ کی طرف یہ کہتے ہوئے لپک کر آتے ہیں : اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۶/۸)۔ میں ساری دنیا سے منہ موڑ کر اپنی تمام توجہات اس خدا کی طرف مرکوز کرتا ہوں جو کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اور میں اس کی محکومیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا ـــــ اس اعلان میں (دوسروں سے) علحدگی اور باخویش پیوستگی کے دونوں اجزا شامل ہیں۔ اس اجتماع میں نظام کے اصول گوشے سمٹی ہوئی شکل میں (IN MINIATURE FORM) سامنے آجاتے ہیں ـــ ایک امت۔ اس کے افراد، ہر قسم کا تفرقہ مٹاتے ہوئے، ایک صف میں ایستادہ ـ ایک امام (مرکز ملت) جس کی آواز پر کامل آہنگی اور یک رنگی سے سب جھکتے اور سب اٹھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ کس حقیقت کا مظہر؟ اس حقیقت کا کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (۱/۴)۔ ہم تیرے سوا کسی کو صاحب اقتدار تسلیم نہیں کرتے۔ کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کرتے۔

نظامِ خداوندی کے اساسی اصولوں کی اس طرح تجدید یاد داشت اور عملی مظاہرہ کے بعد اس معاملہ کی مشاورت کی کاروائی شروع ہوگی جس کے لئے یہ اجتماع منعقد کیا گیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے) یہ اجتماعات اب (جبکہ وہ نظام باقی نہیں رہا اور اس طرح دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے) ظواہر بن کر رہ گئے ہیں بے مقصد اور پیکر بن چکے ہیں بے روح، بایں ہمہ ان کا برقرار رکھنا ضروری ہے۔

موجودہ بے روح پیکروں کا برقرار رکھنا بھی ضروری ہے

ایک تو اس لئے کہ یہ شعائر و مناسک "مسلمان قوم" کے جداگانہ تشخص کے برقرار رکھنے کا ذریعہ ہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ جب کبھی ہم نے اس نظام کے احیا (بارِ دگر قیام) کی کوشش کی، تو ان پیکروں میں روح پھونکنے کا مرحلہ نسبتاً آسان ہوگا۔ اُمت کے دوبارہ قیام کے لئے، نُفِخَ فِي الصُّوْرِ کا (تمثیلی) مفہوم یہ بھی تو ہو سکتا ہے! جیسا کہ کہا گیا ہے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا (۱۸/۹۹)۔ اِن صُوَر (پیکروں) میں روح پھونک کر ان کی اجتماعیت کا احیاء کر دیا جائے گا۔ لہٰذا نماز کی موجودہ ہیئت کو برقرار رکھنے کے ساتھ اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھنا ہوگا کہ یہ، بہ حالاتِ موجودہ نماز پڑھنا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ اسی وقت ممکن ہوگا جب اسلامی نظام قائم ہو (۲۲/۴۱)۔

ضمناً۔ مرکزیت کے نہ رہنے سے امت کی کیا حالت ہو جاتی ہے اس کا نقشہ بھی ہماری موجودہ نمازوں میں سامنے آجاتا ہے۔ فرضوں کی نماز باجماعت میں آپ کو ہم آہنگی اور یک رنگی دکھائی دے گی۔ لیکن اس کے بعد، صلوٰۃ بے امام (سنتوں وغیرہ) میں، وہی مسجد ہوگی۔ وہی امت۔ وہی نماز۔ لیکن ایک امام کے نہ ہونے سے، ساری جماعت، انتشار اور اختلاف کا مظہر بن جائے گی ـــ وہ کھڑا ہے۔ یہ جھکا ہوا۔ وہ سجدے میں ہے، یہ بیٹھا ہوا ـــ غرضیکہ سارا صحن مسجد، مسلمانوں

کی موجودہ پریشانیٔ فکر و نظر اور تشتتِ کردار و عمل کی آماجگاہ دکھائی دیگا۔ امامت (مرکزیت) قائم کر دیجئے، پھر سے وہی ہم آہنگی اور یک نگہی عود کر آئے گی۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی ـــــ علاج اس کا؟ وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

اس دشوار گزار وادی کے بعد اب آگے بڑھئے۔ ذکر متقین کی خصوصیات کا ہو رہا ہے۔ قرآن مجید نے ان کی اگلی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:

(۲/۴) وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ -

یہ وہ لوگ ہیں جو، اے رسولؐ! اس پر ایمان رکھتے ہیں جسے ہم نے تیری طرف نازل کیا۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وحی اس مخصوص اور منفرد علم کا نام ہے جو خدا کی طرف سے حضراتِ انبیائے کرام کو براہ راست ملتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لفظِ "نزول" کا انتخاب کر کے بڑے بلیغ انداز سے اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے۔ اس مادہ (ن۔ ز۔ ل) کے بنیادی معنی ہیں "بلندی سے نیچے کی طرف آنا"۔ اس کے مختلف مشتقات اور ان کے استعمال کے متعلق تو ہم متعلقہ مقامات پر گفتگو کریں گے۔ یہاں ہم اس کے اس مفہوم تک اکتفا کرتے ہیں جس سے مراد وحی ہے۔ جو علم، انسانی فکر کا نتیجہ ہو اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ انسان کے اندر موجود ہوتا ہے اور وہاں سے باہر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ یہ علم نیچے سے اوپر کی طرف اٹھتا ہے۔ اس کے برعکس جو علم خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے اس کے متعلق یوں سمجھئے کہ وہ اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے۔ اس علم کی یہی معروضیت یا خارجیت (OBJECTIVITY) ہے جس کے لئے لفظ انزال یا تنزیل استعمال کیا گیا ہے۔ انسانی علم کی کوئی قسم بھی ایسی نہیں جو فرد متعلقہ کے "اندر سے باہر" نہ آتی ہو۔ یعنی اس میں اس کے فکر و جذبات کا دخل نہ ہو۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک، وجدان (INTUITION) کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہوتا۔ کہیں، باہر سے ملتا ہے۔ غالب کے الفاظ میں:

وحی کی خصوصیت

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

وجدان لیکن یہ محض شاعری ہے۔ عصرِ حاضر کی تحقیق نے بتا دیا ہے کہ اس میں نوائے سروش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ خود شاعر کے اپنے تحت الشعور ہی کی آواز ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے برگساں کے حوالہ سے (جسے عصرِ حاضر میں وجدانی تحقیق کا امام سمجھا جاتا ہے) کہا ہے کہ "(INTUITION) انسانی فکر ہی کی ایک بلند شکل کا نام ہے"۔ [1]

---

[1] RECONSTRUCTIONI OF RELEGIOUS THOUGHTS IN ISLAM (P.3)

ہم نہیں جان سکتے (اور غیر از نبی کوئی انسان بھی نہیں جان سکتا) کہ وحی ملنے کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ ... قرآن کریم نے اتنا ہی کہا ہے فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (۲/۹۷)۔ اے رسولؐ! جبریل اس علمِ خداوندی کو، بحکمِ خداوندی، تیرے قلب پر نازل کرتا ہے۔ یہ علم، قلبِ نبویؐ پر بالفاظہ نازل ہوتا تھا۔ اسی لئے اسے کلام اللہ کہا گیا ہے (۹/۶)۔ رسول اللہ پر جو علم اس طرح نازل ہوتا اسے خود خدا نے قرآن کہہ کر پکارا ہے، جہاں کہا ہے کہ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا (۷۶/۲۳) ہم نے تیرے اوپر اس قرآن کو تنزیلاً نازل کیا ہے۔ یعنی بتدریج۔ اور رسول اللہ کو حکم دیا گیا تھا کہ جو کچھ خدا کی طرف سے آپ پر نازل ہوتا ہے اُسے آپ اپنی ذات تک ہی محدود نہ رکھیں، بلکہ دوسرے انسانوں تک بھی پہنچائیں۔ ارشادِ خداوندی تھا يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (۵/۶۷) اے رسولؐ! جو کچھ منجانب اللہ تیری طرف نازل کیا جاتا ہے اُسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو، تو فریضۂ رسالت کی ادائیگی سے قاصر رہیگا۔ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لئے حضورؐ نے مَا أَنزَلَ اللَّهُ (قرآن) کو جمع، مدوّن اور مرتب شکل میں امت کو دیا جو آج تک ایک لفظ کے تغیر و تبدل کے بغیر امت کے ہاں محفوظ چلا آرہا ہے۔ اس میں نہ کوئی بات منسوخ ہے نہ محرّف۔ اسی مَا أَنزَلَ اللہ پر ایمان لانا متقی ہونے کی شرط قرار دیا گیا ہے

وحیِ خفی

(ضمناً) ہمارے ہاں یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی جلی یا متلو اور مکتوب، جو قرآن کریم کے اندر درج ہے، اور دوسری قسم وحی خفی یا غیر متلو اور غیر مکتوب، جو قرآنِ مجید میں درج نہیں۔ احادیث اسی وحی پر مبنی ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں اس دوسری قسم کی وحی کا کوئی ذکر نہیں۔ اس میں ایک ہی وحی کا ذکر ہے جو قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی اس مقام پر ملے گی جہاں وحی کے متعلق بات سامنے آئے گی)۔

متقی ہونے کے لئے پہلی شرط اللہ پر ایمان لانے کی تھی۔ اس کے بعد مَا أَنزَلَ اللہ پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دیا گیا۔ اس میں پہلی بات سمجھنے کے قابل یہ ہے کہ خدا کے ساتھ ہمارا (یا انسانوں کا) تعلق صرف وحی کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس کے سوا خدا کے ساتھ تعلق کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اور چونکہ خدا کی مکمل اور محفوظ وحی اب قرآنِ مجید کے اندر ہے اس لئے خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید ہی ہے۔ جب ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے ہم کلام ہوتا ہے۔ [کیونکہ یہ خدا کا کلام ہے (۹/۶)] اور جب ہم اس کے احکام پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو ہم خدا کی اطاعت کر رہے ہوتے ہیں کہ اس نے اپنے احکام و قوانین کی اطاعت کا ذریعہ اتباعِ قرآنی قرار دیا ہے۔ لہٰذا جب متقین کی

خصوصیت یہ بتائی گئی کہ وہ مَآ اُنْزِلَ اللّٰہُ پر ایمان رکھتے ہیں تو اس سے عملاً مراد یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کا اتباع کرتے ہیں۔ چنانچہ خود ارشادِ خداوندی ہے اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ (۷/۳)۔ "جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے سوا کسی اور رفیق یا سرپرست کا اتباع نہ کرو۔ کرنے کا کام تو یہی ہے لیکن بہت تھوڑے لوگ ہیں جو اس حقیقت کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں"۔ مَآ اُنْزِلَ اللّٰہُ کے متعلق ہم سردست اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ مَآ اُنْزِلَ اللّٰہُ پورے کا پورا قرآنِ کریم ہے، اس لئے اس سے متعلق گفتگو اس (یا کسی ایک) مقام تک محدود نہیں رہ سکتی۔ (میری دیگر تصانیف کی طرح موجودہ کاوش میں بھی، شروع سے آخر تک، آپ جو کچھ دیکھیں گے وہ (بتوفیقِ ایزدی) مَآ اُنْزِلَ اللّٰہُ ہی کی تشریح و توضیح ہوگی۔ کہ یہ میری زندگی کا مشن ہے)۔

متقین کے متعلق یہاں یہ کہا گیا کہ وہ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ:

(۲/۴) وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ۔

اور جو کچھ اے رسولؐ! تجھ سے پہلے نازل کیا گیا تھا وہ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ رسول اللہ (یا قرآنِ مجید) سے قبل کے مَآ اُنْزِلَ پر ایمان لانے سے مقصود کیا ہے؟ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کی طرف سے ہر قوم میں اور ہر زمانہ میں رسول آتے رہے۔ رسول یا نبی کے معنے ہی یہ ہیں کہ انہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ میں ان سب کی وحی داخل ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو کچھ ان انبیائے کرامؑ کو دیا گیا تھا ان کے نام لیواؤں نے اس میں تحریف کر دی تھی۔ پھر ان میں سے بعض کتب حوادثِ ارضی و سماوی کی وجہ سے ناپید بھی ہو گئیں۔ جو محرف کتب ان انبیاءؑ کے نام لیواؤں کے پاس موجود ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض احکام ایسے ہوں جن میں تحریف نہ ہوئی ہو۔ وہ علیٰ حالہٖ موجود ہوں۔ لیکن، جیسا کہ ہم ناسخ و منسوخ کے نظریہ کے تحت پہلے وضاحت سے لکھ چکے ہیں۔ وحی کا انداز یہ بھی رہا ہے کہ سابقہ انبیاءؑ کی طرف نازل کردہ احکام میں سے جن احکام کا باقی رکھنا مقصود نہیں ہوتا تھا، ان کی جگہ، بعد میں آنے والے نبی کی طرف وحی کی رو سے دوسرے احکام دیدیئے جاتے تھے (خواہ وہ احکام کتبِ سابقہ میں غیر محرف طور پر موجود بھی کیوں نہ ہوں)۔ بنابریں جو کتابیں سابقہ انبیائے کرام کی طرف نازل ہوئی تھیں، نزولِ قرآن کے بعد ان کی صورت یہ ہے کہ

۱:- ان میں سے کوئی کتاب بھی آج اپنی اصلی، غیر محرف شکل میں دنیا کی کسی قوم کے پاس موجود نہیں۔ یہ کوئی بے بنیاد دعویٰ نہیں۔ میں نے ان کتب کی تاریخ مرتب کی ہے اور ان میں خود متعلقہ مذاہب کے اہلِ علم حضرات

کی شہادات سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی اپنی اس شکل میں موجود نہیں، جس میں وہ ان کے نبی کو ملی تھی [۱]۔

۲:- سابقہ انبیائے کرامؑ کی طرف نازل کردہ جس رہنمائی کو علیٰ حالہٖ رکھنا مقصود تھا وہ سب کی سب قرآن مجید میں جمع کردی گئی ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵/۴۸) اے رسولؐ! ہم نے اس کتاب کو تیری طرف حق کے ساتھ نازل کیا ہے جو ان تمام دعاوی کو سچ کرکے دکھا دے گی [۲] جو اس سے پہلے مختلف انبیائے کرامؑ کی وساطت سے ان کی امتوں کے ساتھ کئے گئے تھے، اور جو ان انبیاءؑ کی بنیادی تعلیم کو محیط بھی ہے اور اس پر نگران بھی۔ لہٰذا تم اب ان اقوام کے معاملات کا فیصلہ اسی کتاب کے مطابق کرو۔ اور اس الحق کے آجانے کے بعد ان کے خیالات اور خواہشوں کا اتباع مت کرو۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے بتایا جاچکا ہے، قرآن کریم ان اقوام سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ رسول اللہؐ کی رسالت اور القرآن پر ایمان لائیں۔

دنیا کی مذہب پرست اقوام کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے ہر قوم، دوسرے مذہب کو جھوٹا کہتی ہے۔ اس جھوٹا کہنے کا فطری اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان مذاہب کے بانیوں کو بھی جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ اس سے باہمی نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ جو اہل مذاہب میں مسلسل نزاع اور فساد چلا آرہا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ قرآن کریم، کشادِ قلب اور وسعتِ نگاہ کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ اپنے پیروؤں سے یہ کہتا ہے کہ وہ اعلان کریں کہ ہم جملہ مذاہبِ عالم کے بانیوں [۳] کے متعلق یہ ایمان رکھتے ہیں کہ وہ خدا کے سچے پیغامبر تھے۔ وہ اپنے اپنے وقت میں، خدا کی طرف سے سچا پیغام لے کر

---

[۱] میری اس کتاب کا نام ——— "مذاہبِ عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں" ہے۔

[۲] قرآن کریم کو جو کتبِ سابقہ کا مصدق کہا گیا ہے تو اس کے بھی یہی معنی ہیں، نہ یہ کہ وہ کتابیں جس حالت میں ان اہل مذاہب کے ہاں موجود ہیں قرآن ان کی تصدیق کرتا ہے۔ ایسا کرنا تو کھلا ہوا تضاد ہوگا کہ ایک طرف وہ ان کتابوں کو محرف بھی کہے اور دوسری طرف ان کے سچا ہونے کی تصدیق بھی کرے۔ (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی)

[۳] یاد رہے کہ انبیائے کرام دین کے "بانی" نہیں تھے۔ وہ دین خداوندی کے مبلغ (دوسروں تک پہنچانے والے) تھے۔ لیکن چونکہ مختلف اہل مذاہب کے ہاں دین کا تصور نہیں رہا ـــ اس لئے وہ ان انبیاءؑ کو اپنے مذہب کا بانی کہتے ہیں۔

آئے تھے۔ اگرچہ وہ پیغام اب اپنی شکل میں (قرآن کے سوا) کہیں اور موجود نہیں۔ ہم ان تمام انبیائے کرام کا اسی طرح احترام کرتے ہیں جسطرح محمد رسول اللہ کا احترام۔ یہ احترام ہمارے ایمان کا جزو ہے، کیونکہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲/۲۸۵) "جہاں تک اُن کے رسول ہونے کا تعلق ہے ہم ان میں سے کسی میں بھی فرق نہیں کرتے۔" آپ نے دیکھا کہ جس "محبت" کو (اقبالؒ کے الفاظ میں) فاتح عالم کہا جاتا ہے وہ جماعتِ مؤمنین کے اس ایمان کا کس طرح فطری اور لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بعض انبیائے کرام کا بصراحت نام لیا ہے اور باقیوں کے متعلق کہا ہے کہ ہم نے ان کا نام نہیں لیا (۴/۷۸ نیز ۴/۱۶۴)۔ لیکن جب ہمارا ایمان یہ ٹھہرا کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف انبیائے کرام آئے تھے تو ان میں سے کسی کا نام قرآنِ کریم میں آیا ہو یا نہ، جنہیں مذہب پرست اقوام اپنے اپنے مذہب کا بانی کہیں گی، ان کا احترام ہم پر لازم آجائے گا، ہم ان میں سے کسی کی شان میں بھی گستاخی نہیں کر سکیں گے۔ یہ ہمارے ایمان کے منافی ہوگا۔ البتہ رسول اللہ کے بعد اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کرے گا تو ہم اسے جھوٹا کہیں گے اور اس کا شمار ان انبیاء میں نہیں کریں گے جن پر ایمان لانے کے ہم مکلف قرار دیئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ کہا ہے۔ یعنی جو کچھ رسول اللہ پر نازل کیا گیا اور جو حضور سے پہلے (مِنْ قَبْلِكَ) نازل کیا گیا۔ مِنْۢ بَعْدِكَ۔ یعنی "رسول اللہ کے بعد" نزولِ وحی کا ذکر قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آیا کہ حضور کے بعد نزولِ وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

واضح رہے کہ مسلمان، داخل اُمتِ محمدیہ ہی میں ہوں گے اور اتباع بھی قرآنِ کریم ہی کا کریں گے۔ نہ وہ کسی دوسرے نبی کی امت میں داخل ہوں گے اور نہ ہی ان کی طرف منسوب کردہ کتب کا اتباع کریں گے۔

(۲/۴) وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔

متقین کی جن خصوصیات کا ذکر چلا آرہا ہے، یہ ان کی آخری کڑی ہے۔ یعنی ایمان بالآخرۃ۔ یہ خصوصیت، جہاں نیز نظر سلسلہ کی آخری کڑی ہے وہاں خود جزئیاتِ ایمان کے سلسلۃ الذہب کی بھی آخری کڑی ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ایمان باللہ اور آخری کڑی ایمان بالآخرۃ۔ ایمان باللہ کا عملی مفہوم ہے خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل، ابدی، غیر متبدل اصول و اقدار و قوانین کی صداقت و محکمیت پر ایمان، اور ایمان بالآخرۃ کا عملی مفہوم ہے ان اصول و احکام پر کاربند ہونے کے حیات بخش ثمرات اور ان کی خلاف ورزی کے انسانیت سوز عواقب پر یقینِ محکم خواہ وہ اس دنیا میں برآمد ہوں اور خواہ اُخروی زندگی میں، ایمان بالآخرۃ دوسرے الفاظ میں خدا کے قانون مکافاتِ عمل پر ایمان کا نام ہے۔

آخرۃ (جس کا مونث آخرۃ ہے) "اوّل" کے مقابلہ میں آتا ہے۔ یہ لفظ کسی ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی پہلے

آنے والی چیز کے بعد آ رہی ہو لیکن اس کے بعد پھر اس جیسی کوئی اور چیز نہ آئے بلکہ ایک نئے سلسلہ کا آغاز ہو" بعد میں آنے" کے اعتبار سے اس سے مفہوم مستقبل (FUTURE) ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ آخَرُ ہے جس کا مؤنث اُخْرٰی ہے۔ اس کے معنے ہیں ایسی چیز جو اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہو۔ یہ مفہوم غور طلب ہے۔

تخلیقِ انسانی کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے کہا کہ اس سطحِ ارضی پر زندگی کا آغاز اولین جرثومۂ حیات سے ہوا۔ اس کے بعد زندگی مختلف مراحل میں سے گزرتی، پیکر بدلتی، قرنہا قرن کے ادوار پیچھے چھوڑتی، آگے بڑھتی آئی تا آنکہ یہ درجۂ حیوانات میں داخل ہو گئی (تفصیل ان امور کی آگے چل کر بیان کی جائے گی جہاں انسانی پیدائش سے متعلق آیات سامنے آئیں گی) سورۃ المؤمنون میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ رحمِ مادر میں انسانی جنین کس طرح انہی مراحل میں گزرتا ہے جنہیں ہر حیوانی جنین طے کرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد انسانی بچے کے ضمن میں کہا: ثُمَّ أَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ (۲۳/۱۴)۔ "پھر ہم نے اسے ایک ایسی مخلوق بنا دیا جو اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف تھی"۔

حیوانی اور انسانی زندگی میں فرق

یہاں سے انسانی زندگی، دیگر حیوانات کی زندگی سے متغائر، مختص اور منفرد ہو گئی۔ حیوانات کی زندگی ان کے طبیعی اجسام کی زندگی سے عبارت ہوتی ہے۔ جب جسم پر موت وارد ہو جائے تو اس حیوان کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی زندگی ان سے ان معانی میں متغائر اور منفرد ہے کہ فرد اپنے جسم کی موت سے مرتا نہیں، اس کی زندگی آگے بھی چلتی ہے، لیکن زندگی کی اگلی کڑی سابقہ کڑیوں جیسی نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے اسے خلقِ جدید کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۱۷/۴۹، ۳۲/۱۰، ۱۷/۹۸) کہ جب ہم مرنے کے بعد گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا اس کے بعد ہم ایک نئی پیدائش لے کر زندہ ہوں گے؟ دیگر مقامات پر قرآنِ کریم نے اسے تَارَةً اُخْرٰی (۲۰/۵۵) اور النَّشْاَةَ الْاُخْرٰی (۵۳/۴۷) کہہ کر وضاحت کر دی کہ وہ زندگی، موجودہ حیاتِ ارضی سے متغائر ہو گی۔ مرنے کے بعد کی اس زندگی کو حیاتِ آخرۃ کہا گیا ہے۔ اگر اس پر ایمان نہ ہو تو کوئی شخص نہ مسلمان ہو سکتا ہے، نہ مسلمان کہلا سکتا۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ آخرۃ کے معنے مستقبل (FUTURE) کے ہیں ان معانی کے لحاظ سے دیکھئے تو:

(۱) ہر فرد کا آنے والا کل (فردا) اس کا مستقبل ہے۔

(۲) ہر قوم کا اگلا دَور اس کا مستقبل ہے، خواہ وہ عروج ہو یا زوال کا۔

(۳) عالمگیر انسانیت کی ہر موجودہ نسل کے بعد آنے والی نسل اس کا مستقبل ہے۔ اور

(۴) مرنے کے بعد کی زندگی ان سب کا مستقبل ہے۔

دنیا میں دو قسم کے نظریاتِ زندگی اور ان پر متفرع نظامِ حیات پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریۂ زندگی، نہ خدا کے ابدی، غیر متبدل قوانین (وحی) کا قائل ہے، نہ حیاتِ آخرت کا ماننے والا۔ اس نظریہ کو دہریت یا مادی نظریۂ حیات کہا جاتا

سیکولر نظریۂ حیات

ہے۔ اور اس پر متفرع نظام کو سیکولر۔ سیکولرازم میں قوانین سازی کا اختیار معاشرہ کو حاصل ہوتا ہے اور ان قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج بھی معاشرہ کے قائم کردہ نظامِ عدل کی رو سے برآمد ہوتے ہیں۔ مثلاً ملزم کو پولیس گرفتار کرتی ہے، اور اگر عدالت اسے مجرم قرار دیتی ہے تو وہاں اُسے جرم کی سزا ملتی ہے۔ اس نظام کا پہلا بنیادی نقص تو یہ ہے کہ سوسائٹی ہی قوانین بناتی ہے اور جب جی چاہے وہ ان قوانین میں... ردّ و بدل بھی کر سکتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کا یقین اور اطمینان نہیں ہو سکتا کہ آج کے قوانین کب تک رہیں گے اور کب بدلے جائیں گے۔ اس کا دوسرا بنیادی سقم یہ ہے کہ اگر کسی کا کوئی جرم پولیس کی گرفت میں نہ آئے، یا وہ ایسا انتظام کر لے کہ عدالت اسے مجرم ثابت نہ کر سکے تو اُسے اس جُرم کی سزا ہی نہیں مل سکتی۔ اس کے برعکس، خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اِن بنیادی اسقام سے منزہ اور بلند ہے۔ اس میں انسان کا ہر عمل، خدا کے ابدی قوانین کے مطابق اپنا نتیجہ پیدا کر کے

خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل

رہتا ہے، اور اس کے احاطہ میں محسوس اعمال ہی نہیں آتے، نگاہ کی خیانتیں اور دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی آجاتے ہیں۔ سورۃ مؤمن میں ہے
يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹) خدا، نگاہوں کی خیانت اور دلوں میں پوشیدہ رازوں تک سے بھی واقف ہے۔ جہاں تک ان اعمال کے نتائج کا تعلق ہے، سارا قرآن یوں کہیئے کہ اسی نکتہ کی تفصیل ہے کہیں وہ جامع طور پر کہتا ہے وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۚ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۱/۱۱۱)۔ "یہ حقیقت ہے کہ تمام افرادِ انسانیہ کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل کر رہے گا، اور یہ اس لئے کہ خدا ہر ایک کے عمل سے اچھی طرح باخبر ہے"۔ کہیں وہ انفرادی طور پر کہتا ہے کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)۔ "ہر فرد کا اچھا کام ہو یا بُرا، اس کا نتیجہ سامنے آ کر رہے گا"۔ یہ اس طرح کہ (قرآنی فلسفۂ حیات کی رو سے) انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات (SELF) پر پڑتا ہے اور یہ ذات انہی نقوش کو لئے ہوئے اس زندگی میں بھی قائم رہتی ہے اور اس کے بعد آگے بھی چلتی ہے۔ لہٰذا کسی عمل کے بے نتیجہ رہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جماعتِ مؤمنین کی تمدنی زندگی میں نظامِ عدل کا قیام بھی قرآنِ کریم کی رو سے نہایت ضروری ہے۔ لیکن ہزار تدابیر و احتیاط کے باوجود اس میں کسی نہ کسی سقم کا رہ جانا خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن خدا کا قانون مکافاتِ عمل ان اسقام سے مبرّا ہوتا ہے۔ اس نظام کے متعلق دوسری جگہ ہے: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵)۔ ہر شخص اپنے عمل کا نتیجہ خود بھگتے

گا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا" دوسری جگہ ہے وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)۔ اس قانون کی رو سے نتیجہ خیزی کے سلسلہ میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آسکے گا کسی کی سفارش قبول نہیں کی جائیگی۔ نہ ہی جرم کے بدلہ میں کچھ لے لوا کر مجرم کو چھوڑ دیا جائیگا نہ ہی اس کا کوئی حامی و مددگار ہوگا۔ حتیٰ کہ اس سلسلہ میں اور تو اور حضورؐ نبی اکرم کی زبانِ مبارک سے بھی اعلان کرادیا کہ:۔

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۶/۱۵)

اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی سزا سے بچ نہیں سکوں گا۔ جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے، انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔ اس کو اس کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس انفرادیت کو نہایت مختصر، لیکن بڑے جامع انداز میں یہ کہکر بیان کر دیا کہ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى (۶/۹۵)۔ جو کچھ "تمہارا" ہے ــــ خواہ وہ مال و دولت ہو یا اعزہ و اقارب، دوست اور رفیق ہوں یا عوان و انصار ــ تم ان سب کو پیچھے چھوڑ دوگے، اور ہمارے ہاں صرف اپنی انفرادیت (ذات) کو لیکر آؤ گے، اور

انسانی ذات پر کندہ نقوش

اس پر کندہ نقوش خود پکار اٹھیں گے کہ تم نے کیا کچھ کیا تھا۔ آج یہ نقوش نگاہوں سے پنہاں ہیں۔ اس وقت یہ اس طرح نمودار ہو جائیں گے جس طرح لیموں کے عرق سے لکھے ہوئے الفاظ کاغذ کو آگ کے سامنے رکھنے سے خود بخود ابھرتے چلے آتے ہیں۔ انہی نقوش کو انسان کا اعمالنامہ کہا جاتا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۳-۱۴) "ہر شخص کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لٹک رہا ہے۔ اس وقت وہ لپٹا ہوا ہے۔ ظہورِ نتائج کے وقت کھل کر سامنے آجائے گا اور اس شخص سے کہا جائے گا کہ تم اپنے اعمالنامہ کو خود ہی پڑھ لو اور خود ہی اپنا حساب کرلو۔ تمہاری ذات تمہارا محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے"

حیاتِ اُخروی کی کیفیت، نوعیت اور صورت کس قسم کی ہوگی، اور جنت اور جہنم کی ماہیت کیسی، اسے ہم اپنے شعور کی موجود سطح پر نہیں جان سکتے۔

جنت کے متعلق کہا کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (۳۲/۱۷)" کوئی شخص اس زندگی میں نہیں جان سکتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا وہ سامان جسے پوشیدہ رکھا گیا ہے کیسا ہے"۔ ہر بسیط حقیقت (ABSTRACT REALITY) کی طرح اس نے اسے تمثیلی انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۃ رعد میں ہے مَثَلُ الْجَنَّةِ

تمثیلی بیان

الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ . . . . . (۱۳/۳۵) "جس جنت کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے، تمثیلی طور پر اُسے یوں سمجھو. . . . . (نیز ۴۷/۱۵)۔ اسی طرح جہنم کے متعلق کہا کہ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـئِدَۃِ (۱۰۴/۶-۷)۔ "اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں"

اِن مادراءالطبیعیاتی حقائق کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ ان کی تفاصیل سارے قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں اور اپنے اپنے مقام پر سامنے آتی جائیں گی۔ یہاں اس اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ جنت، انسانی زندگی کی مزید (اگلی اور بلند و بالا) ارتقائی منازل طے کرنے کا نام ہے، اور جہنم اس کے ارتقاء کے رُک جانے کا نام۔ (ان تفاصیل کو میں نے اپنی کتاب — جہانِ فردا — میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے)

البتہ ایک نکتہ ایسا ہے جسے چھوڑ کر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اُخروی زندگی کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ: یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَھُمْ (۱۰/۴۵)۔ وہاں سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے زیادہ الم انگیز جہنم کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ ہم دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں کہ بظاہر کچھ اور بنے رہتے ہیں اور درحقیقت ہوتے کچھ اور ہیں۔ ہم دوستوں کے بہی خواہ اور غمخوار دکھائی دیتے ہیں لیکن اندر ہی اندر ان کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں اور ایسا انتظام کر لیتے ہیں کہ ہمارے ان رفقاء اور دوستوں، عزیزوں کو ہمارے ان عزائم اور سازشوں کی خبر نہ ہونے پائے

ایک دوسرے کو پہچانتے ہونگے

اور ہم ان کی نگاہوں میں بڑے معتمد علیہ بنے رہیں۔ ہم لوگوں کی نظروں میں بڑے بڑے مقدس، متقی، پرہیزگار، پکے اور سچے مؤمن بن کر دکھائی دیتے ہیں لیکن زیرِ نقاب ہماری زندگی نہایت گھناؤنی ہوتی ہے۔ ہم یہ سب کچھ ایسی کاریگری سے کرتے ہیں کہ عمر بھر ہمارا بھید نہیں کھلتا۔ اسی حالت میں ہم دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ لیکن ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ ہمارے یہ تمام اعزہ و اقارب، دوست احباب، ہمارے معتقد اور متبع، سب موجود ہوں، اور ہماری حقیقی زندگی بے نقاب ہو کر بایں نمط ان کے سامنے آجائے کہ ہمیں کسی بات سے مجالِ انکار نہ ہو، سوچئے کہ اس وقت ہماری حالت کیا ہوگی؟ کیا اس سے بڑی سزا کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ اسی نہج سے اس زندگی کے متعلق کہا ہے یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ (۸۶/۹)۔ جس دن تمام راز ابھر کر سامنے آجائیں گے۔ اُف!

لیکن اعمال کے نتائج کے نمودار ہونے کا وقت حیاتِ آخرت ہی نہیں، اس دنیا میں بھی (سب نہیں تو کم از کم بیشتر) نتائج سامنے آجاتے ہیں، بالخصوص قوموں کے اجتماعی نظام کے نتائج — قرآنِ کریم نے آخرۃ کے مقابلہ میں عاجلہ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے (۱۷/۱۸)، اور الدنیا کا بھی (۲/۲۰۰) عاجلہ کے معنی ہیں، بہت جلد سامنے آجانے والے، اور دنیا کے

معنی میں پیش پا افتادہ یا قریبی۔ ہم نے ذیمان بالغیب کے سلسلہ میں جس کسان کی مثال دی تھی اسے ایک بار پھر سامنے لایئے۔ ہم نے کہا تھا کہ اس کے گھر میں بھوک ہے اور اس کے پاس ایک بوری گندم کی ہے جو اس نے اگلی فصل کے بیج کے لئے رکھ چھوڑی ہے۔ اگر وہ

دنیاوی زندگی میں نتائج اعمال

مستقبل کو نظر انداز کر دے اور مفادِ عاجلہ پر لپک پڑے تو وہ اس گیہوں کو پسوا لے گا۔ اس سے اس کے ہاں تازہ تازہ روٹیاں تو پک جائیں گی لیکن فصل کے کاٹنے کے وقت اس کے حصہ میں ایک دانہ بھی نہیں آئے گا۔ یہ اس لئے کہ اس نے آخرۃ (مستقبل) کے مقابلہ میں عاجلہ (قریبی مفاد) کو ترجیح دی تھی۔ قرآن کریم نے تین قسم کے اندازہائے نگاہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک ان لوگوں کا جو زندگی کو اسی دنیا کی زندگی سمجھتے ہیں۔ جن کے سامنے صرف اسی دنیا کے مفاد ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے متعلق کہا فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲/۲۰۰) "بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو صرف دنیاوی زندگی کے پیش پا اور قریبی مفاد کا حصول ہی زندگی کا منتہیٰ قرار دے لیتے ہیں۔ انہیں یہ مفاد تو مل جاتے ہیں لیکن آخرۃ (مستقبل) میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا"۔ انہی لوگوں کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ انہیں جب جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے اعمال کا کچھ تو خوشگوار نتیجہ یہاں ملنا چاہیئے! ان سے کہا جائے گا کہ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (۴۶/۲۰) تم نے اپنے حصہ کی تمام خوشگواریاں دنیاوی زندگی ہی میں لے لی تھیں اور انہیں وہیں استعمال کر کے ختم کر لیا تھا۔ لہٰذا اس زندگی کی خوشگواریوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ یہ

صرف دنیاوی مفاد

سیکولرازم کے نظام کے داعیان کی کیفیت ہے، خواہ ان کا نام کچھ ہی ہو۔

دوسرا زاویۂ نگاہ مذہب پرست لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ دنیا اور اس کی خوشگواریاں قابلِ نفرت ہیں۔ خدا کے بندوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ انہیں ان کے اعمال کا بدلہ آخرت میں جا کر ملے گا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ نظریہ بھی دین کے خلاف ہے۔ اس دنیا میں غربت اور افلاس، ذلت اور خواری، خدا کا عذاب ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن بھی

صرف آخرت

اندھا ہی اٹھائیں گے۔۔۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں نہ اس دنیا کے مفادِ عاجلہ نصیب ہوتے ہیں نہ آخرت کی خوشگواریاں۔ وہ ساری زندگی خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کے سحر آگیں خوابوں میں گزار دیتے ہیں

اور تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جن کا نظریۂ حیات یہ ہوتا ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي

الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲/۲۰۱-۲۰۲) "اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا میں بھی خوشگواریاں عطا کر اور آخرۃ میں بھی۔

دنیا اور آخرت دونوں

اور اس طرح ہمیں دنیا اور آخرۃ کے مساعی سوزِ عذاب سے محفوظ رکھ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کی کوششوں کا نتیجہ اس دنیا میں بھی مل جاتا ہے اور آخرت میں بھی۔ خدا تو بہت جلد حساب کرنے والا ہے" یہ وہ لوگ ہیں جن کا آخرۃ پر ایمان ہوتا ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں اس حقیقت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ۔ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۱۷/۱۸)۔ "جو شخص صرف دنیا کا مفادِ عاجلہ چاہے گا تو ہم اپنے قانونِ فطرت کے مطابق اُسے یہ مفاد دیدیں گے۔ لیکن آخرت (مستقبل) میں وہ ذلیل وخوار، واصلِ جہنم ہوگا۔ وہاں کی زندگی کی خوشگواریوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔" وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱۷/۱۹)۔ "جو شخص (عاجلہ کے ساتھ) مستقبل کے مفاد بھی چاہے گا اور ان مفادات کے حصول کے لئے قوانینِ خداوندی کے مطابق کوشش کرے گا، تو اس کی کوششیں بھرپور نتائج مرتب کریں گی۔" كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰) قوانینِ خداوندی کے مطابق جو بھی کام کرے گا ہم اس کی مدد کرتے جائیں گے۔ ہم نے اپنی بخششوں کے راستے میں پھاٹک نہیں لگا دیئے کہ ایک گروہ کے لئے انہیں کھول دیا جائے اور دوسرے کیلئے بند کر دیا جائے۔ یہ صاحبانِ سعی وعمل ہے اور میدان عمل ہر ایک کے لئے یکساں کھلا ہے۔ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (۱۷/۲۱)۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تمہیں دنیا میں بعض قومیں دوسری قوموں کے مقابلہ میں آگے نظر آئیں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جن لوگوں کی نگاہ (عاجلہ کے ساتھ) مستقبل پر بھی ہوتی ہے، ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔

افراد یا اقوام کے اعمال کے نتائج کس طرح مرتب ہوتے ہیں، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن ... قرآن کریم اتنا ہی بتاتا ہے کہ یہ تمام کارگہ کائنات اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ انسان کا کوئی عمل نتیجہ برآمد کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۴۵/۲۲ ؛ ۵۳/۳۱)۔ خدا نے ارض وسماء کے سلسلہ کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہر

ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے، اور کسی پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو ـــ جہاں تک کائنات میں قوانینِ فطرت کی کارفرمائی کا تعلق ہے، سائنٹیفک تحقیقات کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں کام کا نتیجہ یہ نکلے گا ـــ آگ میں انگلی ڈالیں گے تو وہ جل جائے گی ـــ لیکن جہاں تک ایک فرد کے اخلاقی اعمال یا اقوام کے اجتماعی عمل کا تعلق ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کی نتیجہ خیزی میں کارگہ کائنات کیا کرتا ہے؟ سنکھیا کھانے سے انسان پر کس طرح موت وارد ہو جاتی ہے اُسے تو ہم سنکھیا کے خواص اور انسانی جسم کے نظام سے متعلق سائنٹیفک معلومات کی رو سے بتا سکتے ہیں۔ لیکن مالِ حرام کھانے سے انسانی ذات کس طرح متاثر ہوتی ہے، یا ظلم پر مبنی نظام اپنی صدہا تدابیر کے باوجود آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے تو اس میں نظامِ کائنات کس طرح کارفرما ہوتا ہے، اُسے ہم (کم از کم ابھی تک) نہیں جان سکے۔ شاید علمِ انسان کی مزید وسعتوں کے بعد یہ حقائق بھی بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں۔

اس مقام پر البتہ ایک اہم نکتہ کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔ کوئی مالک اپنے ملازم سے کہتا ہے کہ اگر تم نے پھر برتن توڑے تو تمہاری بری طرح سے پٹائی کروں گا۔ ظاہر ہے کہ اس "پٹائی اور برتن توڑنے" میں کوئی باہمی ربط نہیں۔ یہ محض اس شخص کا فیصلہ یا حکم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہ کہے کہ اگر تم نے پھر برتن توڑے تو ملازمت سے برطرف کر دیئے جاؤ گے۔ اس کے برعکس، ایک ڈاکٹر مریض سے کہتا کہ اگر تم نے دوبارہ یہی کھا لیا تو پیٹ میں ایسا درد اٹھے گا جس سے تم جانبر نہیں ہو سکو گے۔ یہ ڈاکٹر کا حکم نہیں۔ قانون شکنی کا فطری نتیجہ ہے اس "غذا کے کھانے" اور "پیٹ کے درد" میں ایک خاص ربط ہے۔ ڈاکٹر کو چونکہ اس ربطِ باہمی کا علم ہے اس لئے وہ (حکم نہیں دے رہا) قانون کی رو سے اس عمل کے نتیجہ کی (یوں کہیئے کہ) پیش گوئی کر رہا ہے۔

عمل اور نتیجہ کا تعلق

قرآنِ کریم میں جہاں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ (مثلاً) وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (وغیرہ)۔ "ان کے لئے الم انگیز عذاب" تو یہ "حکم" نہیں۔ ان کی قانون شکنی کے فطری نتیجہ کی "پیش گوئی" ہے ـــ یعنی (IF) اور (THEN) کے غیر متبدل باہمی تعلق کا بیان۔

بہرحال یہ ہے وہ آخرت (قانونِ مکافاتِ عمل) جس پر متقین کا ایمان بلکہ یقین ہوتا ہے۔ یقین کے معنے ہوتے ہیں ہر قسم کے شک و شبہ کے زائل ہو جانے کے بعد علم و تحقیق کے ساتھ کسی امر کا پایۂ ثبوت تک پہنچ جانا۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم کی رو سے آخرۃ پر ایمان بھی کسی اندھی عقیدت کا نام نہیں، اس صداقت کے اعتراف کا نام ہے جو علم و تحقیق کے بعد ـــ پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہو۔ اس لئے اس نے دنیا اور آخرۃ دونوں پر غور و فکر کی تاکید کی ہے (۲/۲۲۰) اس ایمان و یقین کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کبھی اس فریب میں مبتلا نہیں

ہوتا کہ میں جو جی میں آئے کر دوں، مجھ سے پوچھنے والا کوئی نہیں. سورۃ انبیاء میں ہے کہ (اور تو اور) جنہیں تم دنیا میں صاحبِ اقتدار (الٰہ) سمجھتے ہو، وہ بھی اپنے اعمال کی جوابدہی سے مستثنیٰ نہیں، ان سے بھی باز پرس ہوگی۔ یہ مقام صرف خدا کا ہے کہ اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا. لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳)۔ صرف خدا کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔ (ضمناً) یہیں سے ایک اور حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ سیاسی لغت میں (SOVEREIGN) کے معنی ہیں (ACCOUNTABLE TO NONE) — جو کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ اسلامی نظام میں بہ حیثیت (اور تو اور) مملکتِ اسلامیہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی خدا کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ یہ ہے خدا کے قانونِ مکافات کے دائرے کی وسعتوں کا عالم!

سورۃ فاتحہ میں مؤمنین کی آرزو یہ بتائی گئی تھی کہ ہم ان لوگوں کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں (اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) جنہیں خدا کی نعمتوں سے نوازا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہماری کتاب کے اتباع سے تمہیں یہ تمام نعمتیں حاصل ہو جائیں گی۔ لیکن اس سلسلہ میں تمہیں ہر وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (۱۰۲/۸)۔ ان تمام نعمتوں کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے انہیں کس طرح حاصل کیا تھا اور کس طرح صرف کیا۔ اپنے ہر عمل کے لئے باز پرس (اور جوابدہی کا احساس اور یقین، ایمان بالآخرۃ کا لازمی نتیجہ، اور مؤمنین و متقین کی بنیادی خصوصیت ہے۔

بات یوں شروع ہوئی تھی کہ جماعتِ مومنین کی یہ آرزو اُبھر کر ان کے لب پر آگئی تھی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵) ہم چاہتے ہیں کہ ہماری راہنمائی زندگی کے سیدھے اور ہموار راستہ کی طرف ہو جائے۔ ان کی اس دُعا کے جواب میں کہا گیا کہ تمہیں یہ راہنمائی ہماری اس کتاب کی رو سے مل سکے گی۔ لیکن اس کے لئے متقین ہونا قدمِ اول ہے (۲/۲)۔ اس کے بعد بتایا گیا کہ متقیوں کی خصوصیات اور علامات کیا ہیں۔ یہ بتانے کے بعد کہا:-

(۲/۵) أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

یہ لوگ ہیں جو خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن رہتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔

مفلحون کا ۔۔۔ ترجمہ عام طور " کامیاب " کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مفہوم اس سے کہیں گہرا اور وسیع ہے۔ عربی زبان میں فلاحت، کاشتکاری یا زراعت کو کہتے ہیں اور فَلَّاحٌ کاشتکار کو. اس لحاظ سے مفلحون وہ کاشتکار ہوتے

ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھ جائیں۔

مفلحون کے معانی

قرآنِ کریم نے اعمالِ صالحہ کی برومندی اور نتیجہ خیزی کو (عام طور پر) کھیتی سے تشبیہ دیکر سمجھایا ہے۔ غور کیجئے کہ کھیتی کی کامیابی کے لئے کون کون سے اجزائے ترکیبی کی ضرورت ہوتی ہے؟ سب سے پہلے، ایسا بیج جس میں اُگنے کی صلاحیت ہو۔ پھر ایسی زمین جو اس بیج میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو قابلِ نمو بنا دے۔ پھر وہ تمام دیگر طبیعی اسباب — ہوا، پانی، حرارت، روشنی وغیرہ — جن سے یہ کھیتی، بڑھتی، پھولتی پھلتی چلی جاتی ہے۔ اور ان سب کے ساتھ زراعت کا وہ قانون اور قاعدہ، جسکی رو سے فطرت کی ان قوتوں اور طبیعی سامان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی کمی رہ جائے تو کھیتی پروان نہیں چڑھے گی۔ اور اگر یہ عمل، ان تمام شرائط کو پورا کرے گا تو پھر (قرآن کے الفاظ میں) ایک ایک دانہ، سات سات سو دانے بن کر کاشتکار کے گھر آجائے گا۔ لیکن یہ دانے اسی بیج کے مطابق ہوں گے جو بویا گیا تھا اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ:۔

"گندم از گندم بروید جو زجو"

"جو بوؤ گے وہی کاٹو گے" یعنی وہ قانونِ مکافات، جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ مرئی مثال جس سے اعمالِ انسانی کے نتیجہ خیز ہونے — یعنی خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس مثال میں ایک اور عظیم حقیقت بھی پوشیدہ ہے۔ کاشتکاری کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کبھی اس تذبذب میں نہیں رہتا کہ نامعلوم اس کی کوششیں صحیح سمت کی طرف جا رہی ہیں یا نہیں، اور یہ کہ وہ نتیجہ خیز بھی ہوں گی یا ضائع چلی جائیں گی۔ کاشتکار ہر روز اس امر کا اطمینان کر لیتا ہے۔ اس کی محنت کے یہ محسوس نتائج، جو بتدریج سامنے آتے رہتے ہیں، اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جان مار کر محنت کرتا ہے۔ اگر کسی مقام پر وہ دیکھے کہ اس کی محنت بارآور نہیں ہو رہی، تو وہ اپنی اس سعیٔ لاحاصل کو جاری نہیں رکھتا۔ وہ وہیں رُک جاتا ہے اور اس پروگرام کا پورا پورا جائزہ لیتا ہے۔ اگر کہیں سقم دیکھتا ہے تو فوراً اس کی اصلاح کر لیتا ہے (اسے توبہ کہتے ہیں)۔ اور اگر یہ دیکھے کہ وہ سرے سے غلط بنیادوں پر چل رہا ہے۔ تو اس پروگرام کو ترک کر کے کوئی دوسرا نتیجہ خیز قدم اٹھاتا ہے کھیتی کی مثال میں یہ حقیقت بھی مضمر ہے۔ الدین میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس "مذہب" میں انسانی اعمال کے نتائج اس طرح محسوس و مشہود شکل میں سامنے نہیں آتے۔ ان کے متعلق فقط یہ (مبنی بر عقیدت) اطمینان دلا دیا جاتا ہے کہ یہ نتیجہ خیز تو ضرور ہو رہے ہیں لیکن ان کے نتائج آخرت میں جا کر سامنے آئیں گے۔ اس قسم کی اندھی عقیدت ٹھوس حقائق کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس لئے علم و بصیرت کی روشنی میں آگے نہیں چل سکتی۔ قرآن کریم نے "فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً" کہکر

اور اسے کھیتی کی مثال سے سمجھا کر مذہب کی پیدا کردہ اندھی عقیدت مندی کو دین کی پیش کردہ حقیقت پسندی میں تبدیل کر دیا۔

محسوس نتائج الدین کے پروگرام پر، سب سے پہلے، حضورؐ نبیٔ اکرم اور آپ کے رفقائے کار، صحابہؓ کرام نے عمل کر کے دکھایا۔ ان کے اس عملی پروگرام اور اس کے درخشندہ نتائج کو قرآن کریم نے ایسی مثال اور تشبیہ کی رو سے بیان کیا ہے جہاں کہا: كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۴۸/۲۹)۔ انہوں نے ایک ننھا سا بیج بویا۔ اس سے ایک چھوٹی سی نرم و نازک کونپل ابھری۔ پھر وہ آہستہ آہستہ، تنا، بن کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کے خوشوں میں دانے پڑے اور فصل اس طرح بارآور ہوئی کہ اسے دیکھ کر ان (کاشتکاروں) کا دل وجد و مسرت سے جھوم اُٹھا۔ اور جو لوگ انہیں طعنے دیا کرتے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ کس قسم کے بیکار مشغلہ میں اپنا وقت اور توانائیاں ضائع کر رہے ہیں، ان کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا۔

اس کے بعد کہا کہ یہ بات صرف اسی دور کے مؤمنین اور متقین سے مختص اور انہی تک محدود نہیں وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸/۲۹) خدا کا یہ وعدہ ہے کہ جو لوگ، جب اور جہاں بھی اس قسم کے ایمان اور اسی انداز کے اعمال کا مظاہرہ کریں گے، ان کی کھیتیوں کو تباہیوں سے محفوظ بھی رکھا جائے گا اور وہ پوری طرح ثمربار بھی ہوں گی۔ اس نتیجہ خیزی اور برومندی کا نام "استخلاف فی الارض" ہے جو ایمان و عمل صالح کا لازمی اور فطری نتیجہ ہے (۲۴/۵۵)

جماعتِ مؤمنین نے اپنی دعا میں کہا تھا کہ جن لوگوں کے راستے پر چلنے کے ہم آرزومند ہیں وہ، وہ لوگ ہیں جو نعمائے خداوندی سے بہرہ یاب ہوئے تھے، وہ نہیں تھے جن کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس گئی تھیں اور وہ ان خوشگواریوں سے محروم رہ گئے تھے۔ وہ "مغضوب علیہم" اور "ضالین" تھے۔

یہ ان کا کوئی محض ذہنی تصور یا تخیلاتی آرزو نہیں تھی۔ اُن قوموں کی تاریخ اور مآل زمانۂ نزولِ قرآن کے عربوں کے سامنے تھا جو ان شقوں کے تابع آتی تھیں۔ جیسا کہ خود قرآن کریم متعدد مقامات پر بتایا ہے، وہ ان شاہراہوں پر سے صبح و شام گزرا کرتے تھے جن پر ان تباہ شدہ اقوام کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات انہیں دعوتِ عبرت و بصیرت دیتے تھے۔ علاوہ ازیں چلتے پھرتے یہودیوں کا انجام بھی ان کے سامنے تھا جو، کسی زمانے میں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی کے وارث ہونے کے باوجود دنیا کی ذلیل ترین قوم بن کر رہ

گئے تھے۔ یہ تھیں وہ اقوام، ان کا اور ان جیسی دیگر اقوام کا تفصیلی تذکرہ اگلے باب میں سامنے آئے گا۔

خلاصہ

(۱) خدائے علیم و حکیم کا یہ ارشاد ہے کہ

(۲) تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو (۲/۵) وہ ہمارے اس ضابطۂ قوانین کے اندر محفوظ ہے (۱۵/۵) جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے، اور نہ کوئی نفسیاتی اُلجھن۔

یہ ضابطۂ قوانین سفرِ زندگی میں، ان لوگوں کو انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں۔

(۳) یہ وہ لوگ ہیں جو ان حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل ہیں، لیکن قرآنِ کریم میں غور و فکر سے ان کا مقصد سمجھ میں آ سکتا ہے، اور صحیح روش کے ان نتائج پر بھروسہ رکھتے ہیں جو اگرچہ ابتداءً اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن جن کا آخرالامر سامنے آ جانا یقینی ہوتا ہے۔

اس مقصد کے لئے یہ لوگ اُس نظام کو قائم کرتے ہیں جس میں تمام افراد قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے جائیں اور جو سامانِ نشو و نما انہیں دیا جاتا ہے، اُس میں سے اپنی ضروریات کے بقدر لے کر (۲/۲۱۹) باقی نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

(۴) یہ وہ لوگ ہیں جو ان تمام صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو (اے رسولؐ!) تجھ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی ہیں، اور جو تجھ سے پہلے پیغمبروں کو ان کے اپنے اپنے وقت میں دی گئی تھیں (لیکن جو اُن کے متبعین کے پاس اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں نہیں رہیں، اور اب صرف قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) —— ان صداقتوں پر ایمان رکھنے کے معنے یہ ہیں کہ وہ صحیح تاریخی شہادتوں سے اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اس پروگرام پر اس سے پہلے بھی کئی بار عمل ہو چکا ہے اور اس سے ہر بار وہی نتائج پیدا ہوتے ہیں جنکا اب وعدہ کیا جاتا ہے، اس لئے اب بھی وہی نتائج مرتب ہوں گے —— وہ اس طرح اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اس ضابطۂ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور یوں حال کی جد و جہد سے انسان کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے —— وہ مستقبل جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔

⑤ یہ وہ سعادت مند لوگ ہیں جو اپنے نشو ونما دینے والے کے قانونِ ربوبیت کی راہنمائی میں سفرِ زندگی طے کئے جاتے ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں آخرالامر پروان چڑھتی ہیں (۲۳/۱—۱۱ ؛ ۳۱/۲—۵)۔
یہ گروہ ان لوگوں کا ہے جو غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہتے ہیں اور ان کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ صحیح راستہ ان کے سامنے آجائے۔

(مفہوم القرآن)

دوسرا باب

آیات ــــــ ۶ تا ۷

کُفّار

۱- واضح ہدایت سامنے آ جانے کے بعد کفر اختیار کرنا۔

۲- انبیاءؑ بشیر و نذیر ہوتے تھے۔

۳- خود اپنی ذات سے انکار بھی کفر ہے۔

۴- تقلید کی روش اختیار کرنے والے۔

۵- جذبات سے مغلوب

۶- نشۂ اقتدار کی سرمستیاں۔

۷- کائنات کو باطل کہنا کفر ہے۔

۸- کفار کبھی مومنوں پر غالب نہیں آسکیں گے۔

۹- کفار کے ساتھ دوستداری کے تعلقات وابستہ نہیں کیے جا سکتے۔

۱۰- دلوں پر مہریں لگنے کا مفہوم۔

۱۱- عذاب کا قرآنی مفہوم۔ زندگی کا کسی مقام پر رُک جانا۔

۱۲- تفرقہ انگیزی۔

۱۳- تنگیٔ رزق۔

۱۴- میزانِ عدل۔ قانونِ مہلت۔

دُوسرا باب (آیت ۶ تا ۷)

(کُفّار)

(۲/۶) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔

۲/۶

قرآنِ کریم نے بنیادی طور پر نوعِ انسان کو دو شقوں میں تقسیم کیا ہے ــــ کافر اور مومن ــــ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲) ــــ "خدا وہ ہے جس نے تمہیں (انسانوں کو) پیدا کیا۔ پھر تم میں کچھ کافر ہیں، کچھ مومن" ــــ ان بنیادی انواع کی ذیلی تقسیمات بہت سی ہو سکتی ہیں، لیکن اصولی طور پر انسانوں کی یہی دو قسمیں ہیں ــــ ایک وہ جو وحی (قرآنِ کریم) میں دی ہوئی ابدی اقدارِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسرے وہ، جو ان سے انکار کرتے ہیں ــــ (اسی کو "دو قومی نظریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی مسلم اور غیر مسلم)

اِس آیت (۶/۲) کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے "جو لوگ کافر ہوئے ان کے لئے برابر ہے خواہ تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہیں لانے کے"۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲/۲) کے سطحی مفہوم کی رو سے اعتراض یہ وارد ہوتا تھا کہ جو لوگ پہلے ہی متقی ہیں انہیں ہدایت کی کیا ضرورت ہے۔ ہدایت تو گمراہوں کے لئے ہوتی ہے۔ اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔ اس سے کہیں شدید تر اعتراض آیۂ زیرِ نظر (۶/۲) کے عمومی ترجمہ اور سطحی مفہوم کی رو سے وارد ہوتا ہے۔

اعتراض

کہا یہ جاتا کہ اگر کفار (غیر مسلموں) کے لئے یکساں ہے خواہ انہیں ہدایت کی تبلیغ کی جائے یا نہ، وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے، تو کیا ہدایت کی ضرورت مسلمانوں کو ہے؟ اس پر مزید اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے آغاز میں تو سب کے سب غیر مسلم تھے۔ اگر ان کے لئے یکساں تھا خواہ انہیں تبلیغ کی جائے یا نہ، تو پھر نزولِ قرآن اور تبلیغِ رسالت کا مقصد کیا تھا؟ علاوہ ازیں، آیت کا اگلا ٹکڑہ، (لَا یُؤْمِنُوْنَ) واقعہ کے خلاف ہے۔ وہی لوگ تو ایمان لا کر مومن بنے تھے؛ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ اس کے صحیح مفہوم کیلئے ان تشریحات کو سامنے لائیے جنہیں ایمان کے ضمن میں پیش کیا جا چکا ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ ایمان، دل کے ارادے اور اپنے اختیار کے ساتھ حقائق کی صداقت کے تسلیم کرنے کا نام ہے۔ یعنی کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب

تک وہ بلا جبر و اکراہ اپنے اختیار و ارادہ سے، ان صداقتوں کو تسلیم نہ کرے۔ اسی اعتبار سے کہا گیا تھا کہ کوئی شخص محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے مؤمن نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بعینہٖ یہی پوزیشن کفر کی ہے۔ اس کے لئے بھی قرآن نے فعل (VERB) کے صیغے استعمال کئے ہیں ـــ کَفَرَ، یَکْفُرُ وغیرہ یعنی "اُس نے کفر اختیار کیا"۔ لہٰذا (ایمان کی ضد ہی سہی) کفر بھی ایک نظریۂ زندگی، ایک فلسفۂ حیات، ایک مسلک اور ایک نظام ہے جسے اپنے اختیار و ارادہ سے اختیار کرنے والا کافر کہلاتا ہے۔ یہ بھی پیدائشی نہیں ہوتا۔

یہاں پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ قومی تشخص کے اعتبار سے مسلم اور غیر مسلم، پیدائشی طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اور اس تخصیص و تمیز کا برقرار رکھنا بھی ضروری ہے۔ لیکن، قرآنی نقطۂ نگاہ سے کافر اور مومن کی بنیادی شرط کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس شرط کی رو سے آیۂ زیرِ نظر (۲) کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے اختیار و ارادہ سے کفر کا مسلک اور نظام اختیار کر لیتے، اور پھر اس پر قائم رہنے کے لئے بضد ہوتے ہیں، اور اس کے خلاف کچھ سننا ہی نہیں چاہتے، ان پر اس وقت تک ہدایت کی تبلیغ کچھ اثر نہیں کر سکتی جب تک وہ بات سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ خودکشی کرنے والے کی مثال کو پھر سامنے لائیے۔ اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ اس کے لئے یکساں ہے خواہ کوئی اُسے ڈوبنے کے خطرہ سے آگاہ کرے یا نہ کرے، وہ کسی ایسی وارننگ پر دھیان نہیں دے گا۔

دیکھنا یہ ہے کہ (قرآنِ کریم کی رو سے) کفر کسے کہتے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں جن پر ہدایت کی تبلیغ کچھ اثر نہیں کر سکتی۔

کفر کے معنی

کُفْرٌ کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے، رات کو، کافِرٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی تاریکی تمام چیزوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ قبر کو بھی اَلْکُفْرُ کہتے ہیں کیونکہ اس میں لاش کو چھپا دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کسان کو بھی کَافِرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتا ہے۔ "چھپانے" کے مفہوم کی بنا پر اس کے معنے انکار کرنے کے بھی ہو گئے۔ کیونکہ جو شخص کسی شے کو چھپاتا ہے وہ اس سے انکار کرتا ہے کہ وہ اس کے پاس ہے۔ چونکہ اِنکار اِقرار کے مقابل میں آتا ہے اس لئے قرآن کریم کی اصطلاح میں کفر، ایمان کی ضد ہے، اور جب یہ اِنکار، مخالفت تک پہنچ جاتے تو پھر ایسا شخص سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے کَفَرَ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس نے نظامِ خداوندی کے خلاف سرکشی اختیار کی۔

کُفْرٌ بمقابلہ شُکْرٌ بھی آتا ہے اس لئے شکر کے معنے ہیں کسی چیز کا ابھر کر سامنے آ جانا۔ لہٰذا کفرانِ نعمت کے معنے ہیں نعمائے خداوندی کا چھپا لینا۔ انہیں عالمگیر انسانیت کے مفاد کے لئے کھلا نہ رکھنا۔ اس کو کفرِ نعمت کہا گیا ہے۔

(اس مادہ (کفر) کے اور مشتقات بھی ہیں۔ لیکن اس مقام پر ہم اس کے انہی معانی تک محدود رہتے ہیں جو آیۂ زیرِ نظر کے

سمجھنے کے لئے ضروری ہیں)۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ کُفرؔ کے معنے چھپا دینا (انکار کرنا) ہیں۔ ظاہر ہے کہ چھپایا انہی باتوں کو جاتا ہے جن کا انسان کو علم ہو اور انکار بھی انہی سے کیا جاتا ہے۔ جن امور کا کسی کو علم ہی نہ ہو، ان کے چھپانے یا ان سے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا کفر سے مفہوم یہ ہوگا کہ قرآنی صداقتیں کسی کے علم میں ہوں اور وہ انہیں چھپائے یا ان سے انکار کرے۔

ہدایت کا علم ہونا ضروری ہے

سورۃ محمدؐ میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدٰی (۴۷/۳۲)۔ "جو لوگ خود بھی کفر کا شیوہ اختیار کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی خدا کے راستہ (نظامِ خداوندی) کی طرف جانے سے روکتے) اور (اس نظام کے قائم کرنے والے) رسولؐ کی مخالفت کرتے ہیں، بعد اس کے کہ صحیح راہنمائی ان کے سامنے واضح طور پر آچکی ہے ...."

سورۃ الانعام میں ہے:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا۔ قَالُوْا شَھِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَشَھِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَنَّھُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ (۶/۱۳۱)۔

"انسانوں سے پوچھا جائے گا ــــــ خواہ وہ بدوی قبائل ہوں (جنّ)، یا شہروں کی متمدن آبادی (انس) ــــــ کہ کیا تمہاری طرف ایسے پیغامبر نہیں آتے تھے جنہوں نے ہمارے قوانین کو تمہارے سامنے پیش کیا تھا اور تمہیں واضح طور پر بتایا تھا کہ ان قوانین کے خلاف راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ وہ اس کا اقرار کریں گے اور کہیں گے کہ ہاں! ایسا ہوا تھا، لیکن انہیں طبیعی زندگی کے مفادات نے دھوکے میں رکھا، اور انہوں نے اس کے باوجود کفر کا مسلک اختیار کیا۔ یوں وہ اپنے خلاف آپ گواہی دیں گے۔" اور اس کے بعد ہے ذٰلِکَ اَنْ لَّمْ یَکُنْ رَّبُّکَ مُھْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّ اَھْلُھَا غٰفِلُوْنَ (۶/۱۳۲)۔ "یہ اس لئے کہ یہ خدا کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ کسی قوم کو اس کے غلط نظام کے انجام و عواقب سے آگاہ کئے بغیر تباہ کر دے، ایسا کرنا ظلم ہوگا۔ اور خدا کسی پر ظلم نہیں کیا کرتا۔" اس سے بھی کفر اختیار کرنے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کے لئے شرط یہ ہے کہ صداقت کسی کے سامنے آچکی ہو اور پھر وہ اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

اسی طرح سورۃ مومن میں ہے کہ اہلِ جہنم، دوزخ کے داروغوں سے کہیں گے کہ ذرا تم ہی خدا سے التجا کرو وہ ہماری اس سزا میں تخفیف کر دے، خواہ ایک ہی دن کے لئے کیوں نہ ہو (۴۰/۴۹)۔ وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ بتاؤ کہ اَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَٰتِ (۴۰/۵۰) کیا تمہارے پاس، خدا کے پیامبر واضح دلائل لے کر نہیں آتے تھے؟ قَالُوا بَلَىٰ۔ وہ کہیں گے کہ ہاں آتے تھے۔ جہنم کے داروغے کہیں گے فَادْعُوا۔ تو پھر تم خود ہی خدا سے التجا کرتے پھرو۔ ہم تو ایسا نہیں کر سکتے۔ جس نے دیدہ دانستہ تباہی مول لی ہو اس کے لئے ہم کیوں دعائیں کرتے پھریں۔ اور اس کے بعد ہے وَمَا دُعَٰٓؤُا الْكَٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَٰلٍ (ایضاً)۔ صداقتوں سے اس طرح انکار کر کے غلط راستوں پر چلنے والوں کی پکار کیا نتیجہ پیدا کر سکتی ہے؟

انذار و تنذیر

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ انذار کے معنے بھی واضح کر دیئے جائیں جو آیۂ زیرِ نظر (۲/۶) میں آیا ہے ــــ یعنی سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ (۲/۶) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، عام طور پر اس کے معنے "ڈرانے" کے کئے جاتے ہیں۔ "ڈرانے" سے اس کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آتا۔ اِنذار کے معنی ہوتے ہیں کسی کو کسی ضرر رساں، یا نقصان دہ بات کے انجام سے قبل از وقوع آگاہ کر دینا اور اس طرح اس کے خطرناک نتائج سے ڈرانا۔ لشکر کے آگے آگے جو ہراول دستہ جاتا تھا، تاکہ دشمن کی نقل و حرکت کو بھانپ کر اس سے اپنے لشکر کو آگاہ کرتا رہے اُسے نَذِيرَةُ الْجَيْشِ کہتے تھے۔ سابقہ صفحات میں یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ اور ہر نظام کا ایک انجام ہوتا ہے۔ خدا کے پیامبر وحیٔ خداوندی کی رو سے لوگوں کو آگاہ کر دیتے تھے کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ تباہ کن ہوگا اور صحیح روش کا نتیجہ خوشگوار۔ اول الذکر کی رو سے انہیں نذیر کہا جاتا تھا ــــ یعنی غلط روش کے مضرت رساں نتائج سے آگاہ کرنے والا ــــ اور ثانی الذکر کی رو سے بشیر ــــ یعنی صحیح روش پر چلنے کے خوشگوار نتائج کی بشارت (خوشخبری) دینے والا۔ بنابریں، اِنذار کے معنے آگاہ کرنا یا (WARN) کرنا ہوں گے، نہ کہ محض ڈرانا۔ سورۃ یٰسٓ کی ایک آیت (۳۶/۷۰) کے چار الفاظ میں اس حقیقت کو اس اختصار اور ایجاز سے بیان کیا گیا ہے کہ چشمِ بصیرت اس پر غور کر کے وجد میں آجاتی ہے۔ کہا کہ یہ قرآن اس لئے نازل کیا گیا ہے لِيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَٰفِرِينَ (۳۶/۷۰) یعنی "(جس شخص یا قوم) میں ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت ہے، اُسے آگاہ کر دیا جائے کہ جس غلط راستہ پر وہ چل رہا ہے وہ اُسے کس طرح تباہی اور ہلاکت کی جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اور جو، اس کے باوجود، اس غلط راستے کو چھوڑنے سے انکار کر دے، اس پر یہ حقیقت آخر الامر واضح ہو جائے کہ کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا تھا"۔ یعنی تنذیر اسی کے لئے

کارگر ہوسکتی ہے جو زندہ رہنے کا متمنی ہو۔

اب آگے چلئے۔ یہ بھی پہلے بتایا جا چکا ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق بنیادی طور دو نظریات متداول ہیں۔ ایک نظریہ یہ کہ انسان کی زندگی طبیعی قوانین کے تابع مصروف بہ حرکت و عمل رہتی ہے، اور جب یہ مشینری (انہی قوانین کی رو سے) چلنے سے بند ہو جاتی ہے تو اسے موت کہا جاتا ہے جس سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسے مغرب کی مادہ پرستی، سیکولرازم، یا کمیونزم کہا جاتا ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسان اس کے جسم ہی سے عبارت نہیں، جسم کے علاوہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات، نفس، (SELF) یا (اقبالؒ کی اصطلاح میں) خودی کہا جاتا ہے۔ یہ نہ طبیعی قوانین کی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی ان قوانین کے تابع۔ یہی انسانی اختیار و ارادے کا سرچشمہ ہوتی

انسانی ذات

ہے اور اسی پر انسان کے ہر عمل کا نتیجہ (یوں کہئے کہ) منقوش ہو جاتا ہے۔ جسم کی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ اس فرد کے اعمال کے ان نقوش کو ساتھ لئے آگے جاتی ہے اُسے اُخروی زندگی، کہا جاتا ہے جس میں اس کا مقام ان نقوش کے مطابق متعین ہوتا ہے جنکی یہ حامل ہوتی ہے۔ یہ قرآنی نظریۂ حیات ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما قرآنی پروگرام کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ اس حقیقت کو سورۂ الشمس کی ان دو جامع آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹۱/۹)۔ "جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی" وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۱۰) "جس نے اسے مادی مفاد کی مٹی کے نیچے دبا دیا اس کی انسانی صلاحیتیں دبی کی دبی (غیر نشوونما یافتہ) رہ گئیں"۔ اس سے واضح ہے کہ کفر، ابدی صداقتوں کو چھپانا اور اپنی ذات سے انکار کرنا یا اسے دبا دینا ہے۔ اسی بنا پر حیوانی سطح زندگی کو کفر کہا گیا ہے۔ یعنی وہ نظریۂ حیات جس میں انسانی زندگی کو حیوانوں کی طرح محض طبعی زندگی سمجھا جاتا ہے۔ سورۂ محمد میں ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲)۔ "جو لوگ کفر کا مسلک اختیار کرتے ہیں ان کا مقصدِ حیات حیوانات کی طرح کھانا پینا اور طبیعی سامانِ حیات سے متمتع ہونا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان کا انجام تباہی کے جہنم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے"؟ دوسرے مقام پر اس نظریۂ زندگی (سیکولرازم) کی وضاحت ان الفاظ سے کی گئی ہے:-

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا۔
وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ
مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴)۔

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں ہم زندہ رہتے ہیں اور پھر زمانے کی گردشیں ہمیں ختم کر دیتی ہیں"

—— اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "ان لوگوں کو حقیقت کا کچھ علم نہیں، یہ محض ظن و قیاس کی وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں"۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ایمان کی طرح، کفر بھی اپنے ارادے اور فیصلے سے اختیار کیا جاتا ہے، اور اختیار کیا جاتا ہے اُس وقت جب حقیقت کا علم ہو چکا ہو۔ چنانچہ سورۂ کہف میں کہا گیا ہے وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ "ان سے کہدو کہ الحق (ابدی صداقت) تمہارے سامنے آچکا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے"۔ دوسری جگہ ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲/۲۵۶)۔ "الدین کے معاملہ میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صحیح اور غلط راستے دونوں متمیز کردیئے گئے ہیں۔ جو راستہ جس کا جی چاہے اختیار کرے (نیز دیکھئے ۱۶/۱۰۶)۔

عقیدۂ جبر کے خلاف

جو لوگ ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے عقیدۂ جبر کو بطورِ سپر اختیار کر لیتے ہیں، قرآن کریم نے انہیں بڑی سختی سے ڈانٹا ہے۔ (مثلاً) سورۃ الانعام میں ہے:

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ
اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ۔ كَذٰلِكَ
كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا۔ قُلْ
هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا۔ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ
اِلَّا الظَّنَّ۔ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ (۶/۱۴۹)۔

"جو لوگ شرک کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں، جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے یہ غلط روش کیوں اختیار کر رکھی ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ اگر خدا کو ایسا منظور نہ ہوتا تو ہم یا ہمارے اسلاف یہ روش کبھی اختیار نہ کرتے"۔ اس پر قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں جسے یہ لوگ بطورِ عذر پیش کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جو ایسا ہی کہا کرتے تھے۔ لیکن ایسا کہنے سے وہ اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے تو بچ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ وہ تباہی ان پر آئی اور ان کا عقیدۂ جبر انہیں اس سے بچا نہ سکا۔ اس کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ سراسر جہالت ہے ان سے کہو کہ تم علم کی بارگاہ میں آؤ اور اگر تمہارے پاس واقعی کوئی دلیل ہے تو اُسے پیش کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ عقیدہ علم و بصیرت پر مبنی نہیں۔ محض ظن و قیاس ہے یا کذب و افترا[1] (نیز دیکھئے ۴۳/۲۰)۔

---

[1] میں نے مسئلہ تقدیر کو اپنی تصنیف —— کتاب التقدیر —— میں شرح و بسط سے بیان کر دیا ہے۔ ارباب ذوق مزید تفصیل اس میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ موضوع زیرِ نظر کے سلسلہ میں یہاں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ایک چیز ہوتی ہے صاحبِ اختیار وارادہ نہ ہونا، اور دوسری چیز ہوتی ہے اس ارادہ کو استعمال نہ کرنا یا ایسی کیفیت پیدا کر لینا جس سے انسان کی یہ بلند ترین صلاحیت کارفرما نہ ہو۔ اول الذکر کے متعلق تو بعد میں بات کی جائے گی۔ ثانی الذکر کے متعلق قرآن کریم بڑی وضاحت سے گفتگو کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ انسان صاحبِ اختیار وارادہ ہونے کے باوجود کس طرح اپنی اس صلاحیت کو خود سلب کر دیتا ہے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ کس طرح ہوتا ہے اور ایسا کرنے والے کس طرح کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

تقلیداً شیوۂ کفر

(۱) تقلیدِ اسلاف سے انسان خود ہی اپنے اختیار وارادہ کو (SURRENDER) کر دیتا ہے۔ سورۂ بقرۃ میں پہلے کہا وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۲/۱۷۰)۔
"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے (قرآن کریم) اس کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی راستے پر چلتے رہیں گے جس راستہ پر ہم نے اپنے اسلاف کو گامزن پایا ہے۔" اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "خواہ ان کے اسلاف نہ عقل و بصیرت رکھتے ہوں اور نہ ہی وحی کے صحیح راستہ پر گامزن ہوں۔ یہ پھر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے"۔
اگلی آیت میں ہے کہ: وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۲/۱۷۱)۔ تقلید کی یہ راہ، انسان کو حیوانوں کی سطح پر پہنچا دیتی ہے جو عقل و فکر سے کام لینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے (۷/۱۷۹)۔ مقلدین اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی مثال یوں سمجھئے کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے جس کے پیچھے چرواہا ہے۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں بلا الفاظ، اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا مطلب۔ وہ یہ آوازیں نکالتا اور ان الفاظ کو دہراتا رہتا ہے اور بھیڑ بکریاں جو ان آوازوں پر لگی ہوتی ہیں، ان کے مطابق اِدھر اُدھر مڑتی رہتی ہیں۔ نہ چرواہے کو اس کا علم ہوتا ہے کہ ان آوازوں اور الفاظ کا مطلب کیا ہے اور نہ ہی وہ بھیڑ بکریاں ان آوازوں کے سوا کچھ سمجھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ یہ ہیں آباء کی تقلید کرنے والے بہرے، گونگے، اندھے، عقل و فکر سے کچھ کام نہ لینے والے، انہیں انسان کون کہہ سکتا ہے؟

مترفین

سورۂ زخرف میں ہے کہ ایسی روش مترفین اختیار کرتے ہیں۔ مترفین انہیں کہتے ہیں جو محنت سے جی چرائیں اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کریں۔ کسی معاملہ کے متعلق علم و عقل کی رو سے سوچنا اور پھر اپنے اختیار و ارادہ سے فیصلہ کرنا، بڑی کاہش اور کاوش چاہتا، اور اپنی ذمہ داری کو قبول کرنا بڑی جرأت اور ہمت کا متقاضی ہوتا ہے۔ تقلید کا مسلک بڑی تن آسانی کا مسلک ہے۔ اس میں نہ خود کوئی

فیصلہ کرنا پڑتا ہے، نہ ذمہ داری کو قبول کرنا۔ لیکن اس تن آسانی سے انسان اپنے آپ کو خود ہی اس جوہر بے بہا سے محروم کرلیتا ہے جو انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز ہے۔ یعنی اختیار و ارادہ کا جوہر۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ کفر کی روش ایسے ہی لوگ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی جو اختیار و ارادہ کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اسے استعمال نہیں کرتے۔

جذبات سے مغلوب

(۲) اب انسان کے اپنے ارادے کو صحیح طور پر استعمال نہ کرنے کی دوسری مثال لیجئے۔ انسانی ارادے کی صورت یہ ہے کہ اس کے ذرائع علم و خبر — سماعت، بصارت وغیرہ — معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ ان معلومات کی بنیادوں پر اس شخص کی فکر کسی نتیجہ پر پہنچتی ہے۔ اس نتیجہ کی روشنی میں وہ اپنے لئے ایک فیصلہ کرتا ہے۔ اس فیصلہ کو بروئے کار لانے کے عزم کو اس کا ارادہ کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے فیصلہ اور اس پر مبنی ارادے کا دار و مدار اس کی سمع و بصر کی صلاحیتوں کے صحیح طور پر کام کرنے پر ہے۔ اگر وہ صلاحیتیں صحیح کام نہ کریں تو پھر نہ وہ صحیح معلومات بہم پہنچاتی ہیں نہ ان پر مبنی فیصلہ کو صحیح فیصلہ کہا جا سکتا ہے۔ آپ کسی شخص کو نشہ (شراب خواری) کی حالت میں دیکھئے! اس کی سمع و بصر اسے کس کس قسم کی معلومات بہم پہنچاتی ہیں، پھر اس کے، ان معلومات پر مبنی فیصلے کس قسم کے ہوتے ہیں! اور اس کے بعد اس کے ارادے کیا!! اس کے اس قسم کے فیصلوں اور ارادوں کے متعلق کسی غیر کی تنقید کو چھوڑیئے، نشہ اتر جانے کے بعد جب وہ، خود، ان پر نگہ بازگشت ڈالتا ہے تو بے حد پشیمان ہوتا ہے کہ یہ میں نے کیا کہا اور کیا کیا ہے!

نشہ، شراب وغیرہ ہی کا نہیں ہوتا۔ حب، اور حس محرکات کی رو سے بھی انسان کے جذبات اس کی عقل و فکر پر غالب آجاتیں وہ نشہ ہی کی کیفیت اختیار کرلیتے ہیں۔ اس وقت اس کی عقل و فکر ماؤف ہوجاتی ہے۔ سورۃ قصص میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ آپ ان لوگوں کو حق و صداقت کے راستے کی طرف آنے کی دعوت دیجئے۔ اس کے بعد ہے فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ (۲۸/۵۰)۔ "اگر یہ لوگ تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ اپنے جذبات کا اتباع کر رہے ہیں۔" وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ (ایضاً)۔ یاد رکھو! جو شخص بھی اپنے جذبات کو صحیح ضابطہ حیات کے تابع نہیں رکھتا اور انہیں اپنی مفاد پرستی کے لئے بیباک چھوڑ دیتا ہے، وہ صحیح راستہ اختیار نہیں کرسکتا۔ اسی کا نام کفر ہے۔

یہ تو افراد کے متعلق ہے۔ قرآن کریم نے اقوام کے متعلق بھی کہا ہے کہ جب کوئی قوم صرف اپنے ہی مفاد کو سامنے رکھے اور اقدارِ خداوندی کو فراموش کردے، تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُم مِّن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۴۶/۲۶)

"ان کی سماعت اور بصارت اور قوت فیصلہ کچھ کام نہیں دیتیں۔ وہ مسلوب مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے قوانین خداوندی سے انکار و جحود کا۔ وہ ان قوانین و اقدار کا مذاق اڑاتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔"

یہودیوں کا حسد

جذبات سے مغلوب ہو کر کفر اختیار کرنے والوں کے سلسلہ میں قرآن کریم (اپنے اولین مخاطب) اہل کتاب کی مثال پیش کرتا ہے، جہاں کہتا ہے کہ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (۲/۹)۔ "یہ اہل کتاب چاہتے یہ ہیں کہ جس طرح انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کر رکھا ہے، تمہاری بھی وہی کیفیت ہو جائے۔ یہ اس حسد کی بنا پر ہے جس کی آگ ان کے سینے میں بھڑکتی رہتی ہے، حالانکہ حق و صداقت ان کے سامنے واضح انداز میں آچکے ہیں۔" قرآن کریم نے یہودیوں کے اس حسد، بغض اور ضد کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ وہ اس زعم باطل مبتلا تھے کہ نبوت حضرت اسحٰقؑ ہی کی۔۔۔اولاد میں محصور رہے گی۔ لیکن نبی اکرمؐ بنی اسمٰعیلؑ میں سے تھے اس لئے یہود اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ انہیں (اور ان کے ساتھ ساری دنیا کو) معلوم ہونا چاہئے کہ نبوت کا تعلق کسی خاص نسل، قبیلہ یا خاندان سے نہیں۔ یہ اختصاص، مشیت خداوندی کی رو سے ہوتا ہے جسے وہ اپنا فضل کہکر پکارتا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں ہے بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (۲/۹)۔ "یہ لوگ خدا کی نازل کردہ (اس) کتاب سے محض ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں اور یہ بہت ہی برا سودا ہے ـــــ یعنی ایسا سودا، جس میں یہ ایسی متاع بے بہا کو بیچ کر محض اپنے ایک جذبہ کی تسکین کا سامان خرید رہے ہیں۔"

پندارِ نفس

ضد ہی کی ایک شکل، پندار نفس ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ اعراف میں ہے کہ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِن قَبْلُ (۷/۱۰۱)۔ "خدا کے پیغامبر ان کی طرف واضح حقائق و دلائل لیکر آتے لیکن انہوں محض بربنائے نخوت و تمرّد انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہدیا کہ تم جھوٹے ہو۔ اس کے بعد وہ پیامبر انہیں ہزار سمجھاتے رہے، لیکن چونکہ ایک دفعہ ان کے منہ سے نہ نکل گئی تھی، اس لئے، محض پندار نفس کی بنا پر، اپنی ضد پر اڑے رہے اور انکار پر انکار کرتے چلے گئے۔

اس نے پندار نفس کی ایک بیّن مثال، آویزش صاحب ضرب کلیمؑ اور فرعون کی داستان کے ضمن میں بیان کی ہے سورۃ نمل میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اہل فرعون کے سامنے ایسے واضح دلائل پیش کئے جن کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

لیکن وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (۲۷/۱۴) "وہ انہیں تسلیم کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہے حالانکہ ان کا دل مانتا تھا، انہیں یقین آچکا تھا کہ بات یہ سچی کہتے ہیں۔ لیکن ان کی سرکشی اور تکبر اعتراف حقیقت کے راستے میں حائل ہو رہے تھے۔"

نشۂ اقتدار

جب کوئی قوم دھاندلی سے اقتدار حاصل کرے اور پھر اُسے قائم و مستحکم رکھنے کے لئے ہر قسم کے جائز اور ناجائز حربے اختیار کرتی جائے، تو وہ بھی حق و صداقت کی راہ کو اختیار نہیں کرتی، اس سے انکار اور سرکشی برتتی چلی جاتی ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے کہ عرب کے نخوت پرستوں کی یہی کیفیت تھی۔ بعثتِ نبیؐ اکرم سے پہلے وہ قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر ہماری طرف خدا کا کوئی پیامبر آگیا تو تم دیکھو گے کہ ہم کس طرح دنیا کی سب سے بہتر ہدایت یافتہ قوم بن جاتے ہیں۔ لیکن —— جب وہ پیامبرؐ آیا تو انہوں نے اس کی دعوت سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ سخت نفرت اور عداوت برتنے لگ گئے، محض اس لئے کہ انہیں ملک میں اقتدار حاصل تھا (اِسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ) اور اس صداقت کے ماننے سے وہ چھوٹا اقتدار باقی نہیں رہتا تھا (۳۵/۴۲-۴۳)۔

یہ ہیں وہ لوگ، جن کے متعلق کہا کہ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۲) جو لوگ اس طرح اپنے جذبات سے مغلوب ہوں ان کے لئے یکساں ہے خواہ تم انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دیا نہ کرو۔ اُن کے جذباتِ حسد و نفرت، بُغض، عداوت، مفاد پرستی، استکبار فی الارض، نشۂ اقتدار ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں چھوڑتے کہ وہ گوش ہوش سے کسی بات کو سُنیں اور عقلِ سلیم کی رو سے فیصلہ کریں۔ ذرا تصوّر میں لائیے اس منظر کو کہ راستے جگمگا رہے ہوں، بجلی کے قمقموں سے سڑک بقعۂ نور بن رہی ہو، لیکن ایک راہرو اپنی آنکھیں بند کرلے، تو اسے یہ روشنی کچھ بھی کام دے سکے گی؟ کیا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کے لئے یکساں ہے خواہ راستے روشن ہوں یا تاریکی میں ڈوبے ہوئے! ایسے ہی ہیں وہ لوگ، جن کے متعلق کہا کہ وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ (۱۰/۴۲) "یہ لوگ تمہاری مجلسوں میں آکر بیٹھتے ہیں بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ تمہاری باتوں کو بڑے غور سے سن رہے ہیں۔ لیکن کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ بظاہر کان تو ان کے تمہاری طرف لگے ہوتے ہیں لیکن خیالات کہیں اور ہوتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ تمہاری آواز ان کے دماغ تک پہنچتی ہے، نہ یہ عقل و فکر کی رو سے اس سے کوئی نتیجہ حاصل کرتے ہیں —— اے رسولؐ! ذرا سوچو کہ جو لوگ کان رکھنے کے باوجود اس طرح بہرے بن جائیں وہ تمہاری اس تبلیغ سے کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں"؟ اگلی آیت میں ہے وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ (۱۰/۴۳)۔ "تم ان سے مصروفِ گفتگو ہوتے ہو، یہ

تمہاری طرف تک بھی رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ ان کے خیالات کہیں اور ہوتے ہیں۔ اے رسولؐ! کیا تم اس قسم کے آنکھوں والے اندھوں کو راستہ دکھا سکتے ہو! سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ۔

نظر اور بصر قرآن کریم نے یہاں نظر اور بصر میں ایسا لطیف فرق بتایا ہے، جس کے لئے ہماری زبان میں موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ ترجمہ ان دونوں کا "دیکھنا" ہی ہے۔ لیکن دیکھنے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے عربی زبان کی یہی وسعت اور قرآن کریم کا انتخابِ الفاظ ہے جس کی رُو سے اس نے، ایک قسم کے دیکھنے کو (جس میں خیالات کہیں اور رہیں) نظر سے تعبیر کیا ہے، اور دوسری قسم کے دیکھنے کو (جس میں سوچنا سمجھنا بھی ساتھ ہو) بصر کہکر پکارا ہے اسے آپ "بصارت" اور "بصیرت" کہکر ان میں تمیز کر سکتے ہیں۔ (نیز دیکھئے ۷/۱۹۸)

سورۂ روم میں ہے:

فَاِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى وَلَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ
اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ۔ وَمَاۤ اَنۡتَ بِهٰدِ الۡعُمۡىِ عَنۡ
ضَلٰلَتِهِمۡ۔ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاٰيٰتِنَا
فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (۳۰/۵۲-۵۳)

"اے رسولؐ! جس طرح تم مُردوں کو سُنا نہیں سکتے اسی طرح ان زندہ انسانوں کو بھی نہیں سنا سکتے، کہ جنہیں تم آواز دو تو وہ جان بوجھ کر بہرے بن جائیں اور اس طرح منہ موڑ کر چلدیں گویا انہوں سنا ہی نہیں — اسی طرح تم ان اندھوں کی بھی صحیح راستہ کی طرف راہنمائی نہیں کر سکتے اور انہیں گمراہی کی تاریکیوں سے نہیں نکال سکتے جو آنکھیں رکھنے کے باوجود دیکھنا ہی نہ چاہیں۔ تمہاری بات پر تو وہی کان دھریں گے جو اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اس کی صداقت پر ایمان لائے ہوں۔"

سورۂ لقمان میں ہے وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسۡتَكۡبِرًا كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا كَاَنَّ فِىۡۤ اُذُنَيۡهِ وَقۡرًا ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ (۳۱/۷)۔ "ذرا اس شخص کی حالت پر غور کرو کہ جب اس کے سامنے ہمارے قوانین پیش کئے جائیں تو وہ انتہائی تکبر و نخوت سے یوں پیٹھ پھیر کر چلدے گویا، اس نے کچھ سنا ہی نہیں گویا اس کے کانوں میں ڈاٹ لگ رہے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے سے وہ اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے کیسے بچ سکتا ہے؟" سنکھیا کھا لینے کے بعد، انسان اس تنبیہہ کو ہزار ان سُنی کر دے (کہ سنکھیا سے موت واقع ہو جاتی ہے)۔

سنکھیا اپنا اثر کر کے رہے گا۔

اضداد سے تبیانِ حقیقت

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ اضداد کی رو سے تبیانِ حقیقت کرتا ہے۔ (مثلاً) سورۃ فاطر میں ہے۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ (۳۵/۱۹)۔ "اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے"۔ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ (۳۵/۲۰)۔ "نہ ہی تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہو سکتی ہیں"۔ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ (۳۵/۲۱)۔ "اسی طرح دھوپ اور سایہ بھی برابر نہیں ہو سکتے"۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ (۳۵/۲۲)۔ "اور نہ ہی زندہ اور مردہ برابر ہو سکتے ہیں"۔ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ (۳۵/۲۲)۔ "خدا کا قانون یہ ہے کہ سُن وہی سکتا ہے جو سُننا چاہے۔ جو زندہ، کفن پہن کر، قبر میں جا لیٹے اور اس طرح مردہ بن جائے اسے کون سنا سکتا ہے۔ اسے کون کچھ دکھا سکتا ہے؟ یہ ہیں وہ چلتی پھرتی لاشیں کہ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۶)۔ جن کے لئے یکساں ہے خواہ تو انہیں راستے کے خطرات سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ جب یہ کچھ دیکھنا سننا ہی نہیں چاہتے تو یہ تمہاری بات کب مانیں گے؟ یہ قرآن تو زندہ انسانوں کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے (۳۶/۷۰)۔ قبرستانوں میں وعظ کہنے کے لئے نہیں۔ . . . .

کیا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھ کر حق و صداقت کی بات ان تک پہنچائی نہ جائے کہ ایسا کرنا سعیٔ لاحاصل ہے؟ نہیں! قرآن کا یہ منشا نہیں۔ ان آیات میں تو قرآن کریم ان لوگوں کی نفسیاتی کیفیت بتاتا ہے۔ ان کے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ رسول اللہؐ (یا دیگر داعیانِ حق) سے یہ نہیں کہتا کہ تم انہیں مرفوع القلم قرار دیکر ان سے منہ موڑ لو۔ رسول اللہؐ کی کیفیت اس طبیبِ مشفق کی سی تھی جس کا دل اس بات سے کُڑھتا ہے کہ مریض دوائی کیوں نہیں پیتا۔ وہ پرہیز کیوں نہیں کرتا۔ حضورؐ کی شدّتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ خود خدا کو کہنا پڑا کہ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (۱۸/۶)۔ "یہ لوگ جو اس قرآن کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے، اے رسولؐ! تو تو ان کے پیچھے غم و تاسف سے اپنی جان تک گھلا لے گا"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ: وَذَكِّرْ بِهِ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰)۔ "بایں ہمہ، تمہاری غم گساری کا یہی تقاضا ہے کہ تو قرآن کے ذریعہ انہیں فراموش کردہ حقیقتوں کی یاد دہانی کراتے جاتا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اس لئے ہلاک ہو جائے کہ سچی بات اس تک پہنچی نہ تھی۔

ہم ایمان کے متعلق گفتگو کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے ایمان کے بنیادی اجزا پانچ ہیں ــــــ اللہ، ملائکہ، رسل، کتب اور یوم آخرت ــــ ان سب کا، یا ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ سورۃ النساءؔ میں ہے وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (۴/۱۳۶) "جو شخص، اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور یوم آخرت سے انکار کرتا ہے وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑتا ہے"۔ لیکن قرآن کریم نے کفر کے تضمنات ایسے اور اتنے بیان کئے ہیں کہ اس کا دائرہ بڑا وسیع ہو جاتا ہے اور اس دائرے کے اندر صرف وہی نہیں آتے جنہیں ہم اصطلاح میں کافر یا غیر مسلم کہتے ہیں، اور بھی آجاتے ہیں۔ اس وقت ہم ان میں سے چند ایک گوشوں کو سامنے لاتے ہیں۔ باقی اپنے اپنے مقام پر آتے جائیں گے۔

کائنات کو باطل سمجھنا کفر ہے

(۱) کائنات کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ اس کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ یہ محض انسان کا اپنا فریب تخیل ہے۔ یونانی فلاسفر افلاطون (PLATO) اس نظریہ کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ جسے اس کی اصطلاح میں "اعیان نامشہود" یا نظریہ "عالم امثال کہا جاتا ہے۔ وہاں سے یہ نظریہ اُبھرا اور رفتہ رفتہ ساری دنیا میں پھیل گیا ــــ بالخصوص تصوف کی دنیا میں ــــ ہندوؤں کے فلسفہ ویدانت میں اسی لئے کائنات کو مایا یا فریب کہا جاتا ہے۔ یا ایشور کا خواب یا کھیل۔ اہل تصوف کا نظریہ وحدت الوجود بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ ہمارے بیشتر (بالخصوص ایرانی) شعرا اسی افلاطونی نظریہ سے متاثر ہیں۔ (مثلاً غالب کہتا ہے:-

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسد

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

مغرب کے مادہ پرست فلاسفروں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ کائنات یونہی اتفاقیہ وجود میں آگئی ہے۔ اپنے زور دروں سے مصروف نقل و حرکت ہے۔ جب یہ زور دروں ایک دن ختم ہو جائے گا تو یہ پاش پاش ہو جائے گی اور کارگہ ہست و بود، نیست و نابود ہو جائے گی۔ نہ اس کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے نہ یہ کسی متعین پروگرام کے مطابق مصروف حرکت ہے، نہ ہی اس کا کوئی منتہا اور مقصود ہے۔

قرآن ان نظریات کو باطل کہہ کر پکارتا ہے اور کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۃ صٓ میں ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷) "ہم نے ارض و سماوات اور جو کچھ ان کے اندر ہے، اسے باطل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا مبنی بر ظن و قیاس نظریہ ہے جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں، اس کا نتیجہ تباہی کا جہنم ہے"۔ (نیز ۲۱/۱۶)۔ اس کے برعکس مومنین کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے،

لیٹے، ہر حالت میں تخلیقِ ارض و سما اور اختلافِ لیل و نہار پر غور و فکر کرتے ہیں اور انتہائی کاوشِ و تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۰-۱۸۹) "اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے سلسلہ کائنات کو باطل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔" اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے کائنات کو فریبِ تخیل یا بلا غرض و غایت (باطل) سمجھنا کفر ہے۔

ثنویت کفر ہے

(۲) قرآنِ کریم میں ہے کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (۲/۲۰۸) "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! دین کے نظام میں مکمل طور پر، پورے کے پورے، داخل ہو جاؤ۔" یہ نکتہ بڑا اہم اور غور طلب ہے۔ ایک طبیب آپ کے مرض کی تشخیص کرنے کے بعد آپ کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتا ہے جو مختلف اجزاء پر مشتمل ہے۔ علاج کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس نسخہ کو مکمل طور پر استعمال کریں۔ اگر آپ ایسا کریں گے کہ اس کے بعض اجزا کو استعمال کریں اور بعض کو چھوڑ دیں تو نہ صرف یہ کہ آپ کے مرض کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس سے الٹا نقصان پہنچ جائے۔ یہی کیفیت اسلامی نظام کی ہے۔ قرآنِ کریم ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اس کے مطابق جو نظام قائم کیا جائے گا اس کی بھی یہی کیفیت ہوگی کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کے دائرۂ اقتدار اور ربطہ کار سے باہر نہیں ہوگا، لہٰذا اُسے پورے کا پورا اختیار کرنا ہوگا۔ اگر صورت یہ پیدا کر لی جائے کہ اس کے بعض حصوں کو اپنے نظام کا جزو بنا لیا جائے اور دوسرے حصوں کو چھوڑ دیا جائے یا چند اجزا اس کے نظام کے لے لئے جائیں اور باقی اجزاء اپنی طرف سے وضع کر لئے جائیں، یا دیگر انسانوں کے وضع کردہ اجزا مستعار لے لئے جائیں، تو نہ صرف یہ کہ یہ نظام اپنے خوشگوار نتائج مرتب نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کا نتیجہ ذلت و خواری، اور اس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ قرآنِ کریم ثنویت کے اس مسلک کو بھی کفر قرار دیتا اور مستوجبِ عذاب ٹھہراتا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)۔ "کیا تمہاری یہ حالت ہے کہ تم کتابِ خداوندی کے بعض حصوں پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصوں سے انکار کرتے ہو؟ یاد رکھو! تم میں سے جو بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہو اور آخرت میں بھی شدید ترین عذاب میں ماخوذ۔"

دوسری جگہ یہ ہے کہ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۚ فَالْحُكْمُ

لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ (۴۰/۱۲)۔ "جب ان لوگوں کو خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی تھی تو یہ اس سے کفر برتتے تھے اور جب اس کے ساتھ اور وں کو شریک کر لیا جاتا تھا تو اس پر ایمان لاتے تھے۔ یاد رکھو! یہ روش کفر اور شرک کی ہے ایمان اور توحید کی نہیں۔ ایمان کی روشن یہی ہے کہ اقتدار اور حکومت کُلّیّۃً اور قاطبۃً خدائے واحد کا ہو" اور یہی وہ عظیم حقیقت ہے جسے سورۃ مائدہ میں یہ کہکر کفر اور ایمان میں واضح حدِّ فاصل قائم کردی کہ:

ماانزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہ کرنا۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

(۳) قرآنِ کریم کا منتہیٰ و مقصود وحدتِ انسانیہ ہے۔ یعنی اقدارِ خداوندی کے تابع، نوعِ انسان کو ایک پر جمع کرنا تاکہ ان فساد انگیزیوں اور خوں ریزیوں کا خاتمہ ہو جائے جو انسانوں کے مختلف ٹکڑوں میں بٹ جانے کا فطری نتیجہ ہیں۔ اس کے لئے وہ آغازِ کار کے طور پر، ایک امت کی تشکیل کرتا ہے جسے وہ امتِ مسلمہ کہکر پکارتا ہے۔ اس امت کی وحدت توحید کی مظہر ہے۔ اسی لئے تفرقہ (فرقہ بندی) اس کے نزدیک شرک اور کفر ہے۔ اس نے، سورۂ روم میں، واضح طور پر کہا ہے: وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا۔ کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱-۳۲)۔ "دیکھنا! تم ایمان لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور اس طرح فرقوں میں بٹ گئے۔ پھر

فرقہ بندی شرک اور کفر ہے

کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہو گیا کہ ہم تو حق پر ہیں اور باقی سب فرقے باطل پر" دوسری جگہ اس نے اس فرقہ بندی کو کفر قرار دیا ہے اور بڑی شدت سے، عبرت انگیز انداز میں، اس کی مخالفت کی ہے جب کہا ہے:

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ۔ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ
یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ
وُجُوْھُھُمْ اَکَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ۔ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ (۳/۱۰۴-۱۰۵)۔

"اے جماعتِ مومنین! دیکھنا تم بھی کہیں ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا، جنہوں نے واضح تعلیمِ خداوندی کے آجانے کے بعد باہمی اختلاف کیا اور اس طرح فرقوں میں بٹ گئے۔ اس کا نتیجہ بہت بڑی تباہی ہو گا (یوں سمجھئے کہ ظہورِ نتائج کے وقت)

بعض چہرے روشن اور تابناک ہوں گے اور بعض روسیاہ اور ظلمت آگیں! یہ روسیاہ وہ ہوں گے جنہوں نے (تفرقہ پیدا کرکے) ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا تھا۔ ان سے کہا جائے گا کہ اب تم اپنے اس کفر کا تباہ کن انجام دیکھو"۔

(۴) ہم، آیت (۲/۳) کی تشریح کرتے ہوئے، الصّلوٰۃ کے زیرِ عنوان بتا چکے ہیں کہ صلوٰۃ، وحدتِ امّت کی مظہر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ بدقسمتی سے ہماری موجودہ نمازیں ہماری فرقہ بندی کی مظہر ہوتی ہیں اور ہماری مسجدیں اس کی آماجگاہ۔ قرآنِ کریم نے اس قسم کی مساجد کی تعمیر کو، جن سے امت میں تفرقہ پیدا ہو، کفر سے تعبیر کیا ہے، اور یہ بات، اس مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں کہی ہے جسے تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے خود رسول اللہ کے عہدِ مبارک میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس مسجد کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے: مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ (۹/۱۰۷)۔ یہ مسجد، وحدتِ امت کو نقصان پہنچانے والی ہے، مؤمنین میں تفرقہ کا باعث ہے لہٰذا یہ کفر ہے اور یوں سمجھئے گویا ان لوگوں کے لئے کمین گاہ ہے جو خدا اور رسول کے خلاف آمادہ بجنگ تھے"۔

مسجدِ ضرار

(۵) اسی سورۃ کی آیت ۳ (۲/۳) کی تشریح کرتے ہوئے عنوان "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ" کے تابع لکھا گیا تھا کہ قرآنِ کریم ایک جامع معاشی نظام دیتا ہے جو دیگر نظامہائے معیشت سے منفرد اور مختص ہے۔ ـــــ یہ نظام، سرمایہ داری کو جڑ سے اُکھیڑ دیتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ سرمایہ بھی دولت کماتا ہے۔ قرآنِ کریم اس نظام کو ربوٰ سے تعبیر کرتا اور اسے کفر کا مسلک قرار دیتا ہے ـــــ ایسا مسلک جس کے خلاف اسلامی نظام مستقل اعلانِ جنگ ہے۔ اس نے اس نظام کا ذکر کرتے ہوئے جماعتِ مؤمنین سے کہا ہے کہ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (۳/۱۳۰ نیز ۲/۲۷۹)۔ یعنی اس نظام سے بچو، ورنہ تم بھی اسی جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے"۔

نظامِ سرمایہ داری ـــ ربوا ـــ کفر ہے

(۶) اس قسم کی فرعی خصوصیات کے بعد قرآنِ کریم نے کفار کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ یہ لوگ پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں تک قرآن کی آواز نہ پہنچنے پائے۔ چنانچہ سورۃ حٰمٓ میں ہے وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ (۴۱/۲۶)۔ "جن لوگوں نے کفر کا مسلک اختیار کر رکھا ہے وہ خود تو قرآن

قرآن مت سننے دو

کے مخالف ہیں ہی، دوسروں سے بھی یہ کہتے ہیں کہ تم بھی اس قرآن کو نہ سنو اور جہاں کہیں اس کتاب کی طرف دعوت دی جاتی ہو ایسا شور مچاؤ کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔ یہی ایک طریقہ ایسا ہے جس سے تم قرآنی مسلک اختیار کرنے والوں پر غالب آسکتے ہو۔ اگر قرآن کی آواز عام ہوگئی تو تم کبھی ان پر غالب نہیں آسکو گے۔"

ان لوگوں نے یہ تدبیر اس وقت سوچی تھی جب قرآن کریم نے کہا تھا کہ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ۚ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ (۸/۵۹) "کفر کا شیوہ اختیار کرنے والے اس زعم باطل میں مبتلا نہ ہوں کہ وہ قرآن کی پیروی کرنے والوں پر سبقت لے جائیں گے۔ یاد رکھو! یہ لاکھ حربے استعمال کریں، انہیں کبھی عاجز اور مغلوب نہیں کر سکیں گے۔" اس کے بعد قرآن کریم نے مسلمانوں سے تاکید کی کہ وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت پوری پوری قوت کے ساتھ کریں (۸/۶۰؛ ۵۷/۲۴)۔ اور پھر اس نے کھلے کھلے الفاظ میں اعلان کر دیا:

کفار مومنین پر غالب نہیں آسکیں گے

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱)۔
یہ کبھی نہیں ہو سکے گا کہ خدا کفار کو مومنین پر غالب کر دے۔

اللہ تعالیٰ کے اس حتمی وعدہ اور یقینی اعلان کے بعد (موجودہ) مسلمانانِ عالم کو خود فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ کیا وہ مومنین کے معیار پر پورے اترتے ہیں؟ خدا کا بنایا ہوا معیار تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ کوئی غیر مسلم قوم امتِ مسلمہ (جماعت مومنین) پر غالب نہیں آسکے گی۔ اور آج ہماری حالت یہ ہے کہ روئے زمین پر شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو جس میں بسنے والی امتِ مسلمہ ——— خواہ ان کی مملکتیں کتنی ہی وسیع اور عریض کیوں نہ ہوں ——— کسی نہ کسی شکل میں، بالواسطہ یا بلاواسطہ، غیر مسلموں کے اثر و تسلط سے آزاد ہوں۔ (بہرحال یہ ضمنی بات تھی)

قرآن کریم نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ کفر اور اسلام دو جداگانہ فلسفہ ہائے حیات، دو الگ الگ نظامہائے زندگی ہیں اور مومن اور کافر دو جداگانہ قومیں یا پارٹیاں۔ ایک کو اس نے "حزب اللہ" کہا دوسری کو "حزب الشیطان" (۵۸/۱۹؛ ۲۲)۔ اور حزب الشیطان کے متعلق وضاحت و صراحت سے کہہ دیا کہ یہ تمہارے نظام کے بدترین دشمن ہیں۔ یہ اسے ناکام کرنے اور مٹانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی یہ کیفیت خود قرآن کریم بیان کرتا ہو، ان سے کسی صورت میں بھی دوستداری کے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں؟ قطعاً نہیں۔ قرآن کریم نے اسے بڑی سختی سے روکا ہے۔ اس نے (نبی اکرمؐ کے علاوہ) حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقا کی زندگی کو مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا اور یہ اس مقام پر کہا ہے جہاں ان کے اس اعلان کو سامنے لایا گیا ہے کہ:

کفار مومنوں کے دوست نہیں ہو سکتے

اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا۔ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (۶۰/۴)۔

"جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے، اور جن کی تم، خدا کو چھوڑ کر، محکومیت اختیار کرتے ہو، ان سب سے سخت بیزار ہیں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان بغض اور عداوت ہے۔ اور ہم اسے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتے۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا ہم ڈنکے کی چوٹ ساری دنیا میں اعلان کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم تمہارے مسلک اور نظام سے اعلانیہ انکار کرتے ہیں۔ تم میں اور ہم میں یہ خلیج اس وقت تک حائل رہے گی جب تک تم بھی ہماری طرح ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ"۔ یہ ہے وہ مقام جہاں جماعت مؤمنین سے کہا گیا ہے کہ: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (۶۰/۴)۔ "تمہارے لئے ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کے مسلک، ملت، شعار میں زندگی کا بہترین نمونہ ہے"۔ اسی لئے نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ: اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (۱۶/۱۲۳)۔ "تم ہر طرف سے کٹ کر ملت ابراہیمی کا اتباع کرو"۔ اور جماعتِ مومنین سے کہا: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى (۲/۱۲۵) تم اس مقامِ ابراہیمی کو حاصل کرنے کے لئے میدانِ حیات کو اپنی تگ و تاز کی جولانگاہ بنا دو"۔ اس نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ:

> "اے جماعتِ مؤمنین! تم اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا، کسی کو اپنا رازداں نہ بنانا۔ یہ (دوسرے) لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ تم ایسی جانکاہ مصیبتوں میں مبتلا ہو جاؤ، جن سے تمہاری قوت ٹوٹ جائے۔ تمہارے خلاف بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کی زبان پر بے اختیار آ جاتی ہیں، لیکن جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہم نے یہ باتیں اس لئے واضح طور پر بیان کر دی ہیں کہ تم عقل و ہوش سے کام لے کر، ان کی طرف سے محتاط رہو۔
>
> دیکھو ایسا کبھی نہ کرنا کہ تم انہیں اپنا دوست بنا لو۔ اگر تم ایسا کرو گے بھی، تو وہ کبھی تمہیں اپنا دوست نہیں بنائیں گے، حالانکہ تم ان تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں، اور ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو

ان (تمہارے مخالفین) کے انبیاءؑ کی طرف نازل ہوئیں تھیں۔ تم یہ کچھ خلوصِ قلب سے کرتے ہو لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی (قرآن پر) ایمان رکھتے ہیں اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں، تو شدتِ عداوت سے، تمہارے خلاف غصہ میں، اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ ان سے کہو کہ جاؤ اپنے غصّے میں مر مٹو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ظاہر کیا کرتے اور تمہارے سینے میں کیا چھپا ہوا ہے۔ تمہاری نفسیاتی کشمکش اور دو رُخی زندگی تمہارے لئے سامانِ ہلاکت بن جائے گی۔

ان کے خبثِ باطن کا یہ حال ہے کہ، اگر کوئی اچھی بات تمہیں چھُو کر بھی گزر جائے، تو انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے، تو یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں لیکن تم ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ اگر تم اپنے پروگرام میں ثابت قدم رہے اور قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرتے رہے، تو ان کی تدبیریں اور سازشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ اللہ کا قانونِ مکافات، انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اس لئے نتائج اس کے مطابق مرتب ہوں گے، نہ کہ ان کی خواہشات کے مطابق"[1] (۳/۱۱۹-۱۱۷)۔

اِس باب میں اس نے یہاں تک کہدیا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا۔ وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا۔ وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ

---

[1] اِن آیات کا متن اپنے مقام پر درج کر دیا جائے گا۔ سرِدست آپ کسی بھی نسخۂ قرآنِ کریم سے انہیں ملاحظہ فرما لیجئے۔

اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ
اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۹/۲۳-۲۴)۔

"اے ایمان والو! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ آئینِ خداوندی کی رو سے اپنوں اور بیگانوں کی تفریق، نسلوں اور خونی رشتوں کی بنا پر نہیں ہوگی بلکہ نظریۂ زندگی کے اشتراک کی رو سے ہوگی۔ لہٰذا، اور تو اور، اگر) تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کریں تو تم انہیں بھی اپنا دوست مت بناؤ۔ یاد رکھو! جو اس تنبیہ کے باوجود ان سے دوستداری کے تعلقات رکھے گا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا، کیونکہ ایسا کرنا، قانونِ خداوندی سے سرکشی کے مترادف ہوگا۔ (اے رسولؐ!) ان لوگوں سے کہدو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، اور دیگر اہلِ خاندان اور مال و دولت، جو تم کماتے ہو۔ اور وہ تجارت، جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور وہ محلات، جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں خدا اور اس کے رسولؐ (نظامِ خداوندی) سے زیادہ عزیز اور اس کے قیام و بقا کی راہ میں جدوجہد سے زیادہ محبوب ہو گئی تو پھر تم اپنی اس روش کے نتائج کا انتظار کرو تا آنکہ قانونِ خداوندی کی رو سے اس کے ظہورِ نتائج کا وقت آجائے۔ یاد رکھو، خدا کبھی اس قوم کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستہ کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل جائے۔"

اس قسم کی تعلیمات، تاکیدات اور تنبیہات کے بعد اللہ تعالیٰ کو پکے اور سچے مومنوں کے ایمان کی پختگی پر اس قدر یقین تھا کہ اس نے پورے اعتماد اور بھروسہ سے کہدیا لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۔ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲)۔ "جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، تم کبھی نہ دیکھو گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستداری کے تعلقات وابستہ کریں جو خدا اور اس کے رسولؐ (نظامِ خداوندی) کے خلاف آمادہ بجنگ ہوں، خواہ ان کے ماں باپ، اولاد، بہن بھائی یا دیگر افرادِ خاندان ہوں۔ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے۔ وحیٔ خداوندی زندگی کے ہر گوشے میں ان کے لئے وجۂ تقویت بنتی ہے۔ اس کا نتیجہ جنت کی خزاں ناآشنا بہاریں ہیں، مختصر الفاظ میں یہ کہ خدا ان سے راضی ہو گیا اور یہ اپنے خدا سے۔ یہی لوگ ہیں جنہیں حزب اللہ — خدا کی پارٹی — کہا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی پارٹی ہمیشہ کامیاب و کامران

رہتی ہے۔"

قرآنِ کریم سے یہ بھی واضح ہے کہ جماعتِ مؤمنین میں منافقین بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اس جماعت میں اس قسم کے خیالات پھیلاتے رہتے ہوں گے کہ ساری دنیا ہماری مخالف ہے اگر ہم اپنے قریب ترین کفار، یعنی قریش وغیرہ سے دوستداری کے تعلقات وابستہ کرلیں تو ہمیں اس سے تقویت حاصل ہو جائے گی ——— یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خفیہ طور پر ان سے اس قسم کے روابط و مراسم بھی قائم کرتے ہوں۔ قرآن کریم نے ان

منافقین کی روش

کی اس قسم کی وساوس انگیزیوں کو بے نقاب کر دیا۔ اور جماعتِ مؤمنین سے کہدیا کہ یاد رکھو، یہ منافق وہ ہیں اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ. اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۴/۱۳۹)۔ "جو لوگ جماعتِ مؤمنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ کیا یہ ایسا اس خیال سے کرتے ہیں کہ اس سے انہیں کچھ تقویت حاصل ہو جائے گی۔ ان سے کہدو کہ تقویت پوری کی پوری صرف نظامِ خداوندی سے وابستہ رہنے سے حاصل ہو گی، مخالفین کے کے ساتھ دوستداری کے تعلقات سے نہیں۔ ان سے ایسے تعلقات قطعاً وابستہ نہیں کئے جا سکتے۔" [واضح رہے کہ "کفار" میں ہر قسم کے غیر مسلم شامل ہیں خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب۔ اہل کتاب کے متعلق وضاحت آگے چل کر سامنے آجائے گی جہاں قرآن کریم نے ان کے ساتھ بھی دوستداری کے تعلقات سے منع کیا ہے) [دیکھئے (۵/۵۱)] حتیٰ کہ اس نے یہاں تک بھی کہدیا کہ جو لوگ تمہارے دین سے استہزا کریں، ان سے بھی دوستداری کے تعلقات وابستہ نہ کرو۔ (۵/۵۷)]

اس مقام پر اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ معاہدات ہو سکتے ہیں اور، عام انسانی سطح پر، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، ان سے معاشرتی مراسم بھی روا رکھے جا سکتے ہیں لیکن انہیں معتمد علیہ اور راز داں نہیں بنایا جا سکتا۔ اور اسی بنا پر انہیں اسلامی حکومت کے کاروبار میں بھی شریک نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مفاہمت نہیں کی جا سکتی

اسلام اپنے اصولوں میں کسی قسم کی لچک نہیں رکھتا۔ اس لئے اس باب میں غیر مسلموں کے ساتھ مفاہمت بھی نہیں کی جا سکتی۔ سورۃ یونس میں ہے:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰/۱۵)۔ "جب لوگوں کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کیا جاتا ہے تو جو لوگ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتے وہ رسول اللہ سے کہتے ہیں کہ قرآن کے ان قوانین و اقدار کو تو ہم تسلیم نہیں کر سکتے۔ اگر تم ہمارے

ساتھ معاملہ کرنا چاہتے ہو تو یا تو اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ۔ اور یا کم از کم اس میں ہماری منشا کے مطابق کچھ تبدیلیاں کر دو۔ پھر ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے"۔۔۔۔ اس کے جواب میں کہا قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۰/۱۵)۔ "اے رسول! ان سے کہدو کہ یہ میرے اختیار میں ہی نہیں کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی تبدیلی کر دوں۔ میرا منصب تو اس قرآن کا اتباع کرنا ہے۔ اگر میں اس کی خلاف ورزی کردوں تو اس کے تباہ کن نتائج سے مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ اس سے میں بھی بچ نہیں سکوں گا۔ اس لئے میں ایسا نہیں کر سکتا"۔ دوسری جگہ ہے وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۶۸/۹)۔ "یہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم اپنے مقام سے ہٹو، کچھ یہ اپنے مقام سے ہٹیں اور اس طرح باہمی مفاہمت کرلی جائے"۔ اس سلسلہ میں حضورؐ سے کہا گیا وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (۱۱/۱۱۳)۔ "دیکھنا تم ان کی طرف ذرا نہ جھکنا، اگر تم اپنے مقام سے ذرا بھی ہٹ گئے تو اسی جہنم میں جا گروگے جس میں یہ جانے والے ہیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ حق اور باطل میں مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ باطل اگر اپنے مقام سے ہٹ جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن اگر حق اپنے مقام سے ذرا بھی ادھر اُدھر ہو جائے تو وہ حق رہتا ہی نہیں۔ حق کے تو بنیادی معانی ہی یہ ہیں کہ وہ اپنے مقام پر اٹل ہو۔ اسے مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں دو اور دو تین ہوتے ہیں اور وہ دونوں اس پر جھگڑ رہے ہیں۔ ایک صلح کرانے والا ان سے کہتا ہے کہ میاں! اس قسم کی ضد سے تو معاملہ طے نہیں ہوگا۔ نہ تمہاری بات رہے نہ اس کی۔ تم اس پر صلح کرلو کہ دو اور دو ساڑھے تین ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص دو اور دو تین کہتا تھا اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ پہلے بھی غلط کہتا تھا، اب بھی غلط کہہ رہا ہے۔ لیکن، جو شخص دو اور دو چار کہتا تھا وہ حق و صداقت کی بات کہتا تھا۔ اگر اس نے "دو اور دو ساڑھے تین" تسلیم کرلیا تو یہ نہ حق رہا نہ صداقت، یہ تو غلط اور باطل ہو گیا۔ کسی سوال کے غلط جوابات سینکڑوں ہو سکتے ہیں لیکن صحیح جواب ایک اور صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ حق، باطل کے ساتھ مفاہمت کر ہی نہیں سکتا۔ یہ کوئی ضد کی بات نہیں، یہ حق کا فطری تقاضا ہے۔

یہ ہے صورت مسلموں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی۔ اس کے بعد آگے بڑھئے۔ اس سے اگلی آیت ہے:

(۲/۷) خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔

اس آیت کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے " اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہریں لگا دیں اور اُن کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور ان کے لئے عذابِ عظیم ہے"۔ آپ اس ترجمہ کو سامنے رکھئے اور پھر اس الجھن پر دوبارہ غور کیجئے جسے ہم نے اس سے پہلی آیت (۲/۶) کے عام ترجمہ کے ضمن میں پیش کیا تھا۔ ان دونوں آیات کے مروجہ ترجمہ سے بات یوں سامنے آتی ہے کہ جو لوگ کافر ہیں ان کے لئے یکساں ہے خواہ تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اللہ نے ان کے کانوں اور دلوں پر مہریں لگا رکھی ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں یعنی یہ لوگ کفر اس لئے اختیار کرتے ہیں (اور ایمان اس لئے نہیں لاتے) کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دی ہیں اور اسی لئے ان کے لئے یکساں ہے کہ خواہ تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ آپ نے دیکھا کہ جو الجھن پہلے دشوار تھی، اس آیت کے متداول ترجمہ سے وہ دشوار تر ہو گئی۔ اس سے انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس میں ان لوگوں کا قصور ہی کیا۔ یہ تو اس باب میں بے بس اور مجبور ہیں ــــــ لیکن یہ دشواری ایک معمہ بن جاتی ہے۔ جب اس ترجمہ کے ساتھ اگلے الفاظ بھی ملا لئے جائیں کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ " انہیں سخت عذاب ہوگا"۔ اس سے معاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب خود اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی اور اس کی وجہ سے ان میں یہ صلاحیت ہی نہ رہی کہ یہ ایمان لا سکتے، اس لئے یہ کافر رہے، تو پھر انہیں عذاب کیوں دیا جائے؟ ــــــ ہے نا یہ بات ایسی کہ اس پر ناطقہ سر بگریباں اور خامہ انگشت بدنداں، رہ جائے! اس قسم کے مروجہ ترجموں سے جو دشواریاں پیش آتی ہیں اس کی اس سے بھی واضح تر مثال سورۃ النحل کی آیت (۱۶/۹۳) میں سامنے آتی ہے اس میں کہا گیا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۱۶/۹۳)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ " اگر اللہ چاہتا تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا (نہ کوئی کافر ہوتا نہ کوئی مومن)۔ وَلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (ایضاً) لیکن اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیدیتا ہے"۔ یہاں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہدایت یا گمراہی اختیار کرنا انسان کے اپنے بس کی بات نہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیدیتا ہے جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔

لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کہا ہے وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۳)۔ " لیکن تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟" دیکھا آپ نے کہ بات کیا ہوئی؟ پہلے کہا کہ خدا جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہے ہدایت دیدیتا۔ اور اس کے بعد کہا کہ " وہ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے گمراہی کا راستہ کیوں اختیار کیا تھا؟"

قرآن کریم کے مروجہ تراجم اور اسے سطحی طور پر سمجھنے کے ان نتائج کے بعد، اب آیئے قرآن کریم کے صحیح مفہوم کی طرف۔

صحیح مفہوم قرآن کریم نے (۲/۷) میں کہا یہ ہے کہ جو لوگ کفر اختیار کرتے ہیں ان کے دلوں پر اللہ مہریں لگا دیتا ہے لیکن اللہ نے دوسری جگہ بات ان چار الفاظ واضح کر دی کہ بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ (۴/۱۵۵)۔ "یہ مہریں ان کے کفر کی وجہ سے لگتی ہیں"۔ یعنی یہ نہیں کہ اللہ ان کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے، اس لئے وہ کفر کی روش اختیار کرتے ہیں، بلکہ یہ کہ چونکہ وہ کفر کی روش اختیار کرتے ہیں اس لئے ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔

اب آیئے سورۃ النحل کی آیت (۱۶/۹۳) کی طرف جس کا غلط مفہوم، بیسیوں قسم کی الجھنیں پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے[1]۔ یعنی وہ آیت جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ یُّضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۳)۔

دنیا میں فتنہ و فساد، جور و استبداد، ظلم و استحصال، کو عام دیکھ کر حساس، لیکن سطح بین لوگ عام طور پر کہتے سنائی دیں گے کہ خدا نے ایسا کیوں نہ کر دیا کہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ وہ ظلم و استبداد کر ہی نہ سکتے۔ سب انسان نیکی کے راستے پر چلتے رہتے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ انسانوں کو بھی دیگر اشیاء کائنات کی طرح ایک ہی راستہ پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کر دیتا۔ —— وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (۱۶/۹۳) —— لیکن اس کی مشیت کا پروگرام ایسا نہیں تھا۔ اس نے انسانوں کو مجبور پیدا نہیں کیا، صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا۔ اسی اختیار و ارادہ کا نتیجہ ہے کہ جب وہ زندگی کے دوراہے پر آتا ہے تو اسے (غلط اور صحیح) دونوں رستے نمایاں طور پر دکھا دیئے جاتے ہیں —— وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ (۹۰/۱۰) اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ بالفاظِ دیگر، وہ جی چاہے تو غلط راستہ اختیار کر لے اور جی چاہے صحیح راستہ پر گامزن ہو جائے —— وَیُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (۱۶/۹۳)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ غلط راستہ پر چلنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اور صحیح راستہ پر چلنے کے ثمرات کیا۔ وہ جونسا راستہ اختیار کرتا ہے اس کے نتائج اسی کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں مواخذہ یا بازپرس کہتے ہیں —— وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۳)۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، انسانی اعمال کے نتائج سزا کے طور پر، اس پر، کہیں خارج سے وارد نہیں کئے جاتے۔ ہر نتیجہ، خود، عمل کے اندر

---

[1] قرآن کریم میں اس انداز کی آیات بکثرت آئی ہیں۔ ان کا صحیح مفہوم اپنے اپنے مقام پر واضح کر دیا جائے گا۔

پوشیدہ ہوتا ہے جس طرح آم کی گٹھلی میں آم کا پیڑ اور ببول کے بیج میں ببول کا درخت۔ ہوتا صرف اتنا ہے کہ عمل پہلے سرزد ہوتا ہے اور نتیجہ اس کے بعد برآمد ہوتا ہے۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے اسی ربط ورد ف کے متعلق فرمایا وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۵۹/۱۸) "ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ دیکھے کہ اس نے اپنے "کل" کے لئے پہلے سے کیا بھیجا ہے" "کل" کے معنے ہی یہ ہیں کہ عمل کا نتیجہ اس کے ارتکاب کے بعد ظہور میں آتا ہے۔ دوسری جگہ ہے يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ (۷۸/۴۰)۔ جب انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنے لئے پہلے سے کیا بھیج رکھا ہے"۔

عمل اور اس کے نتیجہ کا باہمی تعلق

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان نتائج کو اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے مثلاً اسی آیت (۲/۲۶) میں کہا گیا ہے کہ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (۱۶/۹۳)۔ جو شخص صحیح راستہ پر چلنا چاہتا ہے خدا اس کی راہنمائی صحیح راستہ کی طرف کر دیتا ہے۔ جو غلط راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے اسے غلط راہ دکھا دیتا ہے۔ یا مثلاً زیرِ نظر آیت (۲/۷) میں کہا ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ "اللہ نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دی ہیں"، حالانکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خود خدا نے یہ کہا کہ یہ مہریں خود ان لوگوں کے کفر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ بات واضح ہے۔ عمل کی ابتدا انسان کی طرف سے ہوتی اور اس کے نتائج خدا کے مقرر کردہ قانون کی رو سے مرتب ہوتے ہیں۔ جس قسم کا عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے اس کے مطابق خدا کا قانون (یوں کہیئے کہ) اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ اور آخر الامر اُسے پکڑ لیتا ہے یعنی اس کے مطابق اس عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ (مثلاً) بنی اسرائیل کی غلط روی کے سلسلہ میں کہا فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۶۱/۵) "جب وہ خود ٹیڑھے ہو گئے تو خدا نے اُن کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا"۔ یا دوسری جگہ ہے ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۹/۱۲۷)۔ "جب انہوں نے خدا کے بتائے ہوئے راستہ سے منہ موڑ لیا تو خدا نے ان کے دلوں کو اسی طرف موڑ دیا"۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے جامع طور پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔ "اللہ کسی قوم کے احوال و کوائف میں تبدیلی نہیں کرتا تا وقتیکہ وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرلے"۔ یعنی جس قسم کی تبدیلی وہ قوم اپنے اندر پیدا کرے گی خدا کا قانون اُسے ایسا ہی بنا دے گا۔ بالفاظِ دیگر، اس جہانِ سعی و عمل میں، آغازِ کار انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے (INITIATIVE LIES WITH MAN) اور خدا کا قانون اسے (FOLLOW) کرتا ہے۔ انسان جو کچھ بننا چاہتا ہے خدا کا قانون اسے ویسا بنا دیتا ہے، اور جو کچھ وہ اس طرح

مسئلہ تقدیر کا لُبِ لباب

بن جاتا ہے (درخت کے پھل کی طرح) اس کی خصوصیات کی اس سے نمود ہوتی رہتی ہے۔ مسئلہ تقدیر کا یہی لُبِ لباب اور ماحصل ہے جیسے علامہ اقبالؒ نے بڑے دلکش اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے کہ:

رمزِ باریکش بہ حرفے مُضمر است
تو اگر دیگر شوی ، اُو دیگر است

یعنی بات تو بڑی دقیق اور لطیف ہے لیکن ، یہ راز ایک حرف کے اندر چھپا ہوا ہے اور وہ حرف یہ ہے کہ اگر تو بدل جائے تو تیری تقدیر اسی کے مطابق بدل جاتی ہے۔ یعنی جیسا تو خود ہو جائے ویسی ہی تیری تقدیر بن جاتی ہے۔ خدا کا اسی قسم کا قانون تم پر لاگو ہو جاتا ہے۔

خاک شو ، نذرِ ہوا سازد تُرا
سنگ شو ، بر شیشہ اندازد تُرا

اگر تو اپنے آپ کو راستے کا گرد و غبار بنالے تو ہوا کا ادنیٰ سا جھونکا بھی تجھے اڑائے اڑائے پھرے گا اور منتشر کر دیگا ، لیکن اگر تو اپنے اندر پتھر کی سی صلابت پیدا کرلے تو جس شیشہ سے ٹکرائے وہ چکنا چُور ہو جائے گا۔

شبنمی ! افتادگی تقدیرِ تُست
قلزمی ! پائندگی تقدیرِ تست

اگر تو اپنے آپ کو شبنم بنالے تو فضا کی بلندیوں سے پستیوں کی طرف آگرے اور سورج کی ایک ننھی سی کرن تمہارا تشخص اور وجود ختم کر دے۔ لیکن اگر تو اپنے آپ کو بحرِ زخار بنالے تو تجھے بقائے دوام نصیب ہو جائے۔ بنابریں اگر تو کسی طرح پستی میں گر گیا ہے تو وہاں بیٹھا یونہی تقدیر کو نہ روتا رہ ، نہ ہی یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے کہ جب خدا نے میری قسمت میں لکھا ہی ایسا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں ؟ یہ غلط ہے۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر   خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست   زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہاست

تم اس وقت جس حالت میں ہو اسی کے مطابق خدا کا قانون تم پر وارد ہو رہا ہے ، اگر تم چاہتے ہو کہ خدا کا کوئی دوسرا قانون تم پر منطبق ہو ، تو اپنے آپ کو بدل لو ، خدا کا دوسرا قانون تم پر عائد ہو جائے گا۔ خدا کے ہاں تو لاانتہا قوانین ہیں۔ جس قسم کا انسان خود بننا چاہے اسی قسم کا قانون اس پر وارد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ، جب خدا انسان کے کسی عمل کے نتیجہ کو اپنی

طرف منسوب کرتا ہے تو اس سے یہی مراد ہوتی ہے. یعنی "اس نے ایسا کیا تو ہم نے ایسا کر دیا" ایک شخص سنکھیا کھانے سے مر جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بیان کرنے کے مختلف انداز ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سنکھیا نے اُسے ہلاک کر دیا۔ یہ بھی کہ اس نے سنکھیا کھا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیا اور یہ بھی کہ اس نے سنکھیا کھایا اور خدا نے اسے ہلاک کر دیا۔ اور کلیہ کے طور پر یہ بھی کہ جو بھی سنکھیا کھائے گا خدا اُسے ہلاک کر دے گا۔ بالفاظِ دیگر کائنات میں جو کچھ خدا کے مقرر کردہ قوانین کی رو سے ہوتا ہے اُسے خدا براہِ راست اپنی طرف بھی منسوب کر لیتا ہے (مثلاً) بارش خدا کے متعین کردہ قانونِ فطرت کی رو سے ہوتی ہے اور یہ قوانین ایسے اٹل ہیں کہ جو انسان ان کا صحیح علم حاصل کرے وہ بتا سکتا ہے کہ بارش کب اور کہاں ہو گی۔ اس کے باوجود اللہ اُسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے اِنَّ اللّٰہَ وَ یُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ (۳۱/۳۴) "خدا بارش برساتا ہے"۔ یا وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ (۲/۱۶۴) "اللہ تعالیٰ آسمان سے مینہ برساتا ہے"۔ حتیٰ کہ وہ بھی یہ کہتا ہے وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّجَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا (۱۶/۸۰)۔ "اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لئے مسکن بنایا۔ اور اس نے مویشیوں کی کھالوں سے تمہارے لئے گھر بنائے"۔ حالانکہ (ظاہر ہے کہ) خیمے اور مکانات انسان خود بناتے ہیں۔

اعمال کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے

انسان جو کچھ اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کرتا ہے اسے بھی خدا اپنی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ مثلاً (وحی کو چھوڑ کر) انسان ہر قسم کا علم اپنی سعی و کاوش سے حاصل کرتا ہے لیکن چونکہ حصولِ علم کی بنیادی صلاحیت خدا کی عطا کردہ ہے اس لئے وہ کہتا ہے عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ (۹۶/۵)۔ "خدا نے انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جسے وہ جانتا نہیں تھا"۔ وہ یہاں تک بھی کہتا ہے الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ (۹۶/۴)۔ خدا نے انسان کو قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا"۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ بچہ قلم کے ساتھ لکھنا خود سیکھتا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں لین دین کی دستاویز کے سلسلہ میں کہا کہ وَلَا یَاۡبَ کَاتِبٌ اَنۡ یَّکۡتُبَ کَمَا عَلَّمَہُ اللّٰہُ (۲/۲۸۲)۔ "کاتب کو ہرگز نہیں چاہیئے کہ جس طرح خدا نے اسے لکھنا سکھایا ہے، وہ اس دستاویز کو لکھنے سے انکار کر دے"۔ سورۃ مائدہ میں شکاری کتوں کے ذریعہ شکار کرنے کے سلسلہ میں کہا وَمَا عَلَّمۡتُمۡ مِّنَ الۡجَوَارِحِ مُکَلِّبِیۡنَ تُعَلِّمُوۡنَہُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ (۵/۴)۔ "جس طرح خدا نے تم کو سکھایا تھا تم نے اسی طرح ان شکاری کتوں کو سدھایا ہے"۔ ظاہر ہے کہ شکاریوں کو خدا یہ نہیں سکھاتا کہ کتوں کو شکار کرنے کے لئے کس طرح سدھایا جاتا ہے۔ اس فن کو وہ خود سیکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ حصولِ علم کی صلاحیت بنیادی طور پر خدا کی عطا فرمودہ ہے، اس لئے خدا ان امور کو اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے

یہی ہے وہ حقیقت جسے حضرت ابراہیم ؑ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ (۲۶/۷۹-۸۰)۔ "خدا وہ ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑجاتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے۔"

ان آیات سے واضح ہے کہ جو نتائج خدا کے مقرر کردہ قوانین کی رو سے مرتب ہوں (خواہ وہ صحیفۂ فطرت میں بکھرے ہوئے قوانینِ فطرت ہوں یا قرآن کریم کے اندر محفوظ اقدار و قوانینِ خداوندی) خدا انہیں اپنی طرف منسوب کرلیتا ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہوجائے گا کہ اس نے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۲-۷) کیوں کہا ہے۔ یعنی یہ کیوں کہا ہے کہ خدا ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ یا جو گمراہ ہونا چاہتا ہے خدا اُسے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے وغیرہ۔

قرآن کریم کی جن آیات میں کسی بات کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہو اگر اس کا ترجمہ یوں کرلیا جائے کہ "خدا اپنے قانون کے مطابق یوں کرتا ہے" یا یہ کہ "قانونِ خداوندی کی رو سے ایسا ہوتا ہے"، تو تمام الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ میں نے اس باب میں یہی انداز اختیار کر رکھا ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وغیرہ آیات میں خَتَمَ اور طَبَعَ کے الفاظ آئے ہیں۔ جب آپ کسی

ختم اور طبع کے معانی

بوتل میں کوئی چیز بھر کر اُسے کارک سے بند کر دیتے اور مزید حفاظت کیلئے اس پر لاکھ کی مہر بھی لگا دیتے ہیں، تو اسے خَتَمَ کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کو پورے طور بند کر دینا (یہاں سے ختمِ نبوّت کا مفہوم بھی سمجھ میں آجائے گا)۔ بعض اوقات آپ لفافہ وغیرہ بند کرکے اس پر لاکھ لگا دیتے ہیں۔ اور اس لاکھ کے اوپر اپنی مہر کے ذریعہ اپنا نام نقش کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنے کو طَبَعَ کہتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ یعنی کسی شئے کو اس طرح بند کر دینا کہ اس کے اندر کچھ نہ جا سکے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ انسان کے دل کی یہ حالت کس طرح ہو جاتی ہے۔ یہ حالت کہ علم و بصیرت کی کوئی بات اس میں جا ہی نہ سکے۔

(۱) سورۂ مؤمن میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے متعلق کہا کہ اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۴۰/۳۵)۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو بلا سند و دلیل، قوانینِ خداوندی کی مخالفت کئے جاتے ہیں۔ سوچئے کہ یہ روش کس قدر قابلِ مذمت ہے۔ یہ محض نخوت، تکبّر اور غرور کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں" اس کے بعد کہا کہ "اس طرح خدا ایسے لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔"

مہریں کیسے لگتی ہیں (۲) سورۂ روم میں ہے کہ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۔ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ (۳۰/۵۸) "ہم نے لوگوں کو سمجھانے کے لئے قرآن میں مختلف اسالیب و انداز اختیار کئے، لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اس کی آیات پیش کرو تو یہ بلا سوچے سمجھے کہدیں گے کہ تم تو فریب کار ہو، باطل پرست ہو۔" اس کے بعد ہے۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰/۵۹) "اس طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے جو بلا علم دلیل دوسرے کو جھوٹا کہنے چلے جاتے ہیں۔"

(۳) سورۂ انعام میں ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۔ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ ۔ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۔ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۔ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۶/۲۵) ۔

"ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو تیری مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں تو بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ تیری باتوں کو بڑے غور سے سن رہے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں۔ یہ سوچ کچھ اور رہے ہوتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے دلوں پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں جس سے ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں۔ لاکھ دلائل ان کے سامنے پیش کر دیں یہ انہیں تسلیم ہی نہیں کرتے۔ تمہارے ہاں آتے ہیں تو محض جھگڑنے کیلئے اور یہ کہہ کر اٹھ جاتے ہیں کہ محض اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں جو ہمیں سناتا رہتا ہے۔" یوں ان کے دلوں پر مہریں لگتی ہیں۔

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا (۴۷/۱۶) "یہ تمہاری محفل میں بیٹھے ہوئے اپنے ہی خیالات میں غرق رہتے ہیں۔ اور جب اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو ان لوگوں سے، جنہوں نے یہ باتیں دھیان سے سُنی تھیں، پوچھتے ہیں کہ یہ شخص ابھی ابھی کیا کہہ رہا تھا۔" اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (۴۷/۱۶)۔ "یہ ہیں وہ لوگ، جن کے دلوں پر قانونِ خداوندی کے مطابق مہریں لگ جاتی ہیں۔ اور یہ اپنی خواہشات کے پیچھے اندھا دھند چلے جاتے ہیں۔"

ان کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے یہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ (۴۱/۵)۔ "اے رسول! تو جو صبح و شام ہمیں تبلیغ کرتا رہتا ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ ہمارے دل پردوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگ رہے ہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان ایک حجاب ہے۔ اس لئے تو جو جی میں آئے کرلے، ہم اپنے پروگرام کو چھوڑنے والے نہیں" (۴۱/۵)

(۴) سورۃ جاثیہ کی وہ آیات (۴۵/۲۳) پہلے بھی لکھی جا چکی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ "تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا لیا نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (ایضاً) "خدا نے اُسے علم و عقل رکھنے کے باوجود گمراہی میں چھوڑ دیا۔ اس کے قلب اور سماعت پر مہریں لگا دیں۔ اس کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔ اس سے اس کی دیکھنے، سننے، سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں"۔ اسی کو سورۃ النحل میں یوں کہا گیا ہے کہ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ (۱۶/۱۰۷)۔ "یہ اس لئے کہ انہوں نے دنیاوی مفاد کو مستقبل کے مفاد پر ترجیح دی" اور اس کے بعد ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۱۶/۱۰۸)۔ "یہ وہ لوگ ہیں جن کے سمع اور ابصار اور قلوب پر خدا نے مہریں لگا دیں۔ یہی وہ ہیں جو اپنے انجام کی طرف سے غافل رہتے ہیں"۔

ان آیات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ جب انسان غور و تدبر سے کام نہیں لیتا تو اس میں فکر و تدبر کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے[1] اسی کو دلوں پر مہریں لگنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ محمدؐ میں اس عظیم حقیقت کو نہایت مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷/۲۴)۔ "یہ قرآن کریم پر غور کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں؟" اس آیت میں

دِل پر خود دل کا تالا

ایک ایسا نکتہ بیان کیا گیا ہے جس پر روشنی ڈالے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کہا یہ گیا ہے کہ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ ان الفاظ کا ترجمہ مشکل ہے لیکن کہا یہ گیا ہے کہ ان کے دلوں پر خود ان دلوں کے تالے پڑے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دلوں پر تالے کہیں خارج

---

[1] علم الارتقاء کے ماہرین بتاتے ہیں کہ جو نوع اپنے کسی عضو سے کام لینا چھوڑ دے تو عرصہ کے بعد فطرت اس کے اس عضو کو ناپید ہی کر دیتی ہے۔

سے نہیں پڑتے۔ یہ تالے خود دلوں کی کارگاہ میں ڈھلتے ہیں۔ دل اپنے خود ساختہ تالوں کو، خود اپنے اوپر ڈال کر ان کے اندر اپنے آپ کو بند کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک شخص کمرے کے اندر جا کر، دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دیتا ہے اور پھر چیختا چلاتا ہے کہ میں باہر کیسے نکلوں۔ مجھے باہر نکالو۔ حالانکہ جو کنڈی اس نے خود لگائی تھی اُسے وہ خود ہی کھول سکتا ہے اور یہی ہے وہ حقیقت، جو دوسرے مقام پر قولِ فیصل بن کر ہمارے سامنے آگئی ہے، جہاں قرآن نے کہا ہے کہ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۸۳/۱۴)۔ "نہیں بات یہ نہیں جیسے لوگ عام طور پر سمجھے ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ خود ان کے اپنے اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگ جاتے ہیں"۔ اسی کو خدا کی طرف سے لگائی ہوئی مہریں کہا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ (۲/۷) سے مفہوم کیا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں کہا تھا کہ جو لوگ دیدہ دانستہ کفر کی راہ اختیار کر لیتے ہیں اور اپنی روش کے خلاف کچھ سننا ہی نہیں چاہتے۔ ان کے لئے یکساں ہے خواہ ان کی روش کے تباہ کن نتائج سے انہیں آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ وہ صحیح بات ماننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوں گے! ان کی اس کاوش کا نتیجہ یہ بتایا کہ رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ان کے سمجھنے، سوچنے، سننے، دیکھنے کی صلاحیت ہی مفلوج ہو جاتی ہے وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۲/۷) چونکہ یہ سب کچھ ان کا اپنا کیا دھرا ہوتا ہے اس لئے اس کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑے گا۔ اور وہ نتیجہ ہے عذاب عظیم!

(۲/۷) وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ

"عذاب" کا لفظ جس کثرت سے قرآنِ کریم میں آیا ہے اسی کثرت و شدت سے اس کا غلط تصور ہمارے ہاں عام ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہمارے ہاں عذاب شروع ہی مرنے کے بعد قبر میں سے ہوتا ہے — قبر کا عذاب، حشر کا عذاب — جہنم کا عذاب — اور ذہنوں میں اس عذاب کا نقشہ کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے پولیس والے کسی ملزم کو الٹا لٹکا کر، اس کی کھال ادھیڑ رہے ہوں یا لوہے کی گرم سلاخوں سے اس کے جسم کو داغا جا رہا ہو اور وہ اس ناقابلِ برداشت اذیت سے چیخ، چلا رہا اور دہائی دے رہا ہو۔

عذاب کے معنی

جہاں تک دنیاوی عذاب کا تعلق ہے اس کی صورت یوں ہے کہ اگر کہیں زلزلہ آئے تو کہا جاتا ہے کہ یہ خدا کا عذاب ہے۔ سیلاب آجائیں تو یہ خدا کا عذاب ہے۔ بارش نہ ہو تو یہ بھی خدا کا عذاب ہے۔ طاعون یا ہیضہ

کی وبا پھوٹ پڑے تو یہ خدا کا عذاب ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس عذاب کی شکل عجیب ہوتی ہے۔ فسق و فجور لنڈن میں ہوتا ہے اور زلزلہ میکسیکو میں آجاتا ہے۔ فحاشی اور بے حیائی روس میں ہوتی ہے اور سیلاب پاکستان میں آجاتے ہیں۔ یعنی دنیا کے کسی حصے میں اس قسم کے حوادث نمودار ہوں، کہدیا جاتا ہے کہ یہ خدا کا عذاب ہے جو فسق و فجور کی وجہ سے آیا ہے۔ اور اس کی مدافعت یا ازالہ کے لیے کہا جاتا ہے کہ تم (یعنی مخاطبین) خدا سے معافی مانگو۔ اپنے گناہوں سے توبہ کرو تاکہ خدا کا یہ عذاب ٹل جائے

فطری حوادث

قرآن کریم نے اس قسم کے حوادث کا ذکر اقوامِ سابقہ کے احوال و کوائف کے سلسلہ میں کیا ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے اور قوموں کے اعمال اور اس قسم کے طبیعی حادثات میں باہمی ربط و تعلق کیا، اس کی تفصیل اپنے اپنے مقامات پر بیان کی جائے گی۔ جہاں تک دورِ حاضرہ کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے فطری حوادث دنیا کے ہر ملک میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ جو ملک سائنٹیفک تحقیقات کی روشنی میں ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر اختیار کر لیتے ہیں وہ ان کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ علمِ انسانی رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کی رُو سے اس نے اس قسم کے حوادث میں سے اکثر پر قابو پا لیا ہے۔ باقیوں پر بھی وہ اسی طرح قابو پالے گا۔ خدا نے جب انسان سے کہا ہے کہ ہم نے کارگہ کائنات کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے تو اس سے مراد ہی یہ ہے کہ انسان کو یہ صلاحیت عطا کر دی گئی ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے (تفصیل اس کی آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ لہٰذا اس قسم کے کائناتی حوادث کے متعلق کہنا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے گناہوں کی پاداش میں مبتلائے عذاب کر دیتا ہے، صحیح نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اقدار و اصولِ خداوندی کی پامالی سے قوم کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں۔ اس کا اولین نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں عدل کا تصور نہیں رہتا۔ وہ اس دھاندلی کی روش کو پہلے غیر قوموں کے خلاف اختیار کرتی ہے اور اسے جذبۂ حُبّ الوطنی (PATRIOTISM) سے تعبیر کر کے اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ جراثیم خود ان کے اپنے اندر بھی سرایت کر جاتے ہیں۔ اور اس طرح اس معاشرہ میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے جس کا نتیجہ زندگی کے ہر گوشے میں فساد ہوتا ہے [فساد کی تشریح آیت (۲/۱۱) کے تابع ملے گی]۔ اس کا اثر ان کے نظم و نسق پر بھی پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کائناتی حوادث کا مقابلہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتی۔ یہ تعلق ہے قوموں کے اخلاقی بگاڑ اور کائناتی حوادث کی پیدا کردہ تباہیوں کا۔ بالفاظِ دیگر، کائناتی حوادث — سیلاب، زلزلہ وغیرہ — انسانوں کے "گناہوں" کی وجہ سے نہیں آتے۔ یہ فطرت کے قوانین کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔ انسانوں کے "گناہوں" (اخلاقی اقدار سے اعراض برتنے) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں نہ ان حوادث کی روک تھام کی صلاحیت رہتی ہے اور نہ ہی

ان کی وجہ سے پیدا شدہ تباہی کے ازالہ کی استعداد۔

جہاں تک اُخروی عذاب کا تعلق ہے یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس زندگی کے احوال و کوائف ایسے بسیط حقائق ہیں جنہیں ہم محسوس طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ انہیں قرآن کریم میں تشبیہات اور تمثیلات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ انہی کی رو سے ہم متعلقہ مقامات میں بتائیں گے کہ ہماری بصیرت کے مطابق ان کا مفہوم کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد دیکھئے کہ "عذاب" کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

سورۃ فاتحہ کی آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵) میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے زندگی کا تصور حسرکیاتی ہے۔ نہ تو یہ دائرے میں گردش کرتی ہے اور نہ ہی جامد ہے۔ زندگی اپنے نقطۂ آغاز سے مختلف مراحل طے کرتی، ارتقائی منازل میں سے گزرتی، مقامِ آدمیت تک پہنچی ہے۔ یہ مقام انتہائے راہ نہیں اس نے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھنا ہے اور یہ سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ارتقائے آدم کے سلسلہ دراز کا تو ابھی آغاز ہی ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ زندگی کا آگے بڑھتے چلے جانا اس کی کامیابی ہے اور اس کا کسی مقام پر رُک جانا اس کی انتہائی ناکامی اور نامرادی —— زندگی، جب تک ایک ندی کی طرح رواں دواں رہے، زندگی ہے۔ جب وہ کہیں رک کر جوہڑ بن جائے تو اس کی بنیادی خصوصیت (روانی) پہلے محبوس اور اس کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے زندگی کے کسی مقام پر رُک جانے کو "عذاب" سے تعبیر کیا ہے۔ عربوں کے ہاں، صحرا کی خشکی اور گرمی کی شدت سے ان کے جانوروں کو پیاسا رہنا پڑھتا تھا اور اکثر اوقات پیاس کی شدت اس حد تک بڑھ جاتی تھی کہ وہ جانور کھانا پینا بھی چھوڑ دیتا تھا اور اس طرح اس میں چلنے پھرنے کی سکت باقی نہیں رہتی تھی۔ اس کی اس کیفیت کو "عذاب" کہا جاتا تھا۔ اسی اعتبار سے قرآن کریم نے جہنم کو جحیم کہکر پکارا ہے۔ مثلاً (۵۶/۴۴) جحیم کے معنے رکاوٹ یا روک بن جانے کے ہیں۔

زندگی کا جامد ہو جانا ہماری قوم میں، جو بدقسمتی سے صدیوں سے ایک ہی مقام پر کھڑی ہے، حرکت کے مبدّل بہ سکون ہو جانے کی روح فرسا اذیت کا احساس ہی مردہ ہو چکا ہے ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ زندگی ہوتی ہی ایسی ہے۔ اس کربِ اذیت کی کیفیت کا اس سے پوچھئے جو کھیل کے میدان میں دوسرے کھلاڑیوں کے ساتھ دوڑ رہا ہو اور اسے نظر آتا ہو کہ وہ ان سب پر سبقت لے جائے گا۔ لیکن راستے میں اس کے سامنے کوئی رکاوٹ آ جائے اور اس طرح وہ آگے بڑھنے کی بجائے رک کر کھڑا ہو جائے، اور پھر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ جو کھلاڑی اس سے کہیں پیچھے تھے، وہ کس طرح آگے بڑھ کر منزلِ مقصود تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ وہ

"عذاب" ہے جسے الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں ذلت و پستی، محکومی و محتاجی، ضعف و ناطاقتی، بے کسی و بے بسی، غربت و افلاس، اور اس کے بعد دوں ہمتی اور پست حوصلگی بلکہ بے حِسّی اور بے غیرتی، سب، اِس رک جانے کے فطری نتائج ہیں، اور اس لئے "عذاب" کی مختلف شکلیں۔ یہ اس دنیا کا عذاب ہے۔ اس کے بعد اُخروی زندگی میں عذاب کا سوال سامنے آتا ہے۔ اس متعلق تفصیلی گفتگو اپنے اپنے مقام پر کی جائے گی۔ اسوقت اتنا کہدینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم نے اُسے تشبیہی انداز میں بیان کیا ہے اور بنیادی طور پر کہا ہے کہ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (۵۰/۲۲)۔ وہاں آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے اُٹھ جائیں اور نگاہیں اسقدر تیز ہو جائیں گی کہ وہ فولادی تہوں کو بھی چیر کر نکل جائیں گی۔ اس لئے وہاں زندگی کی جولانگاہ میں رک جانے اور پیچھے رہ جانے کے زیاں سے احساس میں اسقدر شدت پیدا ہوگی کہ اسے دیکھ کر انسان چلا اُٹھے گا اور کہیگا کہ يٰلَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا (۷۸/۴۰)۔ اے کاش میں ذی احساس انسان ہونے کے بجائے مٹی کا تودہ ہوتا۔

ذیل میں ہم اِس عذاب کی چند ایک مثالیں درج کرتے ہیں جس کا تعلق اس دنیا کی زندگی سے ہے قرآن کریم بیشتر عذاب کی اجتماعی شکل بیان کرتا ہے۔

ذِلّت و خواری

(۱) قرآن کریم نے اگرچہ عذاب کی مختلف نوعیتیں اور خصوصیات بتائی ہیں —— کہیں "عذاب عظیم" (بہت بڑا عذاب) کہا ہے اور کہیں "عذاب الیم" (الم انگیز عذاب) —— لیکن ہمارے نزدیک، اس کی شدید ترین، اور سنگین ترین صورت وہ ہے جسے اس نے عَذَابٌ مُّهِينٌ —— "ذِلّت آمیز عذاب" سے تعبیر کیا ہے (۲۲/۵ و دیگر مقامات)۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی قوم کی حمیت اور غیرت بالکل ہی مردہ نہ ہو چکی ہو تو ذلت و خواری سے زیادہ کرب انگیز اور عبرت آموز عذاب کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس نے داستانِ بنی اسرائیل میں کئی ایک مقامات پر اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ ان کی مسلسل سرکشی اور معصیت کوشی کا نتیجہ یہ تھا کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوٓا (۳/۱۱۱)۔ "جہاں بھی وہ گئے، ذلت کا رسوا کُن عذاب سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا رہا"۔ ہم نے اوپر بتایا ہے کہ جب کسی قوم میں حرکت نہیں رہتی اور وہ ایک مقام پر رک جاتی ہے، تو اس کا نتیجہ وہ تباہی اور بربادی ہے، جسے قرآن کریم نے عذاب کہکر پکارا ہے۔ اسی بنا پر اس نے اس عذاب کی وضاحت کرتے ہوئے، جس میں قوم بنی اسرائیل ماخوذ ہو گئی تھی، ذلت کے ساتھ مسکنت بھی کہا ہے (۲/۶۱)۔ یعنی ان کی شوکت و عظمت مبدّل بہ ذلت و پستی ہو گئی، اور ان کی حرکت و حرارت

ساکن و منجمد۔ ان کی اس روش کا ذکر کرتے ہوئے کہ وہ ضابطۂ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے اور دوسرے حصہ سے انکار کرتے تھے، کہا کہ صرف بنی اسرائیل ہی نہیں بلکہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)۔ جو قوم بھی ایسی روش اختیار کرے گی اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہوگی اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں ماخوذ۔

(۲) ذلت کی پست ترین شکل یہ ہے کہ کوئی قوم، دوسروں کی محکوم اور غلام ہو جائے۔ مصر میں بنی اسرائیل کی حالت یہی ہو چکی تھی۔ قومِ فرعون نے انہیں اپنا محکوم بنا رکھا تھا۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف گئے ہیں تو انہوں نے اس سے کہا یہی تھا کہ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (۲۰/۴۷) "قومِ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو اور انہیں عذاب کے شکنجے میں نہ کسے رکھو۔" اسی (محکومیت و مغلوبیت) کو قرآن کریم نے استبدال و استخلافِ قومی سے تعبیر کیا ہے یعنی کسی قوم کی جگہ دوسری قوم کا آجانا۔ اس استبدال کی شاذ صورت تو یہ ہوتی ہے کہ فاتح قوم، مفتوح قوم کو، اس کے مساکن و مواطن سے نکال باہر کرتی ہے اور خود ان کی جگہ آباد اور مسلط ہو جاتی ہے (جیسے بھارت میں آریوں نے وہاں کے اصلی باشندوں، دراوڑوں کے ساتھ کیا) لیکن اس کی عام شکل یہ ہوتی ہے کہ مفتوح قوم سے ثروت و شوکت چھن جاتی ہے اور اس کی مالک فاتح قوم بن جاتی ہے۔ یہ بھی "ایک قوم کا دوسری قوم کی جگہ لے لینا ہے"۔ سورۃ توبہ میں جماعت مؤمنین سے کہا گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جہاد کے لئے نکلو۔ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۹/۳۹)۔ "اگر تم نے اس سے گریز کیا تو یاد رکھو! خدا تمہیں الم انگیز عذاب میں ماخوذ کر دے گا۔ اور وہ عذاب یہ ہوگا کہ کوئی دوسری قوم تمہاری جگہ لے لے گی۔ اور تم خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے۔ یہ اس لئے کہ نظامِ خداوندی میں قانون کی عملداری ہے۔ اور قانون اس قدر محکم قوتوں کا مالک ہوتا ہے کہ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

محکومی

دوسری جگہ ہے:

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ۔ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ۔ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا

غَيۡرَكُمۡ ثُمَّ لَا يَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ (۴۷/۳۸)۔

"تم وہ لوگ ہو کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ نظامِ خداوندی کی اقامت و استحکام کیلئے (فی سبیل اللہ) اپنی تجوریوں کے منہ کھلے رکھو، تو تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بخل برتنے لگ جاتے ہیں۔ بخل برتنے والا اس خود فریبی میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے مال و دولت سنبھال کر رکھتا ہے اور دوسروں کو اس سے محروم کرتا ہے لیکن وہ اتنا نہیں سمجھتا کہ اس کی اس روش کا انجام یہ ہوگا کہ وہ خود بھی اس مال و دولت سے محروم رہ جائے گا۔ ان سے کہدو کہ انفاق فی سبیل اللہ کی تاکیدات سے خدا تم سے اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں مانگتا۔ اس میں خود تمہارا ہی بھلا ہے۔ وہ ہر احتیاج سے مستغنی ہے۔ محتاج تو تم ہو۔ یاد رکھو! اگر تم نے انفاق کی دعوت پر گریز کی راہیں اختیار کیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی"۔

(۳) خدا نے جماعتِ مومنین کو اُمّتِ واحدہ کہکر پکارا ہے اور بار بار کہا ہے کہ تفرقہ انگیزی اور فرقہ بندی کفر اور شرک ہے اور اس کا نتیجہ، تباہی اور بربادی کا رسوا کن عذاب۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے

فرقہ بندی

وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓٮِٕكَ لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ (۳/۱۰۴) "دیکھنا! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح ہدایت آجانے کے بعد آپس میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کرلیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے"۔

باہمی اختلاف کے نتیجہ میں جو عذاب وارد ہوتا ہے اس کے ظہور و نمود کی مختلف شکلیں ہیں جنہیں قرآن کریم نے سورۃ الانعام میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ:۔

قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ
اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ
بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ
لَعَلَّهُمۡ يَفۡقَهُوۡنَ (۶/۶۵)۔

"اس عذاب کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نچلے طبقے میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیوں میں بٹ جاتے اور ایک دوسرے سے لڑنے لگ جاتے ہیں اور

یوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ دیکھو ہم کس طرح اپنے قوانین کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لاتے ہیں تاکہ لوگ بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں"۔ یہ تو باہمی خانہ جنگی ہوتی ہے لیکن کبھی یہ تباہی دوسری قوموں کے ہاتھوں شکست کھا کر بھی وارد ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں جماعتِ مؤمنین سے کہا گیا کہ جو مخالفین اب تمہارے خلاف میدانِ جنگ تک میں اُتر آتے ہیں، قَاتِلُوْهُمْ (۹/۱۴)۔ تم ان سے جنگ کرو۔ یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَیْدِیْكُمْ وَیُخْزِهِمْ (۹/۱۴)۔ اللہ چاہتا ہے کہ وہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب میں مبتلا کرے۔ اور یہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو جائیں (نیز ۹/۵۲)۔

(۴) یہ تو عذاب کی وہ شکل ہے جس میں ایک ہی جھٹکے میں قصہ تمام ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وجہ سوہانِ روح وہ عذاب ہوتا ہے جس میں قوم کے اعصاب پر خوف کا احساس مسلط رہتا ہے۔ قرآن کریم نے ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ یہ بتایا ہے کہ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)۔ ایسی قوم نہ خوف کے عذاب میں مبتلا ہوگی اور نہ ہی حُزن کی پیدا کردہ افسردگی سے ملولِ خاطر۔ خوف

خوف اور حزن

عام طور پر بیرونی خطرات سے پیدا ہوتا ہے اور حزن اس داخلی کیفیت کو کہتے ہیں۔ جس میں انسان غم و الم کے احساس میں ڈوبا رہتا ہے۔ یہ وہ جہنم ہے جس کے متعلق کہا کہ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی (۸۷/۱۳)۔ جس میں انسان نہ زندہ رہتا ہے نہ مرتا ہی ہے"۔ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَیِّتٍ (۱۴/۱۷)۔ "نظر آتا ہے کہ موت چاروں طرف سے اس کی طرف بڑھی چلی آرہی ہے لیکن وہ آتی نہیں"۔ ایمان و اعمالِ صالحہ قوم کو عذاب کی ان دونوں شکلوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے برعکس سورۃ النحل میں قرآن نے تمثیلی انداز میں سمجھایا ہے کہ مَثَلًا قَرْیَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً (۱۶/۱۱۲) "ایک بستی تھی جس کے رہنے والوں کو امن بھی نصیب تھا اور اطمینان بھی ——— یعنی نہ انہیں کسی قسم کا خوف تھا نہ حزن ——— ان کی خوشحالیوں کی یہ کیفیت تھی یَاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ (ایضاً) رزق ان کی طرف ہر گوشے سے بافراط کھنچے کھنچے چلا آتا تھا۔ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ (ایضاً) انہوں نے ان نعماتِ خداوندی سے کفر برتا۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (ایضاً)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (ایضاً) اور یہ نتیجہ تھا ان کے اس خود ساختہ نظام کا جو انہوں نے نظامِ خداوندی کے علی الرغم اختیار کر رکھا تھا ——— یہاں سے واضح ہے کہ بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہیں۔

بھوک کا عذاب

یعنی رزق کی تنگی اور بیرونی خطرات کا دھڑکا۔ تنگیٔ رزق کے متعلق اس نے واضح

الفاظ میں کہا ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔ "جو ہمارے قانون سے اعراض برتتا ہے، اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اور جس کی یہاں روزی ہو جائے وہ قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھایا جاتا ہے"۔ دوسری جگہ ہے وَمَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷/۷۲)۔ "جو اس دنیا میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ (بھوک کے عذاب کے متعلق قرآن کریم کے معاشی پروگرام کے ضمن میں وضاحت سے لکھا جائے گا۔ اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔

(۴) سورۃ النحل کی مذکورہ آیت (۱۶/۱۱۲) میں کہا گیا ہے کہ کفرانِ نعمت سے قومیں بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے دوسرے مقام پر بڑے محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے جب کہا کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴/۲۸) کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا ہے جنہوں نے نعمائے خداوندی سے کفر برتا اور اس طرح اپنی قوم کے کارواں کو اس منڈی میں جا اُتارا جہاں اس جنس کا سد کا کوئی پوچھنے والا تک نہ تھا۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴/۲۹)۔ یعنی جہنم میں جا اُتارا جو ٹھہرنے کا نہایت ہی بُرا مقام ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جہنم اور جنت کے متعلق تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر ہوگی۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (۲۹/۵۴)

دنیاوی جہنم

جہنم کہیں دور نہیں۔ وہ تو کفار کو ہر وقت اپنے گھیرے میں لئے رہتی ہے۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (۸۲/۱۶)۔ "اس کی نگاہوں سے یہ اس وقت بھی اوجھل نہیں، وہ انہیں دیکھ رہی ہے"۔ لیکن چونکہ ان کی آنکھوں پر غفلت اور مفاد پرستیوں کے پردے پڑے ہیں اس لئے وہ انہیں نظر نہیں آتی۔ جسے "یوم الحساب" کہا جاتا ہے اس میں ہوتا یہ ہے کہ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (۷۹/۳۶)۔ جو جہنم پہلے نگاہوں سے مستور ہوتی ہے اُبھر کر دیدۂ بینا کے سامنے آجاتی ہے۔

(۵) جیسا کہ پہلے بھی تفصیلی طور پر بتایا جا چکا ہے نہ تو قوموں پر تباہی اور بربادی یونہی دھاندلی سے آتی ہے اور نہ ہی کسی قوم کو سرفرازی اور سربلندی "بخشش" کے طور پر ملتی ہے۔ اس جہانِ سعی و عمل میں، مخالف قوتوں (حق و باطل) کا ہر وقت ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ اس تصادم میں جس قوم میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ جس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی وہ شکست کھا جاتی

اور ہلاک ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے سورۃ انفال میں چند مختصر الفاظ میں اس مقام پر بیان کیا ہے جہاں جماعتِ مؤمنین سے کہا ہے کہ ہم تمہیں یونہی میدانِ جنگ تک کھینچ نہیں لائے۔ اس کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ یہ کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) "جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان ہی کی رُو سے زندہ رہے"۔

زندگی اور ہلاکت علیٰ وجہ البصیرت

یہی وہ اصول ہے جس کی شہادت کے لئے قرآن کریم نے اقوامِ سابقہ کی داستانیں اس شدومد سے بیان کی ہیں۔ ان داستانوں کے بیان کرنے سے مقصد ہی یہ بتانا ہے کہ حق و صداقت کی حامل قوم کس طرح غالب و کامران رہتی ہے۔ اور باطل نظام کی علمبردار قومیں اس طرح تباہ و برباد ہو جاتی ہیں کہ اس کے بعد ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات ان کی نوحہ گری کے لئے باقی رہ جاتے ہیں (۴۰/۸۲-۸۵ وغیرہ)۔ (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) یہ تباہیاں یونہی اندھا دھند نہیں آجاتیں۔ قوموں کو پہلے وارننگ (تنذیر) دی جاتی ہے کہ جس نظام کو تم نے اختیار کر رکھا ہے اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہے۔ انہیں یہ وارننگ بار بار دی جاتی ہے۔ لیکن جب وہ اس پر کان نہیں دھرتیں اور اپنی غلط روش میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں تو پھر وہ اس جہنم میں جا گرتی ہیں جس کے متعلق انہیں وارننگ دی گئی تھی۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (۱۷/۱۵)۔ "ہم کسی قوم کو تباہ نہیں کرتے تھے، جب تک ان میں پہلے رسول نہیں بھیج دیتے تھے"۔ دوسری جگہ ہے وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۶/۲۰۸-۲۰۹)۔ "ہم کسی بستی کو تباہ نہیں کرتے جب تک ان میں ان پیامبروں کو نہیں بھیج دیتے جو انہیں ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کر دیں اور انہیں یاد دلا دیں کہ وہ غفلت میں پڑے نہ رہ جائیں۔ ہم ظالم نہیں کہ کسی قوم کو یونہی دھاندلی سے تباہ کر دیں"۔

قوموں کے زندہ رہنے اور تباہ ہو جانے کا اصول بھی بڑا واضح اور مبنی بر حقیقت ہے۔ طب کی سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ انسان جس ماحول میں رہتا سہتا اور جس فضا میں سانس لیتا ہے۔ وہ لاکھوں کروڑوں ہلاکت انگیز جراثیم سے مملو ہوتی ہے۔ یہ جراثیم انسان کے اندر جاتے ہیں جہاں اس کی قوتِ مدافعت ان کا مقابلہ کرتی ہے۔ اگر وہ قوت محکم ہے تو وہ ان جراثیم کو تباہ کر دیتی ہے اور وہ شخص تندرست رہتا ہے۔ اگر وہ کچھ کمزور ہو گئی ہے تو یہ ہلاکت آفریں جراثیم اس پر غالب آجاتے ہیں۔ اسے مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علاج کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اُس فرد کی قوتِ مدافعت کو بڑھا دیا جائے تاکہ وہ ان آفتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے۔ لیکن

اگر صورت ایسی ہو کہ قوتِ مدافعت گھٹتی چلی جائے اور ہلاکت آفریں عناصر غالب آتے جائیں تو ایک دن ایسا آجاتا ہے جب قوّت مدافعت آخری شکست کھا جاتی ہے۔ اسے موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

افراد کی طرح اقوام کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ جسقدر تعمیری کام کرتی ہیں، ان سے ان کی قوت مدافعت بڑھتی ہے، اور اس طرح تخریبی عناصر اس پر غالب نہیں آتے۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ کسی قوم کے تعمیری کام گھٹتے جائیں اور تخریبی اعمال و عناصر بڑھتے، تو وہ قوم آمادہ بہ زوال ہو جاتی ہے، اور آخرالامر مفتوح و مغلوب اور تباہ و برباد۔ قرآن کریم نے اسے میزان کے پلڑوں کے جھکنے اور اٹھنے کی تشبیہہ سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۷/۸)۔ جس فرد یا قوم کا حسنات کا پلڑا بھاری ہوتا ہے وہ کامیاب و کامران رہتی ہے۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۷/۹)۔ "جس کا یہ پلڑا ہلکا ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو تباہ کر لیتی ہے"۔ ظاہر ہے کہ پلڑوں کے ہلکا اور بھاری ہونے کا یہ طریق کار (PROCESS) ایک دن میں تکمیل تک نہیں پہنچ جاتا۔ اس کے لئے کافی لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے مہلت کا وقفہ یا اجل (میعاد) کہا جاتا ہے۔ جس کے دوران اس قوم کے لئے اس کی گنجائش اور امکان ہوتا ہے کہ وہ پھر سے اپنی تعمیری و مدافعانہ قوتوں کو بڑھالے اور آنے والی تباہی سے بچ جائے۔ لیکن جو قوم ایسا نہیں کرتی اس کی مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۰/۴۹)۔ ہر قوم کے لئے مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ جب وہ وقفہ اپنے آخری لمحہ تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کی تباہی میں نہ ایک ثانیہ کی تاخیر ہوتی ہے نہ تقدیم" (نیز ۱۵/۵)۔ وہ لوگ جو بر بنائے جہالت یہ کہتے ہیں کہ عذاب، خدا کی طرف سے وارد ہوتا ہے۔ یعنی نہ اس کے لئے کوئی قاعدہ قانون مقرر ہے نہ ہی کوئی اصول اور معیار۔ وہ جسے چاہتا ہے عذاب دے دیتا ہے۔ ان کے جواب میں کہا۔ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ۔ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (۴/۱۴۷)۔ اگر تم شکرِ نعمت کرو اور ابدی صداقتوں پر ایمان رکھو تو خدا نے تمہیں عذاب دیکر کیا کرنا ہے۔ وہ تو حسنِ عمل کے بھرپور ثمرات عطا کرتا ہے۔ اور اس کے علیم ہونے کی یہ کیفیت ہے کہ کسی کا ذرہ برابر عمل بھی اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا (۹۹/۷-۸)۔

قانونِ مدافعت و مہلت

ہم نے اوپر یہ تو بتایا ہے کہ زوال آمادہ اور آخرالامر تباہ ہو جانے والی قوموں پر عذاب کس کس شکل میں مسلط ہوتا ہے۔ لیکن یہ چیز متعین طور پر سامنے نہیں آئی کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنا پر قومیں پہلے زوال پذیر اور اس کے

بعد تباہ اور برباد ہو جاتی ہیں۔ منتشر طور پر تو یہ اسباب آپ کو قرآنِ کریم اور اس کتاب میں بھی جا بجا ملیں گے۔ متعین طور پر ان قوموں کو تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(۱) وہ قومیں جو فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتیں۔ قرآنِ کریم نے تسخیرِ فطرت کی قوت انسانی ممکنات میں بتائی ہے لہٰذا جو قومیں اس قوت سے کام نہیں لیتیں وہ صفِ آدمیت میں شامل ہونے کے قابل بھی نہیں قرار پاتیں، چہ جائیکہ اُن کا شمار زندہ قوموں میں ہو۔ یہ عام طور پر مذہب گزیدہ قومیں ہوتی ہیں جن کے نزدیک دنیا کی ہر شئے قابلِ نفرت اور ہر جاذبیت مستحقِ مذمت ہوتی ہے۔ یہ زندہ حقیقتوں سے گریز کی راہیں اختیار کر کے خود ساختہ مقدس افسانوں کی موہوم دنیا میں مگن رہتی ہیں۔

(۲) وہ قومیں جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہیں لیکن ان کا استعمال مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع نہیں کرتیں بلکہ اپنے مفاد کے مطابق کرتی ہیں جس کا نتیجہ قوموں کا باہمی فساد اور تصادم ہوتا ہے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ یہ قومیں بڑے عروج کی طرف جا رہی ہیں لیکن ان کا یہ عروج ہنگامی اور وقتی ہوتا ہے۔ اخلاقی اقدار سے بے اعتنائی ان کی تعمیر کی بنیادوں میں ٹائم بم رکھ دیتی ہے۔ اور جب اس کے پھٹنے کا وقت آتا ہے تو ان کی تہذیب و تمدن کی یہ ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ گرتی ہے۔ قرآنِ کریم نے قومِ عاد و ثمود وغیرہ کے متعلق بتایا ہے کہ وہ بڑی قابلِ رشک قوت و ثروت اور تمکن و تسلّط کی مالک تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ دیدہ ور اور باشعور اور صاحبِ علم و ہنر بھی تھیں لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی، ان کے مطابق نظام قائم کرنے سے انکار کر دیا تو نہ ان کی قوت و سطوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی اور نہ ہی ان کا علم و ہنر ان کے کسی کام آیا۔ اور جس تباہی کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ($\frac{46}{26}$)۔ مغرب کی موجودہ قومیں اس کی زندہ مثال ہیں۔ انہوں نے فطرت کی قوتوں کو اس قدر وسعتوں، گہرائیوں اور پہنائیوں سے مسخر کیا جس کی مثال نہیں ملتی اور اس طرح کرۂ ارض کے گوشے گوشے پر چھا گئیں اور چونکہ وہ تسخیرِ کائنات میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں اس لئے دنیا نے یہ تصور کر لیا کہ ان قوموں پر زوال نہیں آ سکتا۔ لیکن انہوں نے جو اقدارِ خداوندی کو اپنی زندگی سے الگ کیا تو اس وقت جس جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں اس کا کچھ اندازہ اس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جو وہاں کے دیدہ وروں کے سینوں سے بے اختیار اُبھر کر فضائے عالم میں ارتعاش پیدا کر رہی ہے (اس کی تفصیل میری کتاب —— انسان نے کیا سوچا —— میں ملے گی)۔

(۳) تیسری شق میں وہ قومیں آتی ہیں جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کے ماحصل کو اقدارِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کرتی ہیں۔ یہ قومیں جب تک اس روش پر قائم رہتی ہیں، زوال کا سایہ تک

ان پر نہیں پڑتا۔ اس کی تفصیل آپ کو قرآنِ کریم کے بیشمار مقامات میں "ایمان اور اعمالِ صالحہ" کے ضمن میں ملے گی۔

ہم نے اس مقام پر اپنے آپ کو، اس عذاب، یعنی غلط کاموں کے تباہ کن نتائج تک محدود رکھا ہے جو اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ اُخروی عذاب کے متعلق، متعلقہ مقامات پر گفتگو کی جائے گی۔ یہاں اتنا اور واضح کر دینا

عدالتی سزا ضروری ہے کہ جرائم کی جو سزا عدالت کی طرف سے دی جاتی ہے اسے بھی قرآنِ کریم نے عذاب کہکر پکارا ہے (مثلاً ۲۴/۲ و ۲۴/۸)۔

خلاصہ بابِ دوم

یہ ہے میری بصیرت کے مطابق سورۃ بقرۃ کی آیات چھ اور سات (۶ـ۷) کا تفصیلی مفہوم۔ میں نے ان کے مختصر مفہوم کو (نظرثانی شدہ) مفہوم القرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> متقین کے برعکس، دوسرا گروہ، ان لوگوں کا ہے جو اس دنیا کی طبیعی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں اس لئے وہ نہ انسانی ذات کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی نشوونما کے لئے اقدارِ خداوندی کی ضرورت کے قائل ہوتے ہیں۔ طبیعی زندگی کے مفاد کا حصول ان کا مقصدِ حیات اور اس کے حصول کیلئے ہر قسم کا حربہ استعمال کر لینا اُن کا مسلک ہوتا ہے۔ وہ جب تک اس بنیادی نظریۂ حیات کو نہ بدلیں انہیں راستہ کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے ان کے لئے یکساں ہے۔ وہ صحیح راستہ پر کبھی نہیں آسکتے۔ جو شخص خودکشی پر تُلا بیٹھا ہو اس سے یہ کہنا کہ سنکھیا مت کھاؤ، یہ مہلک ہوتا ہے، بے سود ہے۔
>
> اِن لوگوں کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں دیکھنے، بھالنے اور سمجھنے، سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی (جس طرح غصہ میں انسان پاگل ہو جاتا ہے)۔ ان کی آنکھوں پر جذبات پرستی کے

ایسے گہرے پردے پڑ جاتے ہیں کہ وہ نشاناتِ راہ کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اِن کے کانوں میں ایسے ڈاٹ لگ جاتے ہیں کہ وہ آوازِ جرس سے بھی کارواں کا سراغ نہیں پا سکتے۔ ان کے قلب و دماغ پر اس قسم کے غلاف چڑھ جاتے ہیں کہ وہ گرد و پیش پر غور کرنے سے بھی صحیح سمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ وہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔



تیسرا باب
(آیات — ۸ تا ۲۰)

منافقین

۱۔ منافق کسے کہتے ہیں؟ — جس کے قلب و زبان میں ہم آہنگی نہ ہو۔
۲۔ منافقت نفسیاتی مرض ہے۔
۳۔ ادراک، احساسات اور نفس کی بحث — قلب اور فواد میں فرق۔
۴۔ منافقین کی علامات — کفر مستور۔
۵۔ تخریبی ذہنیت — نقصان پہنچا کر خوش ہونا۔
۶۔ سازشیں اور سرگوشیاں — حتیٰ کہ خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے خلاف الزام تراشیاں۔
۷۔ ریاکاری — انفاق و صلوٰۃ و جہاد تک میں۔
۸۔ تفرقہ انگیزی — مسجدِ ضرار — ہماری مساجد!
۹۔ ان سے معاشرتی تعلقات منقطع۔
۱۰۔ اُخروی زندگی میں منافقین کی حالت۔
۱۱۔ صدرِ اول میں منافقین چھٹ کر الگ ہو گئے تھے۔
۱۲۔ صحابہؓ، سب کے سب، مخلص مومن تھے۔
۱۳۔ فسادِ آدمیت کے مختلف گوشے۔
۱۴۔ نیشنلزم کی تباہ کاریاں۔
۱۵۔ مسئلہ خیر و شر، اور نفع نقصان
۱۶۔ زندگی کے مسائل حل کرنے میں عقلِ انسانی کا عجز۔
۱۷۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کا مفہوم۔

تیسرا باب

(آیات ـــ ۸ تا ۲۰)

منافقین

۲/۸

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔

پہلے دیکھا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم نے نوعِ انسان کو اصولی طور پر دو شقوں میں تقسیم کیا ہے ــ مومن اور کافر۔ مومن وہ جو قرآنِ کریم میں مندرج وحیٔ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ کافر وہ جو اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اب ایک تیسری شق سامنے آتی ہے اور وہ ان لوگوں پر مشتمل ہے "جو کہتے ہیں کہ ہم اس صداقت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اسکے باوجود وہ مومن نہیں" قرآنِ کریم کے اسی اجمال کی تفصیل اب ہمارے سامنے آئے گی۔

قرآنِ کریم نے ایمان کے پانچ اجزاء بتائے ہیں ــ اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور آخرت ــ اس آیت (۸/۲) میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم "اللہ اور آخرۃ" پر ایمان لائے ہیں بعض سطح بین لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ یہ لوگ پانچ اجزاء میں سے صرف دو اجزاء پر ایمان کے مدعی ہیں، باقی تین اجزاء کو چھوڑ دیتے ہیں اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ وہ مومن نہیں ہیں۔

ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ یہاں پانچ اجزاء میں سے دو، تین کا سوال نہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے بیشک اجزائے ایمان پانچ ہیں (۲/۱۷۷)، لیکن اس کا انداز یہ ہے کہ وہ کہیں ان اجزاء میں سے صرف ایک کو بیان کرتا ہے، کہیں دو کو، کہیں تین کو، اور کہیں پانچوں کو۔ لیکن ہر جگہ اس کا مقصود پانچ اجزاء ہی ہوتے ہیں۔

تعداد کا سوال نہیں

مثلاً ایک جگہ اس نے کہا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۴۱/۳۰) "جو لوگ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہتے ہیں تو ان پر نزولِ ملائکہ ہوتا ہے" یہاں صرف اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔ سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۲/۶۲) "جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور عمل صالح کرے تو ان کے لئے خدا کے ہاں ان کا اجر ہے" یہاں اللہ اور آخرت پر ایمان کا ذکر ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (۳/۱۷۸)

"اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ"۔ اور سورۃ تغابن میں ہے۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا (۶۴/۸)۔ "ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسولوں پر، اور اُس نور (قرآنِ کریم) پر جسے اللہ نے نازل کیا"۔

اِن تصریحات سے واضح ہے کہ آیت (۸/۲) کا یہ مطلب نہیں کہ چونکہ یہ لوگ صرف دو اجزائے ایمان کا اقرار کرتے ہیں باقیوں کا نہیں، اس لئے یہ مومن نہیں ہو سکتے۔ یہاں مذکور صرف دو اجزاء ہیں لیکن مطلوب پانچوں کے پانچوں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآنِ کریم میں بتائے ہوئے اجزائے ایمان کا اقرار کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مومن نہیں ہیں۔

ایمان کے موضوع پر بات کرتے ہوئے یہ پہلے بتایا جا چکا ہے (دیکھئے ۳/۲) کہ قرآنِ کریم ایسے لوگوں کا بھی ذکر کرتا ہے جو مسلمانوں کی قوم میں تو داخل ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مومن نہیں۔ اس سے وہ لوگ بھی مراد ہیں جو پیدائشی مسلمان کہلاتے ہیں اور وہ بھی جن کے ایمان میں پختگی نہیں ہوتی۔ یعنی وہ قرآنِ کریم کی صداقتوں پر ایمان رکھنے کے مدعی تو ہوتے ہیں، لیکن ان کے اعمال خلافِ قرآن ہوتے ہیں۔ مثلاً اس نے سورۃ یوسف میں کہا ہے۔ وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ (۱۲/۱۰۶)۔ "ان میں سے اکثر کا یہ عالم ہے کہ وہ ایمان لانے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں"۔ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی جہاں یہ بتایا جائے گا کہ شرک کسے کہتے ہیں اور مسلمان ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود کس طرح شرک میں ملوث رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں قرآنی معیار کے مطابق مومن نہیں کہا جا سکتا۔ مومنین کے متعلق تو اس نے کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ (۶/۸۳)۔ "وہ ایمان لاتے ہیں اور پھر اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملوث نہیں ہونے دیتے"۔ (اس کی تشریح بھی آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں یہ بتایا جائے گا کہ ظلم کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح ایمان کو ضائع کر دیتا ہے) قرآنِ کریم نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا ہے کہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آ جائے تو لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُھَا لَمْ تَکُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ کَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِھَا خَیْرًا (۶/۱۵۹)۔ "اُس وقت نہ تو اُس شخص کو اُس کا ایمان کچھ فائدہ دے گا جو اُس سے پہلے ایمان نہیں لایا ہوگا، اور نہ ہی اس شخص کا ایمان جس نے ایمان کے ساتھ کوئی عملِ خیر نہیں کیا ہوگا"۔ یعنی قرآنِ کریم عمل کے بغیر ایمان کو بھی، ایمان تسلیم نہیں کرتا مردہ آں ایمان کہ ناید در عمل۔ اس قسم کے لوگوں کے متعلق بھی قرآن یہ کہے گا کہ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (۸/۲)۔ لیکن اس آیت سے یہ لوگ بھی مراد نہیں۔ جن لوگوں کا اس آیت میں ذکر ہے ان کے متعلق کہا یہ گیا ہے کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۹/۲)۔ "یہ لوگ خدا کو، اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں"۔ اب بات صاف ہو گئی۔ مومن وہ ہے جس کے دل میں بھی ایمان ہو اور زبان پر بھی ایمان۔ کافر وہ جس کے دل میں بھی کفر ہو اور زبان پر بھی کفر۔ لیکن یہ تیسری شق اُن لوگوں کی ہے جن کے دل میں تو

ایمان نہ ہو لیکن وہ دھوکہ دینے کے لئے کہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، ایمان اور کفر دونوں میں قلب اور زبان میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ایمان میں حق و صداقت کے لئے ہم آہنگی، کفر میں باطل کے لئے ہم آہنگی لیکن جب قلب اور زبان میں ہم آہنگی نہ ہو تو ایسا شخص نہ مومن رہتا ہے نہ کافر۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں منافق کہا جاتا ہے۔

منافق

منافق کے لغوی معانی کے لئے آپ آیت (۲/۳) میں "یُنْفِقُوْنَ" کی تشریح دیکھئے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ نَفَقٌ اُس سُرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دو نوں راستے کھلے ہوں۔ جنگلی چوہا اپنا بل بناتا ہے تو وہ باہر نکلنے کے لئے متعدد سرنگیں کھود کر اُن کے منہ مٹی کی باریک سی تہی سے بند کر دیتا ہے۔ اور جب اُسے باہر سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ ان پوشیدہ سرنگوں میں سے کسی ایک سے باہر نکل جاتا ہے۔ ان سرنگوں (میں سے ہر ایک) کو اَلنَّفَقَۃُ کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ منافق اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو کسی نظام یا سوسائٹی میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ اس میں سے نکلنے کے چور دروازے کون کون سے ہیں۔ یعنی وہ سوسائٹی میں داخل ہوتے وقت بھی مخلص نہیں ہوتا، دھوکہ باز ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہہ دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲/۹): جو خدا کو اور جماعتِ مومنین کو دھوکہ دیتے ہیں۔"

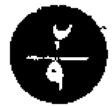
خدع کے معانی

دھوکہ کے لئے یہاں لفظ خُدْعٌ آیا ہے۔ اس مادہ (خ۔ د۔ ع) کے معنی ہیں جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر کرنا۔ کسی کے ساتھ چھپ کر برائی کرنا۔ عرب اس لفظ کا جس طرح محسوس انداز میں استعمال کرتے تھے اُس سے اس کے معانی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ عربوں کی شہرت اور شرافت کا مدار مہمان نوازی پر تھا۔ وہ صحراؤں میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں مویشیوں کا دودھ یا گوشت ہی ہر وقت میسر آنے والی چیز ہو سکتا تھا جس سے مہمان کی تواضع کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ وہ آنے والے مسافر کے سامنے بالعموم دودھ پیش کرتے تھے۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر ایسا ہو کہ مہمان خیمہ میں آجائیں، دودھ دینے والی اونٹنی باہر بندھی ہو، میزبان دودھ دوہنے کے لئے جائے لیکن اونٹنی دودھ چڑھا جائے تو اُس وقت اُس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ اس قسم کی اونٹنی کو خُدُوْعٌ کہتے تھے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ منافق، اُس پارٹی کو جس میں وہ شامل ہو کس طرح دھوکا دیتا ہے۔ یعنی وہ نہایت ناقابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ اُس کے متعلق کہا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ کب دھوکا دے جائے گا۔ اسی طرح وہ اس راستہ کو خَیْدَعٌ کہتے تھے جو بظاہر معلوم ہو کہ منزل کی طرف لئے جا رہا ہے لیکن درحقیقت اس کے خلاف ہو۔ اسی طرح وہ سراب کو بھی خَیْدَعٌ کہتے تھے۔ نیز اُس دینار کو خَادِعٌ کہتے تھے جو دیکھنے میں کھرا معلوم ہو لیکن پرکھنے پر کھوٹا ثابت ہو۔ سُوْقٌ خَادِعَۃٌ اُس بازار کو کہتے تھے جس میں اشیاء کے نرخ ہر آن بدلتے رہیں۔ ابھی کچھ، ابھی کچھ۔

اس لفظ کے ان معانی سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جن لوگوں (یعنی منافقین) کا ذکر اب آرہا ہے انکی خصوصیات کیا ہیں اور وہ کس طرح اس سوسائٹی اور نظام کے لئے جس میں وہ داخل ہوں، تخریب اور تباہی کا موجب ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے دو ہی آیات آگے چل کر کہا ہے کہ یہ لوگ "کاذب" ہوتے ہیں یعنی جھوٹے۔ لیکن محض جھوٹے کہنے سے کذب کا قرآنی

کذب کا مفہوم

مفہوم واضح نہیں ہو سکتا۔ اسے خود قرآن کریم نے ایسے انداز میں واضح کیا ہے کہ اس کے بعد کسی تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ایک شخص کو کسی واقعہ کا صحیح علم نہیں، لیکن جیسا کچھ اسے معلوم ہے وہ اُسے اسی طرح بیان کر دیتا ہے۔ اُس کا یہ بیان تو سچا نہیں کہلایا جا سکتا کیونکہ وہ واقعہ کے خلاف ہے لیکن اُس شخص کو کاذب یا کذاب نہیں کہا جائے گا۔ اس کے برعکس دیکھئے کہ قرآن کی رو سے کاذب کسے کہتے ہیں۔ سورۃ منٰفقون میں ہے کہ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (۶۳/۱) "اے رسولؐ! جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ تو واقعی اللہ کا رسول ہے" آپ دیکھئے کہ انہوں نے بات بالکل سچی کہی ہے۔ ایسی سچی کہ اس کی صداقت کی شہادت خود خدا یہ کہہ کر پیش کرتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ (ایضاً) "خدا خود جانتا ہے کہ تو واقعی اس کا رسولؐ ہے۔" لیکن اس کے بعد وہ کہتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۔ (ایضاً) لیکن خدا اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق بالکل جھوٹے ہیں۔ یہاں دیکھئے کہ یہ لوگ بات ایسی کہہ رہے ہیں جو فی الواقعہ مبنی برصداقت ہے۔ خدا خود اس کی تائید کرتا ہے کہ بات سچی ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ کہتا ہے کہ یہ کہنے والے جھوٹے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے کذب اسے کہیں گے جس میں قلب اور زبان ہم آہنگ نہ ہوں۔ دل میں کچھ اور ہو، زبان پر کچھ اور۔ انہی کو قرآن کریم منافق کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی وہ لوگ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲/۸) جن کے دل میں ایمان نہیں ہوتا محض دھوکا دینے کے لئے زبان سے ایسا کہتے ہیں۔



(۲/۹) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۔

یہ لوگ، بزعم خویش، خدا کو اور جماعت مومنین کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن درحقیقت یہ خود اپنے آپ کو، اپنی ذات کو دھوکہ دیتے ہیں، کسی اور کو نہیں۔ لیکن یہ شعوری طور پر اسے سمجھتے نہیں۔ خدا کو تو اس لئے دھوکہ نہیں دے سکتے کہ وہ ایسا علیم و خبیر ہے کہ دلوں میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانتوں تک سے بھی واقف ہوتا ہے (۴۰/۱۹) اس لئے اسے کون دھوکہ دے سکتا ہے۔ اور جماعت مومنین کو اس لئے دھوکہ نہیں دے سکتے کہ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر منافقین کی ایسی علامات بیان کی ہیں جن کی روشنی میں کوئی آنکھیں رکھنے والا ان سے دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ ذہنی طور

پر کسی کو دھوکہ دے جائیں لیکن اس کے بعد جب اِن کا ملمع اتر جائے تو دوبارہ ایسا نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ مستقل طور پر اصحابِ عقل و شعور کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اب رہا یہ کہ یہ اپنے آپ کو کس طرح دھوکہ دیتے ہیں؛ اس کے لئے قرآن کریم نے ایسی جامع اور عمیق بات کہی ہے جسے دورِ حاضر کے علم النفس (PSYCHOLOGY) کی رُو سے سمجھا جا سکتا ہے قرآن نے کہا ہے کہ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ (۲/۱۰) "ان کے دلوں میں مرض ہے۔"

نفسیاتی مریض

یہ سوال کہ انسان میں سمجھنے سوچنے (ادراک) کا مرکز کون سا ہے اور محسوس کرنے (احساسات) کا مرکز کون سا، قدیم زمانے سے زیرِ بحث چلا آ رہا ہے۔ اور (یہی کہا جائے گا کہ محققین اس باب میں اِس وقت تک کسی حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے۔ ادراک (INTELLECT) اور احساسات (FEELINGS) دو الگ الگ گوشے تصور کئے جاتے ہیں؛ اور یقینی طور پر ان کے مراکز کا تعین نہیں ہوسکا۔ کچھ عرصہ پہلے مفکرین نے (MIND) کی ایک اصطلاح وضع اور اختیار کی تھی جسے ادراک اور احساسات کا سنگم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ذرا آگے چل کر یہ معلوم ہوا کہ اس کی یہ حیثیت بھی ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس لفظ سے (MENTAL) اسم صفت (ADJECTIVE) بنایا گیا تو ایک طرف اس کا تعلق خالصتہً دماغ سے جوڑ دیا گیا۔ جیسے (MENTAL HOSPITAL) دماغی امراض کے شفاخانہ کو کہتے ہیں۔ اور دوسری طرف اس کا تعلق جذبات سے قرار دیا گیا ہے۔ جیسے (DISEASED MENTALITY) سے مراد دماغی امراض نہیں؛ نفسیاتی خلفشار ہے۔ ماہرین علم النفس نے ایک اور اصطلاح وضع کی ہے جسے (PSYCHE) کہہ کر پکارا جاتا اور اس کا ترجمہ انسانی نفس یا ذات (SELF) کیا جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک اس کا تعین بھی نہیں کیا جا سکا کہ یہ ہے کیا؟

قلب اور فؤاد

عربی زبان (اور قرآن کریم میں) اس مقصد کے لئے قَلْبٌ اور فُؤَادٌ دو الفاظ آتے ہیں۔ ان دونوں میں ایک سطحی سا امتیازی خط کھینچنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ قَلْبٌ فہم و بصیرت اور عقل و فکر کا سرچشمہ ہے، اور فُؤَادٌ جذباتِ سوز و گداز کا منبع۔ (فُؤَادٌ ۔ ف، ء، د، سے ہے۔ جس کے معنی بھوننے کے ہیں۔ یعنی تپش، خلش، سوز و گداز، درد و داغ وغیرہ) لیکن یہ بھی کوئی مستقل خطِ امتیاز نہیں ہے۔ قرآن کریم نے قلب کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ وہ تفکر اور تدبر کا سرچشمہ ہے۔ جیسے لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ (۷/۱۷۹) یا۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا (۲۲/۴۶)۔ قلوب جن سے وہ عقل و فکر کا کام نہیں لیتے؛ لیکن دوسری طرف قلب کو کہیں محلِ تسکین و اطمینان کہا گیا ہے (۱۳/۲۸) کہیں رافت و رحمت کا مہبط (۵۷/۲۷) کہیں اُسے قلبِ سلیم کہہ کر پکارا گیا ہے (۲۶/۸۹) کہیں قلبِ منیب (۵۰/۳۳) کہیں شدتِ نفس کی اثر پذیری سے پگھل جانے والا (۸/۲) اور کہیں شقاوت اور قساوت

سے پتھر کی طرح سخت ہو جانے والا۔ (۲۴/۶ ؛ ۷۴/۲)۔ دوسری طرف اس نے فؤاد کو بھی کہیں مرکزِ عقل و فکر کہہ کر پکارا ہے (۷۸/۱۶) اور کہیں سرچشمۂ جذبات۔ (مثلاً ۱۲۰/۱۱ ؛ ۲۳/۱۱ ؛ ۷/۴۳)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے قلب یا فؤاد کے متعلق متعین اور متمیز طور پر نہیں کہا کہ ان میں سے کون سا ادراک کا مرکز ہے اور کون سا جذبات کا سرچشمہ۔ لیکن اس نے منافقین کے متعلق یہی کہا ہے کہ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ (۱۰/۲) نیز (۹/۴) یہ ان کے قلوب میں مرض ہے"۔ دوسری طرف اس نے قرآنِ کریم کے متعلق کہا ہے کہ اس میں شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ (۵۷/۱۰) ہے: "سینے کے امراض کے لئے شفا"۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ قلب کے مرض سے مراد نفسیاتی خلفشار و انتشار ہے۔

عربی زبان میں مَرَضٌ کے بنیادی معنی ہیں توازن و اعتدال کا اس طرح بگڑ جانا کہ کسی قوت میں اضمحلال، ضعف، یا کمی واقع ہو جائے۔ ان تصریحات کی بنا پر فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کے معنی ہوں گے قلب و نگاہ کے توازن کا بگاڑ یا نفسیاتی کشمکش۔ اسی کو (DISEASED MENTALITY) یا ایسی (UN-BALANCED PERSONALITY) کہا جائے گا جو مختلف اقسام کے تضادات (CONTRADICTIONS) یا (COMPLEXES) یعنی کشمکش یا الجھاؤ کا شکار ہو۔ آج سے چودہ سو سال پہلے نفاق کو نفسیاتی مرض قرار دینا قرآن ہی کا اعجاز ہو سکتا تھا۔ اور

شعور

اس کے ساتھ جب یہ ٹکڑا ملایا جائے وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۹/۲) تو بات اور بھی لطیف اور عمیق ہو جاتی ہے۔ عرب، حواس کے ذریعہ کسی شے کے ادراک کو شعور کہتے تھے۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ منافقین ایک ایسے نفسیاتی مرض کا شکار ہوتے ہیں جس کی تشخیص ادراک بالحواس (SENSE PERCEPTION) سے نہیں ہو سکتی۔

عصرِ حاضر کے علم النفس (سائیکالوجی) نے انسانی نفس کو دو حصوں (یا سطحوں) میں تقسیم کیا ہے — نفسِ شعوری (CONSCIOUS MIND) اور نفسِ غیر شعوری (UN-CONSCIOUS MIND) نفسیاتی امراض کے علل و اسباب نفسِ غیر شعوری کے اُن تہ خانوں میں مدفون و مستور ہوتے ہیں جن تک انسانی شعور (یعنی ادراک بالحواس) کی نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ قرآنِ کریم نے کہا یہ ہے کہ منافق ایک ایسے نفسیاتی مرض کا مریض ہوتا ہے جس کے اسباب و علل تک اس کا شعور نہیں پہنچ سکتا۔ یہ مرض بھی نفسیاتی ہوتا ہے اور اس کا علاج بھی نفسیاتی۔ آپ غور کیجئے کہ جب قرآنِ کریم نے اپنے متعلق کہا کہ اس میں نفسیاتی امراض (لما فی الصدور) کی تشخیص اور علاج کا سامان موجود ہے، تو اس سے وہ

نفس و آفاق کی آیات

حقائق کی کن گہرائیوں تک پہنچ گیا۔ اور انسانی علم کو کس کس مستور گوشے تک پہنچنے کی دعوت دی اور تاکید کی۔ اس نے خود اپنے مضمر حقائق کے متعلق کہا ہے۔ سَنُرِيْهِمْ

اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (۴۱/۵۳) "ہم اپنی اُن نشانیوں کو، جو عالمِ انفس و آفاق میں مستور ہیں، بے نقاب کرتے چلے جائیں گے تا آنکہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آجائے"۔ عالمِ آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیاں تو وہ ہیں جو ادراک بالحواس (سائنٹیفک تحقیقات و انکشافات) کی رو سے بے نقاب ہوتی جارہی ہیں، عالمِ انفس میں مستور حقائق کے منکشف ہونے کا دور اب شروع ہوا ہے۔ جوں جوں انسان علم النفس میں آگے بڑھتا جائے گا، نہ معلوم قرآن کی کون کون سی مضمر حقیقتیں بے نقاب ہو کر سامنے آتی جائیں! اس سے ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید کے حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ علمِ انسانی جس سطح تک پہنچ چکا ہو وہ قرآن پر غور و فکر کرنیوالے کی نگاہ کے سامنے ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم پر غور و تدبر کو نہ کسی دور میں محدود کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کوئی دور یا فرد اس کا دعویٰ کر سکتا کہ قرآنِ کریم کے متعلق اس کے فکری نتائج حرفِ آخر ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اُوست

عصرہا پیچیدہ در آناتِ اُوست

الفاظ کی اس بحث کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم منطق یا فلسفہ کی کتاب نہیں جو وہ ان علوم کی اصطلاحی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں میں اُلجھے۔ اس کی زبان عربی ہے اس لئے اس کے الفاظ کے عام معانی وہی ہوتے ہیں جن معانی میں انہیں عرب استعمال کرتے تھے۔ البتہ جہاں وہ ان الفاظ کو اصطلاحات کے طور پر استعمال کرتا ہے وہاں ان کے معانی مختص ہوجاتے ہیں۔ قلب یا فوآد وغیرہ الفاظ عام معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ "نفس" کا لفظ اس کی خاص اصطلاح ہے جسے وہ اس "قوت" کے لئے استعمال کرتا ہے جو انسانی فیصلوں کا سرچشمہ ہے اور جس کی رُو سے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اس نے اپنی اس اصطلاح کو جن مفاہیم کے لئے استعمال کیا ہے ان کا ذکر آگے چل کر نفس سے متعلق بحث میں آئے گا۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ یہ قرآنِ کریم کی بڑی جامع اور منفرد اصطلاح ہے اور کسی زبان کا کوئی ایک لفظ اس کی صحیح اور کما حقہٗ ترجمانی نہیں کر سکتا۔ حتّٰی کہ دورِ حاضر کے علم النفس کی اصطلاح (PSYCHE) یا (SELF) بھی نہیں۔ ہم بھی محض سمجھانے کی خاطر اس کے لئے ذات، یا خودی یا آنا وغیرہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآنی اصطلاح "نفس" کا بدل یا مرادف یہ الفاظ بھی نہیں ہو سکتے۔

منافقین کے متعلق ان بنیادی اور تمہیدی تصریحات کے بعد، ان کی، ان مابہ الامتیاز علامات کا دیکھ لینا ضروری ہے جنہیں قرآنِ کریم خصوصیت سے بیان کرتا ہے۔ ان کی یہ خصوصیات قرآنِ کریم میں اس کثرت سے بیان ہوئی ہیں کہ کسی ایک مقام پر ان سب کا احاطہ مشکل ہے۔ اس جگہ ہم ان میں سے چند ایک نمایاں خصوصیات کو پیش کرتے ہیں۔

منافقین کا کفر

زیرِ نظر آیت (۲/۸) میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں لیکن وہ مومن نہیں یعنی اُن کے دل میں کفر ہے اور زبان پر ایمان کے الفاظ۔ اور یہ کچھ وہ از رہِ فریب ہی کرتے ہیں۔ دوسرے مقامات پر قرآنِ کریم نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ۔ (۵/۴۱)۔ "یہ لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ے آئے لیکن ان کا دل ایمان نہیں لایا"۔ یہی الفاظ (۳/۱۶۶) میں بھی دہرائے گئے ہیں، اور دونوں جگہ کہا یہ ہے کہ وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر سے زیادہ قریب ہیں۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ ہیں تو درحقیقت کافر ہی، لیکن زبان سے مومن بنتے ہیں۔ سورۃ مائدہ میں ہے۔ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ۔ (۵/۶۱)۔ "جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ے آئے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ آتے بھی ہیں تو کفر کو ساتھ لئے ہوئے۔ اور یہاں سے واپس بھی جاتے ہیں تو کفر ہی کے ساتھ۔ لیکن یہ کفر دل میں چھپائے رکھتے ہیں۔ ان سے کہیے کہ خدا تو تمہارے پوشیدہ رازوں تک سے واقف ہے۔ اس لئے تم اس سے کونسی بات چھپا سکتے ہو"۔ اِن کے اسی کفرِ مستور کی وجہ سے انہیں "کفار کے بھائی" کہا گیا ہے (۹/۶۷) اور حضورؐ سے کہا گیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ (۹/۷۳)۔ "اے نبیؐ! جس طرح تمہیں کفار کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے کہا گیا ہے اُسی طرح منافقین کے ساتھ بھی جنگ کرو اور ان سے کسی نرمی کا برتاؤ نہ کرو"۔ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ (۶۶/۹)

سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۲/۱۴)۔ جب یہ لوگ مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، لیکن جب چوری چھپے اپنے سرغنوں سے ملتے ہیں تو انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم جو ان لوگوں سے ملتے ہیں تو اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم اُن کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ ہم درحقیقت تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ ان لوگوں سے تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں"۔

ان پر کسی کو بھی اعتماد نہیں ہوتا

اس مقام سے یوں ہی آگے نہیں بڑھ جانا چاہیئے۔ قرآنِ کریم نے یہاں ایک بڑی گہری بات کہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انہیں اس کی ضرورت کیوں پڑتی تھی کہ وہ اپنے لوگوں کو اس کا یقین دلائیں کہ ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے اپنے لوگوں کو بھی ان پر کامل اعتماد نہیں تھا۔ اور منافقت میں ہوتا ہی یہ ہے۔ منافقت کی روش کا آغاز تو مصلحتاً ہی ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس سے انسان کا کردار ہی ایسا بن جاتا ہے کہ اس پر بھروسہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جو لوگ

ناواقفیت سے ان کے دامِ فریب میں گرفتار ہو جائیں' وہ تو ان سے دھوکہ کھا جاتے ہیں لیکن جو لوگ جانتے ہوں کہ یہ منافقت برتتے ہیں وہ انہیں قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے، خواہ وہ خود انہی میں سے کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ان کے ان کے متعلق کہا ہے کہ مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (۴/۱۴۳)۔ "یہ لوگ (منافق) دل سے نہ اِن کے ساتھ ہوتے ہیں نہ اُن کے ساتھ۔ یہ ان دونوں کے بین بین، مکھی کی طرح اڑتے رہتے ہیں کہ جدھر شیرینی نظر آئے اُدھر ہی جا بیٹھیں۔ پھر ان کا کسی ایک طرف جا بیٹھنا بھی مستقل نہیں ہوتا، اپنے مفاد ہی کی خاطر ہوتا ہے۔ اگر اس کے بعد مفاد کی کشش دوسری جانب ہو تو یہ اُڑ کر اُدھر چلے جاتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ مومن تو ایک طرف خود کفار بھی انہیں قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا أَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۔ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (۲/۷۶) "جب یہ لوگ جماعتِ مومنین سے ملتے ہیں تو اپنے آپ کو ایماندار ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن جب اپنے لوگوں سے تنہائی میں ملتے ہیں، تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ اپنی پارٹی کی مصلحت کی خاطر ان لوگوں سے ملنا تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں اس کی سخت احتیاط برتنی چاہیئے کہ ان سے اپنی کتابوں کی وہ باتیں نہ کہہ دی جائیں جنہیں یہ ہمارے خلاف بطور حجت پیش کر کے ہمارا منہ بند کر سکیں۔ تمہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے" بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان پر کامل بھروسہ ان کی اپنی پارٹی کے لوگوں کو بھی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بار بار تاکید کرنی پڑتی ہے کہ میاں! وہاں جاتے ہو تو بڑی احتیاط سے کام لینا۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے، منافقت سے انسان کی ایسی نفسیاتی کیفیت ہو جاتی ہے کہ اس کی کوئی بات بھی قابلِ اعتماد نہیں رہتی۔ مخالفین میں تو ان کا اعتماد پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ خود اپنوں کی نگاہوں میں بھی وہ پورے پورے بھروسہ کے قابل نہیں رہتے۔

تخریبی ذہنیت

اپنوں میں ان کی کیفیت کچھ ہی کیوں نہ ہو' حقیقت یہ ہے کہ مخالفین کی جس جماعت میں وہ منافقانہ طور پر شامل ہو جاتے ہیں' ان کی تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ وَإِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ۔ (۳/۱۱۸) "جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ لیکن جب تم سے الگ ہو کر اپنی خلوت گاہوں میں بیٹھتے ہیں تو تمہارے خلاف حسد اور غصہ کے جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ وہ پاگلوں کی طرح اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں" قرآن کریم نے ان کی اس کیفیت پر صرف اتنا تبصرہ کیا ہے۔ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۔ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳/۱۱۸) "ان سے کہہ دو کہ تم اپنے غصہ کی آگ میں جل کر بھسم ہو جاؤ۔ خدا جانتا ہے کہ تمہارے سینے میں کیا ہے"۔ سورۂ نساء

میں ہے:۔

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۚ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِىْ تَقُوْلُ ۔ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۔ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ ۔ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۴/۸۱)

"یہ تم سے ملتے ہیں تو تمہیں اپنی بھرپور حمایت اور اطاعت کا یقین دلاتے ہیں لیکن جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو جو کچھ تم نے طے کیا ہوتا ہے، راتوں کی تنہائیوں میں اُس کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ سمجھتے یہ ہیں کہ یہاں کون دیکھنے سننے والا ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ان کی ایک ایک بات کو لکھتا جاتا ہے"۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ (جماعتِ مومنین سے) کہتا ہے کہ "تم ان کی اِن سازشوں سے پریشان مت ہو۔ ان سے اعراض برتو اور قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر کامل بھروسہ رکھو۔ یہ اعتماد اور بھروسہ تمہاری کامیابی کے لئے کافی ہوگا"۔ سورۃ توبہ میں ہے۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ۔ (۹/۶۵) "اگر کہیں اِن کی منافقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور جماعتِ مومنین کے افراد ان سے پوچھتے ہیں کہ تم یہ کس قسم کی باتیں کرتے ہو تو یہ اُن سے کہتے ہیں کہ ہماری اِن باتوں کو (SERIOUSLY) مت لیا کرو۔ ہم تو یونہی ہنسی مذاق میں اِس قسم کی باتیں کر دیتے ہیں"۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ جماعتِ مومنین سے کہتا ہے کہ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (۹/۶۵)۔ "تم ان سے کہو کہ تم ہنسی مذاق کی باتیں کن کے متعلق کرتے ہو؟ خدا اور اُس کے قوانین اور اُس کے رسولؐ کے متعلق؟ تمہیں ایسا کہتے وقت شرم نہیں آتی؟ یہ تو وہ ادب گاہیں ہیں، جہاں ہر قلبِ سلیم رکھنے والے کا سر، انتہائی احترام اور تکریم سے جھک جانا چاہیئے۔ اُس کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آنا چاہیئے کہ یہاں کوئی بات مزاحًا کہی جا سکتی ہے۔ تم ان مقامات پر ہنسی اور مذاق کی باتیں کرتے ہو اور اس کا اعتراف کرنے میں بھی کوئی جھجک و ندامت محسوس نہیں کرتے؛ تم کس قسم کے مدعیٔ ایمان ہو؟"

سوال یہ ہے کہ لوگ اس قسم کی منافقانہ روش کیوں اختیار کرتے ہیں؟ بنیادی طور پر تو قرآنِ کریم نے ان کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (۴/۸۹)۔ "یہ چاہتے ہیں کہ جس قسم کے کافر یہ خود ہیں تم بھی اسی طرح کے کافرین بن جاؤ تاکہ یہ اور تم ایک جیسے ہو جاؤ"۔ اس کے لئے ان کی سازش یہ ہے کہ اٰمِنُوْا بِالَّذِىْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۳/۷۱)۔

سازشیں اور سرگوشیاں

"تم صبح کے وقت اپنے ایمان کا اعلان کر کے ان لوگوں میں جا ملو۔ دن بھر ان میں خلا ملا رکھو۔ وہاں ایسی باتیں کرو جن سے ان میں کے سادہ لوح لوگوں کے دل میں

شکوک و شبہات ابھریں۔ شام کو تم اپنے کفر کو ساتھ لئے ہوئے باہر نکلو تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ بھی اپنے سابقہ کافرانہ مسلک کی طرف پلٹ آئیں "۔ آپ نے دیکھا کہ ان کی چالیں کس قدر گہری ہوتی ہیں۔ جہاں تک ان کی باتوں کا تعلق ہے قرآن کہتا ہے کہ وہ بڑی پُرکشش اور حیرت افزا ہوتی ہیں۔ پھر وہ بات بات میں، خدا کی قسمیں کھا کر سامعین کے دلوں میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ (۲/۲۰۴)۔ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ۔ (۹/۸)۔ "جو کچھ تم کہو وہ اس سے متفق ہوتے چلے جائیں گے حالانکہ ان کا دل ان سے ابا کر رہا ہوگا"۔ جماعت کے اندر رہتے ہوئے ان کا مقصد اس قسم کی وسوسہ انگیزی (WHISPERING COMPAIGN) ہوتا ہے جس سے تمہاری پارٹی میں فتنے بیدار ہو جائیں۔ (۹/۴۸) پارٹی کے وہ مخلص افراد جو بطیب خاطر مالی قربانی کرتے ہیں، ان کے متعلق یہ (منافقین) سرگوشیاں کریں گے کہ یہ محض دکھانے کی خاطر اور جماعت میں امتیازی پوزیشن حاصل کرنے کے لئے پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ باقی رہے جماعت کے وہ غریب افراد، جو مالی امداد دینے کی استطاعت نہیں رکھتے، صرف اپنی بدنی خدمات پیش کرتے ہیں، یہ ان کی ہنسی اڑاتے ہیں کہ انہیں دیکھو! یہ سوت کی انٹی لاکر یوسف کے خریداروں میں اپنا نام لکھوانا چاہتے ہیں (۹/۷۹)۔ اس طرح، یہ جماعت کے اندر انتشار پیدا کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ لوگوں سے یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا (۶۳/۷)۔ "تم اس رسولؐ کو عطیات (چندہ) دینا بند کر دو۔ جب اس کے پاس پیسے نہیں رہیں گے تو جو لوگ اس کے اردگرد جمع ہو رہے ہیں، خود بخود اس کا ساتھ چھوڑ جائیں گے"۔

ان منافقین کی خباثت نفس یہیں تک محدود نہیں رہی تھی۔ ان کا دست دنارت اس عتبۂ عالیہ تک پہنچنے سے بھی نہیں شرمایا تھا جس پر دنیا کے عظیم ترین سربلندوں کی گردنیں بصد احترام جھکتی تھیں اور اس میں انتہائی شرف اور فخر محسوس کرتی تھیں۔ سورۃ توبہ میں ہے۔

ذاتِ رسالتمآبؐ کے خلاف الزام تراشیاں

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ (۹/۵۸)۔ "اے رسولؐ! ان میں ایسے خبیث النفس بھی ہیں جو عطیات کی تقسیم کے بارے میں تمہارے خلاف الزام تراشیوں سے بھی نہیں چوکتے۔ اگر تم انہیں اتنا دیدو جس سے یہ خوش ہو جائیں تو حوالمراد۔ اگر اتنا نہ دو تو ان کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور یہ تمہارے خلاف طرح طرح کے الزامات گھڑتے اور پھیلاتے رہتے ہیں"۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نظام خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے انفاق فی سبیل اللہ بنیادی شرط ہے۔ اور انفاق کو "فی سبیل اللہ" اسی وقت کہا جائے گا جب دینے والا دل کی کامل رضامندی سے دے اور اس کا مقصد

لِوَجْهِ اللّٰهِ کے سوا کچھ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ منافقین کی کیفیت کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اپنی منافقت کے پردے کو چاک ہونے سے بچانے کی خاطر انہیں کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ تشکیلِ جماعت کے ابتدائی ایام میں جب ہنوز اسلام کا معاشی نظام قائم نہیں ہوا تھا اور انفرادی طور پر ایک دوسرے کی مدد کی جاتی تھی۔ ان لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ اگر کبھی مارے بندھے، کسی کو کچھ دینا پڑتا تھا تو اس کے بعد احسان جتا جتا کر اُس بیچارے کی جان عذاب میں کر دیتے تھے۔ یہی تھے وہ لوگ جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۔ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ ۔ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ ۔ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۔ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (۲/۲۶۴)

" اے جماعتِ مومنین! تم ایسا کبھی نہ کرنا کہ کسی کی مدد کر کے اسے احسان جتاؤ اور اس طرح اسے قلبی اذیت پہنچاؤ۔

ریاکاری

اس تمہارا کیا کرایا سب رائیگاں چلا جائے گا۔ ایسا کچھ تو وہی شخص کر سکتا ہے جس کا نہ خدا پر ایمان ہو نہ آخرت پر یقین۔ لیکن اس خیال سے کہ ہمیں نے انہی لوگوں میں رہنا ہے، اس لئے ان سے بنا کر رکھنا ضروری ہے، وہ ریاکاری سے کچھ دے دیتا ہے۔ اس قسم کے نفاق کی مثال یوں سمجھو جیسے کسی سخت چٹان پر یونہی ذرا سی مٹی کی تہ جم جائے اور یوں دکھائی دے کہ وہ بڑی عمدہ زمین ہے جس میں اچھی کھیتی اُگے گی۔ لیکن جب اس پر بارش کا ایک تیز سا چھینٹا پڑے تو سب مٹی بہہ جائے اور نیچے چٹان کی چٹان باقی رہ جائے۔ اس طرح ایک دانے سے سینکڑوں دانے حاصل ہونا تو درکنار، فصل کے کاشت کرنے میں جو محنت صرف ہوئی تھی، اور جو بیج ڈالا گیا تھا، وہ بھی اکارت چلا جائیگا۔ یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان نہ رکھیں اور محض لوگوں کے دکھاوے کے لئے نیک کام کریں، ان پر فلاح و سعادت کی راہیں کبھی کشادہ نہیں ہوتیں۔"

یہ لوگ انفاق میں ہی ریاکاری سے کام نہیں لیتے تھے، صلوٰۃ کے اجتماعات تک میں بھی اسی مقصد کو لئے ہوئے شریک ہوتے تھے۔ سورۃ نساء میں ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۔ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۔ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ (۴/۱۴۲) "یہ منافقین بزعمِ خویش خدا کو دھوکا دیتے ہیں لیکن درحقیقت یہ خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ جب وہ صلوٰۃ کے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں تو مارے بندھے۔ ریاکاری اس میں زیادہ ہوتی ہے اور ذکرِ خداوندی بہت کم۔ لہٰذا ان کی ان نمازوں سے کچھ حاصل نہیں

ہوتا"۔ [مزید تفصیل کے لئے دیکھئے آیت (۲/۳) میں عنوان صلوٰۃ]

صلوٰۃ کے اجتماعات ہی نہیں وہ جنگوں تک میں اسلامی لشکر کے ہمراہ شامل ہو جاتے تھے۔ لیکن وہاں جا کر اس قسم کی سازشیں کرتے، افواہیں پھیلاتے اور وساوس پیدا کرتے کہ لوگ ہمت ہار کر میدانِ جنگ سے بھاگ اٹھیں (۳/۱۵۳)۔ سورہ توبہ میں ان کی اس قسم کی سازشوں کا تذکرہ بڑی شرح و بسط سے آیا ہے۔ اس کا بڑے گہرے غور و فکر سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بعد کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو جس قدر نقصان منافقین نے پہنچایا ہے، کھلے مخالفین کے ہاتھوں اسکا عشرِ عشیر تک بھی نہیں پہنچا۔ قرآن کریم نے ان کا اس تفصیل سے ذکر ہی اس لئے کیا ہے کہ ہم اس باب میں محتاط رہیں۔

ایمان نام ہے عبودیتِ خداوندی کا، یعنی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر معاملہ میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت۔ اس اطاعت میں

منافقین کی عبودیت

مصلحت کوشیوں اور مفاد پرستیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن منافقین اس قسم کی اطاعت کبھی اختیار نہیں کرتے۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ۔ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۔ (۲۲/۱۱)

"تم ایسے لوگوں کو بھی دیکھو گے کہ وہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں تو اس طرح گویا کنارے پر بیٹھے ہیں یعنی کفر اور ایمان کی حدِ فاصل پر۔ اگر وہ دیکھیں کہ قانونِ خداوندی کی اطاعت میں فائدہ ہے تو اُسے اختیار کر لیتے ہیں اور اگر دیکھیں کہ اس میں کچھ نقصان ہوتا ہے تو جھٹ اپنا رخ پلٹ کر دوسری طرف چلے جاتے ہیں"۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ "یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس روش سے انہیں فائدہ ہی فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن اگر یہ ذرا بہ نگاہِ تعمق دیکھیں تو انہیں نظر آجائے کہ اس سے دنیا میں بھی نقصان ہوتا ہے اور آخرت میں بھی نقصان۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے واضح تر نقصان اور کونسا ہو سکتا ہے؟"

قرآن کریم نے یہ کہہ کر کفر اور ایمان میں خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔ "جو شخص متنازعہ فیہ امور کے فیصلے کتابِ خداوندی کے مطابق نہیں کرتا یا کراتا تو ایسے ہی لوگوں کو کافر کہا جاتا ہے"۔ اسی کی تشریح کرتے ہوئے اس نے دوسری جگہ ان واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۴/۶۵)۔ "اے رسولؐ! تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اپنے اختلافی معاملات میں تجھے اپنا حکم تسلیم نہ کریں اور جو فیصلہ تو دیدے

اس سے اطاعت سرکشی برتنا تو ایک طرف، اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہ کریں اور بطیب خاطر اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں"۔ یہ ہے مومن ہونے کی بنیادی شرط۔ اس کے برعکس منافقین کے متعلق کہا کہ:-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ ۔ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ۔ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا - (۴/۶۰)

"کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا؛ جو بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس قرآن اور جو کچھ سابقہ انبیاء پر نازل کیا گیا تھا، اس پر ایمان رکھتے ہیں اور عملاً یہ حالت ہے کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خداوندی عدالتوں اور ضابطوں کی رو سے کراتے ہیں۔ حالانکہ انہیں حکم دے دیا گیا تھا کہ ان سے کفر اختیار کریں۔ ہم نے تو انہیں یہ کہا تھا لیکن ابلیسی قوتیں چاہتی ہیں کہ وہ سیدھے راستے سے کہیں دور نکل جائیں"۔ اس کے بعد کہا۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (۴/۶۱) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم کتاب خداوندی کے مطابق فیصلے کرانے کے لئے اس رسولؐ کی عدالت کی طرف رجوع کرو تو تم منافقین کو دیکھو گے کہ وہ اس سے دور بھاگیں گے"۔

تحاکم الی الطاغوت

آپ نے غور فرمایا کہ منافقت کیا ہے؛ زبان سے مسلمان ہونے کا دعویٰ اور عملاً اپنے معاملات کے فیصلے غیر خداوندی قوانین .... کی رو سے کرنا۔ اس کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں، یہ تو خیر ایک ضمنی سوال تھا۔ اس سے بھی گہرا غور و تدبر کا مقام اب سامنے آتا ہے۔

تفرقہ انگیزی

اسلام کا، بحیثیت الدین — نظام زندگی — قیام اور وحدت امت لازم و ملزوم ہیں یعنی اگر امت کی وحدت باقی نہ رہے، وہ فرقوں یا پارٹیوں میں بٹ جائے، تو اسلام الدین نہیں رہتا، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بنابریں مخالفین کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ امت میں تفرقہ پیدا ہو جائے۔ کافر یعنی کھلے دشمن، تو اس باب میں بمشکل کامیاب ہوتے ہیں لیکن منافقین کی سازشیں اکثر و بیشتر کارگر ہو جاتی ہیں۔ یہ لوگ اس قسم کا تفرقہ، مذہب کا نقاب اوڑھ کر پیدا کرتے ہیں۔ منافقین نے اس قسم کی سازش خود نبی اکرمؐ کی موجودگی میں بھی کی تھی۔ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کر ڈالی۔ وہ یہ کچھ مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے کر رہے تھے لیکن نظر آتا ہے کہ فریب کا پردہ اتنا دبیز تھا کہ کوئی اس سازش کا بھانپ نہ سکا اور انہوں نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ حتیٰ کہ خود خدا کو یہ پردہ اٹھانا پڑا اور اس نے وحی کے ذریعہ بتایا:-

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۔ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۹/۱۰۷)

"ان منافقین میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی چالوں میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کر ڈالی ہے اور اس طرح یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ بڑے پکے مومن اور نظامِ خداوندی کے خدمت گزار ہیں۔ لیکن اس مسجد سے درحقیقت ان کی غرض یہ تھی کہ اس سے اس نظام کو نقصان پہنچایا جائے اور کفر کی راہیں کشادہ کی جائیں یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا جائے، اور اس طرح یہ مسجد ان لوگوں کے لئے کمین گاہ بن جائے جو پہلے سے نظامِ خداوندی کے خلاف مصروفِ کار ہے۔ یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے اس مسجد کو بڑی نیک نیتی سے تعمیر کیا ہے۔ لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ بڑے جھوٹے ہیں"

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۔ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۔ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۔ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۔ (۹/۱۰۸)

"اے رسولؐ! تم اس مسجد میں قدم تک نہ رکھنا۔ جو مسجد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرے، کیا وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ تم اس میں اپنا قدم تک بھی رکھو۔ تمہارا، نہ ان لوگوں سے کچھ واسطہ ہو سکتا ہے نہ ان کی تعمیر کردہ مسجد سے کوئی تعلق (۶/۱۶۰) اس کی مستحق وہ مسجد ہے جس کی بنیاد پہلے دن سے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے اصولِ محکم پر رکھی گئی ہے۔ اس میں وہی لوگ آتے جاتے ہیں جو فرقہ بندی کے شرک کی آلودگی سے پاک اور صاف رہتے ہیں۔ (۳۰/۳۲)۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی کی رو سے بنگاہِ پسندیدگی دیکھے جاتے ہیں۔"

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ ۔ فَانْهَارَ بِهٖ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ ۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۹/۱۰۹)

"ان سے پوچھو کہ کیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت اور منشائے خداوندی سے ہم آہنگی پر رکھی ہو، بہتر ہے یا وہ شخص جس نے یہ بنیاد ریت کے ایسے تودوں کے کنارے پر رکھی ہو جو کٹ کٹ کر دریا میں گرتے چلے جا رہے ہوں اور اس طرح وہ عمارت اپنے بانی کو ساتھ لے کر جہنم کے گڑھے میں جا گرے حقیقت

یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں ان پر زندگی کی کامرانیوں کی راہ کبھی کشادہ نہیں ہو سکتی؟"

اور اس کے بعد قرآنِ کریم نے اس جہنم کی کیفیت جس کے شعلے ان منافقین کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے، ان الفاظ میں بیان کی کہ

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۔ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۹/۱۱۰)

"یاد رکھو! ان کی یہ عمارت جو انہوں نے اس تخریبی مقصد کے لئے بنائی ہے۔ ان کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی۔ اس سے ان کے دل کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا چلا جائے گا۔ ان کے غصہ اور حسد کی آگ میں کمی نہیں ہوگی تاکہ ان کے دل شدتِ اضطراب سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ ان سے کہہ دو کہ خدا کی یہ باتیں یونہی دھمکی نہیں، علم و حکمت پر مبنی حقائق ہیں جو واقع ہو کر رہیں گے۔"

ہم نے اس واقعہ کو پوری قرآنی تفصیل کے ساتھ بیان کرنا اس لئے بھی ضروری سمجھا ہے کہ یہ محض چودہ سو سال پہلے کے واقعہ کا ایک تذکرہ نہیں۔ اس میں خود ہماری اپنی سرگزشت بھی پوشیدہ ہے۔ مساجد کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا، وَ

ہماری مسجدیں!

أَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ أَحَدًا (۷۲/۱۸)۔ "یہ حقیقت ہے کہ مساجد صرف اللہ کے لئے ہونی چاہئیں۔ اس لئے تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔ نہ انہیں خدا کے سوا کسی اور سے منسوب کرو اور نہ انہیں نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے سوا کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرو۔" آپ مساجد کے اس بنیادی مقصد اور اللہ تعالیٰ کی اس تاکید کو سامنے رکھیے اور اس کے ساتھ مسجدِ ضرار پر بھی اپنی نگاہ مرکوز کیجئے اور پھر آنکھوں کے سامنے لائیے ساری دنیا میں پھیلی ہوئی مساجد کو۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ مساجد کسی نہ کسی فرقہ کی طرف منسوب ہیں۔ خالص اللہ کے لئے ان میں (شاید) کوئی مسجد بھی نہ ہو۔ اور جو مسجد مسلمانوں میں فرقہ بندی کی مظہر ہو وہ قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق، مسجدِ ضرار ہے، کفر کی آماجگاہ ہے، اور خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ کرنے والوں کے لئے کمین گاہ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

امت میں تفرقہ پیدا کرنے کے علاوہ قرآنِ کریم نے منافقین کا ایک اور جرم بھی نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ اور اس میں بھی ہمارے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں پوشیدہ ہیں۔ سورۃ احزاب میں پہلے ازواج و بناتِ رسول اللہ اور دیگر مسلمان عورتوں سے کہا کہ وہ باہر نکلا کریں تو اپنے اوپر سے چادر اوڑھ لیا کریں۔ ذٰلِكَ أَدْنٰى أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (۳۳/۵۹)۔ "اس سے یہ پہچانی جائیں گی کہ یہ شریف زادیاں ہیں۔ اور منافقین کو یہ کہنے کا موقعہ نہیں ملے گا کہ

ہم نے غلط فہمی سے ان سے چھیڑ چھاڑ کی ہے"۔ اس کے بعد ہے:۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا مَّلْعُوْنِيْنَ . اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۔ (۳۳/۶۰-۶۱)

"تم اتنی احتیاط برتو، اگر اس کے بعد بھی منافقین، یعنی وہ لوگ جن کے دل میں خباثتیں بھری ہوئی ہیں اور جن کا کام ہی معاشرہ میں شرانگیز خبریں پھیلانا ہے اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے، تو ان کے خلاف قوت کا استعمال کرنا پڑے گا تا آنکہ یہ یہاں سے دور ہو جائیں۔ اس

شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ

جرم کی پاداش میں انہیں ان تمام مراعات سے محروم کر دیا جائے گا جو انہیں اسلامی مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ اگر یہ اس پر بھی اپنی سرکشی سے باز نہیں آئیں گے تو یہ جہاں کہیں بھی ہوں انہیں گرفتار کیا جائے گا اور قتل کی سزا دی جائیگی"۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم کی رو سے شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا اور ان کے خلاف افواہیں پھیلانا، اور اس طرح انہیں اذیت پہنچانا، کتنا بڑا سنگین جرم ہے — وہ جرم جس کی آخری سزا قتل بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے اگلی آیت میں کہا گیا سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۳۳/۶۲)۔ "یہ کوئی وقتی یا ہنگامی حکم نہیں۔ یہ تو خدا کا وہ قانون ہے جو اس سے پہلے بھی الدین کے معاشرہ میں نافذ العمل رہا ہے۔ اس حکم میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی"۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قرآنِ کریم کی رو سے عورت کا مقام کتنا بلند اور اس کا احترام کس قدر ضروری ہے۔

یہ ہیں منافقین کی سازشوں، فتنہ سامانیوں، شرانگیزیوں اور فرقہ سازیوں کی چند ایک مثالیں جنہیں اس مقام پر بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تفصیلات، قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر بااصرار و تکرار آئی ہیں۔ ان کی تشریح وہاں کی جائے گی۔

(جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآنِ کریم نے رسول اللہ سے تاکیداً کہا تھا کہ منافقین کے خلاف بھی اسی طرح جنگ کرو جس طرح کفار کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ اس نے اپنے مستمر انداز کے مطابق کہا کہ اگر یہ لوگ اپنی مخالفانہ روش سے باز آ جائیں تو یہ ان کے لئے بہتر ہو گا۔ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ۔ (۹/۷۴)۔ "لیکن اگر یہ اس سے پھر جائیں تو پھر اللہ انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں الم انگیز عذاب دے گا اور ان کا کوئی والی وارث اور حمایتی ایسا نہیں ہو گا جو انہیں اس سزا سے بچا لے"۔ دوسری

جگہ کہا کہ یہ اپنی ان چالوں سے کچھ دنیاوی مفاد تو حاصل کرلیں گے لیکن یہی مال و دولت ان کے لئے عذاب کا موجب بن جائے گا کیونکہ یہ انہیں اس فریب میں مبتلا رکھے گا کہ تمہاری روش بڑی کامیاب ہے، تم اس پر قائم رہو۔ ان کی اسی روش کی بنا پر رسول اللہ سے کہا گیا۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۔ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (۹/۸۰)۔ "یہ اس سزا سے بچنے کے لئے ہزار بار بھی تمہارے پاس آئیں تو تم ان کا استغفار نہ کرو۔ قانونِ خداوندی میں ایسے لوگوں کے لئے سزا سے محفوظ رہنے کی کوئی گنجائش نہیں"۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۔ (۹/۸۰)۔ "یہ اس لئے کہ ایمان، اطاعت، توبہ اور استغفار کی باتیں محض ان کی زبان پر ہیں۔ ان کے دل میں خدا اور رسول کے خلاف انکار و سرکشی کے جذبات بدستور موجزن رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حفاظت طلبی (استغفار) کیا معنی رکھتی ہے"۔ دوسرے مقام پر حضور کو مخاطب کرکے، جماعت مومنین کو بالواسطہ کہا گیا کہ کفار اور منافقین کی اطاعت مت کرنا۔ اتباع صرف وحیٔ خداوندی کا کرنا اور اس کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ رکھنا (۳۳/۱-۳، ۴۸)۔

قطعِ تعلق

ان کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ ان سے تمام معاشرتی تعلقات منقطع کرلو۔ معاشرتی تعلقات میں جنازہ وغیرہ میں شرکت حرفِ آخر ہوتی ہے۔ انہیں اس سے بھی باز رہنے کی تاکید کی گئی۔ یہاں پھر بوساطتِ نبی اکرم، کہا گیا کہ وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۔ (۹/۸۴)۔ "تم نہ ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کرو اور نہ ہی ان کی موت پر نیک آرزوؤں کا اظہار کرو"۔ اور اس کی وجہ پھر وہی بتائی گئی کہ یہ کفر کو لئے ہوئے دنیا سے گئے ہیں۔ اس لئے جب کفار کے ساتھ اِس قسم کے تعلقات روا نہیں رکھے جاسکتے، تو منافقین کے ساتھ کیسے روا رکھے جاسکتے ہیں؟ ان کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے کی تاکید کو قرآن اگلی دنیا تک بھی لے گیا ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ
نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ
بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ ۔ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۔ (۵۷/۱۳)

"یہ لوگ جو آج تمہارے ساتھ منافقت برت رہے ہیں، یعنی بظاہر تمہارے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں لیکن درحقیقت تم سے الگ ہیں۔ قیامت میں تم سے کہیں گے کہ ذرا ٹھہرو! ہم بھی تمہاری اس روشنی سے اکتسابِ ضیا کرلیں (یعنی کچھ فائدہ اٹھائیں)۔ تو ان سے کہا جائیگا کہ (یہ روشنی دوسروں سے مانگے نہیں ملا کرتی! یہ شمع تو اپنے اپنے اعمال کے تیل ہی سے روشن ہوا کرتی ہے، اس لئے تم اگر جاسکتے ہو تو) پچھلی زندگی کی طرف لوٹ جاؤ اور وہیں سے اِس روشنی کو تلاش کرو (اس لئے کہ یہ روشنی ان اعمال کا نتیجہ ہے جو دنیاوی زندگی

اُخروی زندگی میں

ہیں سرزد ہوتے تھے اور چونکہ دنیاوی زندگی کی طرف کوئی لوٹ نہیں سکتا اس لئے انہیں کہیں سے روشنی نہیں مل سکے گی۔ جس کا دیا اس زندگی میں بجھ گیا وہ اُس زندگی میں بھی تاریکیوں ہی میں رہیگا۔ (۵۷/۱۳)۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر کی طرف (جہاں وہ لوگ ہونگے جن کے دلوں میں ایمان تھا) رحمت ہی رحمت ہوگی اور باہر کی طرف (جہاں ریاکار منافقین ہوں گے) عذاب ہی عذاب ہوگا۔ (ایمان اور منافقت میں ظاہراً بُعد تو ایک اوٹ ہی کا ہوتا ہے، لیکن نتائج کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں)۔ اس سے آگے ہے۔

يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ (۵۷/۱۴)

"وہ منافقین، اِن مومنین کو آوازیں دے دے کر بلائیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوا کرتے تھے جواب تم ہم سے الگ ہو رہے ہو؟ وہ کہیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ظاہری طور پر تم ہمارے ساتھ ہوا کرتے تھے، لیکن تم نے اپنے آپ کو دھوکا میں رکھا تھا۔ تم صرف کنارے پر کھڑے اس انتظار میں رہتے تھے کہ دیکھیں پلڑا کس طرف جھکتا ہے تاکہ اُسی طرف تم بھی ہو جاؤ۔ تم نظامِ خداوندی کی صداقت کے بارے میں ہمیشہ شکوک اور اضطراب میں رہتے تھے۔ تمہاری انفرادی مفاد پرستیاں تمہیں طرح طرح کے فریب دیا کرتی تھیں۔ تم اس کشمکش اور دھوکا میں رہے تاآنکہ قانونِ خداوندی کی رُو سے فیصلہ کی گھڑی آپہنچی۔ فریب کے پردے اُٹھ گئے۔ جس کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی کہ تم ہم میں سے نہیں تھے۔"

اِس کے بعد کہا۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ۔ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ (۵۷/۱۵)

"پھر تم نے اپنے آپ کو اس فریب میں بھی رکھا کہ اگر خدا کے ہاں گرفت ہوئی تو ہم کچھ دے دلا کر چھوٹ جائیں گے۔ اب تم دیکھو کہ اس عذاب سے نہ تم ہی فدیہ دے کر چھوٹ سکو گے اور نہ وہ کفار جن میں تم درحقیقت شامل تھے۔ تم سب کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہی تمہارا کارساز و کارفرما ہے۔ اب تم دیکھ لو کہ تمہاری منافقانہ روش کا انجام کس قدر بُرا ہے!"

قرآنِ کریم نے ویسے تو یہ کہا ہے کہ منافقین اور کفار دونوں کو جہنم میں یکجا کر دیا جائے گا (۴/۱۴۰)۔ لیکن اس کے

ساتھ ہی اس نے اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ (۴/۱۴۵) "منافق جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں ہوں گے"۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن نے دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ کفر، کفار اور منافقین۔ کفر دونوں میں قدر مشترک ہوتا ہے۔ لیکن کفار اس کا کھلے بندوں اقرار کرتے ہیں اور منافق جھوٹ بولتے ہیں۔ جھوٹ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے انسان کو دس جھوٹ اور بولنے پڑتے ہیں۔ اب آپ سوچئے کہ جو شخص زندگی کے ہر قدم پر جھوٹ سے کام لے اس کی زندگی کس قدر عذابِ مسلسل اور الم پیہم میں گزرے گی۔ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہے گا کہ کہیں میرا جھوٹ کھل کر سامنے نہ آجائے۔ یہی وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ منافق بڑا بُزدل ہوتا ہے۔ سورہ توبہ میں ہے کہ یہ منافق قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم ہی میں سے ہیں۔ لیکن وہ تم میں سے نہیں ہیں۔ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ (۹/۵۶) "یہ بے حد بزدل ہیں" اس لئے اپنے دل کی بات دھڑتے سے زبان پر لاتے سے ڈرتے ہیں" ان کی کیفیت یہ ہے کہ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ۔ (۹/۵۷) "اگر انہیں کہیں پناہ گاہ مل جاتے یا کوئی غار، یا کسی قسم کا اور چھپنے کا مقام نظر آجائے تو یہ تمہارا ساتھ چھوڑ کر اس کی طرف یوں لپک کر چلے جائیں جیسے کوئی جانور رسہ تڑوا کر بھاگ رہا ہو" قرآنِ کریم نے ان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ (۶۳/۴) "تو ان کے قد وقامت، طبیعی پیکر، وضع قطع اور تراش خراش کو دیکھے تو وہ بڑی تعجب انگیز اور خوش آیند نظر آتے" وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ (ایضاً) "جب یہ باتیں کریں تو اس قدر جاذب اور پُرکشش، کہ سننے والا مسحور ہو جاتے" لیکن ان ظاہرداری کے پردوں کو ذرا سرکا کر دیکھو تو نظر آجائے۔ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ۔ (ایضاً) "یہ تنومند و توانا انسان نہیں، گھن کھائی ہوئی کھوکھلی لکڑیاں ہیں۔ جنہیں دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا ہے" ان کی بزدلی کا یہ عالم ہے يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (ایضاً) "کہیں ذرا سا پتہ بھی کھڑکے تو ان کی جان نکل جاتی ہے کہ آئی کوئی نئی آفت۔"

سوچئے کہ جو شخص اس اضطرابِ پیہم کی زندگی بسر کر رہا ہو، اس کا مقام اگر جہنم کے پست ترین درجہ میں نہیں ہوگا تو اور کہاں ہوگا؟

درجات و درکات

بات تو ضمنی سی ہے لیکن ہے ایسی کیف انگیز کہ اس کی تشریح کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس سے بھی آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنی حقائق کو انسانوں کے سامنے لانے کے لئے عربی کی زبان کا انتخاب کیوں کیا تھا! اوپر کہا گیا ہے کہ منافق جہنم کے "درکِ اسفل" میں ہوں گے۔ سب سے نچلے درک میں۔ آپ سیڑھی کا تصور ذہن میں لائیے۔ اس میں چند ڈنڈے (STEPS) ہی ہوتے

ہیں جب کوئی شخص ان ڈنڈوں کے ذریعہ اوپر چڑھ رہا ہو تو عرب انہیں درجات کہتے تھے اور جب انہی سے نیچے اتر رہا ہو تو انہیں درکات کہہ کر پکارتے۔ سیڑھی کے ڈنڈے وہی ہیں۔ جو شخص اُن کے ذریعے بلندیوں کی طرف جانا چاہے وہ اُسے بلندی تک پہنچا دیتے ہیں، جو پستی کی طرف آنا چاہے وہ اُسے نیچے لے آتے ہیں۔ طبیعی زندگی کے ساز و سامان وہی ہوتے ہیں۔ جو انسان بلند مدارج حاصل کرنا چاہے، وہ ساز و سامان اُسے سرفرازیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ جو ذلت اور پستی کی طرف جانا چاہے، وہی ساز و یراق اُسے ذلت کے گڑھوں میں دھکیل دیتا ہے۔ سوال ساز و سامان کا نہیں، اس کے استعمال کا ہے، یا یوں کہئے کہ اُس مقصد کا جس کے حصول کے لئے اُسے استعمال کیا جائے۔

(۰)

نبی اکرمؐ نے اپنے پیشِ نظر پروگرام کی پہلی منزل مکہ میں گزاری۔ وہاں واسطہ قریش سے تھا۔ قریش کے کردار میں منافقت نہیں تھی۔ وہ مخالفت کرتے تھے تو کھلے بندوں اور دوستانہ تعلقات وابستہ کرتے تھے تو بھی علی الاعلان۔ اپنے پروگرام کی اگلی منزل کے لئے حضورؐ مدینہ تشریف لائے تو اس شہر کی اپنی آبادی بہت کم تھی اور اس میں بھی اکثریت یہودیوں کی تھی جن کی منافقت دنیا میں ضرب المثل ہے۔ یہی تھے وہ اہلِ کتاب جن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ان کی تدبیر یہ تھی کہ صبح، مسلمان بن کر، مسلمانوں میں آملتے۔ ان میں وساوس پھیلاتے، شکوک اُبھارتے، اور شام کو اپنی جماعت کی طرف لوٹ آتے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ اس طرح شاید ناپختہ ایمان والے مسلمان بھی ان کے ساتھ جماعتِ مومنین سے باہر نکل آئیں۔ (۳/۷۲)۔ مدینہ اور اس کے گرد و نواح ان کی بستیاں تھیں۔ اسی ماحول میں اعراب (بدو) بھی بستے تھے۔ نسلی اعتبار سے یہ بھی عرب تھے، اس لئے انہیں بھی قریش کی طرح منافقت سے دور رہنا چاہیئے تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ——— خراب کرگئی شاہیں بچوں کو صحبتِ زاغ ——— ایک مدت تک یہودیوں کے ماحول میں رہنے سے ان میں بھی منافقت کے جراثیم سرایت کر گئے تھے۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم نے انہیں منافق اہلِ کتاب کا بھائی بند کہہ کر پکارا (۵۹/۱۱) اور کہا ہے کہ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا۔ (۹/۹۷) یہ بدو کفر اور نفاق میں بہت ہی شدید واقع ہوئے ہیں۔" (نیز ۹/۱۰۱) یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ مل کر منافقانہ طور پر اسلامی نظام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ لیکن جب، اس کے علی الرغم، مسلمانوں کی اپنی مملکت قائم ہوگئی تو انہوں نے اس کی اطاعت اختیار کی اور ایمان لے آئے۔ یہی ہیں وہ، جن کے

یہود اور اعراب

متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ان سے کہو، یہ ایسا نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ یہ کہیں کہ ہم نے اسلامی مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ (۴۹/۱۴) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسمت منافقت کا ملمع ان پر سے اتر چکا تھا اور عربی سرشت پھر سے ابھر کر

اوپر آگئی تھی۔ یہ اس لئے کہ قرآن کریم نے ان کے متعلق یہ نہیں کہا کہ یہ اللہ اور جماعتِ مومنین کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس کہا یہ ہے۔ وَ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَیْـًٔا۔ (۴۹/۱۴) "اگر یہ لوگ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرتے رہے تو ان کے اعمال کے اجر میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی" ہم ان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ جہاں تک منافقین کا تعلق ہے، وہ ساری زندگی مسلمانوں کو ستاتے رہے اور انہوں نے ان کی تخریب میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سوال یہ ہے کہ انہیں خدا نے بے نقاب کیوں نہ کر دیا کہ رسول اللہ اور جماعتِ مومنین ــــ بالفاظِ دیگر، نظامِ خداوندی ــــ ان کی سازشوں سے محفوظ رہتا اور اس جماعت کی توانائیاں ان کی مدافعت میں صرف ہونے کے بجائے کلیتہً تعمیری پروگرام کے لئے وقف ہوتیں؟ سوال جتنا اہم ہے اس کا جواب اتنا ہی زیادہ غور طلب ہے۔ سورۂ محمد میں ہے۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ (۴۷/۲۹)۔ یہ لوگ جن کے دلوں میں منافقت کا مرض ہے، کیا یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ ان کا یہ خبثِ باطن کبھی نکھر سامنے نہیں آسکے گا؟" اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے فرمایا۔ وَ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ۔ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ۔ (۴۷/۳۰) "خدا ان کی کارستانیوں سے اچھی طرح واقف ہے اس لئے اگر وہ چاہتا تو تمہیں ان کی ایسی ظاہر اعلامات بذریعہ وحی بتا دیتا جن سے تم انہیں بڑی آسانی سے پہچان لیتے۔ لیکن اے رسولؐ! ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ایسا کرنا ہماری مشیت کے پروگرام کے خلاف ہوتا۔ ہم نے انہیں چھوڑ دیا کہ تم خود انہیں ان کی باتوں سے پہچانو۔"

انہیں خود پہچاننا ہوگا

بات تو یہ چھوٹی سی ہے لیکن اس میں بھی ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ حضورؐ نے جب اپنی انقلاب آفریں دعوت کا آغاز کیا تو چاروں طرف سے مخالفتوں کا ہجوم امڈ کر آگیا، اور ان کی یہ مخالفت آخر دم تک جاری رہی۔ ان میں قریشِ مکہ بھی تھے اور مدینہ کے منافقین بھی۔ سطحی نظروں سے دیکھا جائے تو قریشِ مکہ کی مخالفت بڑی شدید اور ہمت آزما تھی، لیکن ذرا بنگاہِ تعمق غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ منافقین کی مخالفت، قریشِ مکہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اذیت رساں، صعوبت انگیز، صبر آزما اور استقامت طلب تھی۔ قریش کھلے ہوئے دشمن تھے وہ للکار کر سامنے آتے اور پکار کر وار کرتے تھے۔ نہ ان کے پہچاننے میں کوئی مشکل تھی اور نہ ہی ان کے عزائم کے بھانپنے میں چنداں دشواری۔ لیکن منافقین کی صورت ان کے یکسر مختلف تھی۔ وہ کھلے چہروں کے ساتھ شمشیر بکف سامنے آتے تھے، یہ زیرِ نقاب خنجر در آستیں، نہ انہیں آسانی سے پہچانا جاسکتا تھا، نہ ان کے مکائد کا نظر بظاہر اندازہ

لگایا جا سکتا۔ ان کا مسئلہ کس قدر پیچیدہ اور اس کا حل کس قدر دقت طلب تھا، اس کا اندازہ سورۂ توبہ میں مذکورہ تفصیلات سے لگ سکتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت آسان ہو جاتا اگر ان کی پہچان کا کوئی قابلِ اعتماد طریقہ یا ذریعہ مل جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے وحی سے زیادہ قابلِ اعتماد اور یقینی ذریعہ اور کونسا ہو سکتا تھا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ ہمارے لئے یہ ذرا بھی مشکل نہیں کہ ہم ان کا پتہ نشان بتا دیں، لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے۔ یہ آپؐ کو خود ہی کرنا ہوگا۔ اس سے واضح ہے کہ جہاں تک وحی کا تعلق ہے وہ تو خالصۃً خارقِ فطرت اور فوق البشر ذریعۂ علم تھا۔ اس میں حضورؐ کی اپنی فکر و بصیرت یا محنت اور کوشش کا کوئی دخل نہیں تھا لیکن وحی کی روشنی میں جو محیر العقول کارنامے حضورؐ نے سرانجام دیئے ان میں کسی فوق الفطرت عنصر کا دخل نہیں تھا۔ وہ آپؐ کی اپنی نقید المثال فراست و بصیرت کا نتیجہ اور عدیم النظیر سیرت وکردار کا ثمرہ تھا۔ مخالفین کی تدبیر کا جواب حسنِ تدبیر سے دیا جاتا اور شمشیر کی کاٹ دو شمشیر سے کی جاتی تھی۔ یہ فریقین میں برابر کی جنگ تھی، اس فرق کے ساتھ کہ دشمن جو حربہ چاہے استعمال کر سکتا تھا لیکن حضورؐ (اور آپؐ کی جماعت) کو وحی کی عائد کردہ حدود و قیود کا پابند رہنا پڑتا تھا۔ نظر بظاہر اس سے اس کشمکش اور آویزش میں داعیانِ الی الحق کی پوزیشن (DISADVANTAGEOUS) دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت وحی کی متعین کردہ اقدار و اصول کی پابندی تھی جس سے حق آخر الامر غالب آیا۔ اسی کو حضورؐ کے دعاوی کی صداقت کے ثبوت کے طور پر

اسوۂ حسنہ

دنیا کے سامنے پیش کر کے کہا گیا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱) "رسولؐ کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے"۔ اگر ان کارناموں میں فوق الفطرت عناصر کا عمل دخل ہوتا تو حضورؐ کی حیاتِ طیبہ نوعِ انسان کے لئے نمونہ نہ بن سکتی۔

یہ وجہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہہ دیا کہ ہم ان منافقین کا پتہ نشان نہیں بتائیں گے تمہیں انہیں ان کے قول و فعل سے خود پہچاننا ہوگا۔ اور قرآنِ کریم اس کی شہادت دیتا ہے کہ حضورؐ نے انہیں پہچانا اور اپنے معاشرہ کو ان سے پاک اور صاف کیا۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ

منافقین الگ کرائے گئے تھے

الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ (۳/۱۷۸) "ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا مومنین کے معاشرہ کو ایسی حالت میں چھوڑ دے جس میں یہ اس وقت ہے۔ وہ ایسا کرے گا کہ خبیث اور طیب کو الگ الگ کر دے"۔ جیسا کہ ہم (خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ (۲/۷) کی تشریح کرتے ہوئے بتا چکے ہیں، خدا ان امور کو منسوب تو اپنی طرف کرتا ہے لیکن کئے ہوئے یہ انسانوں ہی کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا، اس سے یہ بھی واضح ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں

منافقین کا یہ خبث، جماعتِ مومنین کے طیب سے الگ ہو چکا تھا۔ اور وہ معاشرہ ان مخلص مومنین پر مشتمل تھا جنہیں صحابہؓ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ چونکہ بدوؤں کے ایمان میں ہنوز پختگی نہیں آئی تھی اس لئے قرآنِ کریم نے ان صحابہؓ کو خصوصیت سے مہاجرین اور انصار کہہ کر پکارا ہے۔ ان کے خلوصِ ایمان کی شہادت قرآنِ کریم کے اوراق میں تابندہ موتیوں کی طرح بکھری پڑی ہے۔ سورۃ انفال میں ہے۔ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (۸/۷۴)

وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا، اور وہ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ سب کے سب سچے اور پکے مومن (مومنِ حقا) ہیں۔ ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کا رزق۔"

صحابہ سب مخلص مومن تھے

ان میں کچھ وہ تھے جنہوں نے حضورؐ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہا، اور کچھ وہ جو ان میں ذرا بعد میں شامل ہوئے۔ لیکن خدا نے ان سب کے لئے جنت کی بشارت دی ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے۔

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۔ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹/۱۰۰)

"مہاجرین اور انصار جنہوں نے پہل کی، اور وہ جو اس حسین معاشرہ میں اُن کے بعد شامل ہوئے، اللہ اُن سب سے راضی ہوگیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے۔ خدا نے اُن کے لئے ایسے باغات (جنت) تیار کر رکھے ہیں جن کی بہاریں خزاں نا آشنا ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے جسے نصیب ہو جائے"۔

غور فرمائیے۔ خدا نے تمام صحابہؓ کے لئے، خواہ وہ "السابقون الاولون" کے زمرہ میں شامل تھے اور خواہ وہ ان میں بعد میں شامل ہوئے، ابدی جنت کی ضمانت دی ہے اور سب کے لئے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کا درخشندہ سرٹیفکیٹ عطا فرمایا ہے۔ ان میں بعد میں شامل ہونے والوں کے متعلق کہا ہے فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (۸/۷۵) "وہ بھی تم میں سے ہی ہیں۔ جہاں تک خدا کے وعدے کا تعلق ہے ان میں اور تم میں کوئی فرق نہیں"۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنی معیار کے مطابق مدارج کا تعین اعمال کی رُو سے ہوتا ہے (۴۶/۱۹)۔ لہٰذا السابقون الاولون کے مدارج زیادہ بلند ہوں گے۔ لیکن جہاں تک جنت و مغفرت کے خدائی وعدہ کا تعلق ہے، وہ ان سب کے لئے یکساں ہے۔ چنانچہ سورۃ حدید میں فرمایا۔ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ۔ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ۔ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۔ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

خَبِيْرٌ (۵۷/۱۰)۔ "وہ لوگ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خدا کی راہ میں مال خرچ کیا اور جنگوں میں شریک ہوئے، اور وہ جنہوں نے اس کے بعد ایسا کیا، مدارج کے اعتبار سے یہ دونوں گروہ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ السابقون الاولون کے مدارج نسبتاً بلند ہیں۔ لیکن خدا کے (جنت اور مغفرت کے) حسین اور خوشگوار وعدے ان سب کے لئے ہیں۔ خدا تم سب کے اعمال سے باخبر ہے اس لئے اس نے یہ ضمانت یونہی نہیں دی۔"

یہی ہیں وہ مخلص مومنین جن کے متعلق خدا نے اپنے رسولؐ سے کہا۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۶۲) "خدا وہ ہے جس نے اے رسولؐ! اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کی رفاقت کو تمہاری تائید و تقویت کا موجب بنایا"۔ اس کے بعد دوسری آیت میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۶۴) "اے نبیؐ! خدا اور یہ جماعتِ مومنین جو تیرا اتباع کرتی ہے، تیرے لئے کافی ہے۔" آپ نے غور فرمایا، کہ مہاجرین اور انصار پر مشتمل صحابہؓ کی جماعت کا مقام کس قدر بلند تھا۔ یہی ہے وہ مقام جس کا نقشہ قرآنِ کریم نے سورۃ الفتح میں ان وجد آور الفاظ میں کھینچا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۗ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۔ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۔ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۔ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸/۲۹)

محمدؐ، اللہ کا رسولؐ اور اس کے رفقاءِ کار کی جماعت۔ یہ جماعت بھی کیا عجیب و غریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں لیکن باہمدگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد۔ (تو) انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جھک جاتے ہیں، اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں۔ (لیکن یہ تارک الدنیا راہبوں کی جماعت نہیں) یہ قانونِ خداوندی کے مطابق، سامانِ زیست کی تلاش میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ، اور ان کی سیرت صفاتِ خداوندی سے یک رنگ ہو جائے

اس سے انہیں جو سکونِ قلب اور حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ علامات، سابقہ کتبِ آسمانی — تورات و انجیل — میں بھی مذکور تھیں۔

انہوں نے اس نظامِ خداوندی کو جس طرح قائم کیا اور پروان چڑھایا ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب عمدہ بیج سے شگوفہ پھوٹتا ہے تو اس کی پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر جوں جوں اس کی جڑ مضبوط ہوتی جاتی ہے، اس کی نال موٹی ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سہارے آپ محکم اور استوار طریق پر قائم ہو جاتی ہے۔ (اس میں خوشے لگتے ہیں اور خوشوں میں دانے پڑ کر سخت اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ ننھا سا بیج پکی ہوئی فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے) جب کاشتکار اپنی محنت کو اس طرح ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ لیکن یہی چیز اس کے مخالفین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے لگ جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ، ہر اس جماعت کو جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر، اس کے بتلائے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہوتی ہے، اس امر کا وعدہ دیتا ہے (یعنی یہ اس کا قانون ہے) کہ انکی کوششوں کا ننھا سا بیج، تمام خطرات سے محفوظ رہے گا۔ اور ان کی کھیتی پک کر بہترین ثمرات کی حامل ہو جائیگی۔ (۲۴/۵۵) لیکن اس کے لئے اسی قسم کی محنت اور استقامت کی ضرورت ہوگی جس قسم کی محنت اور استقامت کا ثبوت کسان دیتا ہے — (تخمِ صالح۔ قوانینِ فطرت سے مطابقت، مسلسل محنت اور استقلال و استقامت، کھیتی کی برومندی کے لئے یہ تمام شرائط لاینفک ہیں)

قرآن کریم کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ خدا نے جو کہا تھا کہ مومنین کے معاشرہ میں سے خبیث کو الگ کر دیا جائے گا وہ وعدہ اس طرح پورا ہوا، اور جو طیب جماعت باقی رہ گئی (یعنی حضورؐ کی دنیا سے تشریف براری کے وقت جملہ صحابہ کرامؓ کی جماعت) وہ کس طرح طیب ہی طیب تھی۔ ان میں کوئی منافق نہیں تھا۔

اب آگے چلئے۔

(۲/۹) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔

اس آیت کا مفہوم سابقہ آیت کی تشریح میں آ چکا ہے۔ صرف ایک نکتہ ہے جو تھوڑی سی مزید وضاحت چاہتا ہے۔

سورۃ النساء میں منافقین کی اِس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (۴/۱۴۲) اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "منافقین خدا کو دھوکہ دیتے ہیں، اور خدا انہیں دھوکہ دیتا ہے" اس ترجمہ کی رُو سے خدا کے متعلق جو تصور سامنے آتا ہے وہ واضح ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کے لیے اُس بحث کو سامنے لائیے جو خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۲/۷) کے ضمن میں سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ اور اس کے ساتھ ان الفاظ کو ملائیے کہ وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (۲/۹) تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ مفہوم اس آیت کا یہ ہوگا کہ منافق بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ اور جماعت مومنین کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن درحقیقت ہوتا یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے وہ خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر منافقت کے نفسیاتی مرض نے ان کے عقل و شعور کی صلاحیتوں پر پردہ نہ ڈال دیا ہوتا تو یہ بات کچھ ایسی عمیق و دقیق نہیں تھی کہ ان کی سمجھ میں نہ آ سکتی۔ وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (۲/۹) میں یہ حقیقت بھی پوشیدہ ہے (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) کہ انسان

اعمال کا اثر انسانی ذات پر

کے ہر عمل کا اثر یا نتیجہ اس کی ذات (نفس) پر مرتب ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷/۷) اگر تم سنوارنے والے تعمیری کام کرتے ہو تو اس سے خود تمہاری اپنی ذات سنورتی ہے۔ اور اگر بگاڑ پیدا کرنے والے کام کرتے ہو تو اس سے تمہاری ذات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے" اس نے دوسری جگہ کہا ہے وَ مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (۴/۱۱۱) "جو جرم تم (بظاہر) دوسروں کے خلاف کرتے ہو، وہ درحقیقت خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے۔ اُس سے تمہاری ذات مضمحل ہو جاتی ہے۔" (اثم کے یہی معنی ہیں) مشہور جرمن فلاسفر نطشے نے اسی نکتہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "جو جرم تم نے میرے خلاف کیا ہے اُسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن اس سے جو جرم تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے اُسے کون معاف کرے گا؟" قرآن کریم نے اپنی پیش کردہ حقیقت کو سورۃ حشر میں دو مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں بیان کیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ ۔ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (۵۹/۱۹) "دیکھنا! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنی ذات ہی کو فراموش کر بیٹھے۔" یعنی خدا فراموشی کا نتیجہ خود فراموشی ہے۔ اور اسی کو آیہ زیر نظر (۲/۹) میں "خود فریبی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سے اگلی آیت ہے۔

(۲/۱۰) فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۔ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۔

۲/۱۰ اس آیت کا مفہوم بھی آیہ (۲/۷) میں آ چکا ہے۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ قرآن کریم نے منافقت کو نفسیاتی مرض قرار دیا ہے۔ نفسیاتی امراض کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب تک ان کی اصلی علت (CAUSE) کی تشخیص نہ ہو جائے نہ صرف

یہ کہ ان کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ ہر غلط علاج سے مرض اور بڑھتا جاتا ہے۔ ہم نے پہلے کہا ہے کہ انسان کو اپنے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے دس اور جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور انہی سے یہ مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہا کہ یہ سب نتیجہ ہے بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ کا۔ یعنی اس کذب اور جھوٹ کا جسے انہوں نے اپنی زندگی کا شعار بنا رکھا ہے۔

منافقین کے اس مرض سے پیدا ہونے والے کرب و اضطراب کو قرآنِ کریم نے عَذَابٌ اَلِيْمٌ کہہ کر پکارا ہے یعنی الم انگیز، دردناک عذاب۔ ہم آیہ (۲/۷) کے سلسلہ میں کفر کے متعلق تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ آپ نے وہاں دیکھا ہوگا کہ کفر کا تعلق انسانی فہم و ادراک کی غلطی یا غلط نگہی سے ہے۔ اس بنا پر اس سے پیدا ہونے والی تباہی کو عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۲/۷) کہا یعنی سخت تباہی لیکن منافقت کا تعلق چونکہ انسان کے قلب یا نفسیات سے ہے اس لئے اس سے پیدا ہونیوالی تباہی کو الم انگیز عذاب کہا ہے۔ عام الفاظ میں یوں کہئے کہ اگر کفر کا نتیجہ دردِ سر ہے تو منافقت کا نتیجہ دردِ جگر۔ آپ نے غور فرمایا کہ الفاظ کے انتخاب میں بھی قرآنِ کریم کس اعجاز سے کام لیتا ہے (اسی لئے میں تاکید کیا کرتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے کسی لفظ پر بھی غور و فکر کئے بغیر آگے نہیں بڑھ جانا چاہیئے۔)

منافقین کی چند ایک نمایاں خصوصیات پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے ان کی ایک ایسی خصوصیت بتائی ہے جو یوں کہئے کہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کا ذکر اس سے اگلی دو آیات میں آیا ہے اور وہ یہ ہیں

۲/۱۱ ۲/۱۲

(۲/۱۱-۱۲) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ. اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔

ان آیات کا مفہوم یہ ہے "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ معاشرہ، ملک یا دنیا میں فساد پیدا نہ کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم فساد نہیں پیدا کرتے، ہم تو اصلاح کرتے ہیں" اور قرآنِ کریم لوگوں کو آگاہ کرتا ہے کہ ان کی ان باتوں میں نہ آجانا۔ "یہ اصلاح کرنے والے نہیں، فساد پھیلانیوالے ہیں"

اصلاح اور فساد

اس آیت میں فساد اور اصلاح کے دو ایسے الفاظ آئے ہیں جو قرآنِ کریم کی بڑی معنی خیز اور غور طلب اصطلاحات ہیں۔ صُلْحٌ کے بنیادی معنے یہ ہیں کہ جس چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اُسی حالت میں ہو۔ اس کا اعتدال، توازن، تناسب علیٰ حالہٖ برقرار رہے۔ فَسَادٌ اس کی ضد ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے وہ اس حالت میں نہ ہو۔ اس کے اعتدال، توازن اور تناسب، غرضیکہ ہر جوہر اور ہر خاصیت میں بگاڑ پیدا ہو چکا ہو۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے۔ وہ اُسی حالت میں ہو۔ "ہونا چاہیئے" بظاہر تو دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ دنیائے فکر و نظر کا مشکل ترین مسئلہ ہے جس کے حل کے لئے انسانی فکر

وحی کی روشنی کے بغیر) اُس زمانے سے مصروفِ کاہش و کاوش ہے۔ جب انسانی شعور نے پہلے پہل آنکھ کھولی تھی، لیکن آج تک وہ کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچ پائی۔ علومِ سائنس کے سامنے جو مسئلہ ہے وہ آسان ہے۔ اس میں سوال صرف "کیا ہے"

کیا ہونا چاہیئے؟ مشکل ترین مسئلہ

(WHAT IS) ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اشیائے کائنات یا فطرت کی قوتوں پر پردہ پڑا ہوتا ہے اور سائنس کی تحقیقات اس پردہ کو اٹھا دیتی ہیں۔ اور اس کے نیچے چھپی ہوئی حقیقتوں کو (DISCOVER) کر دیتی ہیں۔ اس سے ہر چیز کے متعلق معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیسی ہے؛ لیکن انسانی دنیا میں اصل سوال (WHAT IS) کا نہیں ہوتا۔ سوال (WHAT OUGHT TO BE) ہوتا ہے۔ ہم روزمرہ کی بات چیت میں کہتے ہیں کہ اُس نے ایسا کیا حالانکہ اُسے "یوں کرنا چاہیئے تھا"۔ وہ شخص ایسا کہنے والے سے پوچھ سکتا ہے کہ مجھے "ایسا کیوں کرنا چاہیئے تھا جیسا تم کہتے ہو"؟ اور اس کے بعد یہ کہ تم یہ کہنے والے کون ہو کہ مجھے ایسا کرنا چاہیئے تھا۔

قصۂ آدم کا تفصیلی بیان چند آیات آگے جا کر ہمارے سامنے آئے گا۔ اُس میں آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین میں ایک صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق (انسان) پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو ملائکہ نے کہا کہ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲/۳۰) کیا تو دنیا میں ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہے جو صاحبِ اختیار و ارادہ ہو؟ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں فساد پیدا کر دیگا۔ یعنی وہ کسی شے کو اُس حالت پر نہیں رہنے دیگا جس حالت پر اُسے ہونا چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ خون ریزیوں کے سوا اور کیا ہوگا!" (علامہ) اقبالؒ نے اس حقیقت کو نہایت حسین انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے:-

گفت یزداں کہ چنیں است و چنیں خواہد ماند

گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود

خدا نے آدم (انسان) سے کہا کہ دیکھو، تم اپنی تمدنی زندگی کے نظام کو اُسی حالت پر رہنے دینا جس حالت پر ہم اُسے بذریعہ وحی متعین کریں، اس میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کرنا۔ اس سے بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ لیکن (وحی سے سرکشی برتنے والے) انسان نے کہا کہ نہیں، اس کا فیصلہ میں خود کروں گا کہ اسے کیسے ہونا چاہیئے۔ "ایسے ہونا چاہیئے اور ویسے نہیں ہونا چاہیئے" کی یہی کشمکش اور آویزش ہے جس کی داستان کو تاریخِ انسانیت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ وحیٔ خداوندی کہتی ہے کہ تمہاری تمدنی زندگی کے نظام کو ایسا ہونا چاہیئے۔ انسان کی مفاد پرستیاں اسے چیلنج کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ نہیں "یوں ہونا چاہیئے"۔ اسی کو فساد کہتے ہیں۔ اسی کو خیر و شر کی کشمکش یا ابلیس و آدم کی آویزش کہتے ہیں۔ (خیر و شر کی مزید وضاحت ذرا آگے

چل کر سامنے آئے گی)۔ قرآنِ کریم کے متعلق بھی بنیادی طور پر یہی سمجھیے کہ وہ اسی صلح اور فساد کی آویزش کا تذکرۂ بلیغ وجمیل ہے۔ مصلحین کی تگ وتاز اِس مقصد کے لئے ہوتی ہے کہ انسانی نظام اُس حالت پر رہے جس حالت پر اُسے خدا (یعنی وحی) رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے مومنین کے پیشِ نظر نصب العین کو ان جامع الفاظ میں بیان کیا ہے ۔۔ یا یوں کہیے کہ اس نے مومنین کی تعریف (DEFINITION) یہ کی ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔ (۸۱/۲۹)۔ "وہ وہی چاہتے ہیں جس طرح خدا چاہتا ہے کہ ہو۔" آپ نے دیکھا کہ مومن "کیا ہونا چاہیئے (OUGHT TO BE) کا

فساد کے مختلف گوشے

مسئلہ کس حسن وخوبی سے حل کر دیتا ہے۔ اِن کی اِسی خصوصیت کی بنا پر انہیں مصلحین یا صالحین کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس وحی سے برگشتہ ہونے والے، اس نظام کو اپنی مفاد پرستیوں کے مطابق بدل ڈالتے ہیں۔ اسی نہج سے انہیں مفسدین کہا جاتا ہے۔ اِس حقیقت کو سمجھنے کے لئے انسانی زندگی کے چند ایک ایسے گوشوں کو سامنے لایا جاتا ہے جن میں قرآنِ کریم کی رُو سے اصلاح کے بجائے فساد برپا ہوتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے نظامِ مملکت کو لیجئے۔ اس میں بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ قانون وضع کرنے کا آخری اختیار کسے حاصل ہو؟ اِسی اتھارٹی کو صاحبِ اقتدار (SOVEREIGN AUTHORITY) یا قرآن کی اصطلاح میں اٰلٰہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت میں اللہ کے متعلق جو بحث سامنے آچکی ہے اُس میں آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم نے کہا یہ ہے کہ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ وہی ایک اٰلٰہ ہے، کوئی اور اٰلٰہ نہیں۔ خارجی کائنات میں اس کے نافذ کردہ قوانین بلا غل وغش کارفرما ہیں۔ سائنس کے محققین اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ کارگہِ کائنات کی بنیاد وحدتِ قوانین پر ہے۔ یعنی اس میں ایک ہی اتھارٹی کے وضع کردہ قوانین نافذ العمل ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ محیر العقول مشینری اس حسن وخوبی سے مصروفِ عمل ہے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۔ (۱۶/۴۹)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے، چاہے وہ (انسانوں کے سوا) عام مخلوق ہو یا فطرت کی قوتیں، سب اُس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور اس سے کبھی سرکشی نہیں برتتیں۔"

نظامِ حکومت

یہ اس لئے کہ وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵/۳۷)۔ "ساری کائنات میں کبریائی (یعنی اقتدارِ اعلیٰ) صرف خدا کو حاصل ہے اور اس کی کبریائی اندھی قوت پر مبنی نہیں، حکمت پر مبنی ہے۔" نظامِ کائنات کو مثال کے طور پر سامنے لانے کے بعد اُس نے انسانوں سے کہا کہ جس طرح تم خارجی کائنات میں خدا کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہو اسی طرح انسانی دنیا میں بھی اسی کو اٰلٰہ مانو ۔۔ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ۔ (۴۳/۸۴) یاد رکھو! خارجی کائنات میں بھی وہی اٰلٰہ ہے

اور اسی کو انسانی دنیا میں بھی الٰہ ہونا چاہیئے"۔ ایک اور جگہ کہا۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ (۲۱/۲۲) یاد رکھو! اگر تم نے ایسی صورت پیدا کر لی کہ خارجی کائنات میں کسی اور کو الٰہ مان لیا اور اپنی داخلی دنیا میں کوئی الٰہ، تو اس کا نتیجہ فساد ہوگا۔ خدا کے متعلق تمہارا یہ تصور کہ اس کا احاطۂ اقتدار صرف خارجی کائنات تک محدود ہے، انسانی زندگی میں انسانوں کو خود مختار ہونا چاہیئے، بڑا غلط ہے اور خدا اس سے بہت بلند و برتر ہے۔ ساری کائنات کا مرکزی کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے"۔ یہ اس لئے کہ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ۔ (۲۱/۲۳) "دنیا میں جو بھی صاحبِ اختیار ہے اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ ایسا ہونا چاہیئے، اس کی تمہارے پاس کیا اتھارٹی ہے۔ یہ اتھارٹی صرف خدا کو حاصل ہے"۔ اسی نے کائنات اور انسانوں کو پیدا کیا ہے اور وہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ خارجی کائنات کی طرح انسانی دنیا کا نظام کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے اس نے دلیل بھی بڑی واضح اور مسکت دی ہے۔ اس نے کہا کہ انسان کوئی بھی ہو، اُس کے وضع کردہ قوانین اور فیصلوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے جذبات کی آمیزش ضرور ہوگی۔ اس طرح حق، خالصتًہ حق نہیں رہیگا۔ اور وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۔ (۲۳/۷۱) "اگر الحق لوگوں کے جذبات کے تابع ہو جاتے تو ارض و سماء اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، میں فساد برپا ہو جاتے۔ اور اُس فساد کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کی صورت یہی ہے کہ وہ قوانین، جن کے تابع انسانوں نے زندگی بسر کرنی ہے، انسانی جذبات سے ملوث نہ ہوں"۔ آیت کا باقی حصہ یہ ہے۔ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ (۲۳/۷۱) "انسانوں کی غلط نگہی کو دیکھیئے۔ ہم انہیں ایسا نظام دینا چاہتے ہیں جس میں ان کے شرف و مجد کا راز پوشیدہ ہے لیکن یہ اُس سے اعراض برتتے ہیں"۔ حکومت کی کوئی شکل بھی ہو، اگر اس میں قانون سازی کے اختیارات کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کے ہاتھ میں ہوں تو اس سے لامحالہ دوسرے انسان ان کی مرضی کے تابع چلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور انسان کی یہ انتہائی ذلّت ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کی مرضی کے تابع چلنے پر مجبور ہو۔ اس سے انسان شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے شرف و تکریم کا راز اسی میں ہے کہ وہ کسی انسان کا محکوم و محتاج نہ ہو۔

ملوکیت

جس حکومت کا نتیجہ فساد ہے اس کی ایک شکل ملوکیت ہے۔ ملوکیت میں کیا ہوتا ہے! اسے قرآنِ کریم نے ملکۂ قومِ سبا کی زبان سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۔ (۲۷/۳۴) "یاد رکھو! جب بادشاہ کسی دوسرے ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو وہاں سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ یعنی وہاں فساد کی صورت پیدا ہو جاتی

ہے۔ وہ سب سے پہلے اُس قوم کے ذی عزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اور یہ چیز کسی خاص بادشاہ تک محدود نہیں' یہ خاصہ ملوکیت ہے۔ بادشاہ کوئی بھی ہوں اور کہیں بھی ہوں' وہ یہی کرتے چلے آئے ہیں اور یہی کرتے چلے جائیں گے۔" دوسری جگہ فساد کی تشریح ان الفاظ میں کردی کہ وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ۔ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (۲/۲۰۵) جب کوئی ایسا شخص ملک میں اقتدار حاصل کر لیتا ہے تو وہاں فساد برپا کر دیا کرتا ہے — وہ فصلوں کو تباہ کر دیتا ہے اور انسانوں کو ہلاک۔ اس کے برعکس خدا کی فرماں روائی میں ایسا نہیں ہوتا۔ خدا فساد کو پسند ہی نہیں کرتا۔"

قرآنِ کریم نے مصر کے فراعنہ کو ملوکیت کے نمائندوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ ان کے متعلق کہتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ۔ فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ (۸۹/۱۱-۱۲)۔" وہ بستیوں کو اُس سیلاب کی طرح تباہ کر دیتے ہیں جو اپنے ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارے ملک میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ کوئی شے بھی اپنی اصل حالت پر نہیں رہتی۔" دوسری جگہ ہے۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ۔ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ یَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ۔ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ۔ (۲۸/۴)۔" فرعون نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی اور دھاندلی مچا رکھی ہے۔ وہ قومِ بنی اسرائیل کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس طرح کبھی ایک پارٹی کو کمزور کر دیتا ہے کبھی دوسری کو۔ وہ اِس قوم کے جن افراد میں جوہرِ انسانیت کی نمود دیکھتا ہے انہیں ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ اور جو ان جوہروں اور صلاحیتوں سے عاری ہوتے ہیں انہیں آگے بڑھاتا ہے۔ یہ ہے وہ فسادِ انسانیت' جسے وہ عام کئے جا رہا ہے۔"

ملوکیت کے یہ معنی نہیں کہ اُس میں قوانین سازی کا اختیار کسی ایک فرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ایک فرد ہو یا افراد کا کوئی گروہ (جسے دورِ حاضر میں مغرب کا جمہوری نظام کہہ کر پکارا جاتا ہے) قرآنِ کریم کی رو سے اِسے ملوکیت قرار دیا جائیگا

جمہوریّت

معلوم ہوتا ہے کہ قومِ ثمود میں کچھ اسی قسم کا 'جمہوری نظام' رائج تھا۔ چنانچہ جب حضرت صالح ؑ نے خدا سے کہا کہ وہ تو ساری کی ساری قوم بگڑی ہوئی ہے، میں ان کی اصلاح کی کیا شکل اختیار کروں؟ تو خدا نے کہا۔ وَ كَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ (۲۷/۴۸)۔" تم ساری قوم کی فکر نہ کرو۔ فساد کی جڑ وہ نو اربابِ اقتدار ہیں جو دار المدینہ میں بیٹھے ہر شے میں بگاڑ پیدا کرتے رہتے ہیں۔" ان کا یہ دگرام یہ ہے کہ کوئی شے اپنی اصلی حالت پر نہ رہنے پائے۔ تم ان (نو) کا علاج کر لو، تو ساری قوم کا علاج ہو جائے گا۔ چیچک کا علاج ہر آبلے پر پھایا رکھنا نہیں ہوتا۔ اس کا علاج یہ ہوتا ہے کہ خون میں جو تخریبی جراثیم داخل ہو گئے ہوں' ان کا ازالہ

کر دیا جائے۔ وہ جراثیم تباہ ہو جائیں گے تو چیچک کے چھلے خودبخود بند ہو جائیں گے۔

اُس نے جنت کے متعلق کہا کہ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ۔ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲۸/۸۳)۔ ”اُخروی زندگی کا یہ مسکن اُن کے لئے ہے جو دنیا میں نہ سرکشی اختیار کرتے ہیں نہ فساد برپا۔ وہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں اور اسی کا نتیجہ یہ جنت ہے“

یہاں ایک اور بنیادی نکتہ وضاحت طلب ہے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ جنت ان کے لئے ہے۔ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ ۔ (۲۸/۸۳) جو دنیا میں علوّ نہیں چاہتے۔ علوّ کا عام ترجمہ دوسروں سے بلند ہو جانا کیا جاتا ہے۔ اور اس سے مراد

مومنین اور علوّ فی الارض

لی جاتی ہے قوت و اقتدار، سرفرازی و سربلندی۔ تصوف کے مسلک خانقاہیت کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ قوت و اقتدار، سرفرازی و سربلندی، غلبہ و تسلط، فرماں روائی و جہانبانی خدا کے بندوں کا شیوہ نہیں۔ مقربینِ بارگاہِ خداوندی کا مسلک یہ ہے کہ وہ انتہائی عجز و انکسار، ضعف و ناتوانی، بے کسی و بیچارگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنی ”خودی“ کو فنا کر دیتے ہیں تاکہ ان میں نمودِ خویش کی آرزو تک باقی نہ رہے۔ یہ حضرات اپنے اس عقیدہ کی تائید میں اس قسم کی قرآنی آیات اور ان کا خودساختہ مفہوم پیش کر دیتے ہیں۔ زندگی کا یہ تصور قرآنِ کریم کے خلاف ہے اور عجمی سازشوں کا پیدا کردہ[1]۔ اس آیت (۲۸/۸۳) میں کہا یہ گیا ہے کہ متقین اور اہلِ جنت وہ ہیں جو دنیا میں علوّ نہیں چاہتے۔ اگر اس کا مفہوم وہ لے لیا جائے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے تو اس ارشادِ خداوندی کے متعلق کیا کہا جائے گا جس میں اُس نے مومنین سے کہا ہے کہ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ (۳/۱۳۹) ”تم مومنین ہو تو تمہیں سب سے بڑا علوّ حاصل ہوگا“ ان کے لئے اعلَون کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں سب سے بلند، سب سے اعلیٰ، سب پر غالب، سب سے اونچا۔ قرآنِ کریم مومنین کی نشانی یہ بتاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

مومنے بالاترے ہر بالا ترے　　غیرتِ اُو برنتابد ہمسرے

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آیت (۲۸/۸۳) میں جس علوّ سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت خود خدا نے کر دی جب کہا کہ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۴۱/۱۵)۔ ”قوم عاد نے الحق کے بغیر غلو اور استکبار حاصل کر رکھا تھا“ دوسری جگہ اس نے کفار اور اہلِ جنت کے متعلق کہا ہے۔ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ (۴۶/۲۰)۔ ”ان سے کہا جائے گا کہ تم نے دنیا میں حق کو

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب۔ شاہکارِ رسالتؐ۔ کا آخری باب

چھوڑ کر، غلبہ و اقتدار حاصل کیا۔ اس سے فساد برپا ہوا، اور اس کا نتیجہ یہ ذلت کا عذاب ہے جس میں تم اس بُری طرح سے گرفتار ہو"
(نیز دیکھئے ۱۴۴/۲ ؛ ۴۲/۲۳)۔ ان آیات میں دیکھئے۔ استکبار فی الارض بغیر الحق کو ناجائز اور وجہ فساد قرار دیا گیا ہے۔ جب غلبہ و اقتدار
کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو وہ علوّ ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ اور منشائے خداوندی کے مطابق ہوگا۔ وہ
نظام اس امر کا اعلان و اعتراف کرے گا کہ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۴۵/۳۷)
"خارجی کائنات میں بھی کبریائی خدا کی ہے اور انسانی زندگی میں بھی اسی کی"۔ یہ جو ہمارے (مسلمانوں کے) معاشرہ میں پانچ وقت

اللہ اکبر کا اعلان

بلند ترین مقام پر کھڑے ہو کر بآوازِ بلند اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اکبر، تو یہ اس امر کی شہادت ہوتی
ہے (یا ہوتی تھی) کہ کبریائی (اقتدارِ اعلیٰ) صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسانوں کا اقتدار اس کا عطا کردہ
اور اس کے پروگرام کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ یہ تھا اذان میں "اللہ اکبر" کے اعلان کا قرآنی مفہوم۔ لیکن آج (جب اسلام
دین کے بجائے مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے) اس کی بھی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ـــ رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی ـــ

(۲) ملوکیت، مذہبی پیشوائیت کی تائید و حمایت کے بغیر، قائم نہیں رہ سکتی۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے
جھکنے پر بطیبِ خاطر آمادہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے وہ ملوکیت کی کبریائی کو تسلیم ہی نہیں کرسکتا۔ مذہبی پیشوائیت اسے یہ تعلیم دیتی
ہے کہ "جسے تم اپنے سامنے مسندِ اقتدار پر جلوہ فرما دیکھ رہے ہو، یہ "ظل اللہ علی الارض" یعنی زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ ایشور

مذہبی پیشوائیت

کا اوتار ہے۔ خدا نے اپنے سارے اختیارات اسے تفویض کر دیئے ہیں۔ لہٰذا اس کے
سامنے جھکنا کسی انسان کے سامنے جھکنا نہیں، خود خدا کے سامنے جھکنا ہے۔ مذہبی
پیشوائیت عوام کے کانوں میں یہ سحر اس اصرار و تکرار سے پھونکتی رہتی ہے کہ انہیں فی الواقعہ انسانی کی شکل میں خدا نظر آنے لگ
جاتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ جابر اور سرکش حکمران جس قسم کا فساد جی چاہے مچاتا ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اس فساد انگیزی
میں مذہبی پیشوا برابر کے شریک ہیں۔ جب فرعون نے دیکھا کہ اس کے پاس حضرتِ موسیٰؑ کے دلائل کا کوئی جواب نہیں تو اس
نے مذہبی پیشواؤں کو بلایا اور کہا کہ وہ عوام پر ثابت کر دیں کہ فرعون برسرِ حق ہے اور (حضرت) موسیٰؑ ملک میں فساد مچانا
چاہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس آویزش کا انجام یہ بتایا ہے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ (۱۰/۸۱)۔ یہ مذہبی
پیشوا چاہتے تھے کہ فرعونیت کا فساد برقرار رکھیں لیکن حق کے مقابلہ میں ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے"۔ مذہبی
پیشوائیت کی فساد انگیزیوں کے متعلق ہم سردست اسی ایک اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ تفصیلات آگے چل کر سامنے آتی
رہیں گی۔

(۳) قوموں کے اجتماعی نظام میں سیاسی اور معاشی گوشوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر ایک گوشے میں بگاڑ ہے

معاشی نظام

تو دوسرے گوشہ میں بھی لازماً بگاڑ ہوگا۔ قرآنِ کریم کے معاشی نظام کے متعلق آیت (۲:۳) کے ذیلی عنوان "مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" کے تحت تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ ملخصاً اس نظام کی اساس ان مسلمات پر ہے کہ :-

(۱) خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو مخلوق کی زندگی اور پرورش کے سامان کا بھی ساتھ ہی انتظام کر دیا ہے۔ اسے رزق کہا جاتا ہے۔

(۲) اسبابِ رزق یا وسائلِ پیداوار کے متعلق اس نے واضح انداز میں کہہ دیا کہ ان کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیئے کہ کوئی متنفس ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔

(۳) یہ ہے وہ صحیح حالت جس پر وسائلِ رزق کو رہنا چاہیئے اور جس کے مطابق رزق کی تقسیم ہونی چاہیئے۔

(۴) اس میں فساد کی شکل یہ ہے کہ کوئی فرد یا افراد کا گروہ انہیں اپنی ذاتی ملکیت میں لے لے، اور پھر اس کی تقسیم اس طرح سے ہو کہ کسی کے پاس ضرورت سے کہیں زیادہ جمع ہو جائے اور دوسرے اپنی ضروریات سے محروم، لہٰذا ان لوگوں کے محکوم و محتاج ہو جائیں جنہوں نے ان ذرائعِ رزق کو اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے قرآنِ کریم اس اندازِ معیشت کو فساد کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اختصاراً کہتا ہے کہ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ (۲:۶۰) "خدا کے عطا کردہ رزق میں سے کھاؤ پیو، لیکن ملک میں فساد نہ مچاتے پھرو" جہاں تک ذرائع پیداوار کو ذاتی ملکیت میں لے لینے کا تعلق ہے، اس نے اقوامِ سابقہ میں سے قومِ ثمود کی داستان کو خاص طور پر بطورِ مثال پیش کیا ہے۔ اُس زمانے میں گلہ بانی ذریعۂ معیشت تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے چراگاہیں اور پانی کے چشمے بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ قومِ ثمود کے اربابِ اقتدار

قومِ ثمود کی فساد انگیزی

(سردارانِ قوم) نے انہیں اپنی ملکیت میں لے رکھا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ قوم کے نچلے طبقہ کے لوگوں کے مویشیوں پر ان کے دروازے بند رہتے تھے، اور کھلتے تھے تو انہی سردارانِ قوم کی مرضی اور مفاد کے مطابق۔ حضرتِ صالحؑ اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے اور انہوں نے سردارانِ قوم سے کہا کہ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ (۷:۷۴) "رزق کے یہ سرچشمے خدا کے عطا کردہ ہیں۔ اس بنیادی حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھو اور ملک میں فساد پیدا نہ کرو۔" انہوں نے کہا کہ تمہارے ذہن میں اصلاح کی شکل کیا ہے؟ حضرت صالحؑ نے کہا کہ بات واضح ہے۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ۔ (۷:۷۳) "یہ زمین بھی خدا کی ہے اور مویشی بھی خدا کے۔ خدا کی اس مخلوق کو خدا کی زمین میں کھلا چھوڑ دو کہ ان میں سے ہر ایک پیٹ بھر کر کھائے پیئے۔" انہوں نے زبانی تو اس کا وعدہ کر لیا لیکن اس پر قائم رہنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ رزق کی ناہمواریوں پر مبنی

نظام نے اس قوم کو تباہ کر دیا۔

جہاں تک اشیائے ضروریہ کی تقسیم کا تعلق ہے اسے عام طور پر تجارت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ نظامِ تجارت میں ناہمواریوں

تجارت میں فساد

کو بھی قرآن کریم نے فساد کہہ کر پکارا ہے اور اس کے لئے قومِ شعیبؑ کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ سورۃ ھود میں ہے کہ قومِ شعیب کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ انہوں نے ان سے کہا۔ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۔ (۱۱/۸۴) "اے لوگو! تم صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تم بڑی خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہو لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت معاشی ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس میں اصلاح پیدا کرو۔ اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو درست رکھو۔ اور ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آجائے گی جو تمہاری پوری کی پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی"۔ اس سے اگلی آیت میں اس کی پھر تاکید کر دی کہ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۔ (۱۱/۸۵) "اے لوگو! اپنے نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو۔ اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو ملک میں فساد برپا ہو جائے گا اور تمہارا معاشرہ تہس نہس"۔

(ضمناً) آیت (۲/۳) میں صلوٰۃ اور معاشی نظام کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس پر نگہ بازگشت ڈالئے آپ وہاں دیکھیں گے کہ حضرت شعیبؑ نے جب اُن سے کہا کہ وہ اقامتِ صلوٰۃ چاہتے ہیں تو وہ یہ سمجھ کر اس پر رضامند ہو گئے۔ کہ (حضرت شعیبؑ کا) اس سے مقصد اپنے طور پر پوجا پاٹ کرنا ہے۔ وہ اس پر رضامند ہو گئے لیکن جب صلوٰۃ کی حقیقت ان کے سامنے آئی تو انہوں نے بڑے تعجب سے کہا کہ اے شعیبؑ! یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۔ (۱۱/۸۷) "کہ ہم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کریں"۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، تقسیمِ رزق میں فساد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض افراد کے پاس بےشمار دولت جمع ہو جاتی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد (SURPLUS MONEY) یعنی ضرورت سے زائد دولت ہے۔ قرآن کریم نے قارون کو

نظامِ سرمایہ داری

اس نظام کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ اُس نے بےشمار دولت جمع کر رکھی تھی۔ صحیح نظام کی طرف دعوت دینے والوں نے اُس سے کہا کہ ہم تم سے یہ نہیں کہتے کہ تم اس میں سے اپنے لئے کچھ بھی نہ لو۔ تم اپنی ضروریات کے مطابق لو اور ضرور لو۔ لیکن اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ

فِي الْأَرْضِ ۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸/۷۷)۔ "جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کر کے تمہاری زندگی کو خوشگوار بنا دیا ہے اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کر کے ان کی زندگی کو بھی خوشگوار بناؤ، اور معاشرہ میں فساد پیدا نہ کرو۔ یہ روش خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے بڑی ناپسندیدہ ہے۔" اس کے جواب میں اس نے وہی کہا جو نظامِ سرمایہ داری کا ہر علمبردار کہتا ہے۔ قَالَ إِنَّمَا أُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ۔ (۲۸/۷۸) "میں نے یہ دولت اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے کمائی ہے۔ اس لئے اسے میں جس طرح میرا جی چاہے صرف کروں۔ اس میں خدا کا کیا دخل ہے اور کسی کو مجھ سے باز پرس کرنے کا کیا حق حاصل ؟" اس پر قرآن نے صرف اتنا تبصرہ کیا ہے کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس سے پہلے کتنے افراد اور کتنی اقوام ایسی تھیں جو دولت اور قوت میں اس سے کہیں بڑھ کر تھیں، لیکن ان کے نظام کا فساد، اس کثرتِ دولت و قوت کے باوجود انہیں لے ڈوبا۔

چونکہ آگے چل کر معاشی نظام کے مختلف گوشے جگہ بہ جگہ ہمارے سامنے آئیں گے، اس لئے ہم اس وقت انہی تصریحات پر اکتفا کرتے ہیں۔

جنسی بے راہ روی

(۴) قرآن کریم کی رو سے جنسی اختلاط کو حدودِ خداوندی کے تابع رکھنا کس قدر ضروری ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے جن دو تین جرائم کی سزا خود مقرر کی ہے، اِن میں زنا بھی شامل ہے (۲۴/۲)۔ جنسی عصمت کا قوموں کے عروج و زوال کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہے، اسے ہم آگے چل کر اپنے مقام پر بیان کریں گے۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ خود مغرب کے محققین بھی، اپنی مدت العمر کی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جو قوم حفاظتِ عصمت کی طرف سے لاپرواہ ہو جاتی یا غفلت برتتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندہ رہ سکتی ہے[1]۔

جنسی بدنہادی (PERVERSION) کی بدترین شکل اختلاطِ ہم جنس (HOMO-SEXUALITY) ہے جس قوم کی طرف حضرتِ لوطؑ مبعوث ہوئے تھے اُس میں یہ وبا عام تھی اور اسی بنا پر قرآن کریم میں اُسے بھی مفسدین کی قوم کہا گیا ہے (۲۹/۳۰)۔ جب "فساد" کی بنیادی تعریف یہ ہے کہ جس چیز کو جس حالت پر ہونا چاہیئے وہ اُس حالت پر نہ رہے۔ یعنی جس مقصد کے لئے اُسے استعمال کرنا چاہیئے وہ اُس کے لئے استعمال نہ کی جائے، تو ہم جنسی اختلاط سے بڑھ کر نمایاں فساد اور کون سا ہو سکتا ہے ؟

(۵) اب ہم فساد کی اس شکل کی طرف آتے ہیں جو اس وقت دنیا میں عالمگیر حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۔ (۱۰/۱۹)۔ "انسانوں نے جب تمدنی زندگی کا آغاز کیا تو وہ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد میں وہ خط جس کا عنوان ہے۔
"قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر"

وحدتِ انسانیت

ایک ہی گروہ، ایک ہی جماعت، ایک ہی قوم اور ایک ہی امت تھے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے اور خاندانوں اور قبیلوں میں بٹ گئے اور اس طرح نوعِ انسانی کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔" اس خود پیدا کردہ تفرقہ کا دور کرنا، فکرِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ وحی کی راہ نمائی ہی سے دور ہو سکتا تھا۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۔ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)۔ اس کے لئے خدا نے انبیاء کا سلسلہ جاری کیا جو لوگوں کو وحدتِ انسانیت کے خوشگوار نتائج کے مژدے سناتے اور تفرقہ کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتے تھے۔ اس کے لئے وہ زبانی وعظ ہی نہیں کرتے تھے۔ انہیں خدا کی طرف سے ضابطۂ قوانین بھی دیا جاتا تھا جس کی رو سے وہ انسانوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے، تفرقہ مٹا دیتے تھے۔" اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے آسمانی راہ نمائی کا منتہیٰ وحدتِ انسانیت ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کی عالمگیر تشکیل۔ اس کے لئے پہلے ایسے انبیاء کرام آتے رہے جو اپنے اپنے حیطۂ کار کے اندر اختلافات مٹا کر وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جب انسانیت اُس دور میں داخل ہوئی، جب ایک عالمگیر وحدت کا امکان ہو گیا تو خدا نے اپنے آخری نبیؐ کو آخری ضابطۂ ہدایت دیکر بھیجا۔ آپ قرآنِ کریم میں دیکھیں گے کہ اس دعوت کو "للناس" کہا گیا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کے لئے دعوت۔ سب سے پہلے اُس نے خدا کے قومی یا نسلی تصور کی جگہ اُسے رَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ۔ (۱۱۴/۱-۳) کہا یعنی کسی خاص نسل، گروہ، یا قوم کا رب اور الٰہ نہیں، تمام نوعِ انسان کا رب اور الٰہ۔ جو رسولؐ اُس خدا نے بھیجا اس کے متعلق بھی یہی کہا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۴/۲۸) "اے رسولؐ! ہم نے تجھے تمام عالمِ انسانیت کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن گروہ بندیوں اور قومیت اور وطنیت کے حدود میں گھرا ہوا ذہنِ انسانی اِس تصور کو جلدی سے نہیں اپنائے گا۔ وہ آہستہ آہستہ اس حقیقت کو سمجھ سکے گا۔"

اس رسولؐ کی وساطت سے اُس نے جو ضابطۂ قوانین (قرآن مجید) بھیجا اُس کے متعلق بھی وضاحت سے کہہ دیا کہ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (۴۵/۲۰)۔ "یہ کسی خاص نسل یا قوم کے لئے نہیں، تمام نوعِ انسان کے لئے وجۂ بصیرت ہے۔"

وحدتِ انسانیت کے منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے، اس نے، بطورِ آغاز کار جس قوم کی تشکیل کی (یعنی امتِ محمدیہ) اس کے متعلق بھی وضاحت کر دی کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۱۰) "تم بہترین امت ہو، جسے تمام نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔"

اس امت کے ہاتھوں جو نظام تشکیل ہونا تھا اس کا مرکز کعبہ قرار دیا گیا، اور کعبہ کے متعلق بھی اس امر کی وضاحت کر دی کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳/۹۵)۔ "دنیا میں وہ پہلا گھر جسے

نسلوں، خاندانوں، وطنوں اور قومیتوں کی انسانیت سوز گروہ بندیوں سے بلند ہے جا کر تمام عالمِ انسانیت کے لئے کھلا رکھا گیا ہے۔ وہ گھر کعبہ ہے جو مکہ مبارک میں واقع اور جو تمام اقوامِ عالم کے لئے ہدایت کا مرکز ہے" مقصد اس سے قِيٰمًا لِّلنَّاسِ۔ (۵/۹۷) ہے۔ یعنی اس نظام کا مرکز جس سے تمام نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائے"

"خیر و شر" کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے ہم بتا چکے ہیں کہ نفع اور نقصان کے اضافی معیاروں کی رو سے ہر فرد (یا زیادہ سے زیادہ) ہر قوم اپنے اپنے نفع کو سامنے رکھتی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے مستقل اقدار کے پیمانوں کے مطابق کہا کہ یاد رکھو:-

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)

"اسی نظریہ، اسی نظام، اسی مسلک کو بقا نصیب ہو سکتی ہے جس کا نصب العین کسی خاص فرد، گروہ یا قوم کا مفاد نہیں بلکہ تمام نوعِ انسان کی منفعت ہو" اقبالؒ کے الفاظ میں:-

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر	سودِ خود بیند، نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق، بینندۂ سودِ ہمہ	در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

ہم نے اس مقام پر قرآنِ کریم کے نصب العین — وحدتِ انسانیت — کے سلسلہ میں ایک ایک، دو دو حوالوں پر اکتفا کیا ہے، ورنہ قرآنِ مجید میں یہ تصریحات بکثرت بکھری پڑی ہیں۔ وہ اپنے اپنے مقام پر سامنے آئیں گی۔ یہاں بتانا صرف یہ مقصود تھا کہ سلسلۂ رشد و ہدایت کی اس آخری کڑی کا مقصد نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہے جس کی بنیاد ایمان (آئیڈیالوجی) کا اشتراک ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو نظریہ، جو تصور، جو عقیدہ اور جو نظام اس کے خلاف ہو گا یا اس کے راستے میں روڑے اٹکائے گا، وہ قرآنِ کریم کی رو سے وجۂ فسادِ آدمیت قرار پائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ خدا کی مقرر کردہ صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر دوسرے راستوں کی طرف نکل جانے والے لوگ وہ ہیں يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (۲/۲۷)۔ "کہ خدا نے جنہیں ملانے کا حکم دیا تھا وہ ان میں فرقہ پرستیوں، گروہ بندیوں، قومیت سازیوں کی خلیجیں حائل کرتے اور اس طرح کوشش کرتے ہیں کہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی انسانیت آپس میں ملنے نہ پائے" وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔ (ایضاً)۔ "یہی لوگ ہیں جو دنیا میں فساد برپا کرتے ہیں"۔

محمدؐ رسول اللہ والذین معہ نے وحی کی راہ نمائی میں اپنے حیطۂ کار کے اندر ان خلیجوں کو کس طرح پاٹا اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی انسانیت کو کس طرح آپس میں جوڑا — ان کے جسموں اور سروں ہی کو نہیں جوڑا بلکہ ان کے دلوں کو جوڑا کہ اصلی جڑنا دلوں کا جڑنا ہے۔ (۳/۱۰۲)۔ تاریخِ انسانیت اس پر شاہد ہے۔ انہوں نے رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی تفریقات کو مٹا کر

امتِ واحدہ کی تشکیل کی۔ اور اس طرح دنیا کو دکھا دیا کہ وحدتِ انسانیت کا قرآن کا پیش کردہ نظریہ یا تصور ناممکن العمل نہیں۔ لیکن

خود یہ اُمت ٹکڑوں میں بٹ گئی

اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے تذکرہ سے ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ وہی امت جو عالمگیر انسانیت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے کھڑی کی گئی تھی، خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پہلے اس نے دین کو مذہب سے بدل کر، مذہب میں مختلف فرقے پیدا کر لئے، اور اس کے بعد نسلوں اور وطنوں کے اختلاف کی بنیادوں پر مختلف قوموں میں بٹ گئی۔

وطن کے اختلاف کی بنیادوں پر جداگانہ قوموں کی تشکیل، یورپ کی پیدا کردہ لعنت تھی۔ لیکن ہم نے جو اوپر کہا ہے، نزولِ قرآن سے اُس دور کا آغاز ہوا جس میں (رفتہ رفتہ) انسان بہرحال یہ سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا کہ کون سا راستہ اُسے آخر الامر کس طرف لے جائے گا۔ یورپ نے باہمی حسد اور نفرت کی بنیادوں پر مختلف قومیتوں کی تشکیل کر لی۔ لیکن جب شدتِ جذبات میں تھوڑا سا سکون پیدا ہوا (یا یوں کہیے کہ جب اس نظریۂ قومیت کے تباہ کن نتائج سامنے آئے)، تو خود وہیں کے مفکرین چیخ چیخ کر پکار اُٹھے کہ یہ نیشنلزم (قومیت پرستی) ہمیں تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم یورپ کے

مفکرینِ مغرب کا واویلا

بہت سے مفکرین اور مدبرین کے اقوال اور آثار پیش کر سکتے ہیں، لیکن بغرضِ اختصار، یہاں دو چار پر اکتفا کیا جاتا ہے[1]

(ALDOUS HUXLEY) وہاں کا ایک مشہور مفکر ہے جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ وہ اپنی کتاب (SCIENCE, LIBERTY AND PEACE) میں لکھتا ہے:

> نیشنلزم، جسے ہم نے ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے، جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ یہ ان میں سے ہر قوم کا "مملکتی مذہب" ہے۔ یعنی خدا کے بجائے قوم کی پرستش، جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا، ان پچاس دیوتاؤں میں سے، ہر ایک دیوتا کا پجاری، باقی انچاس پجاریوں کو ملیکش تصور کرتا ہے نیشنلزم، اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقاید باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کی بجائے علیحدگی، انانیت، خود اکتفائیت کے عقاید پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں، اس کا وجوب ہوتا ہے۔
>
> یاد رکھیے! ہر نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے۔

---

[1] جو حضرات تفصیل دیکھنا چاہیں وہ میری تالیف — انسان نے کیا سوچا؟ — میں "سیاست" کا عنوان دیکھیں۔

نیشنلزم سے تنگ آکر وہاں کے مفکرین انسانیت کے جس نقشہ کے دیکھنے کے آرزومند ہیں، ایک ہلکی سی جھلک اس کی بھی دیکھتے جائیے۔ کیتھولک چرچ کا سابقہ اسقف (TEILARD-DE-CHARDIN) اپنی کتاب (BUILDING OF THE EARTH) میں لکھتا ہے:۔

اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کر دیں اور (مختلف ملکوں اور خطوں سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناتوں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسان کو اپنی آغوش میں لے لے۔

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کا آغاز امتِ واحدہ کی شکل میں کیا تھا۔ اس کے دکھوں کا علاج یہی ہے کہ یہ پھر سے امتِ واحدہ بن جائے۔ اس باب میں کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب میں، جس کا نام ہی اُس نے (THE COMMUNITY OF MAN) رکھا ہے، لکھتا ہے:۔

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتدا میں موجود تھی۔ لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جاسکتا ہے جو انسانوں کو باہمدگر جوڑ دے۔ انسانیت کی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

یہ مفکرین، جس عالمگیر برادری کو اس وقت نگہ تصور سے دیکھ رہے ہیں، اُس کی تشکیل کا طریق کیا ہوگا؟ اس کے متعلق، سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات (GUNNER MYRDAL) لکھتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہوسکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض پر کھنچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کی خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کرسکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔

اور اس کے بعد، یہ مفکر کہتا ہے کہ:۔

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔ (BEYOND THE WALFARE STATE)

اُس مذہب کے متعلق جس کا تصور (MYRDAL) کی روح کے نشیمن میں جلوہ بار ہے، امریکہ کا بین الاقوامی شہرت کا ماہرِ نفسیات (ERIC FROMM) لکھتا ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو:۔

انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دیگا۔ جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اُسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔

(THE SANE SOCIETY)

اگر (ERIC FROMM) یا اُس کے ہمنوا، دیگر اربابِ فکر کے سامنے قرآنِ مجید ہوتا تو وہ اس میں دیکھ لیتے کہ جس مذہب کی نمود کے وہ اس شدت سے آرزومند ہیں وہ پہلے سے اِس کتابِ عظیم کے اندر الدّین کی شکل میں موجود ہے لیکن چونکہ وہ محسوس شکل میں، غیر تو غیر، خود اس کتاب پر ایمان رکھنے کے مدعیوں کے ہاں بھی موجود نہیں' اس لئے وہ اس کی نمود کے منتظر ہیں۔ بیشک، بحالاتِ موجودہ اس کی نمود زمانے کے تقاضوں ہی کی رو سے ہوگی' اور اربابِ بصیرت کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ اس کے لئے اب کوئی لمبا عرصہ درکار نہیں ہوگا۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا!

بہرحال' یہ ہے وہ عالمگیر فساد، جس کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ کہا تھا کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔ (۳۰/۴۱) "انسانوں کے خود ساختہ نظاموں کی وجہ سے خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد برپا ہو گیا"۔ اُس دور کی امتِ مسلمہ (یعنی محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ) نے اس فساد کو اصلاح میں بدلا اور اسی جہت سے قرآنِ کریم نے انہیں مصلحین کہہ کر پکارا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مومنین اور کفار کی طرح 'مفسدین اور مصلحین' ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ (۲۸/۲۰) اور اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ان دونوں کی زندگی ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔ اَمْ

نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۔ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (۳۸/۲۸)۔ "ایسا ہو نہیں سکتا کہ ہم اُن لوگوں کو جو ایمان اور عملِ صالح کے پیکر ہوں، فساد برپا کرنے والوں کے برابر کر دیں یعنی متقین اور فجار ایک جیسے ہوجائیں" اگر ایسا ہوجائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو یونہی بیکار پیدا کر رکھا ہے (۳۸/۲۷) مفسدین کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ ان کے برعکس، وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۔ (۱۱/۱۱۷) "ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ خدا اُس بستی یا قوم کو تباہ کر دے جو مصلحین پر مشتمل ہو ایسا کرنا ظلم ہوگا۔ اور خدا کبھی ظلم نہیں کرتا" اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۔ (۷/۱۷۰) "ہم مصلحین کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔"

مصلحین

آخر میں سوال یہ سامنے آئے گا کہ یہ مصلحین کہا کن لوگوں کو جائے گا؟ ایسا بنا کس طرح جائے گا؟ قرآنِ کریم نے اس کا جواب دو لفظوں میں دے دیا ہے۔ وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۷/۱۷۰) "مصلحین وہ ہوتے ہیں جو قرآنِ کریم سے متمسک رہتے ہیں اور اس کی روشنی میں وہ نظام قائم کرتے ہیں جسے اُس نے صلوٰۃ کا نظام کہہ کر پکارا ہے۔

یہ نظام نہ کسی خاص مقام یا زمانہ تک محدود تھا اور نہ ہی ناممکن العمل۔ قرآنِ کریم خدا کی زندہ و پائندہ کتاب ہے اور اس میں قیامت تک یہ صلاحیت موجود ہے کہ اس کی رو سے ایسا نظام قائم کیا جا سکے جو دنیا کے فساد کو اصلاح میں بدل ڈالے۔

(۲/۱۳) اب قرآنِ کریم میں بیان کردہ مفسدین کی ایک اور ذہنیت ملاحظہ فرمایئے۔

(۲/۱۳) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ۔ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۔

ایمان کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے پہلے بتایا جا چکا ہے (دیکھئے ۲/۴) کہ قرآنِ کریم نے تمام انسانوں سے ایمان لانے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو خدا کے وجود ہی سے انکار کرتے تھے، اور وہ بھی جو خدا کے ساتھ اور خداؤں (دیوی دیوتاؤں، یا اپنی مقدس ہستیوں) کو بھی صفاتِ الوہیت کا حامل سمجھتے تھے۔ نیز اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) بھی، جو نہ صرف خدا پر ایمان کے مدعی تھے بلکہ قرآنِ کریم نے جو اجزائے ایمان بتائے ہیں (خدا۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ آخرت) ان پر بھی ایمان رکھنے کے دعویدار تھے۔ اُس نے ان سب سے کہا تھا کہ تم ان حقائق پر اپنے اپنے تصور کے مطابق ایمان رکھتے ہو لیکن صحیح ایمان وہی ہے جسے خود خدا نے اپنی غیر آمیزش شدہ وحی (قرآنِ کریم) میں بیان کیا ہے۔ اسی لئے

ان سے کہا تھا فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا (۲/۱۳۷) "اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں، جس طرح اے جماعت مومنین! تم ایمان لاتے ہو، تو پھر ان کے ایمان کو ایمان تسلیم کیا جائے گا" حتیٰ کہ اس نے ان مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کے لئے کہا، جن کا ایمان قرآنی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ لیکن اس آیت (۲/۱۳) میں جو منافقین سے کہا گیا ہے کہ تم اُس طرح ایمان لاؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں، تو اس میں ایک خاص امر کی طرف اشارہ ہے۔ جن دیگر افراد یا جماعتوں کو ایمان لانے کے لئے کہا گیا تھا ان میں سے کسی کی کیفیت یہ نہیں تھی کہ وہ دل میں کچھ اور رکھتے ہوں اور زبان سے کچھ اور کہتے۔ ان کے تصورات بے شک غلط تھے اور مبنی بر جہالت، لیکن ان کے قلب و آہنگ میں ہم آہنگی ضرور تھی۔ منافقین سے یہ کہا گیا ہے کہ تم اپنی مصلحت کوشی اور مفاد پرستی کے لئے اختیار کردہ دوُرخی پالیسی کو چھوڑو اور قلب و زبان میں ہم آہنگی پیدا کرو۔ انہوں نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ غور طلب ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ تو بیوقوف ہیں جو کھلے بندوں زبان پر وہی کچھ لے آتے ہیں جو ان کے دل میں ہوتا ہے۔ مصلحت بینی اور مفاد کوشی کے تقاضے یہ نہیں ہوتے۔ اس سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ عقلمند اسے کہا جاتا ہے جو اپنے نفع کی بابت سوچے اور مصلحت بینی اس کی بنیادی شرط ہے جس شخص کو اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہ ہو، اُسے تو پاگل کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم سے جو کہا جا رہا ہے کہ ہم بھی انہی لوگوں کی طرح ہو جائیں تو ہم ایسے بیوقوف نہیں۔ "سفاہت" کے معنی ہیں حماقت، بے وقوفی، عقل و فکر کی ناپختگی سب آجاتے ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں جہاں یہ تاکید کی گئی ہے کہ لین دین کے معاملات کو ضبطِ تحریر میں لے آیا کرو، اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر قرض دینے والا جس نے اس وثیقہ کو املا کرانا تھا، سفیہاً "ہو تو اُسے اس کا کارِ مختار املا کرا دے۔ یہاں سے واضح ہے کہ سفاہت سے مراد عقل کی ناپختگی ہے۔ (نیز دیکھئے (۴/۵) جس میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ عقل میں ناپختہ ہوں ان کے معاملات کی نگہداشت تم خود کیا کرو)۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ (۲/۱۳۰) "ملتِ ابراہیمی سے تو وہی شخص پہلو تہی کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو بیوقوف بنائے رکھنا چاہے" اس سے ظاہر ہے کہ عقل و فکر رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بیوقوف بنائے رکھنا بھی سفاہت میں داخل ہے۔

سفاہت کے معنی

جہاں تک منافقین کے اس جواب کا تعلق ہے کہ یہ لوگ جو مخلصانہ ایمان لاتے ہیں، وہ اپنا نفع نقصان بھی نہیں سوچتے اس کے متعلق ہم آیت (۲/۱۴) کے تابع مزید وضاحت کریں گے۔ یہاں ہم ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت نوحؑ نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو سب سے پہلے غریبوں کے طبقہ نے اس پر لبیک کہا۔ اس کے بعد جب آپ نے سردارانِ قوم کو خاص طور پر مخاطب کیا اور کہا کہ دیکھو! یہ لوگ خدا پر ایمان لے آئے ہیں،

دولت اور عقل

آؤ! تم بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ، تو انہوں نے جواب میں کہا کہ وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (۱۱/۲۷)۔ "جن لوگوں نے تمہارا دین اختیار کیا ہے۔ یہ تو یونہی سطحی سی عقل و فکر کے مالک ہیں۔ ان لوگوں کا فیصلہ بھی کوئی فیصلہ کہلا سکتا ہے۔ لہٰذا ان کی مثال پیش کرنے سے کیا حاصل عقل و دانش کے مالک ہم لوگ ہیں۔ ہمارا فیصلہ مبنی بر فہم و فراست قرار دیا جا سکتا ہے نہ کہ ان لوگوں کا جو ہمارے معاشرہ کے نچلے طبقہ سے متعلق ہیں۔"

اِس سے دولت مند طبقہ کی ذہنیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ دولت مند طبقہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کہ ہمارے پاس دولت ہی بافراط نہیں، عقل و دانش کے اجارہ دار بھی ہم ہی ہیں۔ جن کے پاس دولت نہیں ہوتی وہ سب احمق اور بیوقوف ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی بات ایسی نہیں ہوتی جس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

یہ بات حضرت نوحؑ کے زمانے کے سردارانِ قوم اور طبقۂ امراء نے کہی تھی، لیکن آپ دیکھئے کہ اِس طبقہ کی آج بھی یہی ذہنیت ہے۔ اور یہ ذہنیت نہ کسی خاص زمانے سے مخصوص ہے، نہ کسی خاص قوم سے۔ جب اور جہاں بھی دولت کو عزت وتکریم کا معیار قرار دیا جائے گا، طبقۂ امراء میں یہ ذہنیت پیدا ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم نے ان معیارات کو بدل دیا۔ اس نے کہا کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں واجب التکریم ہیں (۱۷/۷۰)۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین سیرت و کردار (اعمال) کی بنا پر ہونا چاہیئے (۴۶/۱۹)۔ اور اس معیار کے مطابق سب سے زیادہ واجب التکریم اُسے

معیارِ فضیلت

قرار پانا چاہیئے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے۔ (۴۹/۱۳)

قرآنِ کریم نے منافقین کے مندرجہ بالا جواب پر صرف اتنا سا تبصرہ کیا ہے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ عقل و فکر کے مالک ہم ہیں، وہ نہیں جو مخلصانہ انداز سے ایمان لائے ہیں، تو یہ بات ان کی خود فریبی پر مبنی ہے۔ اگر یہ علم و بصیرت کی بارگاہ سے فیصلہ طلب کریں تو وہ انہیں بتا دے کہ احمق اور بیوقوف یہ لوگ نہیں خود تم ہو جو اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ دورخی پالیسی کا انسان کی ذات پر کیا اثر پڑتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآنِ کریم ان کی اس روش کو سامنے لایا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

(۲/۱۴) وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۔

۲/۱۴

"جب یہ لوگ جماعتِ مومنین سے ملتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب پھر اپنے سرغنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم جو ان لوگوں سے جا کر ملتے ہیں تو آپ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم ان میں شامل ہو گئے

ہیں، قطعاً نہیں۔ ہم تو اُن کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

قرآنِ کریم نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ حضراتِ انبیاء کرام کی دعوت کا جواب مخالفین کی طرف سے کیا اور کیسا ملتا تھا۔ اس مخالفت میں دو اجزاء بطور قدرِ مشترک نظر آتے ہیں۔ یعنی تکذیب اور استہزاء۔ تکذیب، یعنی فریقِ مخالف کو جھوٹا قرار دینے کا تعلق انسانی ذہن سے ہے۔ لیکن استہزاء کا تعلق احساسات اور جذبات سے۔ آپ کسی شخص کے سامنے کوئی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ وہ آپ کے دعویٰ

استہزاء۔ پستی ذہنیت کی انتہا۔

کے خلاف دلائل پیش کرتا ہے اور اس طرح اُسے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ طریق فکری ہوگا اور آپ فکر و تدبر ہی کی رو سے اُسے قائل کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اگر صورت یہ پیدا ہو جائے کہ اُس کے پاس دلیل کوئی نہ ہو اور وہ آپ کا منہ چڑانے لگ جائے اور ہر بات ہنسی میں اڑا دے تو آپ سوچئے کہ اس کا آپ کے جذبات پر کیا اثر ہوگا؟ اور ایسے شخص کے متعلق کبھی یہ توقع کی جاسکے گی کہ وہ صحیح اور معقول بات کو تسلیم کرے گا؟ قرآنِ کریم نے بعض مقامات پر تکذیب اور استہزاء دونوں کا ذکر یکجا کیا ہے۔ جیسے كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۰:۱۰) "وہ لوگ جنہوں نے قوانینِ خداوندی کی تکذیب کی اور ان کا مذاق اڑایا"۔ اور بعض مقامات پر صرف استہزاء کا ذکر کیا ہے؛ اور رسول اللہ سے یہ کہا ہے کہ یہ مخالفین جو تمہارا استہزاء کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۳:۷) "دنیا میں کوئی نبی بھی ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ مخالفین استہزاء سے پیش نہ آتے ہوں"۔ (نیز دیکھئے ۶:۱۰)، جس میں کہا گیا ہے کہ تم سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ یہی ماجرا گزر رہا ہے۔)

استہزاء کا اثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے، یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ کمینہ صفت مخالفین نے ہر داعیٔ الی الحق کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے۔ اور دوسری طرف اس کی تاکید کی کہ تم ان باتوں کی وجہ سے دل برداشتہ نہ ہو جانا۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (۷۳:۱۰)۔ "جو کچھ یہ لوگ یہ کہتے ہیں، تم اس سے افسردہ خاطر مت ہو بلکہ اپنے مقام پر استقلال اور استقامت سے کھڑے رہو"۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ۔ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (۴۶:۳۵)۔ "تم ان کی اس قسم کی باتوں پر ویسے ہی استقلال و استقامت کا ثبوت دو جیسا اولوالعزم رسولوں نے دیا تھا"۔ یاد رکھو! اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۳۰:۶۰)؛ خدا نے تم سے جس قدر وعدے کر رکھے ہیں وہ پورے ہو کر رہیں گے۔ کیونکہ وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس لئے فَاصْبِرْ (۳۰:۶۰)۔ "اپنے پروگرام پر مستقل مزاجی سے ثابت قدم رہو"۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ۔ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (۷۳:۱۰)۔ "ان لوگوں کے ساتھ الجھو نہیں۔ یہ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ تمہارا وقت اور توانائی ان کی انہی باتوں کی مدافعت میں ضائع

ہوجائے۔ ان خار دار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے، نہایت حسن کارانہ انداز سے آگے بڑھ جاؤ۔ ان سے کنارہ کشی اختیار کرلو، لیکن یہ بھی، اِن جیسی پست سطح پر اتر کر نہیں۔ انہیں چھوڑ دو بھی تو نہایت حسین وجمیل طریقہ سے چھوڑو۔"

اس کے بعد ہے۔

(۲/۱۵) اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔

اِس کا لفظی ترجمہ یہ کیا جاتا ہے "یہ تم سے استہزاء کرتے ہیں تو اللہ ان سے استہزاء کرتا ہے۔ اور انہیں ان کی سرکشی میں اور آگے بڑھاتا جاتا ہے۔ یہ عقل کے اندھے ہیں"؟ ایسی آیات کا جن میں اس قسم کی باتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، صحیح مفہوم کیا ہے، اس کے متعلق ہم آیت (۲/۷) کے تحت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۲/۷) کے ضمن میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اُسے پھر سے سامنے لائیے، بات صاف ہوجائے گی۔ زیرِ نظر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ لوگ آیاتِ خداوندی سے استہزاء کرتے اور انہیں پیش کرنے والے داعیان الی الحق کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ان کی اس قسم کی احمقانہ روش پر ہنستا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ آنکھیں رکھنے کے باوجود جس اندھے پن کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں اس میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ عقل وفکر کی بنیادوں پر کسی صحیح بات کی مخالفت کریں، ان سے توقع کی جاسکتی ہے کہ کسی مقام پر جاکر، بات ان کی سمجھ میں آجائے اور وہ رک جائیں لیکن جو لوگ جذبات کی پست ترین سطح پر اتر کر معقول باتوں کو ہنسی مذاق میں اڑانے کا شیوہ اختیار کریں، اور اس میں انتہائی لذت محسوس کریں، ان کے کسی مقام پر رُک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ (۲/۱۰) میں کہا گیا ہے، منافقین، منافقت سے جس قدر زیادہ کام لیتے ہیں، اسی قدر ان کا مرض بڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں کہا کہ جس قدر یہ لوگ استہزاء میں بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر ان کا اندھا پن زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

چلتے چلتے، عربی زبان کے دو مادوں کا لطیف سا فرق بھی دیکھتے جائیے۔ مادہ (ع۔ م۔ ی) کے عمومی معنے ہوتے ہیں آنکھوں کی بینائی کا جاتے رہنا۔ اور مادہ (ع۔ م۔ ہ) بصیرت کے اندھے پن کو کہتے ہیں۔ یہ انسان کی وہ کیفیت ہوتی ہے جس میں اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ معاملہ پیشِ نظر کے متعلق کیا کیا جائے۔ اور اس وجہ سے وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں حیران وششدر کھڑا ہوجائے۔ اس آیت میں يَعْمَهُوْنَ (مادہ ع۔ م۔ ہ) کہا گیا ہے۔

یہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس روش کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے "طغیان" میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس لفظ (طغیان) کا مادہ (ط، غ، ی) یا (ط، غ، و) ہے۔ اس کے بنیادی معنے ہوتے ہیں حد اور پیمانے سے باہر ہوجانا۔ پانی جب تک دریا کے اندر رہے، دریا ہے اور اس کا نتیجہ منفعت بخش،

طغیان

لیکن جب اس کے ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جائے تو اسے طغیانی یا سیلاب کہا جاتا ہے جو تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانی قوتیں اور صلاحیتیں اگر خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال میں لائی جائیں تو ان کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ ان حدود سے سرکشی اختیار کریں تو ان کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سرکش اور مستبد ارباب اقتدار کے متعلق قرآن نے یہی کہا ہے۔ مثلاً جب حضرت موسیٰؑ کو نبی مہم کے لئے مامور کیا گیا تو ان سے کہا گیا کہ:۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۲۴)۔ "فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ بڑا ہی حدود فراموش ہو گیا ہے"۔ قوم ثمود کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ انہوں نے معاشی نظام میں کس قدر بگاڑ پیدا کر دیا تھا۔ ان کے متعلق کہا۔ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ۔ (۶۹/۵ نیز ۹۱/۱۱)۔ "ان کی یہ سرکشیاں انہیں لے ڈوبیں"۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۚ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۷/۱۸۶)۔ "جو لوگ خدا کی راہ نمائی کو چھوڑ دیتے ہیں تو انہیں پھر کہیں سے بھی راہ نمائی نہیں مل سکتی۔ انہیں ان کی سرکشی میں چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ راستہ کی تلاش میں اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتے پھریں"۔

سورۃ الرحمٰن میں، نوع انسانی کو چار الفاظ میں ایسی راہ نمائی دی گئی ہے کہ جوں جوں انسانی اس کی گہرائی میں جاتا ہے، اس کی بصیرت رقص کرنے لگتی ہے۔ پہلے کہا۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (۵۵/۷)۔ "تم خارجی کائنات پر غور کرو۔ تم دیکھو گے کہ یہ محیر العقول کارگاہ اس حسن و خوبی سے اس لئے مصروف عمل ہے کہ اس میں جو توازن پیدا کیا گیا ہے اس میں کبھی فرق نہیں آتا"۔ اور اس کے بعد کہا۔

میزانِ عدل قائم رکھو

اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ (۵۵/۸)۔ "تمہارے سامنے خارجی کائنات کے حسن نظم کی مثال اس لئے پیش کی گئی ہے کہ تم بھی اپنے معاشرے کو حدود خداوندی کے تابع رکھو اور اس طرح اس کی میزانِ عدل میں بگاڑ نہ پیدا ہونے دو"۔ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (۵۵/۹)۔ "اس توازن کو عدل و انصاف کی رو سے قائم کرو اور اس طرح ترازو کے پلڑوں کو بالکل سیدھا رکھو۔ ڈنڈی مت مارو"۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰)۔ "اس توازن کو برقرار رکھنے کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ ہم نے جو وسائلِ پیداوار عطا کئے ہیں وہ تمام مخلوق کی منفعت کے لئے ہیں۔ انہیں تمام مخلوق کی منفعت کے لئے کھلا رکھو"۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں فساد پیدا کرتے ہیں۔ انہیں ان کے "طغیان" میں ششدر و حیران چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اس سے مفہوم کیا ہے۔

منافقین کی ان علامات و خصوصیات کے بیان کرنے کے بعد اس کا ملخص اگلی آیت میں یوں پیش کر دیا کہ:

(۲/۱۶) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۔

۲/۱۶

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت بیچ کر گمراہی خریدلی تو ان کی اس تجارت نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا. کیونکہ زندگی کا صحیح راستہ ہی ان کی نگاہوں سے گم ہوگیا؟ اس آیت میں بات تو ایسی کی گئی ہے جیسے ہم روزبیان کرتے اور ایکدوسرے سے کہتے رہتے ہیں، لیکن اس کے اندر بڑے عظیم حقائق اور عمیق معارف پوشیدہ ہیں۔

ہم نے آیت (۲/۱۱) کی تشریح کرتے ہوئے اصلاح اور فساد کے ضمن میں یہ کہا تھا کہ (WHAT IS) کا مسئلہ تو بڑا آسان ہے۔ لیکن (WHAT OUGHT TO BE) کا سوال ایسا ہے جس کے حل کے لئے فکرِ انسانی اپنے اولین ایام شعور سے لے کر آج تک انتہائی متجسس و مضطرب ہے. لیکن وہ کسی حتمی اور اطمینان بخش نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔

خیر و شر کا مسئلہ

اس مسئلہ کو فلسفہ کی اصطلاح میں (GOOD AND EVIL) کا مسئلہ کہا جاتا ہے جس کے لئے عربی زبان اور قرآنِ کریم میں خیر اور شر کی اصطلاحات آئی ہیں۔ عام فہم الفاظ میں اسے نفع اور نقصان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دنیا میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ ایسے کام کرے جو اس کے لئے نفع بخش ہوں اور ان امور سے محترز رہے جو اس کے لئے نقصان دہ ہوں. لیکن یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ نفع کہتے کسے ہیں، اور نقصان کسے؟ بالفاظِ دیگر، انسانی فکر گھوم گھما کر پھر اسی اولین نقطہ پر آکر رک جاتی ہے کہ "کیا ہونا چاہیئے" کا اطمینان بخش حل کیا ہے. انسانوں نے نفع اور نقصان کے اپنے اپنے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ مثلاً ایک دکاندار کسی چیز کو لاگت سے دو روپے

نفع اور نقصان کے پیمانے

زیادہ میں فروخت کرتا ہے تو کہا جائے گا کہ اُسے اس سودے میں نفع ہوا۔ یہاں نفع اور نقصان کے ماپنے کا پیمانہ اس کی لاگت ہے۔ اس قسم کے نفع یا نقصان کو اضافی یا (RELATIVE) کہا جاتا ہے. ہوسکتا ہے کہ ایسے کاروباری حالات پیدا ہوجائیں جن میں یہ دکاندار اُس چیز کو لاگت سے کم میں بیچنے میں بھی اپنا نفع محسوس کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نفع اور نقصان کے اس قسم کے اضافی معیار بدلتے رہتے ہیں. لیکن فکرِ انسانی ایسے نفع و نقصان میں غلطاں و پیچاں چلی آرہی ہے جو اضافی نہیں بلکہ مطلق ہوں۔ یعنی (ABSOLUTE GOOD) اور (ABSOLUTE EVIL) ــ مطلق، یعنی جو ہر حالت میں خیر (نفع بخش) یا ہر حالت میں شر (نقصان رساں) ہو۔ جیسا کہ کہا جاچکا ہے، فکرِ انسانی اس حل تک پہنچنے میں ابھی تک ناکام ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے :-

آدمی اندر جہانِ خیر و شر   کم شناسد نفعِ خود را از ضرر

کس نہ داند زشت وخوب کار چیست جادۂ ہموار و ناہموار چیست

دوسری جگہ وہ زمانۂ حاضر کے انسان کے متعلق کہتے ہیں:۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ فکرِ انسانی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ خیرِ مطلق اور شرِ مطلق کو متعین کر سکے۔ ایسا صرف وحیٔ الٰہی کر سکتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اپنی فکر وجذبات کی رو سے فیصلہ کرنے والے انسان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ (۲/۲۱۶) "بسا اوقات وہ ایسی باتوں کو ناپسند کرتا ہے جو درحقیقت اس کے لئے خیر یعنی منفعت بخش ہوتی ہیں اور ان باتوں کو پسند کرتا اور عزیز رکھتا ہے جو اس کے لئے نقصان رساں ہوتی ہیں" اور اس کے بعد کہا کہ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲/۲۱۶) "کیا چیز تمہارے لئے فی الحقیقت منفعت بخش ہے اور کیا چیز نقصان رساں، یہ تم از خود نہیں جان سکتے۔ اسے صرف اللہ جانتا ہے" دوسری جگہ ہے۔ وَیَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ۭ وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷/۱۱) انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ خیر کی جگہ شر کو آوازیں دے دیکر بلاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ بڑا جلد باز واقع ہوا ہے" یہ صرف اپنے پیش پا افتادہ (عاجلہ) مفاد کو دیکھتا ہے اور مستقبل تک اس کی نگاہ نہیں جاتی۔

انسان اس معیارِ خیر و شر کو از خود کیوں نہیں دریافت کر سکتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کو اپنی (خواہ وہ انفرادی ہو یا گروہ بندانہ) مفاد پرستی کے جذبات سے الگ کر ہی نہیں سکتا اس لئے اس کا وضع یا متعین کردہ معیار اضافی ہوگا مطلق نہیں ہو سکتا۔ خیر و شر کی فلسفیانہ بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، ہم مختصر اور عام فہم الفاظ میں یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مستقل اقدار اور غیر متغیر اصول متعین کر دیئے ہیں اور انہیں وحی کے ذریعہ انسانوں تک پہنچا دیا ہے۔ ہر وہ کام جو ان اصول و اقدار کے مطابق ہوگا، خیر یا منفعت بخش ہوگا۔ جو ان کے خلاف ہوگا وہ شر یا نقصان رساں ہوگا۔

نفع نقصان کا حقیقی معیار

مثال کے طور پر ایک شخص تھوڑا سا جھوٹ بول کر یا فریب دے کر، ہزاروں روپے اکٹھے کر لیتا ہے۔ دوسرا شخص صداقت اور امانت کی اقدار کا پابند رہتے ہوئے اپنے کاروبار میں نقصان اٹھاتا ہے (جیسا کہ غلط معاشرہ میں عام طور پر ہوتا ہے)۔ انسانوں کے خود ساختہ معیار کے مطابق، اول الذکر نے بڑا منفعت بخش سودا کیا ہے۔ اور دوسرے نے بڑا نقصان اٹھایا۔ یہ فیصلہ انسانوں کے خود ساختہ معیار کی رو سے کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس وحیٔ خداوندی کا فیصلہ یہ ہے کہ چونکہ پہلے شخص کا یہ عمل مستقل اقدار کے خلاف ہے اس لئے شر یعنی نقصان رساں۔ اور دوسرے کا عمل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہونے کی وجہ سے خیر، یعنی منفعت بخش ہے۔ اُسے شر اور اِسے خیر قرار دیتے ہیں ان کے مالی نفع اور

نقصان کا سوال نہیں. سوال اُس نفع یا نقصان کا ہے جو ان افراد کی ذات کو ہوا. اِسی سے نیکی اور بدی، بھلائی اور برائی، ثواب اور عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے. نیکی، بھلائی اور کارِ ثواب وہ کام ہیں جن سے اس کی ذات کی نشو ونما اور استحکام ہو. بدی، برائی اور عذاب کے کام وہ جن سے اُس کی ذات کی نشو ونما رک جائے اور وہ کمزور ہو جائے. یہ الگ بات ہے کہ ذات کے استحکام کیساتھ دنیاوی مفاد بھی حاصل ہو جائیں. اسلامی نظام ہی کا خاصہ ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ منافقین نے یہ کہا تھا کہ جو لوگ دیانت اور امانت سے صداقتوں پر ایمان لے آتے اور ان اقدار پر کاربند رہتے ہیں وہ بیوقوف ہیں. عقلمند وہ ہیں جو ان اقدار کی پرواہ کئے بغیر (خواہ زبان سے ان کا اقرار کرتے رہیں) سوچتے یہ ہیں کہ ہمارا نفع یا نقصان کس بات میں ہے. غلط معاشرہ میں ایسا ہی ہوتا اور ایسا ہی کیا جاتا ہے. آج بھی جو شخص یہ کہے کہ میں پوری پوری دیانت داری سے کاروبار کرنا چاہتا ہوں، ہر کاروباری ذہنیت اس پر ہنسے گی اور کہے گی کہ یہ شخص بالکل احمق ہے کاروباری اصولوں کو جانتا ہی نہیں. یہ نقصان اٹھائے گا، تباہ ہو جائیگا.

ان کے برعکس، مومنین ہر حال میں اقدارِ خداوندی پر جمے رہتے اور اس کے متعین فرمودہ غیر متبدل اصولوں کی پیروی کرتے ہیں؛ خواہ اس میں انہیں تکلیفوں پر تکلیفیں اٹھانی، اذیتوں پر اذیتیں برداشت کرنی، اور ہر قسم کے خطرات کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے. جب عام مومنین کی یہ روش ہوتی ہے تو آپ سوچئے کہ ان کے امام (خود رسولؐ) کی اس باب میں کیا کیفیت تھی. وہ دنیا کی تمام ترغیبات کو ٹھکراتا، ہر قسم کی اذیتیں نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتا اور ہر طرح کے نقصان کو بطیب خاطر قبول کرتا، اپنے پروگرام پر گامزن رہتا تھا. دنیاوی نفع ونقصان کو معیار قرار دینے والوں کے نزدیک اس کی یہ روش "پاگل پن" نہیں تو اور کیا قرار پاتی؟ اسی لئے وہ کہتے کہ اِنَّہٗ لَمَجۡنُوۡنٌ (۶۸/۵۱). "یہ تو بالکل پاگل اور دیوانہ ہے". یہ ماجرا کسی ایک رسول کے ساتھ نہیں گزرا. وہ ہر رسول کے متعلق یہی کہتے تھے. قَالُوۡا سَاحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ.

وہ رسول اللہ کو مجنون کہتے

(۵۱/۵۲). "یہ، یا تو (معاذ اللہ) پرلے درجے کا فریب کار ہے اور یہ سب کچھ دکھاوے کی خاطر کرتا ہے، اور اگر ایسا نہیں تو پھر اس کے پاگل ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟" — حالانکہ یہ وہ دیوانگی تھی جس پر ہزار فرزانگی قربان کی جا سکتی ہے!

دنیا کے بازار میں، بیع و شریٰ (خرید و فروخت) میں نفع نقصان کے یہی الگ الگ معیار ہیں جنہیں قرآن کریم نے زیر نظر آیت (۲/۱۶) میں بیان کیا ہے اور جس کے متعلق کہا ہے کہ ان کی تجارت نے انہیں کچھ بھی فائدہ نہ دیا. حالانکہ وہ اپنے معیار کے مطابق سمجھتے تھے کہ ان کا یہ سودا بڑا ہی منفعت بخش رہا. اس بیع و شریٰ کی مثالیں قرآن کریم میں متعدد دیگر مقامات پر بھی آئی ہیں. ان میں سے دو چار ہم یہاں پیش کرتے ہیں.

لیکن ان مثالوں سے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ "نفع اور نقصان" کی اس تعریف (DEFINITION)

کو سامنے رکھیں، جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یعنی نفع یا نقصان کا حقیقی معیار، انسانی ذات کا نفع یا نقصان ہے۔

انسانی ذات

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کفر کی رو سے، انسانی زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس لئے اس میں نفع وہ ہے جس سے دنیاوی مفاد حاصل ہوں۔ اور نقصان وہ جس میں یہ مفاد حاصل نہ ہوں۔ انسانی ذات کا تصور ان کے ہاں ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے اس کے نفع و نقصان کا سوال ان کے سامنے آ ہی نہیں سکتا۔

دنیا کے مقابلہ میں آخرت

(جیسا کہ سورۃ فاتحہ کی تشریح کرتے ہوئے بتایا جا چکا ہے) قرآنی نظریۂ حیات کی رو سے انسانی زندگی عبارت ہے، اس کے جسم اور اس کی ذات سے۔ جسم کا تعلق طبیعی یا مادی دنیا سے ہے، اس لئے اس کے طبیعی جسم کی نشوونما اور استحکام کے لئے وہ مفاد بھی ضروری ہیں جن سے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ جب قرآنی نظام قائم ہو جائے تو اس میں انسان کو یہ دونوں مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر حق و باطل کی آویزش میں ایسا مقام آجائے جہاں دنیاوی مفاد اور انسانی ذات کے مفاد میں ٹکراؤ یا تصادم پیدا ہو تو اس وقت دنیاوی مفاد کے مقابلہ میں، انسانی ذات کے مفاد کو ترجیح دینی چاہیئے۔ اسی کو قرآن کریم کی اصطلاح میں "دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دینا" کہا جاتا ہے۔

دین جب مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں نہ دنیاوی مفاد حاصل ہوتے ہیں نہ انسانی ذات کے مفاد۔ اسے قرآن، دنیا اور آخرت دونوں میں نقصان سے تعبیر کرتا اور 'خسرانِ مبین' کہہ کر پکارتا ہے۔

نفع و نقصان کے اس قرآنی تصور کے بعد، قرآن کریم کی پیش کردہ مثالیں سامنے لائیے۔

(۱) سورۃ الصف میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ۔ (۶۱/۱۰)۔ "اے وہ لوگو! جو ایمان لاتے ہو! کیا ہم تمہیں ایک ایسے کاروبار کا پتہ نشان بتائیں، جس میں کبھی نقصان کا احتمال نہ ہو اور اس طرح تمہیں اس الم انگیز عذاب سے بچا لے جو کاروبار کے نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے۔" وہ کاروبار یہ ہے کہ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۶۱/۱۱)
"تم خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ[1]۔ یعنی اس نظامِ خداوندی کی صداقت اور حکمیت پر پورا پورا یقین رکھو جو اس کے رسولؐ کے ہاتھوں متشکل ہو رہا ہے۔ اس کے قیام و استحکام کے لئے پوری پوری جدوجہد کرو۔ اس کے لئے اپنا مال اور دولت بھی صرف کر دو اور ضرورت پڑنے پر اپنی جانیں تک بھی لٹا دو۔ اگر تم علم و بصیرت سے کام لے کر غور کرو گے تو تمہیں نظر آجائے گا کہ یہ

[1] دیکھئے۔ یہاں مخاطب جماعتِ مومنین کو کیا گیا ہے۔ اور ان سے کہا گیا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اس کی وضاحت ۴/۱۳۶ میں کی جا چکی ہے۔

کاروبار کس قدر منفعت بخش ہے۔ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۶۱/۱۲)۔ "یہ نظام تمہارے لئے ایسا سامان مہیا کر دے گا جس سے تم ان تباہیوں سے بچ جاؤ گے جو تمہارے پیچھے لگی رہتی ہیں۔ اور تمہیں ایسی جنتی زندگی عطا کر دے گا جس کی تر و تازگی میں کبھی کمی واقع نہیں ہوگی ۔۔ (تمثیلاً) سدا بہار باغات کے اندر نہایت پاکیزہ رہنے کے گھر۔ یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے جسے نصیب ہو جائے۔" وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۔ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ ۔ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۶۱/۱۳)۔ "ان کے علاوہ ایک اور چیز بھی جسے تم بہت پسند کرتے ہو، یعنی دیارِ عرب ہی میں نہیں بلکہ اس سے باہر دیگر مقامات میں بھی تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی۔" (۳/۶۱)۔ اس کے لئے تمہیں قانونِ خداوندی کی پوری پوری تائید و نصرت حاصل ہوگی جس سے کامیابی کی راہیں یکے بعد دیگرے تمہارے سامنے کھلتی جائیں گی۔ اے رسولؐ! تم اپنے رفقاء (جماعتِ مومنین) کو یہ مژدۂ جانفزا سنا دو۔ ۔۔ یہ مژدہ کہ اس سے تمہاری دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں گے۔ تمہیں دنیاوی مفاد بھی حاصل ہو جائیں گے اور تمہاری ذات سے متعلق مفاد بھی۔" یہی وہ تجارت ہے جس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (۳۵/۲۹)۔ "یہ وہ تجارت ہے جس میں کبھی خسارہ نہیں ہو سکتا۔"

(۲) کاروبار، خرید و فروخت ہی کا دوسرا نام ہے۔ مومنین کے سلسلہ میں اس خرید و فروخت کی صورت کیا ہوتی ہے اُس کے متعلق سورۃ توبہ میں وضاحت کر دی گئی جب کہا۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)۔ "اس کاروبار کے لئے خدا اور مومنین کے مابین ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی رو سے مومنین اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور اس کے عوض خدا انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے۔" اس کاروباری معاہدہ کے متعلق کہا۔ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ (۹/۱۱۱)۔ "اے جماعتِ مومنین! تم اپنے اس سودے پر، جو تم نے خدا سے کیا ہے، جشنِ مسرت مناؤ۔ اس لئے کہ یہ زندگی کی سب سے بڑی کامرانی ہے۔"

مومنین اور خدا کا معاہدہ

ایک شخص اجزائے ایمان کے اقرار سے حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے لیکن وہ مومن بنتا ہے خدا کے ساتھ اُس معاہدہ کی رُو سے، جسے اُسے زندگی بھر نبھانا ہوتا ہے۔ اسی معاہدہ کی رو سے جماعتِ مومنین کی زندگی کے متعلق قرآنِ کریم کہتا ہے وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ۔ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۲/۱۵۵-۱۵۶)۔ "اس میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا، کہیں سامانِ خورد و نوش کی کمی ہوگی، کہیں مال اور جان کا نقصان ہوگا، کہیں

کھیتیاں اور باغات اجڑیں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن آخر الامر فتح و کامرانی کی خوشخبریاں ان کے لئے ہوں گی جو اس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے۔ اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں ان کی نگاہیں اس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا

مقتولین فی سبیل اللہ

مقصدِ زندگی نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ اس کے لئے ہم نے اپنا مال اور جان وقف کر رکھا ہے۔ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں، ہمارا قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا۔ (۹/۵۹)۔ یہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے" اور اس کے بعد ہے۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۲/۱۵۷)۔ "یہی وہ انقلابی جماعت ہے جو اپنے نشوونما دینے والے کے نزدیک مستحقِ ہزار تبریک و تہنیت ہے۔ خدا اور اس کے ملائکہ ان پر تحسین و آفرین کے پھول برساتے ہیں (ان پر درود و سلام بھیجتے ہیں)، (۳۳/۴۳؛ ۳۳/۵۶)۔ انہی کے لئے سامانِ نشوونما کی فراوانیاں اور الطاف و کرم کی بارشیں ہیں اور ان کا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ یہی ہیں وہ خوش نصیب جن کے متعلق کہا۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (۲/۱۵۴)۔ "جو اس جدوجہد میں جان دے دیتا ہے وہ مرتا نہیں، حیاتِ جاوداں سے بہرہ یاب ہوجاتا ہے۔ اس کا جسم تو ضرور وفات پا جاتا ہے لیکن اس کی ذات آگے بڑھ جاتی ہے۔ مرنے کے بعد اس کی زندگی کیسی ہوتی ہے، تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کا ادراک نہیں کرسکتے" دوسرے مقام پر کہا۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ (۳/۱۶۸)۔ "ان کے متعلق یہ گمان تک بھی نہ کرو کہ وہ مر گئے۔ وہ خدا کے ہاں زندہ ہیں اور اس کے ہاں سے انہیں سامانِ رزق بھی عطا ہوتا ہے"۔ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۳/۱۶۹)۔ "وہ اپنے بلند مقامات کو دیکھ کر، جو انہیں عنایتِ خداوندی سے ملتے ہیں، بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور اس احساس سے کہ ان کی قربانی سے ان کے اُن رفقاء کے لئے، جو ان کے بعد دنیا میں موجود ہیں، ایسا معاشرہ قائم ہوگیا ہے جس میں وہ ہر طرح کے خوف و حزن سے مامون ہیں، ان کی خوشی دوبالا ہوجاتی ہے"۔ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ (۳/۱۷۰)۔ "وہ ان آسائشوں اور راحتوں سے، جو نوازشاتِ خداوندی سے انہیں حاصل ہوتی ہیں، بیحد خوش ہوتے ہیں۔ نیز اس حقیقت سے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا کسی ایمان والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتا، اس کا پورا پورا بدلہ دیتا ہے"۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اِس کاروبار میں منفعت ہی منفعت حاصل ہوتی ہے۔ جو کچھ وہ بیچتے ہیں اس کا تعلق اِس دنیا سے ہوتا ہے جو بہرحال فانی ہے۔ لیکن جو کچھ انہیں اس کے عوض ملتا ہے وہ جاوداں، پیہم رواں ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں

جو تصادمات کے انتہائی شدید مقامات پر بھی اِک تبسم جاں فروز کے ساتھ انتہائی وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھتے ہیں کہ۔

اے دل! بہ تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں!

جان دینے والوں کو اُخروی جنت مل گئی، اور ان کا خون بہا، ان کے رفقار کے لئے استخلاف فی الارض — اس دنیا میں اقتدار و حکومت کی شکل میں سامنے آگیا (۲۴/۵۵)۔ اس طرح اس جماعت کے افراد کو ذات کا استحکام اور دنیاوی مفاد دونوں حاصل ہوگئے۔ سوچئے کہ کس قدر منفعت بخش ہے یہ کاروبار جو خدا کے ساتھ کیا جاتا ہے — یہ ہے اسلام، یہ ہے الدّین۔ ان کے برعکس،

ان کے برعکس

وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲/۸۶)۔ "وہ دنیاوی زندگی کے مفاد کی خاطر اپنی آخرت بیچ ڈالتے ہیں۔ یعنی وہ مستقل اقدار کو پامال کر کے دنیاوی مفاد حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ ہیں جو زندگی بیچ کر موت خریدتے ہیں اور اس طرح مستقل عذاب میں رہتے ہیں۔ اور ان کا کوئی ایسا مددگار نہیں ہوتا جو انہیں اس عذاب سے چھڑا سکے۔" دوسری جگہ کہا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ۔ (۳/۷۶) "وہ لوگ جو خدا کے ساتھ باندھے ہوئے اپنے عہد کو اور اس کے استوار رکھنے کے لئے اٹھائی ہوئی قسموں کو دنیاوی زندگی کے مفاد کے عوض بیچ ڈالتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ان کی ذات تباہ ہو جاتی ہے اور آخرت کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔"

اس قسم کا کاروبار کرنے والوں میں مذہبی پیشوائیت سرفہرست ہوتی ہے۔ یہ ہیں وہ جنہیں مخاطب کر کے کہا گیا کہ۔

مذہبی کاروبار کرنے والے

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ (۲/۴۱)۔ "تم ہماری آیات کو، ثمنِ قلیل، حقیر سی قیمت کے عوض مت بیچو۔ اپنے اس سودے کے انجام سے ڈرو۔" ان کا کاروبار یہ ہوتا ہے کہ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ۔ (۲/۷۹)۔ "وہ اپنی طرف سے فتوے لکھتے ہیں اور پھر انہیں یہ کہہ کر حقیر سی رقم کے عوض، لوگوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ یہ شریعتِ الٰہیہ ہے۔" اور خدا ان کے متعلق کہتا ہے کہ "جو کچھ یہ لوگوں کو لکھ کر دیتے ہیں وہ بھی تباہ کن ہوتا ہے اور اس طرح یہ جو کمائی کرتے ہیں وہ بھی تباہ کن۔"

ان آیات (اور انہی جیسی دیگر متعدد آیات) میں خدا نے کہا ہے کہ تم ہماری آیات کو ثمنِ قلیل کے عوض مت بیچو۔ اس

کے یہ معنی نہیں کہ ان کے عوض تھوڑے سے پیسے مت لو، کثیر رقم حاصل کیا کرو۔ یہ غلط ہے۔ قرآنِ کریم متعدد مقامات پر بتاتا ہے کہ

ثمنِ قلیل سے مراد

آخرت کے عوض دنیاوی مفاد جس قدر بھی حاصل کرلو گے وہ حقیر ہوں گے اور وہ متاع بڑی قلیل۔ مثلاً سورۃ نساء میں ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ (۴/۷۷) "ان سے کہہ دو کہ متاعِ دنیا، وہ کتنی ہی کثیر کیوں نہ ہو، آخرت کے بدلے میں بہرحال قلیل ہے۔ اس لئے کہ حقیقی منفعت آخرت ہی کی منفعت ہے اور وہ اُسے ملتی ہے جو اقدارِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے"۔ سورۃ توبہ میں اسے اور بھی وضاحت سے بیان کر دیا۔ جہاں کہا کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ۔ (۹/۳۸) اے مدعیانِ ایمان! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے نکلو تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو جاتے ہیں! کیا تم آخرت کے مقابلہ میں دنیاوی زندگی کی متاع کو زیادہ پسند کرنے لگ گئے ہو؟ اگر ایسا ہی ہے تو اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیاوی زندگی کی متاع، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، آخرت کے مقابلہ میں، بہرحال قلیل ہے"۔ یہ اس لئے کہ دنیا اور اس کی متاع، حتیٰ کہ انسان کی (جسمانی) زندگی، بہرحال عارضی ہے۔ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (۲۰/۱۳۱) "اور جو سامانِ زیست اقدارِ خداوندی کے مطابق ملتا ہے وہ منفعت بخش بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی"۔ اور ظاہر ہے کہ بقا کے مقابلہ میں فنا کو ترجیح دینے والا آخرالامر نقصان میں رہتا ہے کہ حقیقی نقصان انسانی ذات کا نقصان ہے۔ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ... (۳۹/۱۵)

(۲/۱۷) مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ۔

آیت (۲/۱۶) میں نتیجۃً دو اہم نکات بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ جو لوگ وحی کی صداقتوں پر ایمان لائے بغیر (خواہ وہ کفار ہوں یا منافقین) سفرِ حیات طے کرنا چاہیں، وہ انسانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے صحیح راستہ نہیں پا سکتے۔ اور دوسرا یہ کہ جو لوگ مستقل اقدارِ خداوندی سے اعراض برت کر دنیاوی مفاد حاصل کرتے ہیں، ان کا یہ کاروبار آخرالامر نقصان رساں ثابت ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان نکات کو نظری طور پر بیان کرنے کے بعد، اپنے مخصوص انداز کے مطابق، انہیں محسوس مثالوں کی رو سے سمجھایا ہے۔ یہ مثالیں آیات (۲/۱۷-۲۰) میں بیان کی گئی ہیں۔ انہی کی تشریح اب ہمارے سامنے آتی ہے۔ پہلے، منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے صحیح راستہ کے سوال کو لیجئے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے (اور جس کی مزید تفصیل "قصہ آدم" کے عنوان میں ہمارے سامنے آئے گی)، زندگی ارتقائی وادیوں میں سے گزرتی ہوئی انسانی پیکر تک پہنچی ہے۔ اس میں انسان کو جو کچھ فطرت کی طرف سے از خود ملا ہے وہ، وہی جبلّی تقاضے

(INSTINCTS) ہیں جو دیگر حیوانات کو بھی عطا کیے گئے ہیں۔ انسانی بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو وہ ہر حیوانی بچے کی طرح از خود جانتا ہے کہ اس کی پرورش کا سرچشمہ کہاں ہے اور اس سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے (یعنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ پینا)۔ حیوانات کے سامنے زندگی کا صرف ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ یعنی طبیعی ضروریات کا پورا کرنا۔ اور اس کے لئے جبلت کی راہنمائی کافی ہوتی ہے۔ اس لئے نہ انہیں کسی تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے نہ تجسس کی حاجت۔ اگر انسان کا مسئلہ بھی اتنا ہی ہوتا تو اسے بھی کسی کاوش کی ضرورت نہ تھی لیکن اس کا مسئلہ اتنا ہی نہیں۔ اس کے سامنے زندگی کے اور بیسیوں اہم مسائل بھی ہیں۔ تمدنی اور معاشرتی مسائل۔ سیاسی اور معاشرتی مسائل۔ ملّی اور بین الاقوامی مسائل۔ اور خارجی دنیا سے آگے بڑھ کر خود اس کی داخلی دنیا کے گوناگوں مسائل۔ اس کے شعور اور نفسِ غیر شعوری کے تضادات، اس کی متعدد نفسیاتی الجھنیں، اس کی ذات کی نشوونما اور مستقبل کا سوال وغیرہ وغیرہ۔ ان مسائل کا حل دریافت کر لینا، جبلی راہنمائی کے بس کی بات نہیں۔

جبلت کے علاوہ، انسان کو عقل و فکر کی صلاحیت بھی عطا ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان اس قابل ہے کہ (وحی کی راہنمائی کے بغیر) فکری طریق پر ان مسائل کا حل دریافت کر سکے؟ اس سلسلہ میں ہم، اس سے پہلے، (آیت ۲/۲ کی تشریح کے سلسلہ میں) کچھ گفتگو کر چکے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم نے چونکہ اس مقام پر مثال کے ذریعہ بات سمجھائی ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس کی مزید تشریح کر دی جائے۔ یہ تکرار نہیں، وضاحت ہے۔

عقل کا تجرباتی طریق

زندگی کے مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے عقل کا طریق کار تجرباتی (TRIAL AND ERROR کا) ہے۔ وہ جب کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنے کے لئے ابتدا کرتی ہے تو اس کے سامنے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ کوئی سابقہ نظیر، نہ کسی نقشہ کی لکیر۔ وہ اپنے لئے خود ایک راستہ تجویز اور اختیار کرتی ہے اور اس پر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ راستہ میں ہزاروں قسم کے خطرات آتے ہیں لیکن وہ اس یقین کے ماتحت کہ جو راستہ اس نے اختیار کیا ہے، صحیح ہے، ان خطرات کا مقابلہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں انسان کو انواع و اقسام کی تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس میں خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ لاکھوں جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ لیکن عقل کی اُس یقین دہانی کی بنا پر، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تاآنکہ ایک مقام پر پہنچ کر اُسے پتہ چلتا ہے کہ جو راستہ اُس نے اختیار کیا تھا، وہ غلط تھا۔ وہاں اس کی عقل ایک اور راستہ تجویز کرتی ہے اور اس طرح ایک نئے تجربہ کو سامنے لاتی ہے۔ انسانی فکر کی تاریخ، انہی تجارب کی عبرت آموز داستان ہے۔ (میں نے اس داستان کو اپنی کتاب۔ انسان نے کیا سوچا؟۔ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اربابِ فکر و تحقیق کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں ہوگا) عقل کی ان کاوشوں کو ایک مثال سے سمجھئے۔ مسئلہ زیرِ نظر یہ تھا کہ انسانی معاشرہ میں مختلف افراد کی حیثیت کیا ہے؟ اس مسئلہ کے حل کے لئے عقل نے جو طریق اختیار کیا اس کی تاریخی

ابتداء مفکرین کے ابوالآباء یونانی فلاسفر افلاطون (PLATO) سے ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ پیدائش کی رو سے انسانوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک اہلِ فکر و نظر اور اربابِ حل و عقد جنہیں وہ پاسبان (GUARDIAN) کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ لوگ معاشرہ کے سب سے اونچے مقام پر فائز ہوتے ہیں

غلامی کا مسئلہ

دوسرا طبقہ سپاہیوں کا اور تیسرا طبقہ عوام جو کسانوں، مزدوروں اور غلاموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک، انسانوں کی یہ تقسیم پیدائشی اور فطری ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ غلامی کو تقاضائے فطرت قرار دیتا تھا۔ اس کے لئے وہ (یہ مغالطہ آفریں) دلیل پیش کرتا تھا کہ جس طرح انسانی جسم میں پاؤں کا مقام پست ترین ہے اور ان کا کام سارے جسم کا بوجھ اٹھانا، یہی حیثیت معاشرہ میں غلاموں کی ہے۔ انہیں اس مقام سے بہتر مقام عطا کرنا ایسا ہی ہے جیسے ٹیڑھے پاؤں کو سیدھا جوتا پہنا دینا۔ اس سے چلنے والے کو آسائش کے بجائے جس قدر اذیت پہنچتی ہے، ظاہر ہے۔

یونانی فلاسفروں میں افلاطون کے بعد اس کے شاگرد ارسطو کا نام سرفہرست دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھی غلامی کو فطرت کا تقاضا قرار دیتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس انہیں غلام تھے اور وہ غلامی کے جواز اور ثبوت میں انہیں دلائل پیش کیا کرتا تھا۔

یہ بات آج سے قریب اڑھائی ہزار سال پہلے کی ہے۔ اس اڑھائی ہزار سال کی طویل مدت میں انسانی فکر نے افرادِ انسانیہ کی باہمی پوزیشن کے متعین کرنے میں جو کروٹیں لیں اور جو ٹھوکریں کھائیں، اس کی داستان تاریخ کے اوراق پر خون کے حروف سے لکھی ملے گی۔ ان صبر آزما اور ہمت شکن تجارب کے بعد وہ صدیوں کے بعد کہیں جاکر اس نتیجہ پر پہنچا کہ غلامی ایک غیر فطری تصور اور انسانیت کے لئے لعنت ہے، اور اس کے باقی رکھے جانے کا کوئی جواز نہیں۔ چنانچہ چند سال اُدھر اقوامِ متحدہ (U.N.O.) نے اِسے اپنے منشور میں بنیادی حقوقِ انسانیت کے منافی قرار دیا۔ اور مختلف ممالک میں اسے ختم کیا گیا۔ لیکن اگر بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو اس سے بھی غلامی کی صرف ایک وحشیانہ اور ناتراشیدہ (CRUDE) سی شکل کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس کی روح، دیگر متعدد خبیث روحوں کی طرح، انسانی دنیا میں بدستور گھومتی پھرتی اور مختلف پیکروں اور لباسوں میں سامنے آتی رہتی ہے۔ مثلاً افراد اور اقوام کی سیاسی غلامی، احتیاج کی بنا پر معاشی غلامی، غلط نظامِ تعلیم سے ذہنی غلامی، باطل کے پراپیگنڈہ سے نفسیاتی غلامی وغیرہ وغیرہ۔

قرآنِ کریم نے عقلِ انسانی کے اِس تجرباتی طریق کو مثال کے ذریعہ یوں سمجھایا ہے کہ راستہ سے بھٹکا ہوا مسافر، ایک لق و دق صحرا میں تنہا کھڑا ہے۔ رات کا وقت ہے اور گھُپ اندھیرا۔ وہاں نہ کوئی چراغِ راہ ہے نہ سراغِ جادہ۔ نہ جرسِ کارواں ہے نہ نشانِ منزل۔ حتیٰ کہ ستاروں تک کی قندیلوں کو سیاہ بادلوں کے دبیز پردوں نے مکمل طور پر ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ مسافر

اِس مقام پر ششدر و حیران کھڑا ہے۔ اس کے پاس صرف ماچس کی ڈبیا ہے۔ وہ تیلی جلاتا ہے تو چھوٹے سے دائرے میں روشنی پھیل جاتی ہے۔ وہ اس میں دو قدم تک چلنے نہیں پاتا کہ راستہ کو پھر تاریکی ڈھانپ لیتی ہے۔ وہ کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے یوں وہ اس لق و دق صحرا میں، ٹامک ٹوئیاں مارتا آگے بڑھتا ہے كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا- (۲۰) "ذرا سا راستہ روشن ہوا تو دو قدم چل لیا۔ پھر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا"۔

اس کے برعکس وہ مسافر ہے جو سفر کا آغاز ہی اُس راستہ سے کرتا ہے جس کی نشان دہی وحیٔ خداوندی نے کی ہے۔ وہ راستہ یہاں سے وہاں تک جگمگا رہا ہے۔ وہ راہرو، اس مسافت کو اس قدر یقین اور اطمینان کے ساتھ طے کئے چلا جاتا ہے کہ اُس کا ہر قدم اُسے منزل سے قریب تر لے جا رہا ہے اور اس کے وہاں تک پہنچ جانے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

قرآن اور غلامی

اسی غلامی (SLAVERY) کی مثال کو لیجئے۔ فکرِ انسانی صدیوں کی جانکاہ کاوشوں کے بعد کہیں جا کر اس نقطہ تک پہنچ سکی ہے۔ کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں حقوق کے مالک ہیں۔ وحیٔ خداوندی نے پہلے ہی دن اعلان کر دیا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ "تمام انسان پیدائش کی رو سے یکساں احترام و تکریم کے مستحق ہیں"۔ آدمیت احترام آدمی ـــ اور

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ـــ خواہ اس کا منصب، واضع قوانین کا ہو یا حکمرانی کا ـــ حتےٰ کہ اسے نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو ـــ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے غلام بن جاؤ۔ ایسا کہنے کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اس کا بھی اعلان کر دیا کہ کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو، دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں۔ یہ حق بھی صرف خدا کو حاصل ہے، نہ ہی کسی کو رزق سے محروم کر دینے کا حق اور اختیار۔ ان اعلانات سے سے اس نے ہر نوعِ غلامی کا خاتمہ کر دیا۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق جو ہدایات اور احکامات دیئے گئے ہیں وہ ان غلاموں اور لونڈیوں (مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ) سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآنِ کریم کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ انہیں یک لخت آزاد کر دینا نہ مناسب تھا نہ ممکن۔ اس کے لئے قرآنِ کریم نے ایسے احکامات صادر کئے جن میں سے وہ رفتہ رفتہ یا تو آزاد ہوتے گئے یا آزاد خاندانوں کا جزو بنتے گئے۔ اس طرح اس نے اُس وقت کے موجود غلاموں کے مسئلہ کو حل کر دیا۔

اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر اپنے مقام پر ملے گی)

یہ ہے فرق عقل کے فکری طریق، اور وحی کی راہ نمائی کا۔ لیکن — اس کے یہ معنی نہیں کہ وحی کے تجویز کردہ طریق سفر میں عقل کا کوئی منصب و مقام ہی نہیں۔ قرآن کریم نے عقل و فکر انسانی کو بڑی اہمیت دی ہے اس

عقل کی اہمیت

کی رو سے عقل اور وحی کا باہمی تعلق ایسے ہی ہے جیسے سورج کی روشنی اور انسانی آنکھ کا۔ جس طرح سورج کی روشنی کے بغیر، انسانی آنکھ کچھ کام نہیں دے سکتی، اسی طرح انسان اگر اپنی آنکھیں بند کرلے تو سورج کی روشنی بھی اس کے لئے بیکار ہو جاتی ہے۔ اسی قرآنی حقیقت کو مشہور مغربی مفکر لاک (LOCKE) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کہ

> "جو شخص، وحی کے لئے جگہ بنانے کی خاطر، عقل و بصیرت کو باہر نکال دیتا ہے وہ وحی، اور عقل دونوں کے چراغ گل کر دیتا ہے"۔[1]

زندگی کے اس روشن راستے میں، جسے وحی نے تجویز کیا ہے، جگہ جگہ دوراہے آتے ہیں جہاں مختلف سمتوں کی طرف جانے والے راستوں کے متعلق نشانات (SIGN - POSTS) نصب ہوتے ہیں۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ان نشانات کو پڑھے اور ان کے مطابق صحیح راستہ اختیار کرے یا یوں سمجھئے کہ بچوں کی حساب کی کتاب میں مختلف سوالات دیئے ہوتے ہیں جنہیں وہ ریاضی کے قاعدوں کے مطابق عقل و فکر کی رو سے حل کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے حل کو اس جواب سے ملاتے ہیں جو کتاب کے آخری حصہ میں دیا ہوتا ہے۔ اگر اس کا حل جواب کے مطابق ہے تو بچہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے سوال ٹھیک حل کیا ہے۔ آپ سوچئے کہ اگر کسی بچے کے پاس ایسی کتاب ہو جس میں سوالات کا حصہ تو ہو لیکن جوابات کا حصہ ضائع ہو چکا ہو تو سوال کے حل کرنے کے بعد وہ اس کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق جس الجھن میں مبتلا ہو جائیگا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عقل انسانی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے حل کو وحی کے جواب کے ساتھ ملاتی چلی جائے اور جو اس سے ہم آہنگ ہو اسے صحیح قرار دے کر آگے بڑھ جائے۔ خود افلاطون نے اس طریق کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ :۔

> یہ (ارباب فکر) کچھ بنائیں گے، اُسے پھر مٹائیں گے، یہی کچھ کرتے رہیں گے تاآنکہ وہ انسانی راستوں کو حتی الامکان خدائی راستوں سے ہم آہنگ کریں گے۔ (REPUBLIC)

نور و ظلمات

قرآن کریم نے وحی کو ہر جگہ نور سے تشبیہ دی ہے اور جہاں وہ روشنی گم ہو اسے ظلمات کہہ کر پکارا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۲/۲۵۷)

[1] (ESSAY — BOOK IV)

"ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے" اس کے برعکس طاغوتی عناصر کفار کو یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (ایضاً) "نور سے ظلمات کی طرف لے جاتے ہیں"۔ اسی بنا پر اُس نے قرآن مجید کو نور کہہ کر پکارا ہے۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۱) "اللہ نے، اے رسولؐ! تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ تو اس کے ذریعے لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف لے جائے"۔ (نیز ۵/۱۶)۔ تاریکی کے لئے ظلمات کا لفظ استعمال کرنے میں، دو اہم نکات سامنے لائے گئے ہیں۔ ظلمت کے معنی ہوتے ہیں روشنی کا معدوم ہونا۔ یعنی اُس مقام پر روشنی کا نہ ہونا جسے روشن رہنا چاہیئے تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس ایک بنیادی معنی کے اندر کتنی بڑی حقیقت پوشیدہ ہے۔

ظلمات کے معنی

اشیائے کائنات اور حیوانات کو خارجی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی راہنمائی انکی جبلت کر دیتی ہے جو پیدائشی طور پر ان کے اندر موجود ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے متعلق نہیں کہا گیا کہ وہ ظلمت میں ہیں۔ حالانکہ وحیٔ منزّل من اللہ کی روشنی ان کے پاس نہیں ہوتی۔ وحیٔ منزّل من اللہ کی روشنی کا مقام انسانی دنیا ہے۔ کیونکہ انسان کے اندر ایسی روشنی نہیں رکھی گئی۔ اگر انسانی معاشرہ اپنے آپ کو وحی کی روشنی سے محروم کر لیتا ہے تو اس کے متعلق کہا جائے گا کہ جہاں روشنی ہونی چاہیئے تھی وہاں روشنی نہیں ہے۔ اس مقام کے لئے ظلمت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے ہر جگہ نور کو واحد کے صیغے میں استعمال کیا ہے لیکن ظلمت کو جمع کے صیغے میں۔ یعنی اس نے ظلمات کہا ہے۔ اس دقیق لیکن نہایت لطیف فرق کو پہلے بتایا جا چکا ہے۔ الحق ہمیشہ ایک ہوتا ہے لیکن باطل ہزاروں اقسام کے بھیس بدل کر سامنے آتا ہے۔ صحیح جواب ایک اور صرف ایک ہوتا ہے لیکن غلط جوابات لاکھوں ہو سکتے ہیں۔ اسی بنا پر اُس نے حق یا صحیح جواب کے لئے تو نور کا لفظ استعمال کیا ہے اور باطل یا غلط جوابات کے ظلمات کا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جب روشنی آجاتی ہے تو تاریکیاں خواہ وہ کتنی ہی تو بر تو کیوں نہ ہوں، کافور ہو جاتی ہیں۔ وحی کی روشنی، انسانی فکر اور جذبات کی پیدا کردہ غلط نگہی یا فریب کاری کی جملہ اقسام کو مٹا دیتی ہے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۷/۸۱)

اب اگلی آیت کی طرف آئیے۔

(۲/۱۸) صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔

پہلے اِن الفاظ کو لیجئے۔ صُمّ (مادہ ص۔م۔م)۔ اُس شخص کو کہتے ہیں جس کے کان بند ہو جائیں، یعنی بہرہ۔ نیز وہ شخص جو کسی کی نہ سنے اور اپنی سی کہے چلا جائے۔ جو عقل و فکر سے کام نہ لے۔ سورۃ یونس میں ہے۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ۔ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰/۴۲) "ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو بظاہر تمہاری طرف کان لگائے رہتے ہیں لیکن ان کے خیالات کہیں اور ہوتے ہیں۔ اے رسولؐ! کیا تو ایسے لوگوں کو سنا سکے گا جو عقل و فکر کے

دروازے بند کر کے اپنے کانوں میں ڈاٹ لگا لیتے ہیں۔"

بُکْمٌ گونگے کو کہتے ہیں یا ایسے شخص کو جو بات واضح طور پر نہ کر سکے۔ مراد ان سے بھی وہ لوگ ہوتے ہیں جو عقل و فکر سے کام نہیں۔ سورۃ الانفال میں ہے اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۸/۲۲)
"معیارِ خداوندی کی رو سے بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو عقل و فکر سے کام نہ لے کر بہرے اور گونگے بن جائیں۔"

عُمْيٌ۔ (مادہ ع۔م۔ی)۔ یہ لفظ عام طور پر تو اندھے کے لئے بولا جاتا ہے۔ لیکن ہے بڑا کثیر المعنی۔ گمراہ ہو جانا، باطل پر مصر ہونا، بلا عقل و فکر، اندھا دھند، آگے بڑھتے چلے جانا۔ کسی معاملہ میں غیر واضح اور مشتبہ ہو جانا۔ یہ تمام مفاہیم اس کے اندر شامل ہوتے ہیں۔ سورۃ الانعام میں ہے کہ رسول اللہ سے کہا گیا کہ آپ کہہ دیجئے کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ۔ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ (۶/۵۰) "میں تو صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ پھر ان سے پوچھئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان سے پوچھئے کہ تم اس قدر کھلی ہوئی حقیقت پر غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟" یہاں بھی عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو اندھا کہا گیا ہے۔

لہٰذا صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ سے مراد وہ لوگ نہیں جو طبیعی طور پر بہرے، گونگے یا اندھے ہوں۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو عقل و فکر سے کام نہیں۔ چنانچہ سورۃ بقرہ ہی میں دوسرے مقام پر ہے صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (۲/۱۷۱) "بہرے، گونگے، اندھے، یعنی وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں۔"

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ

لہٰذا جب آیتِ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ وحی کے چراغ کو گم کر کے اپنی پیدا کردہ تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، تو اس سے مراد یہ ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ (۷/۱۷۹) "وہ آنکھیں رکھنے کے باوجود، ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھنے کے باوجود ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔" یعنی خدا نے انہیں جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی تھی وہ اسے استعمال ہی میں نہیں لاتے۔ اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔ (۲/۱۸) "وہ غلط راستہ سے صحیح راستہ کی طرف پلٹتے ہی نہیں۔"

لَا يَرْجِعُوْنَ کا مفہوم

يَرْجِعُ کا لفظ بھی بڑا کثیر المعانی ہے اور اس کا غلط مفہوم، جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے، گمراہیاں پیدا کرنے کا موجب۔ لیکن اس مقام پر ہم اس کی تشریح میں جانا نہیں چاہتے (اس کا مقام آگے چل کر آئے گا)۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اس کے معنی پلٹنے، لوٹنے، واپس ہونے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ اور انہی معانی میں یہ لفظ اس آیت میں آیا ہے۔ جب نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت پیش کی تو آپ کے

مخاطب دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک اہل کتاب جو کسی وقت حق پر تھے لیکن بعد میں اس راستہ سے ہٹ گئے۔ ان سے کہا گیا کہ تم پھر اُسی الحق کی طرف پلٹ کر آجاؤ جو تمہارے انبیاءؑ کی وساطت سے تمہیں دیا گیا تھا لیکن جسے تم نے ضائع کر دیا۔ جب وہ اس سے انکار کرتے تو اُن سے کہا جاتا کہ تم حق کی طرف پلٹ کر کیوں نہیں آتے ؛ لیکن دوسرا گروہ وہ تھا جن کی طرف حق پہلے پہل آیا تھا۔ وہ جب حق کی طرف نہیں آتے تھے تو ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے۔ اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ ان کے لئے بھی لفظ لَا يَرْجِعُوْنَ استعمال کیا گیا ہے۔ بہیئتِ مجموعی یوں سمجھئے کہ مختلف لوگ مختلف غلط راستے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ایک شخص دوراہے (بلکہ چوراہے) پر کھڑا ہوا آوازیں دے رہا ہے کہ جن راستوں پر تم چل رہے ہو وہ تمہیں صحیح منزل تک نہیں لے جا سکتے۔ یہاں واپس آؤ۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ صحیح راستہ کون سا ہے۔ اگر وہ واپس نہ آئیں تو اُن کے متعلق بھی لَا يَرْجِعُوْنَ کہا جائے گا۔ بہرحال مقصد اس سے یہ ہے کہ یہ لوگ غلط راستوں پر چلے جا رہے ہیں۔ قرآن کریم انہیں آوازوں پر آوازیں دے رہا ہے کہ ادھر آؤ۔ میں تمہاری راہنمائی صحیح راستہ کی طرف کروں گا لیکن یہ اس کی دعوت اور پکار کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ اور اندھوں، بہروں، گونگوں کی طرح اندھا دھند آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔ (۲/۱۸)

(۲/۱۹) اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ۔

آیت (۲/۱۶) کی تمہید میں جو دو نکات بیان کئے گئے تھے، اب ان میں کے دوسرے نکتہ کی طرف آیئے یعنی اس نکتہ کی طرف کہ یہ لوگ جو مستقل اقدارِ خداوندی کی قیمت پر زندگی کے طبیعی مفاد حاصل کرتے ہیں تو بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے فائدے میں رہے لیکن درحقیقت ان کا یہ کاروبار منفعت بخش نہیں، نقصان دہ ہوتا ہے۔ فی الحقیقت منفعت بخش کاروبار وہی ہوتا ہے جو اقدارِ خداوندی کی پابندی کے ساتھ کیا جائے۔ "کاروبار" سے مراد محض معاشی لین دین نہیں، اس سے مراد زندگی کے ہر شعبہ میں نفع یا نقصان کا سوال ہے۔ نفع نقصان، یا خیر و شر کے متعلق پہلے بھی گفتگو کی جا چکی ہے لیکن قرآن کریم نے جو مثال بیان پیش کی ہے اس کی تشریح کے لئے اس مسئلہ کی مزید وضاحت بھی ضروری ہے۔

خیر و شر کی مزید تشریح

پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ طبیعی کائنات میں کوئی شے نہ فی ذاتہٖ خیر ہے نہ شر۔ اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ خدا نے تو ہر شے کو خیر ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ انسان اس کے غلط استعمال سے اسے شر بنا دیتا ہے۔ پانی ممدِ حیات ہے۔ اس پر زندگی کا دار و مدار ہے۔ یہ زمینِ مردہ کو

حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ اس سے لہلہاتی کھیتیاں اُگتی ہیں۔ سرسبز و شاداب، ثمربار باغات نمود میں آتے ہیں۔ غرضیکہ زندگی اور اس کے لئے جس سامانِ پرورش و استحکام کی ضرورت ہے، پانی اس میں بڑا بنیادی کام دیتا ہے۔ لیکن جس پانی کو پی کر انسان جیتا ہے اسی میں ڈوب کر وہ مر بھی جاتا ہے۔ وہ پانی جو دریاؤں، نہروں، ندی نالوں کے ساحلوں میں گھرا ہوا بہتا ہے، حیاتِ تازہ کی نمود کا موجب بنتا ہے۔ لیکن جب وہی پانی ساحل فراموش ہو کر سیلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو عالمگیر تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ سنکھیا، کہ جس کا نام ہی ہلاکت کے مرادف ہے، مرنے والوں کی جانیں بچانے کے کام بھی آتا ہے اگر اسے صحیح طریق سے بطور علاج استعمال کیا جائے۔ یہی کیفیت طبیعی کائنات کی ہر شے اور فطرت کی ہر قوت کی ہے۔ خدا نے ان میں سے ہر ایک کو خیر و برکت کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ ان کا غلط استعمال ہے جن کی وجہ سے وہ شر کا موجب بن جاتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر، خیر اور شر ہر شے کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ انسان کے حل کرنے کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کیا طریق ہے جس سے ان کے شر کے پہلو سے محفوظ رہ کر انہیں خیر و برکت کا موجب بنایا جائے۔ ان سے تخریب کی بجائے تعمیری کام لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۲/۱۱۳) سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی ہے۔ یعنی یہ آرزو کہ جو کچھ خدا نے پیدا کیا ہے وہ شر نہ بن جائے، خیر رہے۔ اگر بعض چیزیں خیر اور بعض شر ہوتیں تو شر اشیاء سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی جاتی۔ علومِ سائنس یہ تو بتا دیتے ہیں کہ اشیائے کائنات سے خیر کا نتیجہ کس طرح مرتب ہو سکتا ہے، وہ شر کیسے بن سکتی ہیں، لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ انسان کو اس پر کیسے آمادہ کیا جائے کہ وہ انہیں خیر کے لئے استعمال کرے، شر کے لئے استعمال نہ کرے۔ یہ ان علوم کے حیطہ کار سے باہر کی چیز ہے۔

طبیعی یا خارجی دنیا سے آگے بڑھ کر انسان کی تمدنی دنیا کی طرف آئیے۔ اور یہاں دیکھئے کہ کیا فکرِ انسانی ایسا نظام تجویز کر سکی ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو ــــ یعنی اس کا نتیجہ ہر ایک کے لئے منتج خیر ہو۔ انسانی فکر نے اپنے تجرباتی طریق کی رو سے اس کی تلاش میں بھی بڑے بڑے ہاتھ پاؤں مارے لیکن وہ ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ اس کے لئے جو

نظریہ افادیت

بہترین نظریہ دریافت کر سکی ہے اُسے افادیت یا (UTILITARIANISM) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے عملِ خیر وہ ہے جس سے "زیادہ سے زیادہ افراد کا زیادہ سے زیادہ فائدہ مرتب ہو"۔ یعنی

THE GREATEST GOOD OF THE GREATEST NUMBER

اس نظریہ کی رو سے مقصود کثیر تعداد کا فائدہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ باقی رہ جائیں گے کیا وہ انسان نہیں؟ انہیں اس مفاد سے کس بنا پر محروم رکھا جائیگا؟ اس اعتراض کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔

سیاسی دنیا میں یہی نظریہ جمہوریت کا ہیکل لئے ہوئے ہے۔ جمہوریت کی بنیاد بھی اکثریت کی حکمرانی پر ہے۔ یہاں پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ اقلیت نے کیا جرم کیا ہے کہ انہیں نہ صرف حقِ حکمرانی سے محروم رکھا جاتا ہے بلکہ انہیں، انہی جیسے دوسرے انسانوں کی محکومیت میں دے دیا جاتا ہے جو کسی نہ کسی طرح اکثریت حاصل کر لیتے ہیں۔ فکرِ انسانی ابھی تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکی جس میں شر کا یہ پہلو موجود نہ ہو۔ اس کے ہر نظام میں ـــ خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشی ـــ خیر اور شر باہمدگر مخلوط رہتے ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے زیرِ نظر آیت میں محسوس مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

پہلے ان الفاظ کو لیجئے۔

الفاظ کے معنی

صَیِّب ۔ (مادہ ص۔و۔ب) بارش برسانے والا بادل۔ لیکن وہ بارش جو عین وقت اور ٹھیک مقام پر ہو۔

رعد ۔ بادل کی گرج۔

برق ۔ بجلی کی چمک۔

صواعق ۔ (صاعقہ کی جمع) بجلی کی کڑک۔

خطف ۔ (۲/۲۰) اچک کر لے جانا۔

عرب، جس جغرافیائی ماحول میں رہتے اور جس آب و ہوا میں زندگی بسر کرتے تھے ان کے لئے بارش فی الواقعہ بارانِ رحمت تھی۔ وہ اس کی بوند بوند کو ترسا اور ہلکی سی بدلی کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر وہاں کبھی ایسی گھٹا اٹھتی جو پانی سے لدی ہوئی ہوتی اور عین وقت اور صحیح مقام پر جھوم کر برستی تو یہ چیز ان کے لئے کس قدر وجہِ مسرت ہوتی۔ لیکن اس قسم کی گھٹا میں تاریکی، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک اور کڑک بھی بادلوں کے دامن کے ساتھ لپٹی ہوئی ہوتی۔ وہ بالعموم کھلے آسمان کے نیچے خیموں میں رہتے تھے، اس لئے ان کے ہاں ایسا سامان نہیں ہوتا تھا جس سے وہ بجلی کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ سکتے۔ لہٰذا جب اس قسم کے بادل آتے تو وہ جہاں بارش کی متوقع حیات آفرینیوں سے پُرمسرت ہوتے، ان کی برق سامانیوں سے انہیں ڈر بھی لگتا۔ قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں۔ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳/۱۲؛ ۳۰/۲۴)۔ یعنی، ان برق آمیز گھٹاؤں میں ان کے لئے خوف اور طمع کے دونوں گوشے مضمر ہوتے۔ وہ ڈرتے کہ کہیں بجلی کی چمک ان کی بینائی اچک کر نہ لے جائے (۲/۲۰)۔ اور صاعقہ ان کے کاشانوں پر موت بن کر نہ گر پڑے۔

واضح رہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے برق، رعد اور صاعقہ کو بنایا ہی تباہی کے لئے ہے۔ انکی تخلیق

کا مقصد بھی خیر ہی ہے۔ چنانچہ سورہ الرعد میں ہے۔ وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ (۱۳/۱۳)۔ "رعد بھی خدا کے پروگرام کو مستحق حمد و ستائش بنانے کے لئے مصروفِ عمل رہتی ہے"۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سائنس ابھی تک حتمی طور پر یہ دریافت کر سکی ہے یا نہیں کہ فطرت کی یہ قوتیں، جو فضائے آسمانی میں گرجتی، چمکتی اور تڑپتی نظر آتی ہیں، کون کون سے تعمیری پہلو اپنے اندر لئے ہوتی ہیں۔ جہانتک اس تباہی کا تعلق ہے جو بجلی گرنے سے وقوع پذیر ہوتی ہیں، قرآنِ کریم نے کنایتہً کہا ہے۔ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَاءُ (۱۳/۱۳)۔ "یہ خدا کے قانونِ مشیت (کائناتی قانون) کے مطابق گرتی ہے"۔ لہٰذا اگر اس قانون کا علم حاصل کر لیا جائے تو اس کی ہلاکت سامانیوں سے محفوظ رہنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ بڑی بڑی عمارتوں کے اوپر دھات کی ایک سلاخ نصب کر دیتے ہیں جس سے بجلی کی تخریبی لہر غیر مؤثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ بہرحال، قرآن یہاں کہنا یہ چاہتا ہے کہ فطرت کی ان قوتوں میں تعمیر اور تخریب کے دونوں پہلو مضمر ہوتے ہیں۔ انہیں قانونِ فطرت کے مطابق صرف میں لایا جائے تو نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو ان کے شر کا پہلو غالب آجاتا ہے۔ جنہیں ان قوانین کا علم نہیں ہوتا وہ اپنے طور پر ان سے محفوظ رہنے کے مختلف طریقے سوچتے ہیں۔ بجلی کڑکتی ہے تو وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم اس کی ہلاکت آفرینی سے محفوظ ہو گئے۔ وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر انہوں نے اس طریق سے اپنی قوتِ سماعت کو محفوظ بھی کر لیا تو اس کا بھی تو امکان ہے کہ بجلی کی چمک ان کی بینائی اچک کر لے جائے۔ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ (۲/۲۰)۔

اب اس مثال کو آگے بڑھایئے اور خارجی کائنات سے ہٹ کر انسان کی تمدنی دنیا کی طرف آجایئے۔ اس دنیا کے بھی دو گوشے ہیں۔ ایک گوشہ وہ ہے جس میں تو میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان سے منفعت بخش کام لیتی ہیں۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ قرآنِ کریم نے کس کس انداز سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان سے مختلف کام لے سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کر لے جن کے مطابق یہ قوتیں رد بہ عمل رہتی ہیں۔ جو قوم بھی ان قوتوں کو اس طرح مسخر کر لیتی ہے، وہ مادی دنیا میں ترقی کر لیتی ہے۔ اقوامِ یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ فطرت کے جو حوادث پسماندہ (جاہل) اقوام میں تباہیاں مچا دیتے ہیں، اقوامِ مغرب نے ایسے انتظامات کر رکھے ہیں کہ وہ ان قوتوں کے نفع بخش پہلوؤں سے تو متمتع ہو جائیں۔ لیکن ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں۔

انسان کے نظامِ تمدن کا یہ گوشہ تو وہ ہے جہاں اس کا واسطہ فطرت کی (مجبور دمحبوں) قوتوں سے پڑتا ہے

فطرت کی قوتوں کا استعمال

اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جہاں انسان کا واسطہ انسان سے پڑتا ہے۔ چونکہ یہ نظام عقل اور فکر کا وضع کردہ ہوتا ہے۔ لوگ کرتے یہ ہیں کہ فطرت کی ان

قوتوں کو اپنے ہاں تو منفعت بخشیوں کے لئے استعمال میں لاتے ہیں لیکن انہی کے بل بوتے پر دوسری قوموں پر غلبہ اور تسلط حاصل کر لیتے ہیں۔ اس سے انہیں بظاہر بڑی تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ کمزور اقوام پر جس قدر زیادہ غلبہ و استیلا حاصل کر لیتی ہیں اُسی نسبت سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ان کا یہ نظام اس قدر مستحکم ہو گیا ہے کہ ان پر تباہی آہی نہیں سکتی۔ لیکن قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ ان کا ایسا سمجھنا غلط نگہی اور خود فریبی پر مبنی ہے۔ انسان کی تمدنی زندگی سے متعلق نظام کے استحکام کا مدار صرف مادی قوتوں کے حصول پر نہیں۔ اس کا گہرا تعلق ان کے مصرف سے بھی ہے! اگر یہ اسباب و وسائل تمام نوعِ انسان کی منفعت اور بہبود کے لئے استعمال کئے جائیں تو وہ نظام مستحکم ہوتا ہے۔ اگر انہیں اپنی منفعت اور دوسروں کی تباہی کے لئے استعمال میں لایا جائے تو یہ نظام (بظاہر کتنا ہی مستحکم کیوں نہ دکھائی دے) آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ یہ تباہی یک لخت نہیں آتی، بتدریج آتی ہے اور آتش خاموش کی طرح ان گوشوں سے آتی ہے جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۷/۱۸۲)

قوموں کی تباہی

"جو لوگ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں، ہم انہیں رفتہ رفتہ، بتدریج، اُن راستوں سے تباہی کے جہنم کی طرف لے جاتے ہیں جن کا انہیں علم و ادراک تک نہیں ہوتا"۔ اور اک تو ایک طرف مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ (۳۹/۴۷)۔ "جن کا انہیں ظن، گمان تک نہیں ہوتا"۔ سورۃ النحل میں ہے۔ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ (۱۶/۲۶) "اے رسولؐ! اس قسم کی سازشیں تمہاری مخاطب قوم ہی نہیں کر رہی۔ ان سے پہلے بھی انہی جیسی اقوام، اسی قسم کی سازشیں کرتی رہی ہیں۔ لیکن وہ (سازشیں) کبھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ بلکہ انہیں غیر محسوس طور پر تباہیوں کی طرف لے جاتی رہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مساکن کی بنیادیں تک اکھڑ گئیں۔ ان کی چھتیں ان کے اوپر اس طرح آگریں کہ وہ ان کے بوجھ تلے دب کر کچلی گئیں۔ اور یہ سب کچھ ایسے غیر محسوس طریق سے ہوا کہ ان کی عقل و شعور کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ یہ تباہی کیسے آئی؟ اور کہاں سے آئی؟"

قرآنِ کریم نے اوپر کہا ہے کہ یہ تباہی بتدریج آتی ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو بجائے اس کے کہ یہ قومیں سوچیں کہ ہمارے نظام کی وہ کونسی بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ تباہیوں کی طرف جا رہا ہے۔ وہ سمجھتے یہ ہیں کہ اس میں یونہی دراڑیں سی پڑ گئی ہیں جنہیں پُر کیا جا سکتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ وہ ایک دراڑ یا رخنہ کو بند کرتے ہیں تو دوسری طرف سے دیوار میں دو شگاف نمودار ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی بیان کردہ مثال کی رو سے، وہ بجلی کی کڑک سے محفوظ رہنے کے لئے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں تو اس کی چمک ان کی بینائی اچک کر لے جاتی ہے۔ تاریخِ تہذیب کا مشہور عالم اور مفکر، رابرٹ بریفو (R. BRIFFAULT) اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY)

یوں لکھتا ہے :-

نظامِ باطل کی تباہی

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو، کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اُس نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم وضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت عوام کو لوٹ کھسوٹ کر ایک خاص جماعت کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس کاروبار کو نہایت قابلیت اور تدبر، خلوص اور دیانتداری سے چلایا۔ لیکن یہ تمام انتظامی خوبیاں، بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رُو رعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔

آگے چل کر وہ لکھتا ہے :-

وہ نظامِ تہذیب، جس میں حق وصداقت کو عادی طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہو، آخرالامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ کوئی فرد دھاندلی سے کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے، وہ اجتماعی نظام، جس کا وہ جزو ہے، اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے، انجام کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخابِ طبیعی کے اٹل قانون کی بنا پر جرائم کی اُجرت موت ہے۔

قرآنِ کریم نے زیرِ نظر آیت میں بیان کردہ مثال سے اسی حقیقت کو سمجھایا ہے اور اسے دو لفظوں میں یوں بیان کر دیا ہے۔ کہ وَاللّٰهُ مُحِيطٌۢ بِالْكٰفِرِينَ (۲/۱۹)۔ "خدا کا قانونِ مکافات' حق وصداقت سے انکار کرنے اور سرکشی برتنے والوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ اس سے نکل کر کہیں جا ہی نہیں سکتے"۔ لہٰذا حسنِ تدبر کی جزئی مرمت کاریاں اور پیوندسازیاں انہیں تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔

اور یہیں سے ہم اگلی آیت کی طرف بڑھ جاتے ہیں جہاں کہا ہے۔

(۲/۲۰) يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

۲/۲۰

اس کا عام ترجمہ یہ ہے :-

ہو سکتا ہے کہ بجلی ان کی بینائی اچک کر لے جائے۔ جب وہ چمکتی ہے تو یہ لوگ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں۔ جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت کا بیشتر مفہوم تو سابقہ آیت کی تشریح میں آچکا ہے۔ البتہ دو ایک نکات ایسے ہیں جو مزید وضاحت طلب ہیں۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ۔ اگر اللہ چاہتا تو ان لوگوں کے طبیعی ذرائع علم ــ سماعت و بصارت وغیرہ ــ سلب کر لیتا۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ ایسا کرنا اُس کے قانونِ مشیت کے خلاف تھا۔

سوال یہ ہے کہ اُس کا یہ قانونِ مشیت کیا ہے؟ اور وہ ایسا کیوں نہیں کرتا؟

طبیعی قوتیں سلب نہیں ہوتیں

جب کسی معاشرہ میں مظالم عام ہو جاتے ہیں، جور و استبداد، سلب و نہب، بے انصافی اور دھاندلی کی طاغوتی قوتیں بیباک ہو جاتی ہیں کمزوروں اور ناتواں کا، طاقتور لوگوں کے ہاتھوں جینا دشوار ہو جاتا ہے تو سطح بین لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بار بار ابھرتا ہے کہ خدا اُن بازوؤں کو شل کیوں نہیں کر دیتا جو کمزوروں اور ناتوانوں کی ہڈیاں توڑنے کے لئے بروئے کار آتے ہیں۔ جو ہاتھ کسی مظلوم کے سینے میں خنجر گھونپنے کے لئے اٹھتا ہے، خدا اس ہاتھ کو پتھر کیوں نہیں بنا دیتا کہ وہ حرکت ہی نہ کر سکے؟ ایسا کیوں ہے کہ دھاندلی مچانے والے دن بدن ترقی پر ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی دولت، قوت اور ثروت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ انہیں ہر قسم کے طبیعی مفادات حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر خدا ان کے حصولِ دولت و قوت کے راستے بند کر دے تو یہ اس قابل ہی نہ رہیں کہ غریبوں پر ظلم و ستم ڈھا سکیں۔ خدا کو ایسا کرنا چاہیئے وہ ایسا کیوں نہیں کرتا؟ اس کے جواب میں خدا یہ کہتا ہے کہ ایسا کرنا ہمارے قانونِ مشیت کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے طبیعی دنیا میں طبیعی قوانین (قوانینِ فطرت) نافذ کر دیتے ہیں اور انسانوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکتے ہیں۔ اس سے انہیں ہر قسم کے مادی مفادات حاصل ہو جائیں گے۔ اس میں سوال کافر اور مومن کا نہیں (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) جو شخص بھی ان قوانین کے مطابق محنت کریگا اسے مادی مفاد حاصل ہو جائیں گے۔ کفر اور ایمان کی تمیز کا سوال اس سے آگے چل کر سامنے آتا ہے جہاں طبیعی قوانین کی رو سے حاصل کردہ مفاد اور قوتوں کے استعمال کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ دیکھئے! سورۃ بنی اسرائیل میں وہ اس حقیقت کو کس قدر بلیغ اور دلآویز انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ۔ (۱۷/۱۸)۔ جو شخص بھی دنیا کے مادی مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے، ہم اُسے اس کی سعی و کاوش کے مطابق یہ مفادات دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ

طبیعی مفاد ہر ایک کو حاصل ہو سکتے ہیں

جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا۔ (ایضاً)۔ "جب وہ ان مفادات کو غلط طور پر استعمال کرتا ہے (اسے کفر کہتے ہیں) تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے"۔ دوسری طرف وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔ (۱۷/۱۹)۔ "جو شخص قوانینِ فطرت کے مطابق مادی مفادات حاصل کرتا ہے۔ اور پھر انہیں ہماری متعین کردہ اقدار کے مطابق صرف میں لاتا ہے، تو اس کی محنت بھرپور نتائج پیدا کرتی ہے"۔ جہاں تک طبیعی مفادات کا تعلق ہے كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷/۲۰)۔ "کافر ہو یا مومن، ہم دونوں کو ان کی سعی و کاوش کے مطابق، آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ان دونوں کو ہماری تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے۔ ہم ایسا کبھی نہیں کرتے کہ ایک جماعت کو آگے بڑھ جانے دیں اور دوسری کے راستہ میں پھاٹک لگا دیں کہ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ ایسا کرنا ہمارے قانونِ مشیت کے خلاف ہے۔ طبیعی مفادات ہماری طرف سے تمام انسانوں کو بطور عطیہ دیئے گئے ہیں اور عطیہ میں ایسی شکل کبھی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ ایک کو دیدیا جائے اور دوسرے کو اس سے محروم رکھا جائے۔ ذرائع رزق ہماری طرف سے تمام نوعِ انسان کو بطور عطیہ دیئے گئے ہیں۔ یہ میدان سب کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ جو جس قدر محنت کریگا اس کے مطابق اُسے پھل مل جائے گا"۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

دوسری جگہ ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۔ (۱۱/۱۵)۔ "جو شخص بھی دنیاوی زندگی کے مفادات ۔ اس کی آسائشیں اور آرائشیں ۔ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے قانونِ فطرت کے مطابق کام کرے تو اس کی ان کوششوں کا، اُسے بھرپور نتیجہ مل جائیگا۔ اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائیگی"۔ (نیز دیکھئے ۲۲/۲۰)۔

یہ ہے خدا کا وہ قانونِ مشیت جس کے مطابق اس نے کہا ہے کہ ہم ایسا نہیں کرتے کہ اخلاقی اقدار کو پامال کرنے والوں کی طبیعی صلاحیتوں کو ماؤف کر دیں۔ ان کی تباہی، ان کی ان صلاحیتوں کے باوجود، اس لئے واقع ہو کر رہے گی کہ انہوں نے اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا۔ یہ وہ تباہی ہو گی جس سے انہیں ان کی طبیعی صلاحیتیں اور مادی قوتیں بچا نہیں سکیں گی۔ یہی ہیں وہ قوتیں جن کے متعلق کہا۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٔدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (۴۶/۲۶)۔ "جب

انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اُس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور ان کی سماعت، بصارت اور عقل و فکر کی صلاحیتیں انہیں اس سے بچا نہ سکیں۔ وہ ان کے کسی کام نہ آئیں"۔ وہ کہتا ہے کہ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ۔ (۲۲/۴۶) "ان لوگوں کی ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں، دل کی آنکھیں اندھی ہوا کرتی ہیں"۔ یہ ہے جواب ان لوگوں کے اس اعتراض کا کہ خدا ظالم کے ہاتھ کو شل کیوں نہیں کر دیتا۔ اُس کے بازوؤں کو پتھر کیوں نہیں دیا دیتا؟ کہا کہ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ۔ (۲/۲۰)، "خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن وہ ایسا نہیں کرتا کیونکہ یہ اس کے قانونِ مشیت کے خلاف ہے"۔ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۳۳/۶۲)۔ "اور اس کے قوانین میں تو کبھی تبدیلی نہیں پائے گا"۔

آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے اس نکتہ کو کس طرح واضح کر دیا ہے۔ لیکن آیت کے اگلے ٹکڑہ کا مروجہ غلط مفہوم ایک ایسی الجھن پیدا کر دیتا ہے کہ جس سے نہ صرف قرآنِ کریم کی یہ وضاحت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ اس سے تضاد بھی پیدا ہو جاتا ہے جو قرآنِ کریم کے بنیادی دعویٰ کے خلاف ہے۔ وہ ٹکڑہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ۔ یہ الفاظ قرآنِ کریم میں بکثرت آتے ہیں اور ان کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ وہ جو جی میں آئے کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔ ہر بات اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ جیسا چاہے کرے وغیرہ وغیرہ۔ آپ نے دیکھا کہ اس مفہوم کی رو سے وہ ساری عمارت کس طرح دھڑام سے نیچے آگرتی ہے جو قانون کی حکمرانی کے قرآنی تصور کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ بنابریں، یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ میں نے ان امور کو اپنی تصنیف —— کتابُ التّقدیر —— میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ یہاں اس کا ملخص پیش کر دینا کافی ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ

خدا اُس وقت بھی خدا تھا جب یہ کائنات ظہور میں نہیں آئی تھی۔ اور اس وقت بھی خدا رہے گا جب یہ سلسلہ باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا خدا کی دنیا، اس کی پیدا کردہ مادی کائنات ہی نہیں، اس کے ماوراء بھی ہے۔ قرآنِ کریم نے مادی کائنات کو عالمِ خلق کہہ کر پکارا ہے اور اُس ماورائی دنیا کو عالمِ امر سے تعبیر کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷/۵۴)۔ "یاد رکھو! عالمِ امر اور عالمِ خلق دونوں خدا کی دنیائیں ہیں"۔

عالمِ امر

عالمِ امر کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ بس اتنا تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہاں خدا کا ارادہ کارفرما ہوتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اس کا تعلق خدا کے پروگرام کے شعبۂ پلاننگ (PLANNING) سے ہے۔ وہیں یہ فیصلے ہوتے ہیں کہ عالمِ خلق کیسا ہونا

چاہیئے۔ وہیں خدا کا تخلیقی پروگرام طے پاتا ہے۔ اور اس کے لئے قوانین مرتب ہوتے ہیں۔ وہاں کے متعلق ارشادِ باری تعالےٰ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ۔ (۲۲/۱۴) "خدا اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جو جی میں آئے کرتا ہے" دوسری جگہ ہے۔ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ۔ (۱۱/۱۰۷) "یقیناً تیرا رب اپنے ارادوں کے مطابق جیسا چاہے کرتا ہے" سورہ مائدہ میں ہے اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (۵/۱) "وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا چاہے فیصلہ کرتا ہے" یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (۲۲/۱۸) "وہ جو چاہے کرتا ہے" لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ ھُمْ یُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳) "اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اُس کے سوا ہر ایک سے پوچھا جا سکتا ہے"

یہ ہے خدا کا عالمِ امر جب اس کے امر کے مطابق یہ مادی کائنات وجود میں آئی تو یہاں اس کے امر نے ایک اور پوزیشن اختیار کر لی۔ کہا۔ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا۔ (۳۳/۳۸) "خدا کا امر مقدور ہو گیا" اس لفظ (مقدور) کا مادہ (ق۔ د۔ ر) ہے جس کے بنیادی معنی ہیں اندازہ یا پیمانہ۔ قَدَرْتُ الشَّیْئَ کے معنی ہیں، میں نے اس چیز کو ماپا، اس کا اندازہ کیا۔ قَدَرْتُ عَلَیْہِ الثَّوْبَ کے معنی ہیں میں نے اس شخص کے ماپ کے مطابق کپڑے بنائے۔ لہٰذا، تقدیر کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا پیمانہ یا اندازہ کے مطابق فِٹ ہو جانا۔ اور مِقْدَارٌ اس پیمانے یا ماڈل یا (PATTERN) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے۔

قدر کے معنی

چونکہ کسی چیز کو ایک خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری مقدرت حاصل ہو، اس لئے قَدَرْتُ عَلَی الشَّیْئِ کے معنی ہیں، مجھے یہ قدرت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنے پیمانے کے مطابق بنا دیتا۔

مادہ (ق۔ د۔ ر) کے ان مفاہیم کی رو سے وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸)۔ کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کا امر پیمانوں کے قالب میں ڈھل گیا۔ وہ، خدا کے مقرر کردہ اندازوں کا پابند ہو گیا۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْئٍ قَدْرًا۔ (۶۵/۳)۔ "خدا نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا" مادی کائنات میں، خدا کے مقرر کردہ، یہی وہ پیمانے ہیں جنہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ مثلاً، پانی ایک مقدار تک ممدِ حیات ہے لیکن جب وہ اس پیمانہ سے آگے بڑھ جائے تو انسان کی موت کا باعث بن جاتا ہے (جیسے ڈوب کر مر جانا)، اسے پانی کا پیمانہ کہا جائے گا۔ یہی قانونِ فطرت کہلاتا ہے — قرآنِ کریم میں قانون کا لفظ نہیں آیا۔ اس کی جگہ اسی مادہ (ق۔ د۔ ر) کی مختلف شکلیں آئی ہیں۔ ان پیمانوں کے متعلق خدا

تقدیراتِ الٰہیہ

نے یہ واضح کر دیا ہے کہ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ۔ (۷۷/۲۳)۔ "یہ پیمانے یا قوانین ہم نے مقرر کئے ہیں۔ ہم بہترین پیمانے مقرر کرنے والے ہیں"۔ لہٰذا قَادِرٌ کے معنی ہوئے

پیمانے مقرر کرنے والا؛ یا مادی کائنات کے لئے قوانین متعین کرنے والا۔ پیمانے مقرر کرنے کے اس عمل کو خدا کی تقدیر کہا گیا ہے۔ مثلاً سورہ یٰسین میں ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا۔ (۳۶/۳۸)۔ "سورج (نظامِ شمسی) اپنے مستقر کی طرف رواں دواں چلا جارہا ہے"۔ اور اس کے بعد ہے۔ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ۔ (ایضاً)۔ "یہ اس خدا کا مقرر کردہ قانون (تقدیر) ہے۔ جو ہر بات کا علم رکھتا ہے"۔ یہ تقدیراتِ الٰہیہ (یعنی خدا کے مقرر کردہ قوانینِ فطرت) مقرر تو عالمِ امر میں ہوتے تھے لیکن انسان کو اس کی صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ ان کا علم حاصل کرسکے۔ اسی بنا پر انہیں قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱) کہا گیا ہے۔ یعنی "وہ پیمانے جو معلوم ہوسکتے ہیں"۔ نظری طور پر خدا کے ان پیمانوں کو کَلِمٰتُ اللّٰهِ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اور اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴)"خدا کے ان قوانین میں تبدیلی نہیں ہوسکتی"۔ اور اس کے یہی قوانین جب عملی شکل اختیار کرلیتے ہیں تو اسے سنت اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کے لئے بھی واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا۔ (۳۳/۶۲)۔ "تو خدا کی سنت (روش) میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا"۔

آپ نے دیکھا کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کی اس نئی منزل میں کس قدر عظیم انقلاب رونما ہوا ہے۔ یعنی یہ انقلاب کہ خدا کا وہ امر، جو کسی ضابطہ اور قاعدہ کا پابند نہیں ہوتا، عالمِ خلق میں بہ شکلِ "مقدر" ہوگیا۔ یعنی وہ "اختیارِ مطلق" کے بجائے قانون بن گیا اور قانون بھی ایسا جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ بالفاظِ دیگر، اس سے خدا نے اپنے اوپر خود ایک پابندی عاید کرلی۔ "خدا پر پابندی" کے تصور سے ہم پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے۔ لیکن جب خدا نے خود کہہ دیا کہ ہم ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں کریں گے تو اس سے کپکپی طاری نہیں ہونی چاہیئے۔ جو قادرِ مطلق اپنی ذاتِ مطلقہ، اپنے کامل اختیار و ارادہ سے خود اپنے اوپر کوئی پابندی عاید کرلے تو اس کا ایسا کرنا اس کے قادرِ مطلق ہونے میں نقص پیدا نہیں کرتا۔ پابندی وہی قابلِ اعتراض ہوتی ہے جو کسی پر دوسرا شخص عائد کرے۔ جو پابندی اپنے اوپر آپ عائد کرلی جائے اُسے اصول پرستی کہتے ہیں، جو نہایت مستحسن امر ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ میں نے اپنے لئے یہ فرض قرار دے لیا ہے کہ میں کسی سائل کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں جانے دوں گا تو اس کی یہ خود عائد کردہ پابندی معیوب نہیں، نہایت مستحسن فیصلہ اور مبارک اقدام ہے۔

خدا نے اپنے اوپر آپ پابندی عائد کرنے کے لئے بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جنہیں دیگر مقامات پر انسانوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً اس نے کہا ہے۔

خدا نے اپنے اوپر پابندیاں عاید کر رکھی ہیں

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ (۶/۱۲)۔

"اُس نے رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے" اور دوسری جگہ انسانوں کے لئے کہا ہے۔ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (۲/۱۸۳) "تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے"۔ یعنی یہ فریضہ خدا کی طرف سے انسانوں پر عاید کیا گیا ہے۔ اور کَتَبَ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ (۶/۱۲) میں خدا نے یہ فریضہ خود اپنے اوپر عاید کر لیا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔ حَقًّا عَلَیۡنَا نُنۡجِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (۱۰/۱۰۳) "مومنین کو مصائب و آلام سے محفوظ رکھنا ہم نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے" دوسری جگہ ہے۔ وَکَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (۳۰/۴۷) "مومنین کی مدد کرنا ہمارے اوپر واجب ہے۔"

قرآنِ کریم کے اکثر مقامات میں "وعد اللہ" کے الفاظ آتے ہیں یعنی خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے۔ اور انہی وعدوں کے متعلق کہا ہے۔ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ (۳۰/۶) "خدا اپنے وعدوں کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا" یعنی اس نے وعدہ کا ایفا کرنا اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔

اِن، اور اِن جیسے دیگر مقامات سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قادرِ مطلق ہونے کے بعد، خود اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں جن کی خلاف ورزی وہ کبھی نہیں کرتا۔ الفاظ ان کے لئے کچھ ہی ہوں، ہم اپنی زبان میں یہی کہیں گے کہ یہ خدا کے قوانین ہیں جنہیں وہ کبھی نہیں توڑتا۔ مثلاً اُس نے کہا ہے کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (۲۴/۵۵) "خدا نے اُن لوگوں سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جو اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں تو وہ انہیں دنیا میں ضرور حکومت اور اقتدار عطا کر دے گا" اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ جب خدا نے کہا کہ ہم نے اپنے امر (اختیار و ارادہ) کو پیمانوں میں مقدور کر دیا ہے اور ہم اس کی کبھی خلاف ورزی نہیں کریں گے، تو اس سے اس کے قادرِ مطلق ہونے میں کوئی کمی نہیں ہو جاتی۔ لہٰذا جب کہا جائے گا کہ

انہی پابندیوں کا نام قوانینِ خداوندی ہے

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور انہی قوانین کی رو سے وہ ان پر ایسا کنٹرول رکھتا ہے کہ انہیں ان کی خلاف ورزی نہیں کرنے دیتا۔

اِن تصریحات کے بعد آپ آیۂ زیرِ نظر (۲/۲۰) کی طرف پھر آئیے۔ اس میں اُس نے کہا یہ ہے کہ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَذَہَبَ بِسَمۡعِہِمۡ وَ اَبۡصَارِہِمۡ (۲/۲۰) "اگر ہم چاہتے تو اِن لوگوں کی طبیعی صلاحیتوں کو سلب کر لیتے" لیکن ہم ایسا کر سکنے کی قدرت رکھنے کے باوجود ایسا نہیں کرتے۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (۲/۲۰)

"ہم نے تمام امور کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں"؛ اور ہمارا قانون یہ بھی ہے کہ انسانوں کے طبیعی امور کے فیصلے طبیعی قوانینِ فطرت کے مطابق کئے جائیں۔ اس قانون کی رو سے ہم جھوٹ بولنے والے کی زبان گنگ نہیں کر دیتے۔ کسی کی طرف نگاہِ بد سے دیکھنے والے کی آنکھوں کو اندھا نہیں کرتے۔ جھوٹ اور نگاہ کی خیانت اپنے نتائج ضرور پیدا کرتی ہے لیکن اس کے لئے ہمارے دوسرے قوانین مقرر ہیں۔

اس آیت پر ان تینوں گروہوں سے متعلق بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یعنی متقّین۔ کفّار۔ اور منافقین سے متعلق بحث کا خاتمہ۔ اس کے بعد ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

(۰)

خلاصۂ باب سوم

(آیات: ۸ — ۲۰)

(۸) سابقہ ابواب میں جن دو گروہوں کا ذکر آچکا ہے وہ یا تو وہ ہیں جو کھلے بندوں صداقت کا اقرار کرتے ہیں، یا کھلے بندوں اس سے انکار کرتے۔ تیسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اِس ضابطۂ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور قانونِ مکافات اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے، لیکن وہ درحقیقت ان پر ایمان نہیں رکھتے۔ (یہ لوگ یا تو سطحی جذبات پرست ہوتے ہیں اور یا ابن الوقت اور موقعہ پرست۔ اس لئے ان لوگوں کی رفاقت پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔)

(۹) یہ لوگ نظامِ خداوندی اور اُس کے قائم کرنے والی جماعتِ مؤمنین سے دورُخی چالیں چلتے ہیں۔ اور بزعمِ خویش سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں فریب دے رہے ہیں، حالانکہ اگر یہ عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ وہ خود اپنے آپ کو فریب میں رکھ رہے ہیں۔

(۱۰) اس قسم کی جذبات پرستانہ اور فریب کارانہ زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا قلب و دماغ صحت مندانہ توازن کھو بیٹھتا ہے اور خدا کا قانون یہ ہے کہ غیر متوازن ذہن جس قدر مصروفِ کار رہیگا اسی قدر اس کا توازن اور بگڑتا جائے گا۔

اس روش کو نبھانے کے لئے انہیں قدم قدم پر جھوٹ بولنا اور ہر موقعہ پر نیا بہروپ بدلنا پڑتا ہے۔ اندازہ لگاؤ کہ اس سے ان کی جان کس قدر اَلم انگیز عذاب میں رہتی ہے۔

(۱۱) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ناہمواریاں پیدا کر کے معاشرہ کے نظام کو تباہ مت کرو، تو یہ نہایت ڈھٹائی

سے کہتے ہیں کہ ہم معاشرہ کو بگاڑتے کب ہیں، ہم تو اسے سنوارنے والے مصلحین ہیں ـــ یاد رکھو! یہی لوگ تباہ کاریاں اور ناہمواریاں پیدا کرنے والے ہیں (اس لئے کہ جن کی اپنی داخلی زندگی میں ہمواریاں نہ ہوں وہ معاشرہ میں کس طرح ہمواریاں پیدا کر سکتے ہیں!)

حیرت ہے کہ یہ لوگ اس کا بھی احساس نہیں کرتے کہ ان کے قول و فعل کا یہ تضاد، ان کی اصل و حقیقت کو کس طرح بے نقاب کر دیتا ہے!

(۱۳) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اس ضابطہ زندگی کو اسی طرح مانو اور اختیار کرو جس طرح جماعت مومنین کے افراد اسے صحیح تسلیم کرتے اور اس کے مطابق چلتے ہیں، تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ تو بیوقوف ہیں جنہیں اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں، اور مفت ہاتھ آجانے والے فائدوں کو چھوڑ کر "اصول پرستی" کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں! کیا ہم بھی انہی جیسے احمق بن جائیں؟

یاد رکھو! نفع نقصان سے بے خبر اور احمق خود یہ لوگ ہیں جو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ عارضی مفاد کی خاطر مستقل منافع کو چھوڑ دینا، اچھی تجارت نہیں کہلا سکتی۔

(۱۴) ان کی دو رُخی زندگی کا یہ عالم ہے کہ جب یہ اُن لوگوں کے سامنے آتے ہیں جو اس ضابطہ خداوندی کو اختیار کئے ہیں، تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہاری طرح اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن جب یہ اپنی پارٹی کے سرغنوں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو اُن سے کہتے ہیں کہ ہم اندر سے تو تمہارے ہی ساتھ ہیں، صرف ظاہرا طور پر ان لوگوں سے ملتے اور انہیں بے وقوف بنا کر ان کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔

(۱۵) اے کاش! یہ اس کا اندازہ کر سکتے کہ یہ دوسروں کو بیوقوف بنا کر اُن کا مذاق کیا اڑائیں گے، خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے (حقائق کی دنیا میں) خود اپنا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی قوت و اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر غلط راستے پر پڑ جاتے ہیں اور پھر حیران و سرگرداں مارے مارے پھرتے ہیں، اور جوں جوں آگے بڑھتے ہیں، منزل سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

(۱۶) یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے ہیں کہ دوسروں کو دھوکا دے کر ناجائز فائدے حاصل کر رہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہمارا کاروبار بڑا نفع بخش ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسا نادان ہی کوئی نہیں کہ انہوں نے زندگی کی صحیح روش کے بدلے میں غلط راستہ خرید لیا ہے۔ انکی یہ تجارت کبھی نفع بخش ثابت نہیں ہو سکتی۔ اسلئے کہ غلط راستے پر چلکر زندگی کی منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

(۱۷-۱۸) ان عارضی اور عاجلہ مفاد کے پیچھے پھرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جنگل کی تاریک رات میں راستہ معلوم کرنے کے لئے آگ سلگائے جس سے اُس کے اردگرد کی فضا روشن ہو جائے لیکن اس کے فوری بعد آگ بجھ جائے اور اس طرح خدا کا

قانون اُسے تاریکیوں میں اس طرح چھوڑ دے کہ اُسے کچھ دکھائی نہ دے۔ (یعنی مفادِ عاجلہ کی تابناکیاں ایک دفعہ تو نگاہوں میں چکاچوند پیدا کر دیتی ہیں لیکن اس کے بعد ایسا اندھیرا چھا جاتا ہے کہ اس میں) صرف نگاہیں ہی بیکار نہیں ہوتیں بلکہ سوجھ بوجھ کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اور انسان بہرا، گونگا اور اندھا ۔ یعنی عقل و فکر سے عاری (۲/۱۸) اور جذبات سے مغلوب ہو کر نفع و نقصان کی تمیز سے محروم ہو جاتا ہے (۲/۱۷۱) اور اس کے لئے صحیح راستے کی طرف لوٹنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

(۱۹) یا (ان کے تمدنی اور معاشی نظام) کی مثال، جو ان کے خود ساختہ قوانین سے مرتب ہوتا ہے، ایسی ہے جیسے وقت پر مینہ برسانے والا بادل، لیکن اُس کے ساتھ گھٹا ٹوپ اندھیرا، گرج اور بجلی کی چمک بھی۔ (یعنی سامانِ زیست کے ساتھ اسبابِ ہلاکت ملے ہوئے (۲۴/۴۰)) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بارش کی منفعت بخشیوں سے تو فائدہ اٹھالیں لیکن رعد و برق کی تباہ کاریوں سے بچ جائیں۔ اس کا طریقہ ان کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی جائیں ـــ نہ یہ ہیبت ناک آوازیں سنائی دیں، نہ وہ موت کے منہ میں جائیں ـــ ان نادانوں کو اتنا معلوم نہیں کہ بجلی کی تباہ کاریاں کانوں کے راستے ہی اندر نہیں جایا کرتیں۔ وہ تو پوری کی پوری فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ (یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر تدبّر کی فسوں سازی سے اُن رخنوں کو بند کر دیا جائے جن کے راستے ان کی دانست میں تباہیاں آتی ہیں تو غلط نظامِ زندگی کے عواقب سے محفوظ رہا جا سکتا ہے لیکن ان کا خیال خام ہے)۔ خدا کا قانونِ مکافات اُس قوم کو چاروں طرف سے گھیرے رہتا ہے جو حقائق سے انکار کرتی ہے۔ (۱۳/۷؛ ۴۵/۲۹؛ ۳۶/۷۹؛ ۱۶/۸۲)۔

(۲۰) ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کڑک کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں (اور اس طرح بزعمِ خویش اپنے آپ کو ان خطرات سے محفوظ خیال کر لیں) تو بجلی کی چمک ان کی بینائی اچک کر لے جائے یعنی سامانِ زیست کی فراوانی ان کی نگاہوں میں ایسی خیرگی پیدا کر دے کہ انکی آنکھیں خطرہ کے مقامات کو بھانپنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ یا یہ ایک خطرہ کی روک تھام کا انتظام کریں تو دوسرا خطرہ کسی غیر متوقع مقام سے ابھر کر انہیں تباہ کر دے (۶/۱۴۳)۔

مختصراً یوں سمجھو کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو قوم بھی فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لے وہ ان سے نفع یاب ہو جاتی ہے (۱۷/۱۸-۲۱) لیکن صرف طبیعی زندگی کے مفاد پر نگاہ رکھنے والوں کی یہ نفع یابیاں عارضی ہوتی ہیں؛ اور بلند اقدار کو سامنے رکھنے والوں کی مستقل اور پائیدار (۲/۱۰۲؛ ۱۵/۱۱؛ ۲۰/۳۴) اول الذکر کی حالت یوں سمجھو جیسے کوئی شخص بادلوں سے گھری ہوئی تاریک رات میں، صحرا میں راہ گم کردہ کھڑا ہو۔ جب بجلی کی چمک سے ذرا راستہ روشن ہو جائے تو وہ اُس میں چار قدم چل لے لیکن جب پھر اندھیرا چھا جائے تو کھڑے کا کھڑا رہ جائے۔

ہم چاہتے تو ایسا بھی کر سکتے تھے کہ ان لوگوں کے ذرائع علم (سماعت و بصارت) سلب کر لیتے اور اس طرح انہیں قدرتی سامانِ نشو و نما سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہ دیا جاتا، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم نے ہر بات کیلئے اندازے اور پیمانے مقرر کر دیئے اور قوانین وضوابط ٹھہرا دیئے ہیں۔ کائنات کی کوئی شے ان پیمانوں سے باہر نہیں جا سکتی۔ ان پر ہمارا پورا پورا کنٹرول ہے۔

چوتھا باب

(آیات ۔۔۔۔ ۲۱ تا ۲۹)

النّاس

۱۔ انسانی تخلیق۔
۲۔ عالمِ خلق وعالمِ امر۔
۳۔ مبداء کائنات کے متعلق سائنسدانوں کا عجزِ فہم۔
۴۔ زندگی کی نمود۔
۵۔ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔
۶۔ اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔
۷۔ الٰہ الارض اور الٰہ السماء۔
۸۔ اسٹیٹ کا تصوّر ۔۔۔ عصرِ حاضر کا نِدّ۔ (معبودِ باطل)
۹۔ رزقِ حلال ۔۔۔ رزقِ اللہ۔
۱۰۔ معجزات کا مطالبہ اور انکار۔
۱۱۔ قرآن کا چیلنج۔
۱۲۔ جہنّم کا مفہوم۔
۱۳۔ جنّت کی حوریں۔
۱۴۔ قرآنی مثالیں۔
۱۵۔ زندگی کیسے ظہور میں آگئی؟
۱۶۔ اُخروی زندگی۔
۱۷۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔
۱۸۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا باہمی تعلق۔
۱۹۔ خاتمۃ الکتاب۔

چوتھا باب

(آیات ۲۱ تا ۲۹)

یَاَیُّھَا النَّاسُ

(۲/۲۱) یَاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔

گزشتہ باب میں ہمارے سامنے نوعِ انسان کے تین گروہ ـ متقین، کفار اور منافقین ـ آئے تھے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کا بنیادی تخاطب نوعِ انسان سے ہے۔ وہ انسانوں کی مختلف جماعتوں اور گروہوں کا ذکر ان کی سیرت و کردار، اعمال و افعال اور اوصاف و خصائص کے امتیازات کی رو سے کرتا ہے؛ ورنہ اس کا پیغام عالمگیر انسانیت ہی کے لئے ہے۔ اس کا خدا رَبِّ النَّاسِ مَلِکِ النَّاسِ اِلٰہِ النَّاسِ (۱۱۴/۱-۳) ہے۔ اس کے رسولؐ کا اعلان ہے کہ یَاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (۷/۱۵۸)۔ اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا پیغامبر اور کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ (۳۴/۲۸) کے لئے بشیر و نذیر ہوں۔ اس کی کتاب نوعِ انسان کے لئے برہان اور نورِ مبین (۴/۱۷۴) اور عالمگیر انسانیت کے نفسیاتی امراض کے لئے شفا، موعظت، ہدایت اور رحمت (۱۰/۵۷) ہے؛ جس کے عطا ہونے پر انہیں جشنِ مسرت منانا چاہیئے۔ (۱۰/۵۸)۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یاد رکھو! بقا اور دوام صرف اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ (۱۳/۱۷)۔ یہی ہیں وہ اعمال جنہیں اعمالِ صالحہ اور حسنات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ انہی کے نتیجہ میں اس دنیا میں اقتدار و استخلاف حاصل ہوتا ہے اور اُخروی زندگی میں جنت کی بہاریں۔ اس کا مقصود و منتہیٰ تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتہ میں منسلک کرنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان اپنی تمدنی زندگی کے آغاز میں امت واحدہ کی شکل میں رہتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے اور مختلف قبیلوں، خاندانوں، گروہوں اور قوموں میں بٹ گئے (۱۰/۱۹)۔ ان کے اس تفرقہ اور اختلاف کو مٹانے کے لئے آسمانی رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا گیا۔ رسولوں کو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا گیا، انہیں ضوابط اقدار و قوانین عطا کئے گئے تاکہ ان کے ذریعہ وہ ان منتشر انسانوں کو پھر سے امتِ واحدہ بنا دیں۔ یہ بتائی گئی ہے غایتِ آسمانی ہدایت و سعادت کے سلسلۂ درازکی۔ اسی

بنا پر آیۂ زیرِ نظر میں الناس سے خطاب کیا گیا ہے۔ اور انہیں وہی بات کہی گئی ہے جو اس سے پہلے مختلف انبیائے گرامی قدر کی وساطت سے بار بار کہی جاتی رہی تھی یعنی اِعْبُدُوا اللّٰهَ۔ تم انسانوں کے وضع کردہ قوانین وضوابط کو چھوڑ کر کہ جنہوں نے تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک دوسرے کا دشمن بنا رکھا ہے، صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو (لفظ عبادت کا مفہوم سورۃ فاتحہ کی آیت (۱/۴) میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے۔ تجدید یادداشت کے لئے اُسے ایک مرتبہ پھر دیکھ لیجئے کیونکہ یہی دین کی اصل واساس ہے اور اسی محور کے گرد قرآنِ کریم کی ساری تعلیم گردش کرتی ہے)۔ اس نے واضح طور پر بتا دیا کہ انسانی پیدائش کا مقصد اُسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرے۔ سورۃ الذّٰریٰت میں ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔ (۵۱/۵۶) "انسان خواہ وہ شہروں کی تمدنی زندگی بسر کر رہے ہوں یا خانہ بدوش صحرانورد قبائل کی منتشر زندگی، وہ اپنی تخلیقی غایت اُسی صورت میں حاصل کر سکتے ہیں جب وہ صرف خدا کی محکومیت اختیار کریں"۔

خدا کی صفتِ ربوبیّت

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم میں خدا کا ذاتی نام اللہ ہے اور باقی اس کی تمام صفات ہیں جنہیں الاسماء الحسنیٰ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات میں خدا کی ان صفات کو بڑی کثرت وتکرار سے پیش کیا گیا ہے۔ قرآن کا یہ بھی اعجاز ہے کہ جس مقام پر اللہ تعالیٰ کی جس صفت کو لایا گیا ہے وہ وہاں ٹھیک منطبق ہوتی، اور متعلقہ آیت کے مفہوم کی بڑے دلنشیں انداز سے وضاحت کر دیتی ہے۔ زیرِ تشریح آیت میں کہا گیا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ۔ یعنی یہاں خدا کی صفتِ ربوبیت کو نمایاں طور پر سامنے لایا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ پیشِ نظر آیات کا موضوع ہی خدا کی ربوبیتِ عالمینی ہے (لفظ ربّ کا مفہوم سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت (۱/۱) میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اسے وہاں دیکھ لیجئے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کی پرورش کرتے ہوئے اُسے' اُس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج منزلِ تکمیل تک پہنچانے والا — یعنی ہر شے کو اس کے حسبِ حال سامانِ نشوونما دینے والا)

خالقیت

لیکن اس آیت میں صفتِ ربوبیت کے بعد خَلَقَكُمْ کہہ کر خدا کی صفتِ خالقیت کو بھی نمایاں کیا گیا ہے اور یہ کہہ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (اُس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور اُن انسانوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں) شروع سے آخر تک تمام نوعِ انسان کو' اپنے احاطہ میں لے لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں جو کچھ کہا جائے گا۔ وہ کسی خاص دور کے انسانوں تک محدود نہیں ہوگا۔ اس کا اطلاق ابتدائے انسانیت سے لے کر آخر تک تمام نسلِ انسانی پر ہوگا۔ یعنی خدا نے ان سب کو پیدا کیا اور وہی ان کے لئے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ تخلیق کے سلسلہ میں اس نے کہا۔ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ۔ (۲۶/۱۸۴) "اُس خدا کے

قوانین کی نگہداشت کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور سابقہ نسلوں کو بھی"، اور تخلیق کے ساتھ رزاقیت کے متعلق کہا۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ (۳۰/۴۰) "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا بھی کیا اور سامان رزق بھی عطا کر دیا ہے"۔ دیگر کئی ایک مقامات پر اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس کے سوا نہ کوئی خالق ہے نہ رزاق۔ سورۃ فاطر میں ہے۔۔۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۔ (۳۵/۳) "اے نوعِ انسان! تم خدا کی اُن نعمت ہائے بے پایاں کو نگاہوں کے سامنے لاؤ جن سے اُس نے تمہیں نوازا ہے۔ اور پھر سوچو کہ اُس کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے' اور کوئی ایسا ذی اقتدار بھی جو تمہیں سامانِ نشو و نما عطا کرتا ہے۔ اور جب وہی خالق ہے اور وہی رازق، تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہاں اقتدار و اختیار بھی اُسی کا ہونا چاہیئے۔ جب یہ حقیقت اس قدر واضح ہے تو تم بتاؤ کہ اس سے منہ موڑ کر کس طرف بہکے جاتے ہو؟" دوسرے مقام پر اسی حقیقت اور دعویٰ کو دہرا کر کہا۔ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (۲۷/۶۴) "اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ خالق، رازق اور الٰہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے، تو تم اس کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ بلا دلیل تو کوئی دعوےٰ بھی ہمارے ہاں قابلِ پذیرائی قرار نہیں پا سکتا"۔

رزاقیت

تخلیق و رزاقیت کا یہ ربطِ باہمی بڑا گہرا اور غور طلب ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے، یا کسی اور مخلوق نے' خدا سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ وہ انہیں دنیا میں پیدا کرے۔ اس نے اپنے کسی ہمہ گیر اور محیطِ کل پروگرام کے مطابق مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ آپ سوچیئے کہ کیا یہ ظلم و زیادتی نہ ہوتی کہ مخلوق کو پیدا تو کر دیا جاتا لیکن جس سامان و اسباب پر ان کی زندگی اور پرورش کا دار و مدار ہوتا وہ پیدا نہ کیے جاتے! خدا نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے پہلے اس سامان و اسباب کو پیدا کیا اور اُس کے بعد اُس مخلوق کو' جن کے لیے اس ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ علم الارض اور علم الحیات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ ہوا، پانی، روشنی، حرارت، اور زمین میں پیداوار کی صلاحیت پہلے وجود میں آئی اور جاندار مخلوق اس کے بعد پیدا ہوئی۔ یہ ہے تخلیق اور رزاقیت کا بنیادی ربط۔ ضمناً، یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں مخلوق کی ایک خاصی تعداد سامانِ رزق سے محروم رہ جاتی ہے، تو یہ، رزق کی غیر خداوندی تقسیم کا نتیجہ ہے جسے انسانوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے ورنہ خدا نے تو اس سامان و اسباب کو تمام نوعِ انسان کی ربوبیت کے لیے یکساں طور پر پیدا کیا تھا۔ تفصیل ان امور کی آیت (۲/۳) کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ اس کی مزید تشریح زیرِ نظر آیات میں بھی سامنے آئے گی، اور اس کے بعد بھی، جہاں جہاں معاشی نظام سے متعلق گفتگو ہوگی۔ یہ، بہرحال ایک ضمنی نکتہ تھا۔ یہاں اصل موضوع تخلیق سے متعلق ہے۔

خَلَقَ۔ مادہ (خ۔ ل۔ ق) کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو بنانے یا کاٹنے کے لیے اُسے ماپنا۔ اس کا اندازہ لگانا۔

اس کے تناسب و توازن کو دیکھنا۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے بنانا۔ لہٰذا خَلقٌ کے معنی ہوں گے کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اسکے حشو وزوائد کو دور کرنا اور پھر اُسے اندازے اور پیمانے کے مطابق بنانا اس طرح کہ اس کا توازن و تناسب بالکل درست رہے[1]۔ بالفاظِ دیگر، مختلف عناصر کو نئی نئی ترکیبیں دے کر اُن سے اور چیزیں پیدا کرتے چلے جانا۔ تشریح اس نکتہ کی آگے چل کر سامنے آئے گی۔

سورۃ الاعراف میں ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ (۷/۵۴)۔ "آگاہ رہو! کہ خلق اور امر دونوں خدا کے لئے ہیں۔ ان میں اس کا کوئی اور شریک نہیں"۔ انہی کو عام طور پر عالمِ امر اور عالمِ خلق کہا جاتا ہے۔ امر کے متعلق

خلق و امر

کچھ ابتدائی گفتگو سابقہ باب کے آخر میں، خدا کے قادرِ مطلق ہونے کے سلسلے میں کی جا چکی ہے وہاں امر اور قدر کا ربطِ باہمی بتایا گیا تھا۔ یہاں امر اور خلق کا ارتباط سامنے آتا ہے۔ اَلْاَمَرَةُ۔ صحرا میں چھوٹے چھوٹے پتھر رکھ کر جو راستہ کا نشان بنایا جاتا تھا اس کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے اس کے بنیادی معنی نشان، علامت یا سمت (DIRECTION) کے ہیں۔ یہ لفظ اور بھی متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ہم اس کے انہی معانی پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ ہمارے زیرِ نظر موضوع کا تعلق انہی سے ہے۔ یہ واضح ہے کہ جب بھی کوئی صانع کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کا تصور یا خیال اس کے ذہن میں ابھرتا ہے۔ پھر وہ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرتا ہے۔ اس کی تخلیق کے امکان اور ساخت پرداخت وغیرہ کو ذہن میں لاتا ہے۔ اور جب وہ ان سب امور کا نظری طور پر تعین کر لیتا ہے تو اُس شے کو محسوس طور پر بنانے کے لئے قدم اٹھاتا ہے۔ خدا کے تخلیقی پروگرام میں اس پہلے گوشہ کو عالمِ امر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں، وجود میں لائی جانے والی شے کے متعلق تمام امور "نظری" طور پر طے پا جاتے ہیں۔ اسے آپ پلاننگ کی (تدبیری) اسٹیج کہہ لیجئے۔ لیکن تخلیقی پروگرام میں یہ اسٹیج اس قدر لاینفک اور اہم ہوتی ہے کہ اس کے بغیر کوئی شے وجود میں نہیں لائی جا سکتی۔ اور اگر یہ مرحلہ یقینی طور پر طے ہو جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ گویا وہ شے وجود میں آگئی۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پر اس قسم کی آیات آتی ہیں۔ (مثلاً) وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (۲/۱۱۷)۔ "جب وہ ایک امر (تدبیر) کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اس امر سے کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔" خدا کا یہ امر کیا ہوتا ہے اور وہ کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ ہمارا علم، عالمِ خلق تک محدود ہے۔ اس سے آگے جا نہیں سکتا۔ مشہور مفکر (PRINGLE PATTISION)

---

[1] اس سے خُلق اور اخلاق کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں جو اسی مادہ سے بنتے ہیں۔

نے کہا ہے کہ انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی ہے کہ اس میں تخلیق کے لئے صرف ایک لفظ (CREATION) ہے۔ حالانکہ ضروری تھا کہ تخلیق کے ان ہر دو (غیر مرئی اور محسوس) مراحل کے لئے الگ الگ الفاظ ہوتے۔ عربی زبان میں یہ الگ الگ الفاظ (امر اور خلق) موجود ہیں اور قرآنِ کریم نے انہیں اِسی مقصد کے لئے استعمال کیا ہے[1]۔ اگر اس مفکر کی نگاہ میں ذرا اور وسعت ہوتی تو وہ دیکھتا کہ قرآنِ کریم نے ان مراحل کے لئے دو الگ الگ الفاظ ہی استعمال نہیں کئے، تین الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور یہ الفاظ تخلیقی پروگرام میں جن تین مراحل کی نشان دہی کرتے ہیں وہ بڑے اہم اور بنیادی ہیں (یہ تیسرا لفظ (یا مرحلہ) آگے چل کر سامنے آئے گا۔

جب امر کا مرحلہ طے ہوجاتا ہے تو اس کے بعد خلق کی منزل سامنے آتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں وہ شے محسوس شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ تخلیق کے معنی ہیں مختلف عناصر کو خاص تناسب کے ساتھ ملا کر ان سے ایک نئی چیز پیدا کر دینا۔ انسانی صانع یا کاریگر کے لئے یہ مرحلہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ وہ جب کسی شے کی تدبیر کو ذہن میں طے کر لیتا ہے تو اس کے سامنے وہ عناصر پہلے سے موجود ہوتے ہیں جن کے امتزاج سے اُس نے اُس شے کو بنانا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ایک (ARCHITECT) مکان کا نقشہ تیار کر لیتا ہے تو وہ سامان جو اس مکان کی تعمیر کے لئے ضروری ہوتا ہے دنیا میں موجود ہوتا ہے — اینٹ، پتھر، سیمنٹ، لوہا اور لکڑی وغیرہ — اس کے لئے کرنے کا کام اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ ان عناصر (اشیائے ضروریہ) کو خاص تناسب اور توازن کے ساتھ ملا کر نقشے کے مطابق مکان تعمیر کرتا چلا جائے۔ لیکن جب خدا نے اپنے تخلیقی پروگرام کا آغاز کیا تو صورت یہ نہیں تھی۔ اس نے عالمِ امر میں تخلیقِ کائنات کا نقشہ تیار کر لیا۔ تو اُس وقت کوئی شے بھی ایسی موجود نہ تھی جس سے اس پروگرام کے مطابق تخلیقِ کائنات کی جاتی۔ یہاں پہلے خود اُن عناصر کا وجود میں لانا ضروری تھا جن کی ترکیباتِ نَو سے مختلف اشیائے کائنات کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ ہے خدا کے تخلیقی پروگرام میں وہ تیسرا (یا یوں کہیئے کہ درمیانی) مرحلہ جو (PATTISION) کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا۔ یہ مرحلہ ہے محسوس بنیادی عناصر کو عدم سے وجود میں لانے کا۔ اس کے لئے اس نے بَدَعَ اور فَطَرَ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

بدیع اور فاطر

یعنی کسی شے کو پہلے پہل وجود میں لانا۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالےٰ نے اپنے آپ کو بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲/۱۱۷) کہا ہے۔ سورۃ یوسف میں فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۲/۱۰۱)۔ سورۃ انعام میں یہی لفظ فعل کے صیغہ میں آیا ہے جہاں کہا ہے۔ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۶/۷۹)۔ یعنی وہ ذات جو عناصرِ کائنات کو پہلے پہل وجود میں لائی۔

---

[1] خطباتِ اقبالؒ۔ (صفحہ ۹۷)

تخلیقِ کائنات کے متعلق تفصیلی گفتگو تو بعد میں اس کے مناسب مقام پر آئے گی۔ یہاں ہم اپنے آپ کو اس پروگرام کے اساسی خطوط تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ مغرب کے سائنس دان مختلف اشیائے کائنات کے تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان مرکب اشیاء سے پیچھے ہٹتے ہٹتے ہم ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں جو مختلف اجزاء سے مرکب نہیں بلکہ وہ مفرد ہیں۔ ان مفردات کو (ELEMENTS) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان کی تعداد (۹۲) بتائی جاتی تھی۔ اب ان میں ایک آدھ اور کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ مرکب اشیاء کے متعلق تو یہ جان لینا آسان تھا کہ وہ کس طرح وجود میں آتی ہیں، لیکن ان مفردات کے متعلق انسانی علم کچھ نہیں جان سکا کہ وہ کس طرح وجود میں آگئے۔ مثلاً جب انہوں نے پانی کے ایک قطرہ کا تجزیہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ دو حصہ ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن سے مرکب ہے۔ (اسی لئے پانی کو H_2O سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔ لیکن ہائیڈروجن اور آکسیجن دونوں مفردات ہیں۔

ایٹم سے توانائی تک

یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ کس طرح وجود میں آگئیں۔ مادہ (MATTER) کی اس تجزیاتی تحقیق کا ابوالآباء یونانی فلاسفر، دیمقراطیس (DEMOCRITUS - BORN 470 B.C.) کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی تحقیق یہ تھی کہ مادہ ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات سے مرکب ہے جنہیں مزید تقسیم نہیں کیا جا سکتا ان ناقابلِ تقسیم ذرات کو اجزائے لایتجزیٰ یا (ATOMS) کہا جاتا ہے۔ یہ نظریہ رواں دواں آگے بڑھتا چلا آیا تا آنکہ ہمارے اس دور میں سائنس دانوں نے مزید انکشاف یہ کیا کہ مادہ کا ہر ذرہ درحقیقت مثبت اور منفی برقیہ (بجلی) کا ہیولیٰ ہوتا ہے اور جب یہ اور آگے بڑھے تو انہوں نے کہا کہ یہ برقیاتی لہریں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ توانائی محض (PURE ENERGY) ہیں۔ اگر مادہ کے کسی ذرہ کو پھاڑا جائے تو اس سے ایسی بے پناہ توانائی حاصل ہوتی ہے جس سے یہ عظیم کرۂ ارض بھک سے اڑایا جا سکتا ہے۔ یہ جو آجکل اٹامک انرجی (ATOMIC ENERGY) یا (NUCLEAR ENERGY) کا اسقدر شہرہ ہے، وہ یہی توانائی ہے۔

واضح رہے کہ نہ تو قرآن کریم کوئی سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی اس وقت ہمارا موضوع مادہ کی سائنٹیفک تشریح ہے ہمیں کہنا صرف یہ ہے کہ مفردات اپنی محسوس شکل میں ہوں یا توانائی (ENERGY) کی صورت میں، اصل سوال یہ ہے کہ یہ وجود میں کیسے آگئے۔ قرآن کریم نے اسے بَدِیعٌ اور فَطَرَ سے تعبیر کر دیا۔ یعنی یہ کہہ دیا کہ خدا انہیں عدم سے وجود میں لے آیا۔ اس سے آگے بات ہمارے حیطۂ ادراک میں آ ہی نہیں سکتی۔ ہمارا ذہن یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ کوئی شے عدم سے کس طرح وجود میں آ سکتی ہے۔ یہ اشیاء موجود ہیں۔ ان کے وجود سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ وجود میں کیسے آگئیں۔ آئن سٹائن جیسا عظیم سائنس دان بھی کہہ سکا ہے تو فقط اتنا کہ:-

طبیعی سائنس نے اب تمام اشیاء کو حرکت میں تبدیل کر دیا ہے...... کائنات جو ہمیں اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہے، ایک ٹھوس شے نہیں، جو فضا میں پڑی ہے۔ یہ شے (THING) ہے ہی نہیں، بلکہ عمل (ACTION) ہے یا حوادث (EVENTS) کی عمارت[1]

آپ نے دیکھا کہ سائنس کی تحقیقات کا رخ کس طرح عالمِ خلق سے عالمِ امر کی طرف مڑ رہا ہے۔ لیکن بایں ہمہ، یہ حقیقت ابھی ایک معمہ بنی ہے کہ اس مادی کائنات کی ابتدا ہو کیسے گئی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں (EDDINGTON) بھی اسی طرح نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائے انگشت بدندان کھڑا ہے جس طرح ایک ہل چلانے والا دہقان (ERNST HAECKEL) نے ایک بڑی دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے معمۂ کائنات (RIDDLE OF THE UNIVERSE)۔ وہ اس میں لکھتا ہے :-

ہمیں اس کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ نیچر کی کنہ د حقیقت سے ہم آج بھی اسی قدر بے خبر ہیں جس قدر آج سے (2400) سال پیشتر حکمائے یونان، یا دو سو سال پہلے نیوٹن اور اسپنوزا، یا سو سال پہلے کانٹ اور گوئٹے بے خبر تھے۔ ہمیں تو بلکہ اس کا بھی اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہم جس قدر اس جوہر کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے یہ کائنات مرکب ہے اور مادہ اور توانائی جس کے خصائص ہیں، وہ اور معمہ بنتا جا رہا ہے۔ ہم اسکی محسوس شکلوں اور ان کی ارتقائی منازل کا علم تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن ان محسوس شکلوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے اس کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جان سکتے۔ (صفحہ ۳۱)

اور ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعیات کا پروفیسر، ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کروتھر کہتا ہے کہ :-

نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے[2]

(THE GREAT DESIGN P.35)

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے، قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ علوم سائنس کی کتاب

---

[1] خطباتِ اقبالؒ۔ (صفحات ۵۳ تا ۴۰)

[2] اس موضوع پر مزید معلومات کے لئے میری کتاب — انسان نے کیا سوچا؟ — کا باب دوم دیکھئے۔

نہ ہونے کے باوجود، جہاں جہاں کسی حقیقت کی طرف اشارہ بھی کر دیتا ہے تو سائنس کے انکشافات اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس نے مادی کائنات کے اولین عناصر کے متعلق تو اتنا ہی کہا کہ خدا انہیں عدم سے وجود میں لایا ہے، لیکن اس کے بعد اس نے بتایا کہ اس ابتدائی مرحلہ کے بعد، خدا کا تخلیقی پروگرام کس طرح مختلف اشیاء کو ارتقائی مراحل میں سے گزارتا ہوا انہیں آخری شکل دے دیتا ہے۔ کئی ایک مقامات پر اس نے کہا ہے کہ۔ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ۔ (۱۰/۴) "وہ کسی شے کی تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اُسے مختلف گردشیں دیتے ہوئے آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے"۔ ان گردشوں سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے حشو و زوائد کو دور کر کے، اس میں صحیح توازن و تناسب پیدا کر دیا جائے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی (۸۷/۲)۔ "وہ ایک چیز کو پیدا کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس میں تسویہ (اعتدال) پیدا کرتا چلا جاتا ہے"۔ اسی بنا پر خدا نے اپنے آپ کو اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (۵۹/۲۴) کہا ہے۔ یعنی تخلیق کی ابتدا کرنے والا، پھر اُس شے کو مختلف گردشیں دے کر، اس کے حشو و زوائد کو دور کرنے والا۔ اور اس طرح اُسے آخری شکل دے دینے والا۔ ارسطو نے مختلف اشیاء میں وجہِ امتیاز شکل (FORM) کو قرار دیا تھا۔ بلکہ وہ تو شکل ہی کو شے کہہ کر پکارتا تھا۔ قرآنِ کریم نے خدا کو المصوّر کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ وہ کس طرح مختلف اشیائے کائنات کو تخلیقی مراحل سے گزار کر انہیں ایک خاص شکل (FORM) میں لے آتا ہے۔ اشیائے کائنات کی یہ خدا کی کشیدہ و تراشیدہ صورت، حسنِ تناسب و توازن کی بہترین مظہر ہوتی ہے۔ اس نے کہا ہے۔ اَلَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ۔ (۳۲/۷) "خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو متناسب اور متوازن (حسین ترین پیکر عطا کیا ہے"۔ اور اسی جہت سے اس نے اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (۲۳/۱۴)۔ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خالقوں

احسن الخالقین

میں سے بہترین خالق۔ حسنِ تخلیق کے علاوہ، اس میں ایک اور بھی عظیم نکتہ مضمر ہے۔ خدا نے اپنے آپ کو جو احسن الخالقین کہا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ دیگر خالقین کے وجود کو بھی تسلیم کرتا ہے، اگرچہ ان کے اور خدا کے خالق ہونے میں یہ فرق ہوگا کہ خدا احسن الخالقین ہے اور دوسرے خالق اُس سے کمتر درجے کے۔ ظاہر ہے کہ ہماری معلوم کائنات میں، انسان ہی خالق ہو سکتا ہے ۔۔۔ یعنی مختلف مادی سامان سے نئی نئی چیزیں بنانے والا۔ علامہ اقبالؒ تو اس قوتِ تخلیق کو نہ صرف وجہِ شرفِ آدمیت قرار دیتے ہیں۔ بلکہ جو انسان اس سے عاری ہو وہ اُسے مومن بھی تصور نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست　　نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

تخلیق و تولید

واضح رہے کہ تخلیق اور تولید میں بنیادی فرق ہے۔ عملِ تولید (یعنی افزائش نسل، جو جنسی اختلاط کا نتیجہ ہوتی ہے) میں انسان اور حیوان سب شامل ہیں۔ اگر انسان بھی تولید تک ہی محدود رہے تو وہ

حیوانی سطح سے آگے نہیں بڑھتا۔ اُسے حیوانی سطح سے ممتاز کرنے والا جوہر، عملِ تخلیق ہی ہے۔ بالفاظ دیگر، حیوانات کا عمل تولید ہے، تخلیق نہیں۔ انسان تولید اور تخلیق دونوں پر حاوی ہے اور خدا کا عمل تولید نہیں، صرف تخلیق ہے۔ اسی لئے اُس نے عیسائیت کے اس باطل عقیدہ کی جگہ جگہ تردید کی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ 'ابن اللہ' (خدا کے بیٹے) تھے۔ قرآنِ کریم نے سورۃ اخلاص میں جو اللہ تعالیٰ کی چند نہایت جامع صفات گنائی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ (۱۱۲/۳) "نہ وہ خود کسی کے عملِ تولید کا نتیجہ ہے اور نہ ہی تولید اُس سے عمل میں آتا ہے" حتیٰ کہ وہ خود مخلوق بھی نہیں، بلکہ خالق ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر، فاطر ہے۔ انسان خالق ہو سکتا ہے، فاطر نہیں ہو سکتا۔

خدا کے متعلق یہ تصور بھی باطل ہے کہ وہ ایک دفعہ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد معطل ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

مخلوق میں اضافے

اس کا عملِ تخلیق برابر جاری ہے۔ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵/۱) "وہ نت نئے تخلیقی اضافے کرتا رہتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

غالب اسی حقیقت کو اپنے رنگ میں یوں پیش کرتا ہے کہ

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مشہور مفکر (ERNST CASSIER) اپنی کتاب (AN ESSAY ON MAN) میں لکھتا ہے:۔

> سلسلۂ ارتقاء کے باب میں اب یہ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ ارتقاء کے معنی یہ نہیں کہ اب بنیادی تخلیق (ORIGINAL CREATION) نہیں ہو رہی۔ فجائی ارتقاء درحقیقت بنیادی تخلیق (یا تخلیقِ جدید) ہی ہے۔ اس انکشاف نے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء میں اہم تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

اور ہمارے زمانے کا علمِ ارتقاء کا ماہر (SIMPSON) لکھتا ہے کہ

> سلسلۂ ارتقاء میں یہ رجحان نظر آرہا ہے کہ زندگی کے تمام ممکن گوشوں میں نت نئے اضافے ہو رہے ہیں ــــ اضافے اور پھر ان اضافوں میں مزید کثرت۔
>
> (THE MEANING OF EVOLUTION P. 25)

بے خبر

یہی نہیں کہ خدا اپنی تخلیقی کائنات بلکہ نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی مخلوق سے غافل اور بے خبر بھی نہیں۔ سورۃ مومنون میں ہے۔ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (۲۳/۱۷)۔ "ہم اپنی خلق کی طرف سے

فل اور بے خبر نہیں۔" اس میں اس عقیدہ کی تردید کر دی جس کی رو سے سمجھا یہ جاتا تھا کہ کائنات ایک کلاک ہے جسے خدا نے ایک دفعہ کوک دیا ہے، اور اب وہ اپنے زورِ دروں سے خود بخود مصروفِ حرکت ہے۔ اور خدا یہ فریضہ ادا کر کے آرام سے سو گیا ہے۔ نہیں! خدا مخلوق میں نت نئے اضافے بھی کرتا رہتا ہے اور ان کی ہر حالت اور ہر کیفیت سے باخبر بھی ہے۔ اشیائے کائنات، ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے ہر آن ایک نئی حالت میں ہوتی ہیں۔ انہیں اُس حالت (STAGE) کے مطابق سامانِ نشوونما کی ضرورت ہوتی ہے جسے خدا برابر پہنچائے چلا جاتا ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے۔ يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَاْنٍ۔ (۵۵/۲۹)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مختلف اشیاء کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر آن مختلف حالت میں ہوتی ہیں۔ اور اپنی ہر حالت میں سامانِ نشوونما کے لئے خدا کی محتاج۔" اور چونکہ خدا اپنی تخلیق کی طرف سے غافل نہیں اس لئے وہ ان کی ہر طلب کو بطریقِ احسن پورا کئے جاتا ہے۔

(۷)

ہم نے اس وقت تک تخلیقِ کائنات کے متعلق گفتگو کی ہے۔ یعنی اس امر کے متعلق کہ یہ مادی یا غیر نامی (IN-ORGANIC) اشیائے کائنات کس طرح وجود میں آئیں۔ اس موضوع کے متعلق بات نہیں کی کہ صفحۂ ارض پر زندگی (LIFE.) کی نمود کیسے ہوئی اور خود انسان کس طرح وجود میں آیا؟ جہاں تک آغازِ حیات کا تعلق ہے سائنٹیفک تحقیقات اس باب میں بھی اسی طرح محوِ حیرت ہیں جس طرح وہ آغازِ کائنات کے متعلق ششدر و حیران۔ البتہ وہ آغازِ حیات کے بعد جاندار اشیاء کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ نظریۂ ارتقاء کی پیداوار ہے۔

زندگی کی نمود

اس نظریہ کی ابتداء تو مشہور سائنس دان ڈارون سے ہوئی تھی لیکن اس کے بعد اس میں اتنے اور ایسے تغیرات ہو چکے ہیں، کہ ڈارون کا نام، یوں کہیئے کہ بس تبرکاً ہی لیا جا سکتا ہے۔ صحیفۂ فطرت کے اوراق اور خزائن و دفائنِ ارضی کے نقوش و آثار کے مطالعہ کے بعد ذہنِ انسانی نمودِ حیات اور تخلیقِ انسانی کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے، وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

(۱) صفحۂ ارض پر زندگی کی ابتداء پانی سے ہوئی۔

(۲) پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کا اولین جرثومۂ حیات (LIFE - CELL) وجود میں آیا۔

(۳) زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے، پھولنے اور مختلف سمتوں میں پھیلنے لگے۔

(۴) ان جراثیم کے پیکروں میں ہزارہا سال کے مراحل کے بعد مختلف قسم کی تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔

(۵) ان طویل المیعاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق اُس منزل میں پہنچا جب تولید (یعنی تخلیق بذریعۂ تناسل) کہا

جاتا ہے۔ اس سے مراد حیوانی زندگی سمجھ لیجئے۔ اور

(۶) حیوانی زندگی اسی قسم کے مزید طویل المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بہ منزل، انسانی پیکر میں جلوہ فرما ہوئی۔

اس طرح نوعِ انسان کی ابتداء ہوئی۔

چونکہ اس بات کا سمجھ لینا کہ زندگی کس طرح وجود میں آگئی، انسانی ادراک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے قرآنِ کریم اتنا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا ہے کہ

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۔ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا۔ کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے؟

یعنی زندگی اپنی نمود کے لئے پانی کی محتاج ہے۔ پانی ہی سے اس کی ابتدا ہوئی اور اب بھی جہاں پانی نہیں وہاں زندگی کی نمود ممکن نہیں۔ اُس کے بعد قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ زندگی کے اس سرچشمہء اولین پر مرکزی کنٹرول خود خدا کا ہے سورۃ ہود میں ہے۔ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (۱۱/۷)[له] یعنی سرچشمہء حیات پر اقتدارِ خداوندی متمکن ہے" اور اسی بنا پر اس نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ وَاللّٰهُ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ (۳/۱۵۵) "قانونِ حیات و ممات خدا ہی کے کنٹرول میں ہے"

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کس طرح وجود میں آگیا۔ اس موضوع کے متعلق تفصیلی گفتگو تو اس مقام پر کی جائے گی جہاں قصہء آدم سامنے آئے گا۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ جو ہمارے ہاں عام تصور ہے کہ خدا نے پہلے پہل مٹی کا ایک پتلا بنایا اور اُس میں روح پھونک کر اُسے انسانی شکل عطا کر دی۔ اور پھر اسکی پسلی چیر کر اس میں سے اس کی بیوی نکالی، اور اس طرح مرد اور عورت کے اس سب سے پہلے جوڑے (آدم اور حوا) سے سلسلہء افزائشِ نسلِ انسانی کی ابتدا ہو گئی، یہ تصور قرآنی نہیں۔ یہودیوں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا ہے۔ انسانی تخلیق کے متعلق قرآنِ کریم سے جو اشارات ملتے ہیں

انسانی تخلیق

وہ ہماری فکر کا رُخ نظریہء ارتقاء کی طرف ہی موڑتے ہیں۔ (میں نے ان موضوعات پر تفصیلی گفتگو اپنی کتاب ــ ابلیس و آدم ــ میں کی ہے۔ اربابِ ذوق و تحقیق اس کا مطالعہ مفید پائیں گے۔ یہاں چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے) قرآن کریم نے بتایا یہ ہے کہ:۔

[له] اس آیت کا ترجمہ کیا جاتا ہے ــ "خدا کا عرش پانیوں پر ہے" ــ اور پھر اس کی تفسیر میں ایسی ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جن کی رو سے توہم پرستی ہر سو تیرتی پھرتی نظر آتی ہے۔ لیکن ہمیں ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲)۔

خدا نے انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی یعنی غیر نامی مادہ سے کی۔

اس غیر نامی مادہ سے جب پانی کا امتزاج ہوا تو وہ اس سلسلۂ ارتقاء کی اگلی کڑی تھی۔ چنانچہ فرمایا۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (۳۷)

ہم نے انسانوں کو طینِ لازب یعنی چپچپی مٹی سے تخلیق کیا۔

سائنٹیفک تحقیقات ہمیں بتاتی ہیں کہ یہ طینِ لازب وہی ہے جو تالابوں کی تہ میں اور جوہڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے پانی اور مٹی کی آمیزش سے زندگی کا اولین خلیہ (LIFE - CELL) وجود میں آیا۔ یہ خلیہ، زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات، اپنے اندر لئے ہوتا ہے، اسی طرح جیسے ایک ننھا سا بیج، ایک تناور درخت کو اپنے اندر سمیٹے، نمود و شگفتگی کے لئے ہمہ تن اضطراب ہو۔ زندگی کا یہ وہ اولین خلیہ ہے جسے قرآن کریم نے "نفسِ واحدہ" کہہ کر پکارا ہے۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے۔ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ۔ (۹۹) "خدا وہ ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے آگے بڑھایا۔ پھر تمہارے لئے مختلف منازل مقرر کیں کہ تم ایک وقتِ معین کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ منزل تمہیں اگلی منزل کے سپرد کر دے۔ بلاشبہ ہم نے اپنے قوانینِ حیات کو اربابِ فکر و نظر کے لئے نکھار اور ابھار کر بیان کر دیا ہے۔" اس انتقالِ مکانی یعنی ایک مستقر سے دوسرے مستقر تک پہنچنے میں ہزار در ہزار سال کا عرصہ لگتا رہا۔ انہی تدریجی منازل کے متعلق کہیں یہ کہا کہ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا۔ (۱۴) "اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے۔" کہیں یہ کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۱۹) "تم یقیناً بدستور ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہوئے شاہراہِ حیات پر آگے بڑھتے اور بلند بھی ہوتے جاؤ گے۔" انہی سابقہ مراحل میں سے گزرنے کے بعد وہ منزل آگئی جہاں سلسلۂ توالد بذریعہ جنسی اختلاط آگے بڑھا۔ ارشاد ہے۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (۳۲) "پھر انسانی نسل کو کمزور سے مائع کے خلاصہ سے بنایا" اور اس طرح:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ

اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۔ (۲-۳)

یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جس میں مختلف امکانی صلاحیتیں

باہمدگر مخلوط ہوتی ہیں۔ پھر ہم اسے مختلف حالتوں میں گردش دیتے

رہے حتیٰ کہ اسے سننے اور دیکھنے والا اور صاحبِ اختیار و ارادہ بنا دیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے زندگی کا صحیح راستہ دکھا دیا اور اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا کہ یہ چاہے تو اُسے اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔

یوں صاحبِ اختیار و ارادہ انسان وجود میں آگیا ــ قرآنِ کریم نے اس طویل و عریض داستان کو سورۃ السجدہ کے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے، جب کہا کہ۔ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ۔ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (۳۲/۵)۔ "تدابیرِ الٰہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی مضمر شکل میں علمِ الٰہی کی بلندیوں پر ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کسی اسکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو زمین (مادہ) کی پستیوں سے اس کا آغاز کیا جاتا ہے۔ یہاں سے وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی اپنے مقامِ تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن میں کا ایک ایک وقفہ تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار (بلکہ پچاس پچاس ہزار (۷۰/۴)) سال کا ہوتا ہے۔" (مثلاً) انسانی تخلیق ہی کو لو۔ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ (۳۲/۷)۔ "اس کی ابتداء غیر نامی مادہ سے ہوئی۔" ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّآءٍ مَّهِينٍ (۳۲/۸)۔ "پھر یہ مختلف مراحل میں سے گزرتا ہوا اس منزل میں جا پہنچا جہاں اس کی تولید کا سلسلہ نطفہ قرار پایا۔" ثُمَّ سَوَّاهُ (۳۲/۹)۔ "اس کے حشو و زوائد کو دور کر کے اسے ہر طرح سے درست کیا اور اس کے اعضاء و جوارح میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا کیا۔ (۳۲/۹)"۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۔ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۳۲/۹)۔ "پھر اُس نے تمہیں علم و عقل اور قوتِ فیصلہ عطا کر دی لیکن بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جو ان صلاحیتوں کی کامل نشو و نما کرتے اور انہیں صحیح مقام پر صرف کرتے ہیں۔"

اس طرح سلسلۂ ارتقاء سے نوعِ انسانی (نہ کہ کوئی خاص فردِ انسانیہ) وجود پذیر ہوئی۔ یہ ہے وہ نوعِ انسان، جس سے کہا گیا ہے کہ:۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۲/۲۱)۔ "تم اُس خدا کے قوانین کی اطاعت کرو جس نے تمہیں پیدا بھی کیا اور جو تمہاری نشو و نما کا ذمہ دار بھی ہے۔ اُس کے اور صرف اُسی کے قوانین کی اطاعت کرو تا کہ تم زندگی کے ہلاک کر دینے والے خطرات سے محفوظ رہو۔"

ہلاکت انگیز خطرات سے حفاظت

"زندگی کو ہلاک کرنے والے یہ خطرات" دو قسم کے ہیں۔ ایک کائنات کے طبیعی (ارضی اور سماوی) حوادث۔ جہاں تک ان حوادث کا تعلق ہے، ذرا اس منظر کو سامنے لائیے کہ جب انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اس نے اپنے آپ کو کس دنیا میں پایا؟ سر پر مسلسل آگ برسانے والا مہیب آتشیں گولہ۔ یعنی آفتاب ــ چاروں طرف بڑے بڑے خوفناک پہاڑ، اِدھر اُدھر ساحل ناآشنا سمندر

اور ان کی تباہ کن تلاطم خیزیاں۔ یہاں وہاں، کف بر دہان' دریاؤں کی وحشت سامانیاں، تا بہ حدِ نگاہ ڈراؤنے جنگل، اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدہے۔ کبھی بادل کی لرزہ انگیز گرج، کبھی بجلی کی جگر پاش کڑک۔ کبھی ہلاکت انگیز آندھی، کبھی بلاخیز جھکڑ۔ کہیں آتش فشاں پہاڑوں کی مرگِ سیال، کہیں زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم۔ شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا اژدہام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار، اور بے سروسامان ابنِ آدم! اس ماحول سے اس نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ کا اعجاز دیکھئے کہ ان تمام ہلاکت سامانیوں کے باوجود نوعِ انسان کا یہ کارواں بلا انقطاع آگے بڑھتا چلا آیا۔ اس مقام پر سورۃ الاعراف کی ایک نہایت حقیقت کشا آیت بیساختہ سامنے آجاتی ہے۔ وہ آیت جس کے عام مروجہ مفہوم نے اُسے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ آپ نے خانقاہیت کے آذرکدوں میں بالخصوص "یوم الست" "مستِ الست" یا "قالوا بلیٰ" وغیرہ معانی الفاظ سُنے ہوں گے اور پھر ان کی بنیادوں پر اٹھائے ہوئے وہ افسانے جنہیں (اقبالؒ کے الفاظ میں) اندیشۂ عجم نے زیبِ داستاں کے لئے تراش رکھا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:-

یومِ الست!

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ۔
وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۔ قَالُوْا بَلٰى ،
شَهِدْنَا ۔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا
غٰفِلِيْنَ (۷/۱۷۲)

اس آیت کا پورا پورا مفہوم تو اس کے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ قرآنِ کریم نے بنی آدم سے کہا یہ ہے کہ تم بتاؤ کہ ان تمام ہلاکت سامانیوں کے باوجود، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اور ان خارجی حوادث کے علاوہ خود انسانوں کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ تباہیوں کے علی الرغم، نسلِ انسانی کا اس تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آنا' خدا کی ربوبیت کی زندہ شہادت ہے یا نہیں؟ نسلِ انسانی کا وجود، ربوبیتِ خداوندی کی کس طرح منہ بولتی تصویر اور اعلانیہ شہادت ہے، اس کے متعلق کسی سائنس دان سے پوچھیے۔ وہ بتائے گا کہ قرآنِ کریم اس ایک آیت میں کیسی عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔

جہاں تک حوادثِ ارضی و سماوی کا تعلق ہے، ان سے نمٹ لینا پھر بھی آسان تھا، کیونکہ خالقِ کائنات نے انسانوں سے کہہ دیا تھا کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۵/۱۳)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اُسے خدا نے اپنے قوانینِ فطرت کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے تاکہ تم ان پر غلبہ پا کر انہیں منفعت بخش کاموں میں صرف میں لاؤ۔ جو قوم بھی غور و فکر سے کام لے گی، وہ نہ صرف

یہ کہ ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہے گی بلکہ ان سے بڑے بڑے کام لے سکے گی؛ یہ وہ "ملائکہ" تھے جو "آدم" کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔[1] اس لئے ان کی طرف سے بنی آدم کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ اُس "ابلیس" سے تھا جس نے اُس سے بغاوت اور سرکشی اختیار کی ـــ یہ ابلیس ہے، انسان کے وہ جذبات جو وحی کی قیود سے بیباک ہو جائیں۔ انہی جذبات کا نتیجہ انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے وہ باطل نظام ہیں جن میں بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) کا منظر سامنے آتا ہے یعنی جن میں انسان خود نوعِ انسان کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور ان میں سب سے زیادہ تباہ کن باطل نظام وہ ہے جس کا تعلق معیشت، یعنی سامانِ رزق کی تقسیم اور مصرف سے ہے اور اسی کی طرف قرآن کریم نے اگلی آیت میں اشارہ کیا ہے کہ

(۲/۲۲) اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنی رزاقیت کی ذمہ داری کو پورا کرنے کیلئے نظامِ کائنات کو کس انداز سے وضع کیا، اسے سمجھنے کے لئے پہلے اِس حقیقت پر غور کرو کہ اس نے زمین کو گول ہونے کے باوجود، کس طرح پھیلا اور بچھا دیا؛ فَرْشٌ" کے معنی ہیں کسی چیز کو بچھانا اور پھیلانا۔ گول چیز کی کیفیت کیا ہوتی ہے اسے چھوٹے سے پیمانے پر سمجھنے کے لئے کسی گنبد پر کھڑے ہو جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کی اتنی بڑی ضخامت کے باوجود بہت تھوڑا سا حصہ ایسا چپٹا ہوتا ہے جس پر بیٹھا یا لیٹا جا سکے۔ جہاں سے اسکی گولائی شروع ہوتی ہے وہاں کوئی شخص کھڑا بھی نہیں ہو سکتا، لڑھک کر نیچے گر جاتا ہے۔ لیکن اس کرۂ ارض کی کیفیت عجیب ہے۔ یہ نہ صرف گول ہے بلکہ نہایت برق رفتاری سے مصروفِ گردش بھی۔ اس کی اس گردش کو قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر واضح کیا ہے۔ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ (۱۶/۱۵)۔ "تم اس پر سکون سے بیٹھے بھی رہو اور وہ گھومتی بھی رہے؛" اس کے

فرشِ زمین

فِرَاشًا ہونے پر ایک اور زاویۂ نگاہ سے بھی غور کیجئے۔ گول چیز کی اوپر کی (چپٹی) سطح کتنی ہی پھیلی ہوئی کیوں نہ ہو، اس پر آپ چلتے جائیں تو ایک مقام ایسا آجائے گا جہاں اس کی گولائی آپ کے سامنے ہوگی اور گولائی کے بعد وہ خلا جس کے اندر وہ چیز ایستادہ یا معلق ہو۔ لیکن کرۂ ارض کی کیفیت یہ ہے کہ سیاح اس کے ایک مقام سے چلنا شروع کرتے ہیں۔ پورے کرہ کا چکر کاٹ کر پھر اُسی مقام پر آجاتے ہیں۔ انہیں نہ کہیں اس کی گولائی دکھائی دیتی ہے اور نہ وہ خلا جس میں یہ معلق ہے۔ اس خلا کی جگہ مسلسل، وہ افق دکھائی دیتی رہتی ہے جہاں (عام الفاظ میں) زمین اور آسمان ملتے نظر

---

[1] تفصیل "قصۂ آدم" میں سامنے آئے گی۔

آتے ہیں۔ سوچئے کہ یہ فِرَاشًا کی کیسی محیر العقول شکل ہے؟ اسے قرآن نے مَهْدًا بھی کہا ہے۔ (۲۰/۵۳ ; ۴۳/۱۰)۔ اَلْمِهَادُ نرم اور ہموار بستر کو کہتے ہیں۔ یعنی ہموار اور سراپا آسائش۔ اسی سلسلہ میں خدا نے اپنے متعلق کہا ہے کہ وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ۔ (۵۱/۴۸)۔ "ہم نے زمین کو بچھا اور پھیلا دیا۔ دیکھئے ہم کس قدر اچھے آسائشیں بہم پہنچانے والے ہیں!"

اس آیت (۲/۲۲) میں آگے ہے۔ وَ السَّمَآءَ بِنَآءً۔ سما کے متعلق تفصیلی گفتگو تو وہاں کی جائے گی جہاں "السمٰوٰت والارض" کا ذکر آئے گا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ہر وہ چیز جو ہمارے اوپر چھائی ہوئی ہو،

بناءِ سماوی

سماء کہلاتی ہے۔ چنانچہ گھر کی چھت بھی سماءٌ کہلاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ "اوپر اور نیچے" تو اضافی سمتیں ہیں، اس اعتبار سے ہر چیز، اپنے سے نچلی چیز کی نسبت سے سماءٌ کہلاتی ہے اور اپنے سے اوپر کی چیز کی نسبت سے ارضٌ۔ اس مفہوم کے پیشِ نظر قرآنِ کریم کی اس آیت کو سامنے لائیے اور جھوم جائیے! ارشاد ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ۔ (۶۵/۱۲)۔ "اللہ وہ ہے جس نے متعدد آسمانی کرّے پیدا کئے اس انداز سے کہ ہر سما کی ایک ارض ہے۔"

سماءٌ کے معنی بادل بھی ہیں۔

زیرِ نظر آیت میں سَمَآءَ "بِنَآءً" کہا گیا ہے۔ بِنَآءٌ کے معنی ہیں عمارت، یعنی جو چیز بھی تعمیر کی جائے اُسے بِنَآءٌ کہتے ہیں۔ نیز اس کے معنی چھت کے بھی ہوتے ہیں۔ چونکہ یہاں ارض کے لئے فِرَاشًا (فرش) آیا ہے اس لئے بِنَآءٌ کے معنی چھت زیادہ مناسب ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہا ہے۔ وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا۔ (۲۱/۳۲)۔

سقفِ محفوظ

"ہم نے سماء کو سقفِ محفوظ بنایا ہے"۔ یعنی ایسی چھت جو خود بھی محفوظ ہے اور تمہارے لئے وجہِ حفاظت بھی۔ اور یہ نکتہ پھر بڑا وجد آفریں ہے۔ علم الافلاک کے ماہرین بتاتے ہیں کہ جنہیں شہابِ ثاقب یا ٹوٹنے والے تارے (METEORS) کہا جاتا ہے وہ درحقیقت نظامِ شمسی کے چھوٹے چھوٹے اجرام (ٹکڑے) ہوتے ہیں جو کششِ ثقل کی قوت سے ٹوٹ کر نیچے گرتے اور بارش کی طرح برستے رہتے ہیں۔ بعض اوقات کرۂ ارض بھی اس بارش کے سامنے آجاتا ہے۔ کہنے کو تو یہ ٹکڑے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں لیکن درحقیقت ہوتے ہیں اتنے اتنے بڑے، اور برستے ہیں اس قوت کے ساتھ کہ اگر وہ کہیں ایک بار بھی اُسی حالت میں زمین پر آگریں تو یہ کرہ تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ جسے ہم فضا یا (ATMOSPHERE) یا سماء کہتے ہیں، وہ میلوں موٹا، تہ در تہ، دبیز گیسوں کا (گویا) لحاف ہے جو پورے کرۂ ارض کو محیط ہے۔ جب یہ شہابِ ثاقب اس فضا میں داخل ہوتے ہیں تو وہ (فضا) ان پتھروں کو پیس کر رکھ دیتی ہے اور جسے ہم ٹوٹا ہوا تارا کہتے ہیں۔ وہ ان کی چمکنے والی راکھ

ہوتی ہے۔ ان میں سے کبھی کبھی پتھر کا کوئی ٹکڑا جلنے سے رہ جاتا ہے تو وہ زمین پر گرتا ہے۔ لیکن یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ فضا میں پس جلتے ہیں۔ اگر فضا ان پتھروں کی بارش کو پیس کر راکھ نہ بنادے تو زمین پر زندگی محال ہو جائے۔ یوں یہ فضا ہمارے لئے چھت کا کام دیتی ہے اور ہم شہابِ ثاقب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہتے ہیں ــــ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (کہ یہ (اور اسی قسم کی کئی اور صورتیں) خود نظامِ فطرت کی پیدا کردہ ہیں اور متعدد دوسری صورتیں انسان خود تسخیرِ فطرت سے پیدا کرسکتا ہے۔

خارجی کائنات سے آگے بڑھ کر اب انسان کی معاشی دنیا کی طرف آیئے اور اس میں دیکھئے کہ انسانوں کا خودساختہ نظام اسے کس طرح تباہ کر دیتا ہے، اور قوانینِ خداوندی کی اطاعت اسے کس طرح ان خطرات سے محفوظ و مامون بنا دیتی ہے۔

قرآنِ کریم نے اس نہایت جامع انداز سے کہا کہ آسمان سے بارش ہوتی ہے تو زمین سے فصلیں پیدا ہونے لگتی ہیں (۲/۲۲)۔ ان اجناس اور پھلوں کے متعلق ایک لفظ میں ساری بات سمٹا کر رکھ دی جب کہا کہ رِزْقًا لَّكُمْ۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے (لَكُمْ) متاعِ زیست اور سامانِ پرورش ہے۔ اس میں لکم کا لفظ قرآنِ کریم کے پورے معاشی نظام کو اس طرح سمٹائے ہوئے ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ پہلے نوعِ انسان کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ (۲/۲۱)۔ اور یہاں کہا۔ رِزْقًا لَّكُمْ۔ جس طرح اس نے پوری کی پوری نوعِ انسان کو پیدا کیا ــــ انسانوں کے کسی ایک طبقہ، گروہ، قبیلہ، خاندان، یا قوم کو نہیں ــــ پوری کی پوری انسانیت کو۔ اسی طرح خدا کا عطا کردہ رزق، کسی خاص طبقہ، گروہ یا قوم کے لئے نہیں، پوری نوعِ انسان کے لئے ہے۔[1] ارض' پیداوار کا بنیادی ذریعہ ہے اور اس کے متعلق قرآنِ کریم نے باصرار و تکرار کہہ دیا ہے۔ کہ اس پر کسی

ارض پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی

کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی ــــ نہ کسی فرد کی، نہ افراد کے کسی گروہ کی۔ سب سے پہلے اس نے بےشمار مقامات پر کہا ہے کہ ارض و سما کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ سو جب وہ خدا کی پیدا کردہ ہیں تو ان پر کسی اور کی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس نے متعدد مقامات پر کہہ دیا کہ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲/۱۰۷)۔ ارض و سمٰوٰت اُسی کی ملکیت ہیں اور اُسی کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کا موجب" یا جو ذمہ داریاں اُس نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، انہیں پورا کرنے کا ذریعہ۔ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۲/۲۸۴) کے یہی معنی ہیں۔ اس کی یہ ذمہ داری کیا ہے جسے پورا کرنے کے لئے اُس نے زمین کو پیدا کیا اور اس پر اپنا کنٹرول رکھا؟ اس کے متعلق اس نے سورۃ ھود میں کہا وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔

---

[1] اس کے متعلق آیت (۲/۳) میں 'ینفقون' کے تحت گفتگو ہو چکی ہے لیکن موضوع کی نسبت کے لحاظ سے یہاں اس کی مزید تشریح ضروری سمجھی گئی ہے۔

(۱۱/۶)، "سطحِ زمین پر چلنے والا کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر نہ ہو"۔ اس نے تصریفِ آیات سے (مختلف پہلوؤں کو سامنے لاکر) اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ زمین تمام نوعِ انسان کے فائدے کے لئے ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت یا اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰) خدا نے زمین کو اپنی ساری مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے"۔ سورۃ الاعراف میں ہے۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۔ (۷/۱۰)۔ "ہم نے تمہیں زمین میں متمکن کیا اور اس میں تم سب کے لئے سامانِ معیشت رکھ دیا"۔ دوسری جگہ ہے۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ۔ (۱۵/۲۰)۔ "ہم نے زمین میں تمہارے لئے بھی سامانِ معیشت رکھ دیا اور ان کے لئے بھی، جنہیں تم رزق نہیں پہنچاتے"۔ یعنی ایسی مخلوق جس کے رزق کی ذمہ داری انسانوں پر نہیں۔ انسان صرف انہی مال مویشیوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں جو ان کے کنٹرول میں ہوں۔ اسی کے لئے زمین سے پیدا ہونے والے سامانِ رزق کے متعلق کہا۔ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ (۲۰/۵۴)۔ "اس رزق کو تم خود بھی کھاؤ پیو اور اپنے مال مویشی کو بھی کھلاؤ پلاؤ"۔ مال مویشیوں کے سلسلہ میں آپ قومِ ثمود کے اُس واقعہ کو سامنے لائیے جسے آیت (۷/۷۳) میں بسلسلہ انفاق بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی جس میں اُس قوم کے اُن سرداروں سے، جنہوں نے چشموں اور چراگاہوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے کر ان میں غریبوں اور کمزوروں کے مویشیوں کا داخلہ بند کر دیا تھا، کہا تھا کہ تم اس سراسر دھاندلی پر مبنی روش سے باز آجاؤ۔ یہ ہے۔ نَاقَةُ اللّٰهِ ۔ (اللہ کی اونٹنی) اور یہ ہے اَرْضُ اللّٰهِ ۔ (اللہ کی زمین)۔ "اللہ کی اونٹنی" کو کھلا چھوڑ دو کہ وہ "اللہ کی زمین" میں چرے چگے (۷/۷۳)۔ تم کون ہوتے ہو کہ خدا کی مخلوق کو خدا کی زمین سے متمتع نہ ہونے دو۔ تمہیں اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ تم اس پر بند لگا دو۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۔ (۱۷/۲۰)۔ "جو چیزیں خدا کی طرف سے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بلا مزد و معاوضہ اور بغیر منّت و صلہ، مفت عطا ہوتی ہیں۔ ان پر پھاٹک لگانے کا کسی کو حق نہیں"۔ انہیں بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہنا چاہیئے۔ (۱۷/۲۰)۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۔ (۴۱/۱۰)۔ "ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے"۔

یہ شرک ہے

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے وسائلِ رزق (ارض یعنی زمین) خدا کے پیدا کردہ ہیں اور خدا ہی ان کا مالک ہے۔ لہٰذا، ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ ان کا کوئی اور بھی مالک ہو سکتا ہے، شرک ہوگا۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے آیتِ زیرِ نظر میں یہ کہہ دیا کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (۲/۲۲) "تم خدا کے ند نہ بناؤ کیونکہ تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ند نہیں ہو سکتا"۔ اس جگہ قرآنِ کریم خدا کے شریک و سہیم کے لئے ند کا لفظ آیا ہے۔ یہ بھی قرآنِ کریم کا اعجاز ہے۔ ند کے معنی ہوتے ہیں کسی کا ہم پایہ، ہمسر،

اُس کے برابر۔ لیکن اس میں شرط یہ ہوتی ہے کہ جن دو ہستیوں کو ایک دوسرے کا ہم پایہ تصور کیا جائے' ان کی کیفیت یہ ہو کہ ان میں سے ہر ایک اپنی طرف کھینچے۔ اسی لفظ نِدّ کی جمع انداد ہے۔ اس کا مطلب واضح ہے کہ جب تم زمین پر انسانوں کی ذاتی ملکیت تسلیم کر لو گے تو ایک تو تم انہیں خدا کا ہمسر اور ہم پایہ یعنی شریک تسلیم کر لو گے' اور دوسرے یہ کہ ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ ہو گی کہ اس بنیادی وسیلۂ رزق اور اس کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف کھینچے' اور دوسروں کو اس سے محروم بھی کر دے۔ آپ سوچیئے کہ زمین پر ذاتی ملکیت کے نظام کا، خواہ وہ کسی ایک فرد کی ذاتی ملکیت ہو یا افراد کے مجموعہ، یعنی کسی خاص قبیلہ، خاندان، گروہ، پارٹی یا قوم کی ذاتی ملکیت۔ اس کے سوا کچھ اور نتیجہ ہو نہیں سکتا کہ ان میں کا ہر مالک، زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرے خواہ اس سے مخلوقِ خدا بھوکوں کیوں نہ مر جائے۔ آپ دیکھئے کہ قرآن کریم نے جہاں جہاں اس قسم کے اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا ذکر کیا ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کا تعلق وسائلِ رزق کی ملکیت اور رزق کی تقسیم سے ہے۔ پہلے اس زیرِ نظر آیت ہی کو لیجئے۔ اس میں بھی پیدائش رزق کے بعد کہا گیا ہے کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا۔ (۲/۲۲)۔ سورۂ حٰمٓ میں ہے۔ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا۔ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۱/۹)" اے رسول! ان لوگوں سے کہو کہ کیا تم خدا سے کفر برت رہے ہو؟ اُس خدا سے جس نے ارض کو دو مراحل میں پیدا کیا۔ مرحلۂ اول وہ تھا جس میں یہ ہنوز اس قدر گرم تھی کہ اس پر کسی جاندار مخلوق کے پیدا کرنے اور اس کے زندہ رہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے مرحلے میں اسے اس قدر ٹھنڈا کر دیا گیا کہ اس پر ذی حیات کا رہنا ممکن ہو گیا اور ان کے لئے سامانِ رزق کا موجود رہنا اور پیدا ہونا بھی" کہا کہ "یہ ہے وہ ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار خدا، جس سے تم کفر برت رہے ہو"۔ یہ کفر کیا ہے؟ یہ کہ "تم اس کے انداد مقرر کر رہے ہو۔ اس کے پیدا کردہ وسائلِ رزق کو انسانوں کی ملکیت میں دے رہے ہو"۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ۔ (۴۱/۱۰)۔ "خدا نے اس ارض کو اس طرح بنایا کہ پہاڑوں کے ذریعہ آبپاشی کا نظام مقرر کر دیا۔ زمین کی مٹی میں اس کی صلاحیت رکھ دی کہ اس سے بھرپور فصلیں پیدا ہوں۔ پھر اس کی گردش سے موسموں میں ایسے تغیرات متعین کر دیئے کہ ان کی رُو سے سال کے مختلف حصوں میں مختلف اقسام کی فصلیں پیدا ہو جائیں۔ اس سارے انتظام سے مقصود یہ تھا کہ زمین کی یہ پیداوار تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی رہے۔ جب یہ خدا کی ملکیت میں رہے گی تو اس سے یہ مقصد پورا ہوتا جائیگا۔ لیکن اگر اسے ذاتی ملکیت میں دے دیا گیا تو پھر یہ مقصد پورا نہیں ہو سکے گا"۔

دوسری جگہ ہے کہ جب انسان مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو نہایت تضرع وزاری سے خدا سے دعائیں مانگتا ہے۔ اس وقت وہ ان دعاؤں میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لیکن جب اُسے خوشحالی نصیب ہوجاتی ہے تو پھر وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور خدا کے انداد — شریک وسہیم — قرار دینے لگ جاتا ہے۔ اس سے وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ کہا کہ یہ کفر ہے۔ اس سے تم کچھ وقت کے لئے تو فائدہ اٹھالوگے لیکن آخر الامر تم تباہ اور برباد ہو جاؤگے (۳۹/۸)۔ اسی حقیقت کو سورۂ ابراہیم میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ۔ (۱۴/۲۸)۔ "کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر کبھی غور کیا جنہوں نے خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے کفر برتا اور اس طرح اپنی قوم کے قافلہ کو اُس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنس کا سدا کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ ان کا مال ومتاع سب غارت چلا گیا۔" اسی کو جہنم کی تباہی کہا جاتا ہے۔ (۱۴/۲۹)۔ یہ کفرانِ نعمت اس طرح سے ہوا کہ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ۔ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ۔ (۱۴/۳۰)۔ "انہوں نے خدا کے ند مقرر کردیئے اور اس طرح لوگ اس کی طرف سے چلنے والے راستے کو چھوڑ کر گمراہ ہوگئے تم ان سے کہہ دو کہ تمہاری یہ روش کچھ وقت کے لئے تو تمہیں سامانِ زندگی بہم پہنچا دے گی لیکن تمہارا آخری ٹھکانا تباہی کا جہنم ہوگا۔" سورۂ بقرہ میں اسے اور بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ کہا۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ۔ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ (۲/۱۶۴)۔ "یہ حقیقت ہے کہ ارض وسماوات کی تخلیق، اور لیل ونہار کے اختلاف، اور وہ کشتیاں جو سمندروں میں بط کی طرح تیرتی پھرتی ہیں، اور لوگوں کے لئے ذریعۂ معاش بنتی ہیں۔" وَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ۔ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ۔ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ۔ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (ایضاً)۔ "اور وہ بارش جسے اللہ بادلوں سے برساتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کردیتا ہے۔ اور وہ جاندار مخلوق جو زمین میں چلتی پھرتی ہے اور وہ ہوائیں جو مختلف موسموں میں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں اور وہ بادل جو زمین اور فضا میں معلّق، قوانینِ خداوندی کی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ کائنات کے یہ تمام شواہد ومظاہر، اربابِ عقل وفکر کے لئے اس امر کے دلائل ہیں کہ یہ سب خدا کے پیدا کردہ اور اُسی کی ملکیت ہیں۔" لیکن اس کے باوجود وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا۔ يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ۔ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (۲/۱۶۵)۔ "ایسے لوگ بھی جو خدا کے انداد تراش لیتے ہیں جن میں سے ہر ایک، دوسروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے تاکہ اس کا جتھہ زیادہ کثیر التعداد اور طاقتور ہو

جائے۔ لیکن جو لوگ خدا کو خالق اور مالک مانتے ہیں انہیں کوئی اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا۔ وہ کھنچ کر جاتے ہیں تو خدا کی طرف"۔
لوگ ان باطل "خداؤں" کی طرف کھنچ کر کیوں جاتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ انہوں نے رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت میں لے رکھا ہوتا ہے، اور اس طرح محتاجوں اور محروموں کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ وہ کشاں کشاں انکی طرف جائیں اور محض روٹی کی خاطر ان کے ہر حکم کی اطاعت کریں۔ یہی وہ مختلف "خدا" ہیں جن کے متعلق کہا۔ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ (۲۳/۹۱) "یاد رکھو! اگر خدا کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہوتا تو صورت یہ پیدا ہو جاتی کہ ہر الٰہ اپنی اپنی مخلوق کو اپنی طرف کھینچ کر لے جاتا اور اس طرح ان میں سے بعض خدا، دوسرے خداؤں کو مغلوب کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدائے حقیقی ان تصورات سے بلند و بالا ہے جنہیں یہ لوگ اپنے ذہنوں میں قائم کر لیتے ہیں"۔ اسی لئے ان سے کہا کہ۔ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا۔ (۱۷/۲۲) "خدا کے ساتھ کوئی اور الٰہ تسلیم نہ کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو آخر الامر ذلیل و خوار ہو کر، ایں سو ماندہ و آں سو درماندہ، رہ جاؤ گے"۔ اس لئے کہ خدائے حقیقی اور ان باطل خداؤں میں فرق یہ ہے کہ :۔

این خدا نانے دہد، جانے برد　　　　آں خدا نانے دہد جانے دہد

ان خداؤں کو قرآن کریم نے الٰہ الارض کہہ کر پکارا ہے (۲۱/۲۱)۔ اور اس سے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جیسے جوں جوں واشگاف کرتے جائیں گے، حقائق و معارف کے دفتر آپ کے سامنے کھلتے چلے جائیں گے۔ کہا اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ۔ (۲۱/۲۱)

اِلٰہ الارض

"کیا انہوں نے اپنی ارضی (معاشی) زندگی کے لئے اور الٰہ تجویز کر رکھے ہیں جن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ انہیں سامانِ زیست مہیا کرتے ہیں؟" ان سے کہو کہ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ (۴۳/۸۴) "یاد رکھو! سماء (خارجی کائنات) میں بھی وہی صاحبِ اقتدار ہے اور ارضی (انسانوں کی تمدنی، معاشرتی، معاشی) زندگی میں بھی وہی الٰہ۔ اور اس کی یہ الوہیت (اقتدار اور حاکمیت) زمینی خداؤں کی طرح، ظلم و استبداد اور سلب و نہب پر مبنی نہیں، علم و حکمت پر مبنی ہے"۔

یہاں کہا یہ گیا ہے کہ جیسے تم خارجی کائنات کا خدا تسلیم کرتے ہو اسی کو اپنی ارضی زندگی میں بھی صاحبِ اقتدار تسلیم کرو۔ زمانۂ نزولِ قرآن کے لوگ معلوم نہیں اس عظیم حقیقت کا کس حد تک ادراک کر سکے تھے لیکن ہمارے دور میں یہ اس طرح بے نقاب ہو کر سامنے آئی ہے کہ اس کے سمجھنے میں اب کچھ بھی دشواری نہیں رہی۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں، ہمارا

دور مادہ پرستی یا سیکولرازم کا دور ہے۔ سیکولرازم کے معنی خدا سے انکار ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو خدا کا وہ انکار

کائناتی خدا

ہے جس پر کمیونزم اور سوشلزم کے نظریۂ حیات کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یعنی وہ سرے سے خدا کی ہستی ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس کی دوسری قسم وہ ہے جو ان ملکوں میں رائج ہے جو اپنے آپ کو خدا پرست کہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کائناتی خدا کے تو قائل ہیں لیکن اپنی ارضی زندگی میں اُس سے انکار کرتے ہیں۔ ان سے خدا کے متعلق جب بھی بات کرو تو وہ کہیں گے کہ ہم مانتے ہیں کہ خدا نے کائنات کو پیدا کیا اور یہ سلسلہ اُسی کے متعین کردہ قوانینِ فطرت کی رُو سے برقرار اور سرگرمِ عمل ہے۔ ان کا خدا پر ایمان یہیں تک ہے۔ جہاں تک ان کی تمدنی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کا تعلق ہے وہ کہتے ہیں کہ اس میں مذہب یعنی خدا کا کوئی دخل نہیں۔ اسے ہم اپنی مرضی اور منشا کے مطابق چلائیں گے۔ یہ ثنویت — یعنی کائناتی خدا (الٰہ السماء) الگ اور انسانی زندگی کا خدا (الٰہ الارض) الگ، آج دنیا کے تمام "خدا پرستوں" کا شعار بن چکا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب اقوامِ مغرب (یورپ اور امریکہ کی مملکتوں) کو کمیونزم کی یلغار سے خطرہ لاحق ہوا تھا تو انہوں نے یہ نعرہ بلند کیا تھا کہ "دنیا کے خدا پرستو! آؤ اور متحد ہو کر ان منکرینِ خدا کا مقابلہ کرو"۔ خدا پرستوں سے ان کی مراد کائناتی خدا کو ماننے والوں سے تھی، کیونکہ الٰہ الارض ان میں سے کوئی بھی خدا کو نہیں مانتا تھا، نہ ہی اب مانتا ہے۔ دیکھئے قرآنِ کریم چودہ سو سال پہلے اس حقیقت کو کیسے واشگاف الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ بعض آیات میں اُس نے اس حقیقت کو مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے اور بعض میں زیادہ تفصیل سے۔ سورۃ لقمٰن میں ہے۔ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۳۱/۲۵)۔ "اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین اور آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ کہیں گے کہ انہیں اللہ نے پیدا کیا ہے۔ تم ان سے کہو کہ اس حد تک تو بات ٹھیک ہے، لیکن تمہیں یہ بھی جاننا اور ماننا چاہیئے کہ خدا کی حمدیت خارجی کائنات تک ہی محدود نہیں یہ کلی (الحمد) ہے۔ اس لئے کہ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۳۱/۲۶) ارض ہو یا سماء، اقتدار و اختیار ہر جگہ اسی کا ہے اور اسی جہت سے وہ مستغنی عن الکل اور مستحقِ حمد و ستائش قرار پاتا ہے"۔ (نیز ۲۹/۶۱)۔ سورۃ زخرف میں پہلے یہ کہا۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۔ (۴۳/۹)۔ "اگر تم ان سے پوچھو کہ اس کائنات کو کس نے پیدا کیا تو یہ اس کا اقرار کریں گے کہ اسے خدائے عزیز العلیم نے پیدا کیا ہے"۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے پانچ آیات (۴۳/۱۰-۱۴) میں اس تمام سامانِ زیست کا تفصیلی تذکرہ ہے جسے اُس نے نوعِ انسان کی پرورش اور نشو و نما کے لئے پیدا کیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ خدا کو خالق ماننے والے ان "خدا پرستوں" کی کیفیت یہ ہے۔ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۚ اِنَّ الْاِنْسَانَ

لَتَكُفُوْرٌ مُّبِيْنٌ . (۱۵/۴۳)." یہ خدا کے بندوں کو اس کا شریک وسہیم بلکہ اس کا جزو قرار دیتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ انسان کیسا کھلا ہوا ناسپاس گزار ہے"۔

سورۂ مومنون میں ہے۔ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ . سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ . قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳/۸۴-۸۵)." ان سے کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کا ہے، تو یہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ خدا ہی کا ہے۔ ان کے اس جواب کے بعد ان سے کہو کہ پھر تم اس حقیقت کو اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں اپنے سامنے کیوں نہیں رکھتے"۔ اس کے بعد ہے۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ . سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ . قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ . (۲۳/۸۶-۸۷)." تم ان سے پوچھو کہ فضائے آسمانی میں تیرنے والے ان کرّوں پر کس کا تصرف ہے اور کون ان کی نشوونما کا ذمہ دار ہے۔ وہ کون ہے جس کا اس عظیم، محیّرالعقول کارگہ کائنات پر مرکزی کنٹرول ہے۔ تو یہ جواب میں کہہ دیں گے کہ ان پر خدا ہی کا کنٹرول ہے"۔ اس کے بعد کہا کہ "ان سے پھر پوچھو کہ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کیوں نہیں کرتے؟" اس کے بعد ہے۔ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ . اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ . سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ . قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ . (۲۳/۸۸-۸۹)." ان سے پوچھو کہ کائنات کی ہر شے کس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہ کون ہے کہ جو اس کی پناہ میں آجائے اُسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن جو اس کے قوانین سے سرکشی اختیار کرے اُسے کائنات میں کوئی بھی پناہ نہیں دے سکتا۔ یہ اسے بھی تسلیم کریں گے کہ یہ بھی سب کچھ خدا ہی کے لئے ہے۔ تم اس کے بعد ان سے پوچھو کہ ان حقائق کو تسلیم کر لینے کے بعد وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے تمہیں دھوکا لگتا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ حق نہیں۔ میں اس کے سوا کیا کہتا ہوں کہ انسانوں کی زندگی پر بھی اُسی کے قوانین کا کنٹرول ہونا چاہیئے، جنہیں اُس نے وحی کے ذریعہ عطا کیا ہے؟" اور اس کے بعد کہا بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۲۳/۹۰)۔ "بات یہ نہیں کہ انہیں اس باب میں کہیں دھوکہ لگتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم نے ان کی طرف وہ ضابطۂ قوانین بھیجا ہے جو سرتاسر حق و صداقت پر مبنی ہے۔ لیکن چونکہ اس کی زد ان کی مفاد پرستیوں پر پڑتی ہے اس لئے یہ اُس سے انکار کرتے ہیں اور خدا پرستی کو صرف اس حد تک محدود رکھنا چاہتے ہیں کہ خارجی کائنات میں اقتدار و اختیار خدا کا ہے کیونکہ اس سے انکی مفاد پرستیوں پر کوئی زد نہیں پڑتی ـــ لیکن اپنی معاشرتی زندگی پر خدا کا کوئی اختیار و اقتدار تسلیم نہیں کرتے۔ یاد رکھو! خدا کا اس قسم کا اقرار کچھ معنی نہیں رکھتا۔ لہٰذا یہ لوگ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں کہ یہ خدا کو مانتے ہیں"۔

سورۂ عنکبوت میں پہلے اس اصل الاصول کو بیان کیا کہ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا . اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ . وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ . (۲۹/۶۰)." ان سے کہو کہ ذرا غور کرو کہ کائنات میں کتنے ذی حیات

ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرتے ہیں۔ ان سب کو خدا کے کائناتی قانونِ ربوبیت کے مطابق سامانِ زیست ملتا ہے۔ لہٰذا اگر تم بھی اپنے ہاں ویسا ہی نظام رائج کر لو تو تم سب کو اسی طرح رزق ملتا جائے گا۔ اس لئے کہ خدا سب کی سنتا اور ہر ایک کی ضروریات سے واقف ہے" اس کے بعد ہے وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۲۹/۶۱) "لیکن ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ خارجی کائنات میں تو خدا کے قوانین کی محکمیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن انسان کی دنیا کو اس سے باہر رکھنا چاہتے ہیں، مثلاً اگر ان سے پوچھو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج جیسے اجرامِ فلکی کس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تو یہ اقرار کریں گے کہ اللہ ہی نے ایسا کر رکھا ہے۔ تم ان سے کہو کہ پھر تم اپنے معاشرہ کی تشکیل بھی اُسی کے قوانین کے مطابق کیوں نہیں کرتے، یہاں پہنچ کر تم کیوں الٹے پھر جاتے ہو؟" ایک آیت آگے چل کر کہا۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۲۹/۶۳) "اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو بادلوں سے بارش برساتا اور اس سے زمینِ مردہ کو از سرِ نو زندگی عطا کرتا ہے۔ تو یہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے اور نہایت حسن و خوبی سے کرتا ہے۔ تم ان سے کہو کہ جب تم اس کے معترف ہو کہ جہاں جہاں خدا کا قانونِ ربوبیت کارفرما ہے وہاں ہر طرف سے ستائش و نیائش کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، تو پھر تم اپنے معاشرہ میں وہی قانون کیوں رائج نہیں کرتے؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہاں پہنچ کر ان کی مفاد پرستیوں کے جذبات ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر غالب آ جائیں گے اور اس طرح یہ عقل و فکر سے کام نہیں لیں گے ورنہ بات تو کچھ ایسی نہیں جو ان کی عقل و فکر میں نہ آسکے"۔

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے

ہم چاہتے تو اِس مقام پر یورپ کے بڑے بڑے سائنس دانوں، مفکروں اور مدبروں کے اقوال نقل کر دیتے جن سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ وہ کس طرح اس امر کے معترف ہیں کہ خارجی کائنات میں ہر جگہ قانون کی کارفرمائی ہے اور یہ قوانین نہ ان اشیائے کائنات کے وضع کردہ ہیں نہ انسانوں کے مرتب کردہ۔ یہ اُسی خدا کے متعین فرمودہ قوانین ہیں جس نے اِن اشیائے کائنات کو پیدا کیا ہے[1]۔ ان کے اس قسم کے اعترافات کو درج کرنے کے بعد پھر ہم یہ بھی بتاتے کہ

---

[1] میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب ـــ انسان نے کیا سوچا؟ ـــ میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

وہ کس طرح مصر ہیں کہ ان کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی میں خدا کا کوئی عمل دخل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وہ خود قوانین وضع کر سکتے ہیں۔ وہ اس میں مذہب کا اتنا ہی دخل تسلیم کر سکتے ہیں کہ لوگ اپنے اپنے طور پر خدا کی پرستش کر لیا کریں۔ اور جو عقائد جی میں آئے رکھیں بشرطیکہ وہ ملکی قوانین سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اسی کا نام سیکولر نظام ہے۔

حیرت بالائے حیرت یہ کہ ایسا کچھ یورپ کی اقوام ہی نہیں کہتیں یا کرتیں، بلکہ مسلمانوں کی مملکتوں میں بھی یہی نظام رائج ہے۔ ان کے ہاں بھی سیاست اور مذہب دو الگ الگ شعبے ہیں۔ مذہب کا تعلق اعتقادات، عبادات یا زیادہ سے زیادہ نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق پرسنل لاز تک ہے۔ معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی اقوامِ یورپ کی طرح جمہوری نظام کے تابع چلتی ہے جس میں قوانین سازی کے اختیارات بلاحدود و قیود انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی اللہ الارض خدا نہیں۔ معاشی زندگی میں اللہ الارض کے معنی یہ تھے کہ وسائلِ رزق پر کسی کی ملکیت جائز نہ قرار پائے۔ وہ اس مقصد کے لئے ملّت (نظامِ مملکتِ اسلامیہ) کے زیرِ اہتمام رہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ رزق پیدا کرے اور اس کی اس طرح تقسیم کرے کہ کسی کی ضروریاتِ زندگی رُکی نہ رہیں اور کسی کے پاس زاید از ضرورت جمع نہ ہو۔ باطل کے نظام میں یہ وسائلِ رزق انسانوں کی ملکیت میں رہتے ہیں، ان کی شکلیں تو بدلتی رہتی ہیں لیکن روح ہر جگہ

دورِ ملوکیّت کے ند

وہی کارفرما رہتی ہے۔ اَنۡدَادًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ۔ تاریخ کے ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اور آج بھی موجود ہیں۔ جسے دورِ جہالت و استبداد کہا جاتا ہے اس میں صرف ایک نِدّ ہوتا تھا جسے بادشاہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ چنانچہ ملوکیّت کے نمائندہ فرعون نے یہی کہا تھا کہ یٰقَوۡمِ۔ اَلَیۡسَ لِیۡ مُلۡکُ مِصۡرَ وَ هٰذِهِ الۡاَنۡهٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ۔ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (۴۳/۵۱)۔ اے میری قوم کے لوگو! کیا یہ حقیقت نہیں کہ ملکِ مصر کی زمین اور اس میں بہنے والے دریا اور نہریں میری ملکیت ہیں۔ کیا تم اندھے ہو کہ تمہیں اس قدر محسوس حقیقت بھی نظر نہیں آتی"؟ یہ دورِ جہالت تھا جس میں بات، کھردرے پن سے ہی سہی، کھلے کھلے الفاظ میں کی جاتی تھی اب دورِ تہذیب ہے جس میں انداداً من دون اللہ فرعون کی طرح کھلے کھلے بات نہیں کرتے۔ اب وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ ہماری ملکیت ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے ایک بڑا پُرفریب تصور ایجاد کیا ہے جسے (STATE) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

عصرِ حاضر کا نِد، اسٹیٹ

اسٹیٹ کا تصور ایسا مبہم ہے کہ وہ کسی کے سامنے متعین طور پر آتا ہی نہیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اسٹیٹ ہوتی کیا ہے؟ وہ رہتی کہاں ہے؟ وہ اپنے احکام کس طرح وضع کرتی ہے اور کس طرح نافذ؟ اس کا کسی کو علم نہیں، لیکن اسٹیٹ ہے کہ فرعون کی طرح وہ اپنے احکام نافذ کئے چلی جاتی ہے اور ان سے سرکشی برتنے والوں کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ جب محمود غزنوی نے سومنات پر حملہ کیا

تو اُسے بتایا گیا کہ مندر میں رکھی ہوئی مورتی کو بڑی فوق الفطرت قوتیں حاصل ہیں۔ وہ لوگوں کی پکار کا جواب دیتی اور انکی مانگ پوری کرتی ہے۔ محمود کو اس پر بڑی حیرت ہوئی اُس نے مندر میں جاکر بہ نگاہِ تجسس دیکھا تو اُسے نظر آیا کہ مورتی کے پیچھے ایک ایسا پردہ لٹک رہا ہے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتا اور لوگ جنہیں مورتی کی آوازیں سمجھتے ہیں وہ اس پردہ کے پیچھے سے ابھرتی ہیں۔ اس نے پجاریوں کی تخویف و ترہیب کے باوجود اس پردہ کو پھاڑ ڈالا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ اسکے پیچھے مندر کے بڑے بڑے پجاری براجمان ہیں اور مورتی کے نام پر پسِ پردہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ دورِ حاضرہ میں (STATE) کی کیفیت بھی اُسی مورتی جیسی ہے۔ اگر آپ اسٹیٹ کے کاروبار کا تجزیہ کریں گے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ جو کچھ اسٹیٹ کے نام سے کہا اور کیا جاتا ہے وہ درحقیقت برسرِاقتدار طبقہ کے فیصلے اور فرامین ہوتے ہیں جنہیں وہ اسٹیٹ کے نام سے جاری کرتے اور لوگوں سے منواتے ہیں۔ الٰہ الارض کی روح وہی ہے۔ اس نے پیکر دوسرا اختیار کر رکھا ہے ۔۔ اس فرق کے ساتھ کہ مورتی تو پھر بھی مجسم شکل میں سامنے ہوتی تھی، اسٹیٹ کے بت کا محسوس پیکر نہیں ہوتا۔ اُسے کسی مندر میں نصب کرنے کے بجائے پروپیگنڈا کے ذریعہ عوام کے ذہنوں کے بتکدہ میں متمکن کر دیا جاتا ہے۔ وسائلِ رزق پر اسٹیٹ کی ملکیت بتائی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت اُن چند نفوس کے قبضہ میں ہوتے ہیں جو اسٹیٹ کے نام پر حکومت کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم ان تمام انسانوں کو جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انہیں اپنی ذاتی ملکیت میں رکھتے ہوں، انداداً من دون اللہ قرار دیتا ہے۔

قرآن کی ان تصریحات کے بعد جب سورۃ بقرہ کی آیت (۲/۱۶۸) ہمارے سامنے آتی ہے تو ہم گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔ (۲/۱۶۸)۔ "اے نوعِ انسان! خدا نے تمہارے لئے جو رزق پیدا کیا ہے،

رزقِ حلال و طیّب

اسے حلال و طیّب طریق سے کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تو تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔" یہاں قرآنِ کریم نے زمین میں پھیلے ہوئے رزق کو حلال اور طیّب طریق سے کھانے کے لئے کہا ہے۔ طیّب کے معنی ہوتے ہیں پسندیدہ، خوشگوار جس کے نتائج عمدہ مرتب ہوں۔ یہاں تک بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن رزق کو بطریقِ حلال کھانے کا سوال غور طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے "مردار، بہتا ہوا خون، لحم خنزیر اور ہر وہ شے جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کیا جائے" کو بصراحت حرام قرار دیا ہے (۲/۱۷۳; و دیگر مقامات)۔ لیکن "ما فی الارض" میں تو کھانے پینے کی تمام چیزیں آجاتی ہیں۔ ان کے بطریقِ حلال کھانے سے کیا مراد ہے؟

ہم، حرام وحلال کی فقہی بحثوں میں الجھے بغیر، اس مقام پر اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے رزقِ حلال کی تشریح "رزقِ کریم" کہہ کر کر دی ہے یعنی "عزت کی روٹی"۔ سورۃ الانفال میں "مومنین حقا" (سچے اور سچے مومنوں) کا ذکر دو مقام پر آیا ہے۔ اور دونوں جگہ کہا ہے کہ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (۸/۴؛ ۸/۷۴)۔ "انہیں رزقِ کریم (باعزت رزق) میسر آئے گا"۔ اقبالؒ نے اس مشکل نکتہ کو یہ کہہ کر حل کر دیا ہے:

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

ظاہر ہے کہ جس رزق کے حصول کے لئے انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کا دست نگر اور محتاج ہو، اس سے "پرواز میں کوتاہی" آنا تو ایک طرف، قوتِ پرواز سلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن۔ یہ وہ رزق ہے جو "انداداً من دون اللہ" کے ہاتھوں ملتا ہے۔ اس کے برعکس وہ رزق ہے جسے خدا نے "رزق اللہ" (۲/۶۰)۔ یا رزق ربّک (۲۰/۱۳۱) کہہ کر پکارا اور اسے خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى کہا ہے (ایضاً) یعنی خیر بھی اور پائندہ بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ رزق ہے جو نظامِ خداوندی کی وساطت سے ملتا ہے اور اس میں کوئی انسان نہ کسی انسان کا دست نگر ہوتا ہے نہ زیر بارِ احسان۔ یہی وہ نظام ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

کس دریں جا سائل و محروم نیست		عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اور یہی دینِ خداوندی کا ماحصل ہے۔ یعنی

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس		نکتۂ شرعِ مبیں، ایں است و بس

قرآنِ کریم نے "مردار، خون، اور لحمِ خنزیر" کو حرام قرار دینے کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ (۲/۱۷۳)۔ یعنی ہر وہ شے جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے، حرام ہو جاتی ہے۔ یہ خصوصیت نظامِ خداوندی ہی میں ہوتی ہے کہ اس میں رزق "رزق اللہ" ہوتا ہے، "رزق ربّک" ہوتا ہے کسی انسان کا نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ رزق 'رزق حلال وطیب' ہوتا ہے۔

اس نظام کا آغاز، حضور نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں ہو چکا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس کی رو سے 'قطعاتِ اراضی' کو بڑے بڑے سرداروں کے قبضہ سے نکال کر، مملکت کی تحویل میں لانے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ قرآنِ کریم کی بعض آیات اس پر شاہد ہیں۔ سورۃ الرعد میں اسے بڑے دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہؐ کے دل میں فطرۃً یہ سوال ابھرتا ہو گا کہ جس نظام کے قیام کے لئے میں اس قدر جدوجہد کر رہا ہوں معلوم نہیں وہ کاملۃً میری زندگی میں متشکل ہو سکے گا

یا نہیں۔ اس کے جواب میں حضورؐ سے کہا گیا کہ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ. (۱۳/۴۰) "تم اس کا خیال مت کرو کہ تمہاری زندگی میں ایسا ہوگا یا نہیں ہوگا یہ ضرور، لیکن اس کے لئے وقت کا تعین تم نہیں کر سکتے۔ تمہارے ذمہ اس پیغام کا لوگوں تک پہنچائے چلے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ اس کے نتائج کب متشکل ہو کر سامنے آتے ہیں"۔ اس کے بعد کہا۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا. وَاللّٰهُ يَحْكُمُ. لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۳/۴۱)۔ "اس کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

قطعاتِ اراضی پر تحدید

کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ جن بڑے بڑے قطعاتِ اراضی پر ان سرداروں نے قبضہ کر رکھا تھا وہ کس طرح سمٹ کر چھوٹے ہو رہے ہیں۔ یعنی رفتہ رفتہ ان کی ملکیت سے نکلتے جا رہے ہیں۔ یہ سب خدا کے فیصلوں کے مطابق ہو رہا ہے جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ وہ بڑا سریع الحساب واقع ہوا ہے؟ اب یہ ان پر کبھی مسلط نہیں ہو سکیں گے (۱۳/۴۱)۔ اس سلسلہ کا آغاز رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہو چکا تھا اور تکمیل عہدِ فاروقی میں پہنچ کر ہو گئی جب عراق کی زمین افراد کی ملکیت کے بجائے مملکت کی تحویل میں رکھی گئیں۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اس دور میں خدا ہی الٰہ السماء تھا اور وہی الٰہ الارض۔ اور اندادًا من دون اللہ" میں سے کسی کا وجود باقی نہیں رہا تھا۔ اُس دور میں رزق "رزق اللہ" تھا اور ہر ایک کو بلا منّتِ غیرے ملتا تھا۔

(۰)

اس کے بعد آپ پھر اس آیت کی طرف آجایئے جس میں رزق کو حلال و طیب طریق سے کھانے کے لئے کہا گیا ہے (یعنی آیت (۲/۱۶۸) کی طرف)۔ اس میں تنبیہہ یہ کی گئی ہے کہ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ "تم شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرنا۔ شیطان کے نقوشِ قدم کی تشریح ایک آیت کے بعد یہ کہہ کر کر دی کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ. قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا. اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ. (۲/۱۷۰)۔ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کتاب کا اتباع کرو جسے خدا نے نازل کیا ہے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں!

اسلاف کی تقلید

ہم تو اپنے اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلتے رہیں گے؛ اس پر قرآنِ کریم نے اتنا ہی کہا ہے کہ "خواہ ان کے اسلاف کے سامنے نہ خدا کا بتایا ہوا صحیح راستہ ہو اور نہ ہی وہ عقل و فکر سے کام لیتے ہوں، یہ بہر صورت انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے رہیں گے!"

رسولؐ اللہ کے اولین مخاطب اہلِ کتاب بھی تھے اور وہ عرب بھی، جو کسی آسمانی کتاب کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں

تھے جہاں تک اہل کتاب کا تعلق ہے، وہ نظری طور پر تو اس کے مدعی تھے کہ وہ ان کتابوں کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے انبیاؑ کو ملی تھیں لیکن وہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں ان کے پاس نہیں تھیں۔ ویسے بھی وہ کتابیں جس شکل میں بھی انکے پاس تھیں، وہ عملی زندگی میں ان کا اتباع نہیں کرتے تھے بلکہ اس شریعت کا اتباع کرتے تھے جو ان کے ہاں اسلاف سے مروج چلی آرہی تھی ___ بعینہٖ جس طرح ہم آج خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) کو اپنے ہاں رکھتے ہوئے بھی عملاً اتباع اس طریق کا کرتے ہیں جو ہمارے ہاں اسلاف سے مروج چلا آرہا ہے ___ لہٰذا رسول اللہؐ کے اولین مخاطب خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا دوسرے لوگ، اتباع سب اپنے اسلاف ہی کا کرتے تھے۔ یہ تھے وہ لوگ جنہیں کہا جاتا تھا کہ وہ خدا کی کتاب کا اتباع کریں جو ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ تو وہ اس کے جواب میں حضورؐ سے کہتے تھے کہ ایسا کہنے میں تم (معاذ اللہ) جھوٹ بولتے ہو کہ تم جس روش پر چلنے کی ہمیں دعوت دیتے ہو وہ خدا کی متعین کردہ ہے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے اسلاف کا راستہ چھوڑ کر تمہاری اطاعت کرنے لگ جائیں۔ ہم ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ تمہارے اتباع کے مقابلہ میں ہم اپنے اسلاف کے اتباع کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اپنی طرف سے نہیں کہتے، یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور یہیں سے ہم اگلی آیت کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔

(۲۳) وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ. وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ.

۲/۲۳

اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے اگر تمہیں اس کے متعلق شک ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں تو تم اس کی مثل ایک سورۃ بنا کر لے آؤ اور خدا کو چھوڑ کر جنہیں بھی اپنے ساتھ بلانا چاہو، بلا لو۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایسا کر کے دکھاؤ؟"

ضمناً، یہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو اپنا عبد کہہ کر پکارا ہے اور ___ صرف حضورؐ ہی کو نہیں، خدا نے اپنے تمام رسولوں کو اپنا عبد کہا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ خدا کی عبدیت شرف و مجدِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔

خدا کا عبد

انسان کے لئے اس سے بڑا مقام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ اور یہ اس لئے کہ خدا کی عبدیت کے معنی یہ ہیں کہ ایسا انسان دنیا میں کسی اور کا محکوم، مطیع، فرماں پذیر اور غلام نہیں رہتا۔ اسے ہر قسم کی آزادی حاصل ہوتی ہے ___ خدا کی عبدیت کا یہ فطری نتیجہ ہے۔ اور آپ سوچئے کہ کس قدر بلند ہے یہ مقام، جسے نصیب ہو جائے۔ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والا، دنیا کی بلند سے بلند چوکھٹ سے مستانہ وار، سر اٹھائے آگے بڑھ جاتا ہے۔ بقولِ اقبالؒ

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام ۔۔۔ نہ غلام اُو را، نہ اُو کس را غلام

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ان لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں، یہ آپ کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں، خدا کی وحی ہے۔ غور کیجئے تو ایک مدعیٔ نبوت کے لئے یہ مشکل ترین مقام ہوتا تھا۔ اُسے خدا کی طرف سے جو وحی ملتی تھی اُسے غیراز نبی محسوس شکل میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کا تو قلبِ نبوی پر نزول

اس کا ثبوت کیا ہے؟

ہوتا تھا (۲/۹۷) اُس کے بعد وہ وحی کے الفاظ اپنی زبان سے دہراتا تھا اور لوگوں کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتا تھا کہ یہ میری فکر کا نتیجہ نہیں، خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی ہے — وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ (۵۳/۳-۴) "یہ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ جسے تم نطقِ نبوی سمجھ رہے ہو، یہ درحقیقت وحیٔ خداوندی ہے۔" اور ان کا سوال یہ تھا کہ اس کا ثبوت کیا ہے — یہی سوال قرآن کے اولین مخاطب کیا کرتے تھے۔ اور یہی آج بھی کیا جاتا ہے جب پوچھا جاتا ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ قرآنِ کریم خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے؛ محمدِ عربی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں۔ رسول اللہ اپنے اس دعویٰ کو علم و بصیرت کی بنا پر پیش کرتے اور دلیل و برہان کی رُو سے منوانے کی کوشش فرماتے۔ اسی لئے قرآنِ کریم میں بار بار تاکید آئی ہے کہ ان لوگوں سے کہو کہ یہ غور و فکر سے کام لیں، علم و بصیرت کی رو سے سوچیں، گہرے شعور اور تدبر سے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ اس سے یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے گی کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ ماورائے فکرِ انسانی ہے۔

لیکن اتنی محنت و کاوش کون کرتا ہے۔ بالخصوص وہ لوگ جنہیں تقلید کی روش نے نہ صرف سہل انگار اور تن آسان بنا دیا ہو بلکہ اُن کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بھی ماؤف کر رکھا ہو۔ وہ اس کے ثبوت میں کوئی محسوس نشان طلب کرتے تھے۔ ایسا نشان جو خارقِ عادات اور فوق الفطرت ہو اور جسے وہ اپنی طبیعی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیں۔ ایسے نشان کو اصطلاح میں معجزہ کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسا واقعہ جو انسان کی عقل و فکر کو عاجز کر دے۔ وہ سمجھ ہی نہ سکے کہ ایسا

معجزاتِ طلبی

کس طرح واقعہ ہو گیا۔ محسوسات کا خوگر انسان اس قسم کے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں مرئی نشانات طلب کرتا اور انہی کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ آج بھی آپ خود اپنے ہاں غور کیجئے۔ جن بزرگوں کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے اوّل تو ان میں بہت کم صاحبِ علم و فضل ہوتے ہیں۔ اور جو صاحبِ علم ہوں اور انہوں نے کچھ کتابیں بھی لکھی ہوں تو انہیں ان کی علمی قابلیت کی بنا پر اولیاء اللہ نہیں مانا جاتا۔ ان کی طرف کرامات منسوب ہوتی ہیں اور اسی بنا پر انہیں خدا کے مقربین تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ خانقاہی محفلوں میں بیٹھئے۔ ان بزرگوں کی قبروں کے مجاور یا دیگر معتقدین ان حضرات کی کرامات پر کرامات بیان کرتے اور سننے والے سر دھنتے چلے جائیں گے۔ آپ ان کے سوانحِ حیات کو پڑھیئے، ان میں بھی ان کی علمی یا فکری کاوشوں کا کوئی ذکر نہیں ملے گا۔ اگر ملے گا بھی تو یونہی سرسری سا۔ ساری کتاب ان کی کرامات کے

تذکروں سے بھری ہوگی۔ انہی کرامات کی وجہ سے ان کی شہرت ہوگی اور انہی کے بل بوتے پر وہ مرجعِ انام بنیں گے۔ یہی کیفیت ایک زندہ پیر کی بھی ہوتی ہے۔ اس کا کوئی ایک خارقِ عادت کرشمہ یا شعبدہ مشہور ہو جائے، پھر دیکھیے کہ مخلوق کس طرح اس کی طرف کھینچی چلی آتی ہے۔ اسی قسم کے خارقِ عادات کرشموں کی توقع لوگ انبیاء کرام سے بھی کرتے تھے اور انہی کا ان سے مطالبہ بھی ہوتا تھا۔ ہم معجزات سے متعلق گفتگو آگے چل کر متعلقہ عنوان میں کریں گے۔ یہاں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے

اس سے انکار

کہ رسول اللہ کے مخاطبین یہی مطالبہ حضورؐ سے کرتے تھے اور خدا کی طرف سے (رسول اللہ کی زبانی) اس کا یہ جواب ملتا تھا کہ میرا معجزہ تو یہی کتاب ہے۔ اس کے سوا مجھے کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر مخاطبین کی طرف سے اس مطالبہ اور حضورؐ کی طرف سے اس جواب کو دہرایا گیا ہے۔ دو ایک مقامات ملاحظہ فرمایئے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا۔ (۱۷/۹۰)۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس وقت تک تیری بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے جب تک تو اس قسم کے معجزات نہ دکھائے۔ مثلاً تو اشارہ کرے اور زمین سے پانی کا چشمہ پھوٹ بہے۔ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (۱۷/۹۱)۔ "یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور تیرے حکم سے اس میں پانی کی ندیاں جاری ہو جائیں۔ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (۱۷/۹۲)۔ "یا جیسا کہ تو ہمیں اکثر عذابِ خداوندی سے ڈرایا کرتا ہے، ہم پر آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دے اور اس طرح ہم پر ناگہانی آفت ٹوٹ پڑے۔ اور یا تو خود خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کر دے۔ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ۔ (۱۷/۹۳)۔ "یا تیرے لئے سونے کا ایک محل خود بخود تیار ہو جائے۔ یا تو ہمارے دیکھتے دیکھتے آسمان پر چڑھ جائے۔ اور صرف آسمان پر چڑھ ہی نہ جائے کیونکہ محض اتنی بات سے ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے بلکہ وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب ہم پر اتار دے جسے ہم پڑھ کر دیکھ لیں کہ اُسے واقعی خدا نے لکھا ہے۔ تم ایسا کر کے دکھاؤ گے تو پھر ہم مان لیں گے کہ تم واقعی خدا کے رسول ہو۔" آپ غور کیجئے کہ ان کی طرف سے یہ مطالبات ہوتے تھے اور، ظاہر ہے کہ ان مطالبات میں وہ سب شریک ہوتے تھے۔ کچھ لوگ مطالبہ کرنے والے، اور دوسرے اس انتظار میں کہ دیکھیں، یہ مدعیٔ نبوت ایسا کر کے دکھا سکتا ہے یا نہیں! اس قسم کا ہوا کرتا تھا مخاطبین کا ہجوم، اور ان کے سامنے یہ مدعیٔ نبوت! اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کی طرف سے (مبنی بر وحی) کیا جواب ملتا تھا۔ یہ جواب کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (۱۷/۹۳) اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اول تو تمہارا خود خدا کے متعلق یہ تصور باطل ہے کہ وہ اپنے قوانینِ فطرت کو توڑ کر، جن کے

متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ اُن میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اس قسم کے خلافِ فطرت واقعات ظہور میں لے آئے گا، اور وہ بھی اس لئے کہ تم اس کتاب کے متعلق یہ تسلیم کر لو کہ یہ اس رسولؐ کی فکر کا نتیجہ نہیں، خدا کی طرف سے عطا فرمودہ ہے۔ یعنی اُس کتاب کے متعلق جو قدم قدم پر یہ دعوت دیتی ہے کہ تم عقل و فکر سے کام لو۔ میرا کوئی دعویٰ علم و بصیرت کے خلاف نہیں ۔ اے رسولؐ! پہلے تو تم اِن سے یہ کہو کہ تمہارا خدا کے متعلق یہ تصور ہی باطل ہے اور اس کے بعد ان سے کہو کہ تمہارا یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ خدا کے رسولوں کو فوق البشر ہونا چاہیئے۔ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (ایضاً)۔ "میں تو صرف ایک انسان ہوں"۔ اور بَشَرٌ

بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

مِّثْلُكُمْ۔ (۱۸/۱۱۰) "بالکل تمہارے جیسا انسان"۔ اس لئے اس قسم کے خلافِ فطرت واقعات نہ تو خدا ہی ظہور میں لائے گا اور نہ ہی میں انہیں اپنی طرف سے پیش کر سکوں گا کہ میں ایک انسان ہوں/ اور کسی انسان کو اس کی قوت اور اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ خدا کے قوانین کو توڑ سکے۔

آپ سوچیئے کہ اس جواب پر وہ کس طرح منہ موڑ کر اور طرح طرح کی باتیں بناتے ہوئے منتشر نہ ہو جاتے ہوں گے، اور اس سے خود رسول اللہ کے دلِ شفقت آگیں پر کیا نہ گزرتی ہوگی! ایسے ہی تھے وہ مقامات، جہاں حضورؐ کی دلجمعی اور تسکین خاطر کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قسم کے سکون آفریں پیغامات آتے تھے کہ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ۔ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا۔ وَاُوْذُوْا۔ حَتّٰى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا۔ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ (۶/۳۴)۔ "تم ان لوگوں کی اس قسم کی باتوں سے کبیدہ خاطر نہ ہو۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ تم سے پہلے بھی جو رسول آئے، ان کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا۔ ان کی پیش کردہ تعلیم کی بھی اسی طرح تکذیب ہوتی رہی۔ لیکن انہوں نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہایت استقلال و استقامت سے اپنے پروگرام پر جمے رہے اور مخالفین کی طرف سے جس قدر تکالیف پہنچتی رہیں، انہیں ہمت سے برداشت کیا۔ یہاں تک کہ بالآخر ہمارے قانون کے مطابق ہماری طرف سے نصرت آپہنچی۔ ہم نے اس کے لئے کوئی خلافِ فطرت طریقہ اختیار نہ کیا۔ اس لئے کہ خدا کے قوانین اٹل ہیں، ان میں کوئی ردّ و بدل نہیں کر سکتا۔ یہ بات ان انبیاءؑ کے احوال و کوائف سے واضح ہو جاتی ہے جن کے تذکرے اس قرآن میں تم تک پہنچ چکے ہیں"۔ اس کے بعد ہے۔ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ۔ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ۔ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ (۶/۳۵)۔ "ان لوگوں کی طرف سے اس قدر مخالفت کے باوجود، تم اس غم سے نڈھال رہتے ہو کہ یہ صحیح راستہ کی طرف کیوں نہیں آتے۔ تم کیوں اپنے آپ کو خستہ حال کر رہے ہو (۲۶/۳)۔ تم لاکھ غم کھاؤ اور ہزار افسوس کرو، یہ پھر بھی صحیح راستہ کی طرف نہیں آنے کے۔ اگر تم ایسا کر سکو کہ زمین میں کوئی سرنگ لگا کر پاتال تک جا پہنچو یا آسمان میں

سیڑھی لگاکر عالمِ بالا تک پہنچ جاؤ اور وہاں سے کوئی ایسا معجزہ لے آؤ جس سے ان کا مطالبہ پورا ہو جائے، تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھو کہ ان لوگوں کے اس قسم کے مطالبات سے مقصد یہی ہے نا کہ تمام لوگ ایک راستہ پر چلنے لگیں۔ اگر انسانوں کا اختیار وارادہ سلب کر کے سب کو ایک طریقہ پر چلانا مقصود ہوتا تو خدا کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا؛ لیکن خدا کا منشاء یہ ہے نہیں۔ وہ انسان سے اس کا اختیار وارادہ نہیں چھیننا چاہتا۔ لہٰذا وہ چاہتا ہی نہیں کہ خلافِ فطرت حوادث دکھا کر لوگوں کی عقل کو ماؤف کر دیا جائے اور اس طرح وہ ایک راستہ پر چلنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ یہ ہے اس کی حقیقی وجہ، سو تم بھی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا (ظاہر ہے کہ تم ایسے کبھی نہیں ہو گے) جو حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے کہا کرتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو ایسا کیوں نہ بنا دیا کہ سب ایک ہی (صحیح) راستہ پر چلیں۔

مخالفت کی حقیقی وجہ

اوپر کہا گیا ہے کہ اگر ان لوگوں کا اس قسم کا مطالبہ پورا کر بھی دیا جائے تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لانے کے۔ تو اس سے ایک اور لطیف حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ یہ لوگ حضورؐ کی پیش کردہ دعوت سے اس لئے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان کے انکار اور مخالفت کی اصلی وجہ یہ تھی کہ جو نظام حضورؐ قائم کرنا چاہتے تھے اس سے ان لوگوں کے تمام ناواجب مفادات ختم ہو جاتے تھے — مساواتِ انسانیہ کی بنا پر وہ تمام فخر و مباہات جسے قریش، محض بربنائے نسل، اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتے تھے، وہ شرف و عزت جو کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے انہیں حاصل تھی اور جس کی بنا پر وہ تمام عرب کی عقیدتمندیوں کا مرکز بنے رہتے تھے، وہ معاشی مفادات جو انہیں نظامِ سرمایہ داری کی رو سے حاصل تھے — حضورؐ کے پیش کردہ نظام کے قیام سے ان سے یہ سب کچھ چھن جاتا تھا۔ لہٰذا یہ تھی اصلی وجہ ان کی مخالفت کی۔ وہ معجزات کا مطالبہ محض اتمامِ حجت کے لئے کرتے تھے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہا کہ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (۶/۷)۔ "اگر ہم تیری طرف ایک ایسی کتاب بھی نازل کر دیں جو قرطاس پر لکھی ہوئی آسمان سے اترے اور جسے یہ چھو کر اچھی طرح اپنا اطمینان بھی کر لیں کہ یہ سچ مچ کی ایک کتاب ہے، تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ کہہ دیں گے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔" اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا (۱۵/۱۵)۔ "اس نے (یوں کہیے کہ) ہپناٹزم (قوتِ متخیلہ) سے ہماری نگاہوں کو مدہوش کر دیا ہے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ اس قسم کے خارقِ عادت واقعات سے مفاد پرستوں کا یہ خاص گروہ ایمان نہ لاتا لیکن عوام ان سے ضرور متاثر ہو جاتے اور حضورؐ کے پیروکار بن جاتے۔ لیکن، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ منشائے خداوندی کے خلاف ہوتا۔ منشائے خداوندی

ہے ہی یہ کہ غلط اور صحیح راستے لوگوں کے سامنے واضح طور پر رکھ دیئے جائیں اور پھر اسے ان کے اختیار اور ارادہ پر چھوڑ دیا جائے۔ کہ وہ جو راستہ چاہیں اختیار کرلیں قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸/۲۹) "اُن سے کہہ دو کہ حق تمہارے خدا کی طرف سے آگیا۔ سو جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔" اسی سے انسان اپنے فیصلوں اور اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اور ان کے نتائج کا مستحق۔ نہ مجبوری سے لایا ہوا ایمان، ایمان ہوتا ہے نہ کفر، کفر۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (۱۰/۹۹) "اگر مشیتِ خداوندی میں یہ ہوتا کہ تمام انسان مومن ہوتے تو اس کے لئے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسا کرتا۔ لیکن یہ ان کے اپنے فیصلہ سے اختیار کردہ راستہ نہ ہوتا۔ اشیائے فطرت اور حیوانات کی طرح مجبوری کا نتیجہ ہوتا۔ لہٰذا، جو شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کی عقل و فکر کو ماؤف کر کے انہیں مومن بنایا جائے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ چاہتا یہ ہے کہ لوگوں کو اس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا جائے۔ خدا ایسا نہیں چاہتا۔ نہ ہی وہ ایسا کرتا ہے۔"

یہ تھا وہ جواب، جو ان لوگوں کی معجزہ طلبی پر دیا گیا اور کہا گیا کہ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (۲۹/۵۰) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسولؐ کو خدا کی طرف سے معجزات کیوں نہیں دیئے جاتے۔ ان سے کہو کہ معجزات کا دینا خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن اس سے سلسلۂ رشد و ہدایت کا سارا مقصد ہی فوت ہوجاتا۔ میرا منصب معجزات دکھانا نہیں، تمہیں اس سے آگاہ کرنا ہے کہ جس روش پر تم چل رہے ہو، اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں۔" اور اس کے بعد ہے۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (۲۹/۵۱) "کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ خدا نے اے رسولؐ! تمہاری وساطت سے ان کی طرف اس قسم کا ضابطۂ زندگی بھیجا ہے کہ جو لوگ بھی اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں گے، انہیں دنیا میں سامانِ زیست فراوانی سے ملے گا اور وہ عزّ و شرف سے بھی بہرہ یاب اور سرفراز ہوں گے۔ کیا یہ کتاب ان کے لئے کافی معجزہ نہیں جو یہ حسّی معجزات کے مطالبے کرتے رہتے ہیں۔"

یہاں چند لمحات کے لئے رُک کئے اور نگاہ کا رُخ ایک اور حقیقت کی طرف پھیریئے۔ حضورؐ کی مخاطب قوم کی طرف سے مطالبات کے باوجود کوئی معجزہ ظہور میں نہیں لایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا، اور بار بار فرمایا کہ میرا معجزہ یہی میری کتاب ہے۔ تم اس پر غور و فکر کرو۔ وہ اس پر غور و فکر کرتے تو انہیں وہ تمام مفادات چھنتے نظر آتے جو انہیں اس وقت حاصل تھے۔ ان حالات میں سوچئے کہ جو حضرات، اس کے باوجود حضورؐ کی رسالت پر

صحابہؓ کا ایمان

ایمان لے آئے تھے؛ فکر وکردار؛ دونوں اعتبارات سے ان کا مقام کس قدر بلند تھا! فکری اعتبار سے اس لئے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، عرب جیسے توہم پرستانہ ماحول میں، خالص غور وفکر کی رو سے صداقت کا پہچان لینا، کتنی بلند نگہی کی دلیل ہے۔ اور کردار کے اعتبار سے اس لئے کہ انہیں صاف نظر آتا تھا کہ اس صداقت کے قبول کرنے سے ان کے مفادات کس طرح ان سے چھن جائینگے۔ اور انہیں کس قدر مصائب کا سامنا کرنا ہوگا، لیکن اس کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے انہوں نے اس صداقت کو تسلیم کیا اور برملا تسلیم کیا! ان حضرات کے ایمان کی پختگی اور قبولیتِ صداقت کے خلوص میں کسی قسم کا بھی شبہ ہوسکتا ہے؛ یہی تھے وہ پیکرانِ حق وصداقت جنہیں خدا نے "مومن حقا" کہہ کر پکارا (۸/۴) اور رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (۹/۱۰۰) کی خلعت سے نوازا تھا۔

اس ضمنی گوشہ کے بعد، پھر اصل موضوع کی طرف لوٹئے۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ان سے کہا گیا کہ میرا معجزہ یہ کتاب ہے۔ کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں؟

جب اُن سے یہ کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ تم ہمارے سامنے یہ کتاب پیش کرتے ہو، لیکن ہمارا تو اعتراض ہی یہ ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ یہ کتاب میری تصنیف کردہ نہیں، خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے تو ہم اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس قسم کی کتاب ہم خود بھی تصنیف کرسکتے ہیں۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا۔ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔ (۸/۳۱) "جب ان کے سامنے اِس قرآن کی آیات کو پیش کیا جاتا ہے تو یہ بڑی بے اعتنائی سے کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں سن لیا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسی کتاب تصنیف کرسکتے ہیں۔ اس میں اس کے سوا رکھا ہی کیا ہے کہ اقوامِ سابقہ کے قصے کہانیاں ہیں جنہیں یکجا کردیا گیا ہے"۔ اس جواب پر ان سے کہا گیا کہ بہت اچھا۔ ہمیں یہ منظور ہے۔ چلئے فیصلہ کن بات یہی رہی۔ اگر تم اس کتاب کی مثیل ونظیر کوئی کتاب تصنیف کر دو تو ہمارا یہ دعوٰے (معاذ اللہ) جھوٹا ہوگا کہ یہ انسانی تصنیف نہیں، خدا کی کتاب ہے۔ خدا نے ان کا چیلنج قبول کیا اور اپنے

قرآن کا چیلنج

رسولؐ سے کہا کہ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۱۷/۸۸)

"تم تو ایک طرف، اگر ساری دنیا کے انسان — حضری اور بدوی سب کے سب مل کر بھی کوشش کریں کہ اِس قرآن جیسا قرآن بنالیں تو وہ ایسا نہیں کرسکیں گے، خواہ وہ ایک دوسرے کے کتنے ہی مددگار کیوں نہ بن جائیں"۔ یہ قرآن جیسا کہ یہ کہتے ہیں، اقوامِ سابقہ کی داستانوں کا مجموعہ نہیں۔ اس میں تو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے متعلق ابدی حقائق اور ازلی راہنمائی دی گئی ہے جسے ہم مختلف اسالیب وانداز سے لوٹا لوٹا کر سامنے لاتے ہیں تاکہ ہر بات کی وضاحت ہوجائے۔ اس جیسا

مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات کون بنا سکتا ہے؟"

یہاں کہا گیا کہ، جیسا کہ تم نے خود ہی دعویٰ کیا ہے، اس قرآن جیسا، پورا قرآن بنا کر دکھاؤ۔ دوسری جگہ اس مطالبہ میں خود اپنی طرف سے تخفیف کر کے یہ کہہ دیا کہ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (۱۱/۱۳) "یہ کہتے ہیں کہ اس رسولؐ نے یہ قرآن خود بنا لیا ہے اور اسے خدا کی طرف یونہی منسوب کر رہا ہے۔ ان سے کہو کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ خدا کی کتاب نہیں، انسان کا کلام ہے، تو تم پورے کا پورا قرآن تو ایک طرف، اس جیسی صرف دس سورتیں بنا کر لے آؤ، اور خدا کو چھوڑ کر، جسے بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہو، کر لو۔ بات صاف ہو جائیگی۔"

یہاں دس سورتیں کہا گیا ہے اور سورۃ یونس میں اس میں مزید تخفیف کر کے کہا اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (۱۰/۳۸) "دس سورتیں بھی نہیں۔ ان سے کہو کہ اس جیسی ایک سورت ہی بنا کر پیش کر دو۔"

اور اس کے بعد یہ کہہ کر بات کو آخری حد تک پہنچا دیا کہ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۵۲/۳۴) "ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو ایک سورۃ بھی نہیں، جو حقائق اس میں بیان کئے گئے ہیں، ان جیسی صرف ایک حقیقت، صرف ایک بات ہی وضع کر کے دکھاؤ۔"

کس قدر ہے خود اعتمادی اپنے اس دعویٰ پر کہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان وحی کی کسی حقیقت کی مثل و نظیر پیش کر سکے۔ اور یہی تھی وہ انتہا درجہ کی خود اعتمادی، جس کی بنا پر، ان کا چیلنج قبول کرنے کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ

(۲/۲۴) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۔

"اول تو تم ایسا کرنے کی ہمت ہی نہیں کرو گے۔ اور اگر تم نے ہمت کر کے کوشش کر بھی لی تو اس میں یکسر ناکام رہ جاؤ گے۔ تم ایسا کر ہی نہیں سکو گے۔ اور جب صورت یہ ہے تو کیا پھر یہ بات واضح نہیں کہ یہ کتاب واقعی وحی پر مبنی ہے۔ اس رسولؐ کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی تم اسے قبول نہیں کرو گے تو اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا، تم خود ہی تباہیوں کے جہنم میں جا گرو گے۔"

آگے بڑھنے سے پہلے دو ایک نکات کی وضاحت ضروری ہے۔ اس میں قرآن کی سورتوں کا ذکر آیا ہے۔ لغوی اعتبار سے اس مادہ (س۔ و۔ ر) کے معنی ہوتے ہیں بلندی، برتری، شرف و فضیلت، سطوت و شوکت، جاہ و جلال،

زور اور دبدبہ۔ ان مفاہیم کے مظاہر، آگے چل کر مختلف مقامات پر، ہمارے سامنے آتے جائیں گے اور ان کی وضاحت متعلقہ

سورۃ کے معنی

مقامات پر کی جائے گی۔ لفظِ سورۃ کا مفہوم سمجھنے کے لئے اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ عربوں کے ہاں یہ لفظ اُس عمارت کے لئے بولا جاتا تھا جو خوبصورتی کے ساتھ منزل بہ منزل آسمان کی طرف بلند ہوتی چلی جائے۔ اِس عمارت کی ہر منزل کو سورۃ کہا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے قرآنِ کریم بہ ہیئتِ مجموعی ایک عمارت ہے جو انتہائی زیبائی و رعنائی لئے ہوئے، بتدریج بلند ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی ہر منزل کو سورۃ کہا جاتا ہے۔ اس سے ایک عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے۔

آپ نے لوگوں کو عام طور پر یہ کہتے سنا ہوگا کہ قرآنِ کریم نزولی ترتیب کے اعتبار سے کیوں مرتب نہیں کیا گیا؟ یعنی تیئس سال کے عرصہ میں جو آیات وقتاً فوقتاً نازل ہوتی گئیں، انہیں اُسی ترتیب سے لکھتے چلے جانا چاہیئے تھا اور اس

قرآن کی ترتیب

طرح یہ کتاب مرتب ہو جانی چاہیئے تھی۔ میں ایسا کہنے والوں سے کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا، صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تو حقیقت ہے کہ رسول اللہ نے قرآن اسی ترتیب کے ساتھ مرتب شکل میں امت کو دیا تھا۔[1] میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں اور گزشتہ قریب چالیس سال سے اس کا مسلسل مطالعہ کرتا چلا آرہا ہوں۔ اور یہ حقیقت علیٰ وجہ البصیرت میرے سامنے آگئی ہے کہ اس کی موجودہ ترتیب بھی ایک معجزہ ہے۔ میں نے اسے ایک نصاب کی کتاب پایا ہے۔ نصاب کی کتاب کی ترتیب اس طرح رکھی جاتی ہے کہ شروع میں اس کے مسلمات اور مبادیات مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ، درجہ بدرجہ ان مسلمات کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کا ہر اگلا باب، پچھلے باب یا ابواب کا ماحصل ساتھ لیتے ہوئے آگے بڑھتا اور بلند ہوتا چلا جائے، تا آنکہ جب قاری اس کے آخری حصہ تک پہنچے تو پوری کتاب کے مندرجات نہایت حسنِ ترتیب کے ساتھ اس کے ذہن میں منقوش ہو جائیں۔ میں نے قرآنِ کریم کو اسی طرح کا پایا اور اسے اسی طرح سمجھا ہے۔ اور میں اپنی بصیرت کے مطابق حتمی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی یہ ترتیب بھی اُس اعجاز کا ایک حصہ ہے جس کا چیلنج دنیا کو دیا گیا ہے۔ خدا کی یہ کتابِ عظیم اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لئے نہ تو "شانِ نزول" کی محتاج ہے اور نہ کسی اور ترتیب کی۔ یہ خود مکتفی ہے اور اپنی وضاحت آپ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو نور (روشنی) کہا ہے اور روشنی اپنی تابندگی کے دعویٰ کے لئے کسی خارجی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی۔

ویسے بھی اگر مزید غور کیا جائے تو یہ حقیقت کہ اس کی ترتیب بھی منجانب اللہ ہے نمایاں طور پر سامنے آجائے گی۔

---

[1] میں نے اسے اپنی کتاب "مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں" کے آخری باب میں وضاحت سے لکھا ہے۔ مزید تفصیل اِسی تفسیر کے متعلقہ مقامات میں سامنے آتی جائے گی۔

خدا نے اسے اپنی "کتاب" کہا ہے اور کتاب اُسی کو کہا جاتا ہے جو مرتب شکل میں دی جائے۔ غیر مرتب، منتشر فقرات (آیات) اور غیر مربوط ابواب (سورتوں) کو کتاب کہا ہی نہیں جا سکتا۔

دوسرے یہ کہ آج ہمارے پاس اس کا ذریعہ کون سا ہے جس کی رُو سے یقینی طور پر کہا جا سکے کہ قرآنی آیات کے نزول کی ترتیب کیا تھی ــ یعنی کون سی آیت کب نازل ہوئی تھی۔ اس کا ذریعہ لامحالہ روایات کو قرار دیا جا سکتا (اور قرار دیا جاتا) ہے اور روایات کے غیر یقینی ہونے کی جو صورت ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں (روایات تو یہ بھی کہتی ہیں کہ رسول اللہ نے مرتب شکل میں قرآن مجید امت کو دیا ہی نہیں تھا۔ یہ بعد میں جمع اور مرتب کیا گیا تھا۔ اور جمع اور مرتب بھی اس طریق سے کہ جسے دیکھ کر انسان سر پکڑ کر بیٹھ جاتے!) اس قسم کے غیر یقینی ذریعہ کی رُو سے مرتب کردہ قرآن کو اُس قرآن کا بدل (بلکہ اس سے بہتر) قرار دینا جسے خود رسول اللہ نے (من جانب اللہ) امت کو دیا تھا، بڑی زیادتی ہے۔ اس قسم کی کوششوں کا ماحصل اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق شکوک پیدا ہوں۔ قرآن اپنی موجودہ شکل و ترتیب کے ساتھ خدا کی وہ کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے اور یہی قرآن دنیا کے لئے چیلنج ہے۔

اس ضمنی بحث کے بعد پھر اسی چیلنج کی طرف آیئے جس کا ذکر چلا آرہا تھا۔

قرآن مجید نے یہ چیلنج اپنی قوم مخاطب کو دیا۔ دوسرے لوگوں کو چھوڑیئے، قریش نے حضورؐ کی دعوت کی مخالفت اس کے یوم اوّل سے اُس وقت تک مسلسل کی جب تک مکہ فتح نہیں ہو گیا۔ اس مخالفت میں ان کے ساتھ مسلسل تصادمات ہوتے رہے۔ انہوں نے لڑائی پر لڑائی لڑی اور جنگ پر جنگ کی۔ اس میں انہیں جس تکالیف اٹھانی اور نقصانات برداشت کرنے پڑے، وہ ظاہر ہے۔ اس کی آخری حد یہ تھی کہ فتح مکہ کے بعد ان کا وہ سب کچھ جاتا رہا جس کے تحفظ اور بقا کے لئے انہوں نے یہ کچھ کیا تھا۔ سوچئے کہ اگر ان کے لئے اس چیلنج کا قبول کرنا ممکن ہوتا جو قرآن نے دیا تھا ــ کہ اس قرآن جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ ــ تو وہ کس آسانی سے رسول اللہ کی اس دعوت کو ختم کر سکتے تھے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، وہ اہل زبان تھے، انہیں اپنی زبان پر ناز تھا۔ ایسا ناز کہ وہ اس کے مقابلہ میں کسی اور کو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے ہاں زبان کی بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ ان کے شعرا محض زبان کے زور پر انقلاب برپا کر دیتے تھے۔ قرآن خود انہی کی زبان میں نازل ہوا۔ ان کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ اس چیلنج کو قبول کر لیتے۔ قرآن نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بدوی قبائل کو بھی ملا لیں۔ اور ان کے علاوہ جن اور لوگوں کو بھی چاہیں اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ ان سے اعلانیہ کہہ دیا گیا تھا کہ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۲۳) "شہید" کے معنی گواہی دینے والا، نگران اور فیصلہ کرنے والا بھی ہوتے ہیں سو بالفاظِ دیگر ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ "اگر تم اس چیلنج کو قبول کر کے کسی محفل میں اس کا فیصلہ کرانا چاہتے ہو تو تم وہ

محفل خود اپنی نگرانی میں منعقد کرالو۔ خود تمہارے اپنے لوگ اس کی شہادت دیں گے کہ تم نے جو پیش کیا ہے وہ کیسا ہے"۔ سوچئے کہ اگر وہ سمجھتے کہ ایسا کرنا ممکن ہے تو وہ اس چیلنج کی طرف لپک نہ آجاتے؟ انہوں نے ساری عمر جنگیں لڑیں، اپنی جان ومال کا ضیاع برداشت کیا۔ ان کے عزیز واقارب، حتیٰ کہ ان کی بیویاں تک ان کا ساتھ چھوڑ کر مخالف جماعت (مومنین) کے ساتھ مل گئیں۔ بیس سال کے عرصہ تک یہ سب کچھ ہوتا رہا، لیکن وہ اس چیلنج کے قبول کرنے کی طرف نہ آئے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے مؤرخین سے کہ وہ تاریخ کی اس شہادت پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ وہ عرب اس کتاب کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچے تھے؟ باقی رہا یہ کہ جب وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ کتاب فکرِ انسانی کا نتیجہ نہیں ہو سکتی تو انہوں نے مخالفتوں اور مقابلوں کو چھوڑ کر اس کتاب کو قبول کیوں نہ کر لیا؟ تو اس کی وجہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اس کی وجہ وہی تھی جسے قرآنِ کریم نے قومِ فرعون کی داستان کے ضمن میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا۔ (۲۷/۱۴) "وہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا برابر مقابلہ کرتے چلے گئے، حالانکہ ان کا دل مانتا تھا کہ وہ صداقت پر مبنی ہے۔ وہ اس سے اس لئے سرکشی برتتے گئے کہ ان کا پندارِ نفس، ان کا بیجا تکبر، ان کی خوئے استبداد ان کے آڑے آتی تھی۔ وہ اسے اپنی انتہائی ذلت سمجھتے تھے"۔ اور یہ کتنی بڑی نفسیاتی حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم دو لفظوں میں بیان کر گیا ہے۔ کتنی حقیقتیں ہیں جنہیں ہم محض جھوٹی عزت اور شکستِ پندار کی بنا پر جھٹلاتے چلے جاتے ہیں، حالانکہ ان کے سچا ہونے کا ہمیں یقین ہوتا ہے۔

اور قریش تو اس باب میں قومِ فرعون سے آگے تھے۔ ان کے تکبر اور پندار کا تو یہ عالم تھا کہ جب بدر کے میدان میں ابوجہل کے حلق پر تلوار پھرنے لگی تو اس نے اپنے قاتل سے کہا کہ میری گردن کو ذرا اور نیچے سے کاٹو، خواہ اس میں مجھے کتنی ہی سخت تکلیف کیوں نہ ہو۔ اس نے پوچھا کہ تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ جنگ کے بعد جب مقتولین کے سروں کو نیزوں پر گاڑ کر ان کا جلوس نکالا جائے گا تو میں چاہتا ہوں کہ ابوجہل کا سر باقی سروں کے مقابلہ میں اونچا دکھائی دے۔ سوچئے کہ اس قسم کی قوم، دعوتِ محمدیہ کی صداقت کو ایسے ہی کس طرح قبول کر لیتی! انہوں نے اسے قبول نہ کیا لیکن یہ واقعہ اہلِ دنیا کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس امر کی شہادت قرار پا گیا کہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ اسے ناممکن سمجھتے تھے۔ کیا یہ واقعہ اس امر کا زندہ ثبوت نہیں کہ قرآن کسی انسان کی فکر کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ ماورائے فکرِ انسانی ہے۔ علمِ خداوندی ہے!

اور پھر یہ بات زمانۂ نزولِ قرآن کے مخاطبین تک ہی محدود نہیں۔ یہ چیلنج ساری دنیا کے لئے ہے اور چودہ سو سال

سے برابر دہرایا جا رہا ہے۔ اس عرصہ میں (عرب اور غیرعرب) غیر مسلموں میں بھی عربی زبان کے ایسے ایسے عالم گزرے ہیں جن کا ادب میں بڑا بلند مقام ہے۔ کیا اِس چودہ سو سال میں، کسی زمانے میں، دنیا کی کسی قوم نے یا کسی فرد نے اس کا دعویٰ کیا کہ میں اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں؟ قریشِ مکہ نے تو چھ سات برس ہی لڑائیاں لڑی تھیں۔ دیگر اقوام اور ان کی طرف سے مسلمانوں کی مخالفت سے قطع نظر،

آج بھی یہ چیلنج موجود ہے

اقوامِ یورپ کی عیسائی سلطنتوں نے متحدہ طور پر قریب تین سو سال تک صلیبی لڑائیاں لڑیں۔ مسلمانوں کے ہاتھوں کتنے اور کس قدر نقصانات اٹھائے، اپنی سلطنتیں تباہ کرائیں۔ انہوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا، لیکن اس چیلنج کو قبول نہ کر سکیں، حالانکہ اس کی رُو سے مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شکست دے دینا کس قدر آسان تھا! یہ حقیقت، کہ آج تک کسی نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا، کیا اس امر کی زندہ شہادت نہیں کہ یہ کتاب انسانی فکر کی تخلیق نہیں؟

اور اگر ماضی کے واقعات کو چھوڑ بھی دیا جائے تو یہ چیلنج آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہے۔ دنیا بھر کی غیرمسلم اقوام مسلمانوں کی مخالفت میں جس طرح سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں، اور اس کے لیے جس قدر کاوشیں اور سازشیں کر رہی ہیں ــــ وہ کاوشیں اور سازشیں جنہوں نے ان پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر رکھی ہے ــ کیا وہ اتنی سی بات بھی نہیں سوچ سکتیں کہ اگر اس چیلنج کا مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کر لی جائے تو اسلام کو (بپناہ خدا) ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دنیا سے نیست و نابود کیا جا سکتا ہے، اور اس کے بعد مسلمان قوم کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہ سکتا! یہ تو بیں اتنی بیوقوف نہیں، کہ وہ اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکیں۔ لیکن ان کے اربابِ علم و نظر یہ جانتے ہیں کہ یہ چیلنج قبول نہیں کیا جا سکتا۔ جب انگریز ہندوستان میں آئے ہیں تو ان کے پادریوں کی ایک فوج ان کے ساتھ آگئی اور انہوں نے جگہ بجگہ مسلمانوں کے ساتھ مناظرے شروع کر دیئے۔ یورپ کی عیسائی سلطنتیں ان کی پشت پر تھیں۔ خود ہندوستان میں انگریزی حکومت کی حمایت اور مدد انہیں حاصل تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ہر موضوع پر مناظرے کئے۔ کہیں کامیابی حاصل کی کہیں شکست کھائی۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس چیلنج کو قبول نہ کیا۔ انہوں نے اِسے کبھی اور کسی جگہ بھی ...... مناظرہ کا موضوع نہیں بنایا۔

بہرحال، بات اس چیلنج کی تھی جسے قرآن نے اپنی مخاطب قوم، یا دنیا کی اقوام کے سامنے پیش کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس چیلنج کا تعلق قرآن کے اسلوبِ بیان سے تھا یا اس میں مندرج حقائق سے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا تعلق دونوں سے تھا۔ قرآن اپنے حقائق و معارف کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے اور الفاظ کے انتخاب، اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بھی معجزہ۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے، خدا کی طرف سے (ہر نبی پر) نازل شدہ وحی معجزہ ہوتی تھی۔ وحی کی تو بنیادی خصوصیت ہی یہ تھی کہ وہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں تھی، خدا کی طرف سے عطا کردہ علم ہوتا تھا جس میں صاحبِ وحی (انسان) کی اپنی

محنت، کسب و ہنر اور کاوش و کاہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس اعتبار سے خدا کی طرف سے نازل شدہ ہر کتاب معجزہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے رسول اللہ سے کہا کہ آپ ان اہل کتاب (یہود) سے کہیئے۔ قُلْ۔ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (۲۸/۴۹) "تم کوئی ایسی کتاب پیش کرو جو تمہارے پیغمبر پر نازل شدہ کتاب اور اس قرآن سے بہتر ہدایت دینے والی ہو تو میں اس کا اتباع کروں گا۔" جو کتاب تمہارے پیغمبر کو دی گئی تھی وہ تو اب تمہارے پاس ہے نہیں، یہ کتاب تمہارے سامنے ہے۔ لہٰذا تم اس سے بہتر کتابِ ہدایت پیش کرو، اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ منجانب اللہ نہیں۔ لہٰذا یہ چیلنج قرآنِ کریم کے کتابِ ہدایت ہونے کی جہت سے بھی تھا۔ لیکن اگر یہ چیلنج یہیں تک محدود ہوتا تو اس میں بحث و نزاع کا امکان تھا۔ اس کے برعکس اسلوبِ بیان کے متعلق چیلنج ایسا تھا جس میں بات مجاز اور محسوس انداز سے سامنے آ سکتی تھی۔ چیلنج کا یہی وہ گوشہ تھا جس کے متعلق بار بار کہا گیا کہ یہ کتاب عربی زبان میں نازل کی گئی ہے۔ خود لفظ عربی کے معنی فصیح اور واضح کرنیوالے کے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، عربوں کو اپنی زبان کے فصیح و بلیغ ہونے پر اتنا ناز تھا کہ وہ اپنے سوا ساری دنیا کو عجمی، یعنی گونگا، کہتے تھے۔ لہٰذا لفظ 'عربی' کے اس بنیادی

عربی زبان کی کتاب

معنی کے لحاظ سے قرآن کے اسلوبِ بیان کو نہایت واضح کہا گیا۔ قرآن کی متعدد آیات میں ہے۔ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (۱۲/۲) "ہم نے اس قرآن کو نہایت واضح انداز میں نازل کیا ہے تاکہ تم اسے اچھی طرح سمجھ لو۔" قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کے معنی واضح کتاب ہونگے۔ سورۃ زمر میں اس نکتہ کی وضاحت یہ کہہ کر دی کہ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ۔ (۳۹/۲۸)۔ "واضح قرآن جس میں کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی ابہام نہیں، التباس نہیں، نہایت صاف و شفاف، اپنے مطالب کو وضاحت اور صراحت سے بیان کرنے والی کتاب۔" (نیز دیکھئے۔ ۲۰/۱۱۳؛ ۴۱/۳؛ ۴۲/۷؛ ۴۳/۳)۔ ان آیات میں "قرآناً عربیاً"، کے معنی واضح کتاب بھی ہو سکتے ہیں اور عربی زبان کی کتاب بھی۔ ایک جگہ لِسَانًا عَرَبِيًّا (۴۶/۱۲) کہا۔ یعنی عربی زبان کی کتاب۔ اور دوسری جگہ کہا بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ (۲۶/۱۹۵) "واضح عربی زبان کی کتاب۔" اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم نے جو اپنے متعلق بار بار کہا ہے کہ یہ عربی زبان کی کتاب ہے تو اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ اس کے اسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش کی معجزانہ خصوصیت پر بھی بڑا زور دیتا ہے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ اگر کوئی شخص اردو زبان میں ایک کتاب تصنیف اور شائع کرے اور اس میں بار بار کہے کہ اس کتاب کی زبان اُردو ہے تو اس کا یہ کہنا بے معنی نظر آئے گا۔ اس لئے کہ اس کتاب کی زبان خود کہہ رہی ہوگی کہ وہ اردو میں لکھی گئی ہے۔ بنا بریں، قرآنِ کریم کے اس کہنے سے کہ یہ عربی زبان کی کتاب ہے۔ اور عربی زبان بھی وہ جو نہایت واضح ہے، یہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

کہ اس کا مقصد وہی چیلنج تھا جو عربوں کو دیا گیا تھا یعنی ان سے کہا یہ گیا کہ یہ خود تمہاری اپنی زبان کی کتاب ہے۔ لہٰذا تمہیں اس چیلنج کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر یہ عربی کے سوا کسی اور زبان کی کتاب ہوتی تو تم اس پر فوراً اعتراض کر دیتے کہ یہ ہماری زبان نہیں۔ ہم اسے سمجھ تک نہیں سکتے اس لئے یہ چیلنج بے معنی ہے۔ خود قرآنِ کریم میں ہے۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ۔ (۴۱/۴۴) "اگر ہم اس قرآن کو عجمی زبان میں نازل کرتے تو یہ فوراً پکار اٹھتے کہ بات واضح طور پر کہو، ہم یہ زبان ہی نہیں سمجھ سکتے۔" دوسرے مقام پر ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس مدعیٔ رسالت کو کوئی دوسرا شخص سکھا پڑھا جاتا ہے اور یہ اُسے وحی کہہ کر پیش کر دیتا ہے۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (۱۶/۱۰۳) "ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ تمہیں کوئی دوسرا شخص آکر سکھا جاتا ہے۔ ایسا کہتے وقت وہ اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ جس شخص کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ آکر تمہیں یہ کتاب سکھا پڑھا جاتا ہے اُس کی زبان عجمی ہے یا وہ بڑا ہی غیر فصیح ہے۔ اور یہ کتاب عربی مبین کی کتاب ہے۔" (نیز دیکھئے۔ ۲۵/۵)

ان تصریحات سے مقصود یہ واضح کرنا تھا کہ قرآنِ کریم کا یہ چیلنج زبان اور اسلوب بیان کی جہت سے بھی تھا۔ اور وہ لوگ، باوجود اس کے کہ خود ان کی زبان عربی تھی اس چیلنج کو قبول کرنے سے عاجز رہے۔ علاوہ ازیں، قرآنِ کریم میں کئی ایک نکات اور بھی ایسے آئے ہیں جن سے اس چیلنج کے اِس گوشہ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اُس زمانہ کے عربوں کی حقائق و معارف سے عدم واقفیت کا یہ عالم تھا کہ قرآن سے پہلے ان کے ہاں سرے سے کوئی آسمانی کتاب ہی نہیں تھی۔ سورۃ سبا میں ہے وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ (۳۴/۴۴)۔ "اور ہم نے انہیں اس سے پہلے نہ کوئی کتاب دی تھی جسے یہ پڑھتے پڑھاتے اور نہ ہی ان کی طرف کوئی رسول بھیجا تھا۔" اس آیت میں بات تو کسی آسمانی کتاب کی کی گئی ہے لیکن تاریخ اس پر شاہد ہے کہ عربوں کے ہاں قرآنِ کریم ہی سب سے پہلی کتاب تھی۔ ان کی تعلیمی حالت یہ تھی کہ مکہ، جو ان کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا اس کی ساری آبادی میں صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان سترہ میں رسول اللہ شامل نہیں تھے، جس کی

حضورؐ دعوائے نبوت سے پہلے اَن پڑھ تھے

شہادت خود قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ سورۃ عنکبوت میں ہے۔ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (۲۹/۴۸)۔ "اے رسولؐ! اگر تم لکھے پڑھے آدمی ہوتے تو پھر بھی ان لوگوں کے لئے شک و شبہ کی گنجائش ہوتی کہ تم نے یہ کتاب خود تصنیف کرلی ہے لیکن تیری کیفیت تو یہ تھی

کہ دعوائے نبوت سے پہلے تو نہ پڑھنا جانتا تھا نہ لکھنا۔[1]

یہ تو لکھنے پڑھنے کی بات رہی۔ جہاں تک نبوت و رسالت کا تعلق ہے، قرآن کریم میں ہے۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ ۔ (۴۲/۵۲)۔ "اے رسولؐ! تو (دعوائے نبوت سے پہلے) اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ الکتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں" یہی نہیں بلکہ وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۔ (۲۸/۸۶) "تو کبھی اس کی توقع تک نہیں کر سکتا تھا کہ تجھے خدا کی طرف سے کتاب ملے گی۔ یہ تو خدا کی رحمت ہے جو اُس نے تجھے اس سے نوازا۔"

یہ کیفیت تھی اُس شخص کی، جس نے اپنی قوم کو یہ چیلنج دیا کہ آؤ تم سب مل کر اس کتاب کے کسی ایک حصہ کی مثیل و نظیر بنا کر دکھاؤ۔ اور پھر، ایسا بھی نہیں تھا کہ اس چیلنج کا دینے والا کہیں باہر سے آگیا ہو، اور اُن لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ اس کا ماضی کیا ہے؛ اس لئے انہیں شک ہو کہ یہ کہیں سے پڑھ پڑھا کر آگیا ہے اور اپنے آپ کو اَن پڑھ اور سیدھا سادھا ظاہر کر کے ایسا دعویٰ کر رہا ہے۔ حضورؐ نے جب یہ کہا کہ میں تو اس سے پہلے لکھنا پڑھنا تک نہیں جانتا تھا۔ میرے تو حیطۂ گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ میں تمہارے سامنے کوئی ایسی کتاب پیش کر سکوں گا، تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ میں تم میں کوئی اجنبی نہیں۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)

"میں نے اس سے پہلے اپنی ساری عمر خود تم میں بسر کی ہے۔ اس لئے تم میرے (ماضی) سے اچھی طرح باخبر ہو اور جانتے ہو کہ میں کیسا شخص تھا۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ جس شخص کا ماضی یہ ہو، وہ اتنا بڑا افترا کیسے کر سکتا ہے؟"

حضورؐ کے اس اعلان میں دونوں باتیں آجاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم خود جانتے ہو کہ میں ایک اَن پڑھ شخص تھا، اور میں نے کبھی خیال تک بھی نہیں کیا تھا کہ میں نبی بنا دیا جاؤں گا۔ لہٰذا یہ بات بھی تم سے پوشیدہ نہیں کہ میں اَن پڑھ ہونے کے باوجود ایسی کتاب پیش کر رہا ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ میں نے جس انداز سے اپنی ساری عمر تم میں بسر کی ہے، تمہارا کیا خیال ہے کہ اس قسم کی زندگی ایک صداقت شعار دیانت دار شخص کی ہوتی ہے یا ایسے شخص کی جو جھوٹا دعوائے نبوت کرنے کی سوچ

---

[1] یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ساری عمر ان پڑھ رہے، تو یہ عقیدہ قرآن مجید کی اس شہادت کے خلاف ہے۔ اس نے بصراحت کہا ہے کہ دعوائے نبوت سے پہلے نبی یہ عالم تھا کہ تو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ دعوائے نبوت کے بعد حضورؐ کی یہ کیفیت نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ جس ہستی کا فریضہ تعلیم کتاب حکمت ہو، جو ایک عظیم مملکت اور وسیع و عریض مملکت کا سربراہ ہو، وہ لکھنا پڑھنا بھی نہ سیکھے۔

رہا ہو؟

اور کمال یہ کہ جہاں وہ لوگ — یعنی وہ جو مخالفت میں انتہا تک پہنچے ہوئے تھے — یہ نہ کہہ سکے کہ تم لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان میں سے کسی نے حضورؐ کی سابقہ زندگی کے خلاف بھی ایک حرف تک نہ کہا۔ لہٰذا، ہمارے نزدیک، حضورؐ کے دعویٰ نبوت کی یہ دو نوں معجزانہ شہادات تھیں — ایک حضورؐ کی ایسی پاکیزہ سیرت، جس کے خلاف آپ کے مخالفین ایک حرف تک نہ کہہ سکے، اور دوسرے قرآن کریم، جس کا چیلنج وہ عمر بھر قبول نہ کر سکے۔

"دو معجزات"

جہاں تک قرآنِ کریم کے اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ لفظی طور پر بھی اس کتاب کی مثیل و نظیر لانا انسانی فکر کے لئے ممکن نہیں، اس کا ثبوت بڑا واضح اور بیّن ہے۔ (جیساکہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) اس چودہ سو سال کے عرصہ میں عربی زبان کے بڑے بڑے نامور ادیب اور ممتاز ارباب فصاحت و بلاغت گزرے ہیں جن میں مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ ان کی تصنیف کردہ ہزاروں کتابیں موجود ہیں جو انشاء اور بلاغت کے بلند ترین مقام پر سمجھی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کو سامنے رکھیئے اور پھر قرآنِ کریم کے کسی حصہ پر غور کیجئے۔ دونوں پر نمایاں فرق نظر آجائے گا۔ اور تو اور احادیث منسوب الی الرسولؐ کے مجموعوں میں بھی جہاں کہیں قرآنِ مجید کی کوئی آیت آجائے، خواہ کسی کو اس کا علم ہو یا نہ کہ وہ قرآن کی آیت ہے، وہ محض زبان کے اعتبار سے ان دونوں میں فرق محسوس کر لیگا۔ ہماری کئی عربی زبان کی تفاسیر ایسی ہیں جن میں فصاحت و بلاغت پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں بھی جہاں جہاں قرآن کی آیت آتی ہے وہ باقی عبارت میں اس طرح جگمگا رہی ہوتی ہے جیسے پتھروں کے ڈھیر میں چمکتا ہوا ہیرا۔

قرآنِ کریم کے اعجاز کا یہ عالم ہے کہ عربی زبان میں اس کی مثیل و نظیر تصنیف کرنا تو ایک طرف، دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ تک نہیں ہو سکتا۔ اس کا اعتراف اپنوں کو بھی ہے اور غیروں کو بھی۔ مثال کے طور پر، مشہور مورخ اور عربی زبان کے ممتاز نحوی اور ادیب، امام ابن قتیبہؒ (متوفی ۲۷۶ھ)، اپنی تصنیف — "کتاب القرطین" — میں عربوں کے مختلف اسالیب بیان کی خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا

> قرآنِ کریم کا نزول، ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنیوالا، قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی زبان میں (کما حقہٗ) نہیں کر سکتا، جیساکہ ترجمہ کرنے والوں نے، انجیل کا ترجمہ سریانی زبان سے حبشی یا رومی زبان میں کر لیا تھا، ایسے ہی

زبور اور تورات کے تراجم اور باقی کتب الہیہ کے تراجم عربی زبان میں کر لیے گئے تھے کیونکہ عجمی زبانوں میں، مجاز کی وہ وسعت نہیں جو عربی زبان میں ہے[1]۔ مثال کے طور پر دیکھئے اگر آپ قرآنِ کریم کی اس آیت کا ترجمہ کرنا چاہیں۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ (۸/۵۸)

تو آپ قیامت تک ایسے الفاظ مہیا نہیں کر سکتے جو ان معنوں کو ادا کر دیں جو اس آیت میں ودیعت ہیں، بجز اس کے کہ آپ اس نظم و ترتیب کو توڑ کر الگ الگ چیزوں کو ملائیں اور جو چیزیں اس میں ودیعت کی گئی تھیں، انہیں اس طرح ظاہر کر دیں، اور یوں کہیں کہ اگر تمہارے درمیان اور کسی قوم کے درمیان صلح اور معاہدہ ہو، اور تمہیں ان سے خیانت اور نقضِ عہد کا اندیشہ ہو، تو پہلے انہیں بتا دو کہ جو شرائط تم نے ان کے لیے منظور کی تھیں تم نے انہیں توڑ دیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی ان کے خلاف اعلانِ جنگ بھی کر دو تاکہ تم اور وہ دونوں نقضِ عہد کو جان لینے میں برابر برابر ہو جاؤ۔"

ایسے ہی قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا (۱۸/۱۱)

اگر آپ چاہیں کہ اس مضمون کو کسی دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کر دیں تو اس سے وہ مضمون قطعاً نہیں سمجھا جا سکے گا جو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے اور اگر آپ یہ کہیں

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ عجمی زبانوں میں عربی زبان جیسی مجاز کی وسعت نہیں۔ لیکن سوال صرف زبان کی وسعت کا نہیں۔ عربی زبان اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اس زمانے کے عربوں کے ہاں بھی موجود تھی۔ اور آج تک موجود ہے۔ اگر سوال صرف زبان کی وسعت ہی کا ہوتا تو قرآنی الفاظ کی جگہ ان کے مترادفات، بآسانی رکھ دیئے جا سکتے تھے جن کی اس زبان میں کمی نہ تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ سوال قرآنی الفاظ کی جگہ ان کے مترادفات کا نہیں، اصل سوال قرآن کے اسلوبِ بیان کا ہے جس کے متعلق مسلم اور غیر مسلم ماہرینِ لسانیات یہ متعین ہی نہیں کر سکے کہ اس اسلوب کا نام کیا رکھا جاتے۔ یہ ہے وہ وجہ کہ کسی اور زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ تو ایک طرف، اس کے الفاظ کی جگہ خود عربی زبان کے مترادفات بھی رکھ دیئے جائیں تو وہ ان کا بدل نہیں ہو سکتے۔

کہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے انہیں چند سال تک سُلائے رکھا" تو اب بھی آپ نے مضمون کا ترجمہ تو کر دیا، مگر الفاظ کا ترجمہ نہیں کر سکے۔

ایسے ہی قرآنِ کریم کی تیسری آیت ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا۔ (۲۵/۷۳)

اگر آپ اس آیت کا ترجمہ اس کے الفاظ کے مطابق کریں گے تو وہ ایک مغلق بات بن جائے گی۔ اور اگر آپ یوں کہیں گے کہ "وہ لوگ اس سے تغافل نہیں برتتے" تو اس سے آپ نے مضمون کو دوسرے الفاظ میں ادا کر دیا ہے، ترجمہ نہیں کیا۔

(قرطین۔ جلد دوم، صفحہ ۱۶۳)

یہ تو تھی ایک مسلم صاحب طرز ادیب کی رائے۔ غیروں میں سے بھی جس نے قرآنِ کریم کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ ہمارے زمانے میں مشہور مستشرق (H. A. R. GIBB) کا شمار عربی زبان کے ممتاز ترین علماء میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (MODERN TRENDS IN ISLAM 1945 EDITION) میں لکھتا ہے:۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔۔ جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے ...... قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس کے عربی زبان کے، تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے، مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں، جن میں عام واقعات یا قوانین و احکام مذکور ہوں، ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو، لیکن با ایں ہمہ جو مدّ و جزر، جو نشیب و فراز، جو بلندیاں اور گہرائیاں، جو لطافتیں اور باریکیاں، اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے، وہ ترجمہ میں کیا آسکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجیے:۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ۔ (۵۰/۴۳)

اور انگریزی ہی نہیں، دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کرکے دکھائیے۔ اس کے چھ الفاظ
میں جو پانچ مرتبہ "ہم" (WE) کی تکرار ہے، اسے کونسی زبان ادا کرسکے گی؟

(صفحہ ۴ ترجمہ رواں)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، بجز اس کے جو اقبالؔ نے کہا گیا ہے کہ سے

فاش گویم آنچہ در دِل مضمر است
ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

(۰)

اس کے بعد پھر آیتِ زیرِ نظر (۲/۲۴) کی طرف آجائیے جس میں کہا گیا ہے۔ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ. (۲/۲۴) "ان سے کہا گیا کہ جب تم اس چیلنج کے قبول کرنے سے عاجز آجاؤ گے تو کیا پھر بھی اس حقیقت کو تسلیم نہیں کروگے کہ یہ کتاب کسی انسان کی فکری تخلیق نہیں خدا کی وحی ہے۔ لیکن اگر تم اِس حقیقت کو تسلیم نہیں کروگے تو اس سے کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم تباہی کے النار میں جا گروگے۔

النّار کے معنی

اس النّار میں جس کا ایندھن النّاس اور الحجارۃ ہیں اور جو ان صداقتوں سے انکار کرنے کا فطری نتیجہ ہے۔" اس میں پہلا وضاحت طلب لفظ النّار ہے۔ اس کے عام معنی آگ ہیں۔ لیکن جس طرح ہمارے ہاں، غصّہ کی آگ، انتقام کی آگ، دشمنی کی آگ، آتشِ حسد اور آتشِ بغض کے الفاظ عام طور پر استعمال ہوتے ہیں عربوں کے ہاں نار کا لفظ بھی ان معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ نیز عرب "نارالحرب" اُس آگ کو کہتے تھے جسے وہ اعلانِ جنگ کے لئے پہاڑیوں کی چوٹی پر جلاتے تھے۔ اور "نارالقوم" کے معنی ہیں اُس قوم نے شکست کھائی۔ اس سے اس لفظ النّار کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ خود قرآنِ کریم نے اسے تباہی اور بربادی اور شکست و ہزیمت کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں جماعتِ مومنین سے کہا کہ تم خدا کی اُس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی اور اس طرح تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا (۳/۱۰۲) "تم تباہی اور بربادی کے جہنّم (النّار) کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ خدا نے تمہیں اس میں گرتے گرتے بچا لیا"۔ ظاہر ہے کہ یہاں النّار سے مراد وہ تباہی ہے جو افرادِ قوم کی باہمی عداوت اور خانہ جنگی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ خود قرآن نے اسے "نارالحرب" (۵/۶۴) کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ النّور میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ خدا جماعتِ مومنین کو استخلاف فی الارض عطا کرے گا (۲۴/۵۵-۵۶) لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مُعۡجِزِيۡنَ

فِی الْاَرْضِ ۔ وَمَاْوٰىھُمُ النَّارُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۔ (۲۴/۵) "یہ لوگ جو اس نظام کی مخالفت میں اس قدر جدّوجہد کر رہے ہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ اس جماعت کو شکست دے دینگے۔ انہیں شکست نہیں ملے گی۔ اس کے برعکس' یہ مخالفین خود نذرِ آتش ہو جائینگے۔ اور سوچئے کہ یہ کیسا بُرا انجام ہوگا" ظاہر ہے کہ یہاں النّار سے مراد شکست اور ذلّت کی زندگی ہے۔

قرآنِ کریم میں عام طور پر النّار سے مراد جہنم ہے، اور ہمارے ہاں عام عقیدہ یہی ہے کہ جہنم ایک ایسا مقام ہے جس میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں اور اس میں کفار کو جھونکا جائے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہنم' اُخروی زندگی میں معصیت اور سرکشی کا مآل ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن جنت اور جہنم ان قلبی کیفیات کا نام ہے جن کا سلسلہ اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر متعلقہ مقامات پر سامنے آتی جائے گی) یہاں ہم مختصر الفاظ میں اتنا بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ جہنم کے معنی کیا ہیں اور اس کا قرآنی مفہوم کیا؛

جہنم کے معنی زمانہ قدیم میں یروشلم کے جنوب میں ایک وادی تھی جس میں مولوک دیوتا کا مندر تھا۔ وہاں انسانوں کو زندہ جلا کر اس دیوتا کے حضور قربانی پیش کی جاتی تھی۔ عبرانی زبان میں وادی کو جی کہتے ہیں اور جس شخص کی طرف وہ وادی منسوب تھی اس کا نام ہنّوم تھا۔ اس بنا پر اس وادی کو، جس میں انسانوں کو جلا کر قربان کیا جاتا تھا، "جی ۔ ہنوم" (یا جہنم) کہا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے جہنم سے مراد "انسانیت کی قربان گاہ" ہوگا' اور عذابِ جہنم کا مفہوم ہوگا، انسانیت سوز عذاب، خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ قرآنِ کریم اپنے بسیط حقائق کو محسوس تشبیہات و تمثیلات کے ذریعہ سمجھاتا ہے۔ اس نے جہنم کی اس کیفیت کو بھی مختلف محسوس تشبیہات کی رُو سے سمجھایا ہے۔ انہی کو' قرآن میں بیان کردہ جہنم کی تفصیلات کہا جائے گا۔ لیکن انہیں' بہرحال' تشبیہات ہی سمجھنا چاہیئے۔

اُخروی زندگی کی ماہیت اور نوعیت کا سمجھ لینا ہمارے شعور کی موجودہ سطح کے لئے ممکن ہی نہیں۔ اتنی بات بہرحال' واضح ہے کہ جہنم کسی گڑھے کا نام نہیں جس میں آگ جلائی گئی ہو۔ یہ قلبِ سوزاں کی کیفیت کا نام ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ ۔ (۱۰۴/۶-۷) "خدا کے قانونِ مکافات کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دِلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں"۔ اسی طرح سورۃ توبہ میں بیان کردہ مسجدِ ضرار کے واقعہ کو سامنے لائیے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ منافقین نے اس مسجد کی بنیاد تباہی کے کنارے پر رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَانْھَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ ۔ (۹/۱۰۹) "وہ عمارت اپنے بانی کو ساتھ لے کر جہنم میں جا گری"۔ یہ جہنم کیا تھا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِھِمْ ۔ (۹/۱۱۰) "ان کے دل، اضطرابِ پیہم کی آماجگاہ بن گئے" اور اس اضطرابی کیفیت نے

ان کے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا" یہ ہے جہنّم۔

آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ "تم اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن 'الناس اور الحجارۃ ہیں'۔ ایندھن کے لئے لفظ وقود آیا ہے۔ وَقَدٌ آگ کو کہتے ہیں اور وَقُوْدٌ ان لکڑیوں کو جن سے آگ جلائی جائے۔ حَطَبٌ ایندھن کے لئے رکھی ہوئی لکڑیوں کو کہتے ہیں' اور وَقُوْدٌ اس وقت کہتے ہیں جب اِن لکڑیوں کو سلگا دیا جائے۔ لہٰذا' وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کے معنی ہوں گے وہ آگ جس کے شعلے الناس اور الحجارۃ کے اپنے پیدا کردہ ہوں گے۔ بانگِ درا میں 'سیرِ فلک کے عنوان سے' علامہ اقبالؒ کی ایک نظم ہے جو جہنم کی حقیقت کو بڑے معنی خیز اور بصیرت افروز انداز سے سامنے لاتی ہے۔ اُس میں انہوں نے کہا ہے کہ جب وہ جنت کے "خاتمِ آرزوئے دیدہ و گوش" نظارہ سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے دور ایک یخ بستہ سرد خانہ دیکھا۔ اپنے گائیڈ سے پوچھا کہ یہ خطۂ زمہریر کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جہنم ہے۔ اس پر انہوں نے بصد استعجاب کہا کہ ہم نے تو سن رکھا ہے کہ جہنم میں بھڑکتے ہوئے شعلے ہوں گے اور آپ اس یخ بستہ خطّہ کو جہنم بتا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ جہنم ہی ہے لیکن اس کے شعلے اپنے نہیں ہوتے۔

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں — اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں!

یہ ہے وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کا مفہوم۔

چند ایک دیگر مقامات پر بھی ایسا ہی کہا گیا ہے۔ مثلاً آیت (۶۶/۶) میں یہی الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ آلِ عمران میں کفار کے متعلق کہا گیا ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ۔ (۳/۱۰) "یہ لوگ خود ہی جہنم کا ایندھن ہیں" سورۃ انبیاء میں باطل پرستوں سے کہا گیا کہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (۲۱/۹۸) "تم خود اور تمہارے یہ باطل پرست مقتدا جن کی تم عبودیت اختیار کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں" سورۃ الجنّ میں صحیح راستہ سے ہٹ جانے والوں کے متعلق کہا۔ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا۔ (۷۲/۱۵) "یہ جہنم کا ایندھن ہیں"

النّاس والحجارۃ

آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اس جہنم کا ایندھن الناس اور الحجارۃ ہوں گے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے انسان اور پتھر۔ اور پتھروں سے مراد لی جاتی ہے وہ بت جن کی لوگ پرستش کرتے ہیں۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ کیونکہ آیت کے اگلے لفظ ہیں اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (۲/۲۴) "یعنی وہ آگ جسے کفار کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ پتھر، خواہ ناتراشیدہ ہو، یا اُسے تراش کر کوئی مورتی بنا دی جائے نہ مومن ہوتا ہے نہ کافر۔ مومن اور کافر تو انسان ہی ہوتے ہیں، پتھر نہیں ہوتے۔ اس لئے جو آگ کفار کے لئے تیار کی گئی ہو اس میں پتھروں کے جھونک دینے کا کیا مطلب؟

النّاس کے عام معنی نوعِ انسانی ہیں۔ لیکن جب یہ لفظ تقابلی طور پر آئے گا تو اس کے معنے عوام الناس ہوں گے یعنی عام لوگ۔ مثلاً قرآنِ کریم مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہتا ہے کہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتَابَ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲/۴۴)۔ "تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم، لوگوں کو تو یہ وعظ و نصیحت کرتے ہو کہ وہ نیک کام کریں، اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو۔ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ الکتاب کے احکام، عوام اور مذہبی پیشواؤں، دونوں کے لئے یکساں طور پر واجب الاتباع ہوتے ہیں"۔ دوسری جگہ ان مذہبی پیشواؤں کے متعلق ہے لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (۹/۳۴)" یہ، الناس، یعنی اپنے پیچھے چلنے والے عوام کا مال باطل طریق سے کھا جاتے ہیں"۔ ان مقامات میں، ظاہر ہے کہ النّاس سے مراد مذہبی پیشواؤں کا اتباع کرنے والے عوام ہیں۔ سورۃ نساء میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (۴/۳۷)۔ "یہ وہ لوگ ہیں خود بھی بخل کا شیوہ اختیار کرتے ہیں اور الناس کو بھی یہی حکم دیتے ہیں کہ وہ بھی ایسا ہی کریں"۔ (نیز ۵۷/۲۴)۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں النّاس سے مراد عوام ہیں اور حکم دینے والے اربابِ اقتدار یا قوم کے لیڈر۔

ان (اور ان جیسے دیگر مقامات) سے واضح ہے کہ النّاس سے مراد عوام ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو مذہبی پیشواؤں، قومی لیڈروں یا حکمرانوں کے پیچھے چلتے ہیں۔

اب آیئے لفظ حِجَارَۃ کی طرف۔ اس کا مادہ (ح-ج-ر) ہے جس کی بنیادی معنی ہیں روکنا۔ منع کرنا۔ اور اس سے مراد ہوتی ہے عقل۔ جو انسان کو یہ بتاتی ہے کہ تمہیں کس مقام پر رُک جانا چاہیئے[1] (خود لفظِ "عقل" کے معنی بھی روکنے اور منع کرنے کے ہیں)۔ اس اعتبار سے حِجْرٌ ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو بہت ہوشیار اور چالاک ہو۔ قرآنِ کریم نے ایسے لوگوں کو "ذِی حِجْرٍ" (۸۹/۵) کہا ہے۔ یعنی اربابِ دانش و بینش۔ لیکن وہی اربابِ دانش و بینش جو بڑے چالاک اور ہوشیار ہوں۔ یہی لوگ ہیں جو مذہبی پیشوا، قومی لیڈر یا اربابِ اقتدار بن کر خدا کی طرف جانے والے راستوں میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بنا بریں "وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" کے معنے ہوں گے عوام اور ان کے لیڈر۔ قرآنِ کریم میں، جہنم میں عوام اور ان کے لیڈروں کے باہمی جھگڑوں کو تشبیہی انداز میں بڑے عبرت آموز پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ سبا کی آیات (۳۴/۳۱-۳۳) میں کہا گیا ہے۔[2]

---

[1] پتھر کو حجر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔
[2] آیات کسی نسخۂ قرآنِ مجید میں دیکھ لیجئے۔

اگر تو اس منظر کو سامنے لاتے جب یہ لوگ، جنہوں نے ظلم کی راہ اختیار کی تھی، خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور اپنی غلط روی کا ایک دوسرے پر الزام دھر رہے ہوں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم یقیناً قوانینِ خداوندی پر ایمان لے آتے۔

لیڈر کہیں گے، ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو۔ جب سیدھا راستہ تمہارے سامنے آگیا تھا تو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ اس راستہ کو اختیار نہ کرنا۔ تم خود ہی جرائم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے۔ اب مفت میں الزام ہم پر دھرتے ہو۔

ان کے متبعین کہیں گے کہ تم دن رات اس قسم کی چالیں چلتے اور سازشوں کا جال پھیلاتے تھے، جس سے ہم سیدھے راستہ کی طرف آ ہی نہ سکیں۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ تم نے ہمیں نہیں بہکایا تھا۔

لیکن ان کا یہ عذر قابلِ پذیرائی نہیں سمجھا جائے گا اور ان سب داخلِ جہنم کر دیا جائے گا۔

سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے کہ جہنم میں جانے والے ایک دوسرے کو مطعون کریں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تم یورشیں کر کے ہماری طرف آیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں غلط راستے پر ڈال دیتے تھے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہمارا تم پر کب اختیار و اقتدار تھا۔ تم خود ہی صحیح راستہ پر چلنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم غلط راستہ پر چل رہے تھے۔ لیکن ہم نے تو تمہیں اس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا تھا۔ تم خود ہی پیچھے چل پڑے تھے۔ اب ہم سب اس عذاب میں برابر کے شریک ہیں (۳۷/۲۲-۳۳)۔[1]

سورۃ مومن میں ہے:

جہنم میں متبعین اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے اور تم ہمیں بڑے سبز باغ دکھایا کرتے تھے۔ اب ذرا اس عذاب سے ہمیں چھڑا دو۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہم خود اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ اب تو ہم سب کو یہ عذاب بھگتنا پڑے گا۔ (۴۰/۴۷-۴۸ نیز ۲/۱۶۶-۱۶۷ و ۲۶/۹۵-۱۰۲)[1]

ان تصریحات سے بتانا یہ مقصود ہے کہ آیت (۲/۲۴) میں کہا یہ گیا ہے کہ اگر ان واضح دلائل کے باوجود تم ان صداقتوں کا انکار کئے چلے جاؤ گے تو تم تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرو گے — تم بھی اور تمہارے پیچھے چلنے والے عوام

[1] آیات کسی نسخۂ قرآن مجید میں دیکھ لیجئے۔

بھی ـــــ وہ تباہی جو غلط راستے پر چلنے کا فطری انجام ہوتی ہے۔

اس کے برعکس وہ جماعت ہے جو ان صداقتوں کو تسلیم کر کے خدا کے بتائے ہوتے پروگرام پر عمل پیرا رہتی ہے۔ ان کی زندگی کس قسم کی خوشگواریوں کی آماجگاہ ہوتی ہے اسے اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

(۲/۲۵) وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۔ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۔ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۔ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔

۲/۲۵

قرآن کریم نے حضرات انبیاءؑ کرام کو نذیر اور بشیر کہکر پکارا ہے یعنی لوگوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے والے اور ان کے حسن عمل کے خوشگوار اثرات کی خوشخبریاں دینے والے۔ فریضۂ تنذیر کو آیت (۲/۲۴) میں ادا کرنے کے بعد، اب قرآن کریم تبشیر کی طرف آیا ہے۔ آیۂ زیر نظر کا عام ترجمہ حسب ذیل ہے:

> اے رسولؐ! تو خوشخبری دے ان لوگوں کو، جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے، کہ ان کے واسطے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ انہیں وہاں جب کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے مل چکا ہے۔ انہیں یہ پھل ملتی جلتی ہوئی شکل میں دیتے جائیں گے اور ان کے لئے وہاں پاکیزہ ازواج ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ایمان کا تفصیلی بیان آیت (۲/۳) میں گزر چکا ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک عمل صالحہ کا تعلق ہے اس کا عمومی تصور لفظ فساد کے ضمن میں، آیت (۲/۱۱) میں دیا جا چکا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ فساد اور اعمالِ صالحہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس تقابل سے اعمالِ صالحہ کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ مادہ اس کا (ص-ل-ح) ہے۔

اعمالِ صالحہ

اَصْلَحَ اِلَيْهِ کے معنی ہوتے ہیں اَحْسَنَ اِلَيْهِ، یعنی اس نے ایسا کام کیا جس سے دوسرے آدمی کی خرابی، نقص یا کمی دور ہو گئی۔ لہٰذا اعمالِ صالحہ سے مراد ہیں حسن کارانہ توازن پیدا کرنے والے کام۔ اَلصَّلَاح کے معنی ہوتے ہیں حالات کا عقل و شرع کے تقاضوں کے مطابق معتدل و مستقیم ہو جانا۔ یعنی جس چیز کو جس حالت میں ہونا چاہیئے اس کا ٹھیک ٹھیک اسی حالت میں ہونا۔ بالکل مناسب، درست باترتیب، ٹھیک حالت میں رہنا۔ اس مفہوم کی وسعت کے اعتبار سے اعمالِ صالحہ

کے معنی ہوں گے ایسے کام، جن سے انسان کی مضمر صلاحیتیں بیدار ہو جائیں اور اس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتے۔ نیز جن سے معاشرہ کا حسن و توازن قائم رہے اور ناہمواریاں دُور ہو جائیں۔ جو کام اس دنیا اور آخرت، دونوں کی زندگی کی خوشگواریوں کو اپنے ساتھ لائیں۔ یہ بہرحال وہی کام ہوں گے جو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوں۔ قرآن کریم میں آپ شروع سے آخر تک دیکھیں گے کہ "اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت" لازم و ملزوم طور پر ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھنا اور اس کے ساتھ ہی قرآن میں بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق صلاحیت بخش کام کرنا۔ اس سے واضح ہے کہ وہ اعمال، جن کا سرچشمہ دل کا یقین (ایمان) نہ ہو محض رسم یا عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں جو میکانیکی طور پر سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے صحیح نتائج مرتب نہیں ہو سکتے اس لئے کہ صحیح اعمال کا اولین نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ انسان کے اندر تبدیلی پیدا ہو۔ اس کی ذات نشو و نما پائے۔ جس سے اس کی سیرت میں پاکیزگی اور کردار میں بلندی پیدا ہو۔ جو کام میکانیکی طور پر کئے جائیں ان سے یہ نتیجہ کبھی مرتب نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف، وہ ایمان جو اعمالِ صالحہ کا محرک نہیں بنتا، دل کا یقین نہیں بلکہ محض زبان کے رسمی اقرار کا نام ہے جو اسی طرح بے نتیجہ ہوتا ہے جس طرح اعمال بلا ایمان بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ نیز اعمال بھی وہی اعمالِ صالحہ ہیں جنہیں قرآن کریم نے صالح قرار دیا ہے، نہ کہ وہ جنہیں ہم اپنی دانست و معیار کے مطابق اعمالِ صالحہ سمجھ لیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے بہت سے کاموں کو اعمالِ صالحہ کے طور پر بیان کیا ہے لیکن ان اعمال کی کوئی جامع اور مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ اگر ہم ایمان کے متعلق یہ کہیں کہ یہ ان بلند اقدار کی صداقت پر یقینِ محکم کا نام ہے جنہیں قرآن کریم نے انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے متعین کیا ہے، اور اعمالِ صالحہ، ان اقدار کے تحفظ (یعنی ان کے مطابق کام کرنے) کو کہتے ہیں، تو یہ چیز حقیقت کے مطابق ہوگی۔ اسی کو بالفاظِ دیگر کیریکٹر کہا جاتے گا۔ لہٰذا کیریکٹر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین نہ ہو۔ اس کی پہچان ان کاموں کے ذریعہ ہوتی ہے جو اس شخص سے سرزد ہوں، اور اس کا محسوس نتیجہ یہ ہو کہ نوعِ انسان کے معاملات سنورتے جائیں اور معاشرہ میں حُسن پیدا ہو جائے۔ قرآن کریم نے ان کا نتیجہ الجنّۃ بتایا ہے۔ بلکہ یہاں جنّت کی بجائے جنّت کا لفظ آیا ہے۔ الجنّۃ قرآن کریم کی بڑی بنیادی اور جامع اصطلاح ہے جس کا پورا پورا مفہوم کسی ایک مقام پر سامنے نہیں آسکتا کیونکہ اس کی تفاصیل یہاں سے وہاں تک قرآن کریم کے صفحات پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح بکھری پڑی ہیں۔

جنّت کا مفہوم

لغوی طور پر اس مادہ (ج۔ن۔ن) کے معنے ہیں چھپا لینا۔ اس مادہ سے بہت سے الفاظ آتے ہیں اور ان میں سے کئی ایک کا ذکر قرآن کریم میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ لیکن یہاں ہم ان میں سے صرف ایک لفظ (جنّت) ہی کو لیں گے۔ جنت کے معنی باغ کے ہیں۔ بالخصوص اس باغ کے جس کی

زمین درختوں کی کثرت اور روئیدگی کی بہتات کی وجہ سے چھپی ہوئی ہو، نظر نہ آئے۔ قرآن کریم میں ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ اس دنیا کی جنت بھی بتایا گیا ہے اور اُخروی زندگی کی جنت بھی۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اُخروی زندگی اور اس کی کیفیات کی کُنہ اور حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔ اسی لئے قرآن کریم نے انہیں تمثیلات اور تشبیہات کے پیکروں میں پیش کیا ہے۔ سورۃ الرعد میں ہے۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ (۱۳/۳۵) "جس جنّت کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے ...." اس کے بعد اس کی تفاصیل دی گئی ہیں۔ اسی طرح سورۃ محمدؐ کی آیت (۴۷/۱۵) میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ جنتِ اُخروی کا بیان تمثیلی اور تشبیہی ہے۔ اس لئے ان الفاظ کے وہ معنے نہیں لینے چاہئیں جن معانی میں ہم انہیں اپنی محسوس دنیا میں استعمال کرتے ہیں۔ اس نے یہ بتانے کے لئے کہ جنت کسی مقام کا نام نہیں، کہا ہے۔ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (۵۷/۲۱ نیز ۳/۱۳۲)۔ "وہ جنت، جس کی وسعتیں ارض و سمٰوٰت، یعنی تمام کائنات کو محیط ہیں"۔ اس کے چشموں کے متعلق کہا۔ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (۷۶/۶)۔ "خدا کے بندے ان چشموں سے سیراب ہوں گے جنہیں وہ خود اپنے قلب کی گہرائیوں سے بہا کر لائیں گے"۔ قرآنی تمثیلات کے متعلق اس نے کہا۔ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ (۲۹/۴۳)۔ "ان مثالوں کی رو سے وہ لوگ حقیقت تک پہنچ سکیں گے جو علم کے ذریعہ ان کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں گے"۔ جو لوگ یہ خیال کریں کہ ان سے، اسی دنیا کی محسوس اشیاء جیسی چیزیں مراد ہیں، تو انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳۲/۱۷)۔ "کوئی شخص یہ جان نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کے نتیجہ میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان، اُن سے مخفی رکھا ہے وہ کیا ہے اور کیسا ہے؟" باقی رہا ان کا تشبیہی اور تمثیلی بیان، تو یہ ظاہر ہے کہ یہ مثالیں ایسی ہونی چاہئے تھیں جنہیں قرآن کی اولیں مخاطب قوم بآسانی سمجھ سکتی۔ عرب جیسے ملک میں، چاروں طرف تپتے ہوئے صحرا پھیلے ہوئے تھے جن میں کہیں کہیں پانی کا کوئی ایک آدھ چشمہ مل جاتا تھا اور اس چشمے کے گرد دو چار درخت اُگ آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے لئے اس سے زیادہ آرام دِہ، پُر آسائش، سکون بخش منظر اور کون سا ہو سکتا تھا کہ گھنے باغات ہوں جن میں صاف شفاف چشمے ہوں۔ ان چشموں کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی چاروں طرف بہہ رہا ہو۔ اس باغ میں تپش کا کہیں گزر نہ ہو۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے ہوں۔ دودھ اور شہد کی ایسی افراط ہو گویا ان کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ کھانے کے لئے پرندوں کا لطیف گوشت میسر ہو۔ ان باغات میں نہایت آرام دِہ خیمے نصب ہوں —— ان کے نزدیک اس سے زیادہ آسائش بخش سامانِ زیست اور کونسا ہو سکتا تھا؟ اس سے

آگے بڑھتے تو ان میں سے جو لوگ ایران اور بازنطینی حکومتوں کے زیرِ سایہ شہروں میں آتے جاتے تھے وہ وہاں کی تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ، حسین سامانِ آرائش و زیبائش کو دیکھتے تھے وہ ان کے لئے یقیناً جنت نگاہ اور فردوسِ گوش بنا ہوگا۔ قرآن کریم نے جنتی زندگی کے سلسلہ میں اس سامان کا بھی ذکر کیا اور نہایت دلآویز انداز میں کیا۔ اعلیٰ درجے کے قالین اور صوفے بچھے ہوئے، عالیشان محلات، جن میں حریر و اطلس کے پردے آویزاں، بلوریں آفتابے، چاندی سونے کے ظروف، نہایت خوش ذائقہ مشروبات، ایسا دلکش ماحول اور اس میں ہم مزاج، ہم رنگ، یک آہنگ احباب کی محفلیں ــــ ان عربوں کو جنتی زندگی اسی قسم کی مثالوں سے سمجھائی جا سکتی تھی۔ اگر قرآن کی اولین مخاطب قوم کے تصوراتِ زندگی کچھ اور ہوتے تو انہیں انہی کے مطابق تمثیلات و تشبیہات کے ذریعہ جنت کی مجرد حقیقتوں کو سمجھایا جاتا۔

ان باغات میں جو پانی کی ندیاں رواں دواں بتائی گئی ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے حسن عمل کے نتائج، زمان و مکان کی حدود کے پابند نہیں۔ ان سے پیدا ہونے والے باغات ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں گے یعنی جب تک انسانوں سے یہ اعمال سرزد ہوتے رہیں گے ان سے یہ نتائج مرتب ہوتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ سورۃ الرعد میں کہا گیا مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ۔ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (۱۳/۳۵)۔ "متقیوں سے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک باغ ہے جس کے نیچے پانی کی ندیاں رواں دواں ہیں۔ اس کے درختوں کے پتے خزاں ناآشنا ہیں۔ اس لئے ان کے سائے میں بھی کبھی فرق نہیں آتا اور ان درختوں کے پھل بھی ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ یہ نہیں کہ کسی خاص موسم میں پھل لگیں اور دوسرے موسم میں وہ پھلوں کے بغیر رہ جائیں۔ یہ ہے ان لوگوں کی زندگی کی مثال جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔" سورۃ ابراہیم میں اس حقیقت کو اور بھی زیادہ دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے باغات اور ان کے نیچے بہنے والی ندیوں کا ذکر کیا گیا۔ پھر کہا اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۔ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۱۴/۲۴-۲۵)۔ "تم غور کرو کہ اللہ کس طرح مثالوں کے ذریعہ بات سمجھاتا ہے؟ زندگی بخش اور ثمر بار نظریۂ زندگی کی مثال ایک ایسے درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال تک پہنچی ہوئی ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہر موسم میں پھل دیتا چلا جائے۔ ہم ایسی مثالیں اس لئے بیان کرتے ہیں کہ لوگ ان کے اندر چھپی حقیقتوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے لا سکیں۔" اقبالؒ

کے الفاظ میں :-

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند، بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

لیکن قرآنِ کریم نے ایک ہی جنت کا ذکر نہیں کیا۔ کہا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (۵۵/۴۶)۔ "جن لوگوں کو عدالتِ خداوندی میں حاضر ہونے کا احساس ہے ــــ یعنی وہ جانتے ہیں کہ اُن سے ان کے ہر کام کی بازپرس ہوگی تو ان کے لئے دو جنتیں ہوں گی"۔ یعنی ایک جنت اس دنیا میں اور دوسری جنت آخرت میں۔ پھر ان جنتوں کے متعلق کہا ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (۵۵/۴۸)۔ ان جنتوں میں زندگی (MONOTONOUS) نہیں ہوگی بلکہ ان میں بڑی (VARIETIES) ہوں گی"۔

اُخروی جنت کی طرح قرآنِ کریم نے جنتِ ارضی کے کوائف کو بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے اس کی ابتدا جنتِ آدم سے کی ہے، اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، آدم کی داستان کسی فرد کی داستان نہیں، بلکہ یہ خود آدمی کی کہانی ہے۔ نوعِ انسان کی سرگزشت، جسے بڑے دلنشیں محاکاتی انداز میں تمثیلاً بیان کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق بہرحال اسی دنیا سے ہے کیونکہ کہا یہ گیا ہے وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (۲/۳۰)۔ "جب خدا نے ملائکہ سے کہا ہم اب زمین میں سابقہ مخلوق کے جانشین کے طور پر ایک نئی مخلوق پیدا کرنے والے ہیں جو صاحبِ اختیار و ارادہ ہو"۔

جنتِ ارضی

یہ ظاہر ہے کہ اس سے انسان کی اسی زندگی کا بیان مقصود ہے۔ اس کے بعد ہے کہ آدم کو الجنّۃ میں رہنے کے لئے کہا اور اس اَلْجَنَّةَ کی پہلی خصوصیت یہ تھی وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)۔ "اس میں وسائلِ رزق پر حد بندیاں نہیں کی گئی تھیں۔ اس میں "میری اور تیری" کا سوال نہیں تھا۔ اس میں کیفیت یہ تھی کہ جس کا جہاں سے جی چاہے، پیٹ بھر کر کھالے"۔ دوسری جگہ ہے کہ آدم سے کہا گیا ــ کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)۔ "اس میں تجھے نہ تو روٹی کی محتاجی کا خوف لاحق ہوگا، نہ کپڑے سے محرومی کا خدشہ۔ اس میں تجھے نہ پانی کی نایابی کا خطرہ ہوگا اور نہ ہی سکونت کے متعلق کسی قسم کا اندیشہ"۔ اس میں لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ (۱۵/۴۸)۔ "سامانِ رزق کے حصول کے لئے نہ تو جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی، نہ کسی قسم کا اضمحلال اور افسردگی ہوگی، اور سب سے بڑی چیز یہ کہ وہاں اس بات کی پوری پوری ضمانت ہوگی کہ وہاں سے انہیں کوئی نکالے گا نہیں" (نیز ۳۵/۳۵)۔ وہاں صرف سامانِ زیست ہی نہیں

ملے گا۔ وہاں معاشرتی زندگی ایسی پاکیزہ ہوگی کہ لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا۔ اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۲۶-۲۵/۵۶) ۔اس میں کوئی لغو اور بیہودہ بات سننے میں نہیں آئے گی نہ ہی کوئی ایسی بات ہوگی جس سے واماندگی پیدا ہو جائے۔ اس کے برعکس، وہاں چاروں طرف سے امن و سلامتی کی صدائیں اور دعائیں فردوس گوش بنیں گی" (نیز ۱۳/۲۴ و ۱۴/۲۳) ۔اس لئے کہ اُس معاشرہ کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے خلاف کسی قسم کا بغض، کینہ یا حسد نہیں ہوگا۔ یعنی کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جسے دوسروں سے چھپا کر رکھیں (۷/۴۳ و ۱۵/۴۷) سب سے بڑی بات یہ کہ وہاں کوئی کسی کو ذلیل اور رخوار نہیں کر سکے گا۔ وہاں شرفِ آدمیت اور احترامِ انسانیت کا پورا پورا تحفظ ہوگا غرضیکہ وہاں کیفیت یہ ہوگی کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۶/۴۸) " نہ کسی قسم کا خارجی خوف ہوگا نہ داخلی حزن و ملال"۔

یہ وہ جنتِ ارضی تھی جو اس دنیا میں ان قوموں کو حاصل ہوئی جنہوں نے ایمان و اعمالِ صالحہ کی زندگی بسر کی۔ اور جو آج سے چودہ سو سال پہلے محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے عہدِ ہمایوں میں دنیا کے سامنے آئی۔ قرآن کریم نے قوم فرعون اور بنی اسرائیل کی کشمکش کے سلسلہ میں کہا ہے۔ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ۔ كَذٰلِكَ۔ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۲۶/۵۷-۵۹) "ہم نے اپنے قانونِ مکافات کے مطابق قومِ فرعون کو اس سرزمین سے نکال باہر کیا جس میں ان کے باغات اور چشمے تھے۔ جن میں ان کے خزانے اور انتہائی تکریم و عزت کے مقامات تھے اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دیا" (نیز ۴۴/۲۸-۲۵) اس نے جماعتِ مومنین سے کہا کہ اگر تم نے ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کی تو۔ یُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ۔ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۶۱/۱۲) " ہم تمہیں بھرپور آسائشوں کے سرسبز و شاداب باغات میں نہایت پاکیزہ مساکن عطا کریں گے"، اور جب آخر الامر انہیں یہ جنتِ ارضی عطا ہوگئی تو وہ بیساختہ پکار اُٹھے۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ۔ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ۔ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (۳۹/۷۴) " کس قدر مستحقِ ستائش ہے خدا کی ذات جس نے اپنے وعدوں کو اس طرح پورا کر دکھایا اور ہمیں اسی دنیا میں اس جنت کا مالک بنا دیا جہاں ہمیں اس امر کا پورا پورا اقتدار اور اختیار حاصل ہے کہ ہم اپنی مرضی کے مطابق جس طرح جی چاہیں رہیں سہیں۔ کس قدر عمدہ اور خوشگوار ہے کام کرنے والوں کی محنت کا یہ صلہ!"۔ قرآن کریم نے صلح حدیبیہ کا، جو فتح مکہ کی تمہید تھی، مقصد یہ بتایا ہے لِیُدْخِلَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَیُكَفِّرَ عَنْهُمْ

سَیِّاٰتِهِمْ - وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا (۴۸/۵) "تاکہ اس سے ہم مومنین اور مومنات کو اس جنت میں بسا سکیں جس کی بہاریں خزاں ناآشنا ہوں۔ اور اس طرح ان کے معاشرے کی ناہمواریوں کو دور کر دیں۔ معیارِ خداوندی کی رو سے

مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے

بہت بڑی کامیابی ہے جسے حاصل ہو جائے"۔ یہاں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ جنت صرف مردوں ہی کے لئے نہیں، بلکہ مردوں اور عورتوں، مومنین اور مومنات ــــ دونوں کے لئے ہو گی۔ چنانچہ دوسری جگہ کہا ہے وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ - وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (۴/۱۲۴) "جو کوئی بھی عملِ صالحہ کرے گا، خواہ وہ مرد ہو اور خواہ عورت، اور وہ مومن بھی ہو، تو انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ اور ان کے حسنِ عمل کے صلہ میں ذرا برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی"۔

اور دوسری بات یہ سامنے آئی کہ جنتِ ارضی کے متعلق خدا کے یہ وعدے فتح مکہ کے قریب جا کر پورے ہوئے۔ یعنی قریب بیس[*] برسوں پر پھیلی ہوئی زندگی کے ان جانکاہ تصادمات اور صعوبات کے بعد، جن کا نقشہ قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

جانکاہ تصامات کے بعد

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ - مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ - اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲/۲۱۴)

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی، مفت میں، جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔ تمہیں بھی ان جانگداز مراحل سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے اس قسم کے انقلاب آفرینی کے لئے جدوجہد کی۔ کیفیت یہ تھی کہ سختیاں اور مصائب انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اُٹھتے کہ بارِ الٰہا! ہماری کوششوں کی بارآوری کا وقت کب آئے گا؟ ایسے ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل کے بعد کہیں جا کر ان کی کوششیں کامیاب ہوتی رہیں اور تائیدِ ایزدی ان کی سعی و عمل کو ثمربار کرتی رہی۔

تمہیں بھی انہی مراحل میں سے گزرنے کے بعد جنّتی زندگی مل سکے گی۔

(نیز دیکھئے ۳/۱۴۱ ؛ ۹/۱۶ ؛ ۲۹/۲ ؛ ۳۳/۱۰)۔

جنّتِ ارضی کے متعلق ہم سر دست انہی کوائف پر اکتفا کرتے ہیں اور ان میں صرف ایک اضافہ ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ جنت، اجتماعی زندگی بسر کرنے سے حاصل ہو سکے گی۔ خانقاہیت کے خلوت کدوں کی انفرادی زندگی کی رُو سے نہیں۔

جنّتِ اجتماعی زندگی سے حاصل ہوگی

چنانچہ قرآن کریم میں اس کے لئے شرط ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹/۲۹-۳۰) "تم میرے بندوں کے ساتھ مل جاؤ اور اس طرح میری جنّت میں داخل ہو جاؤ"۔ جنت قرآنی معاشرہ کی تشکیل سے حاصل ہوتی ہے۔

جنت کی زندگی میں یہ بھی کہا گیا ہے وَلَهُمْ فِيهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (۲/۲۵)۔ "اس میں پاکیزہ ازواج ہوں گی"۔ ہمارے ہاں عام تصوّر یہی ہے کہ جنت، اُخروی زندگی میں جاکر ملے گی اور اس میں جنتی مردوں کو بڑی خوبصورت بیویاں ملیں گی جنہیں حوریں کہکر پکارا گیا ہے۔ چونکہ اس تصور کی رو سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور اسلام کے مخالفین اس پر بڑے اعتراضات کرتے ہیں، اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس نکتہ کی وضاحت یہیں کر دی جائے۔

جنّت میں ازواج

ہمارے ہاں ازواج کے معنے بیویاں ہی لئے جاتے ہیں۔ حتّٰکہ زوجہ بیوی کو کہا جاتا ہے اور خاوند کو زوج بھی نہیں کہا جاتا۔ لیکن عربی زبان (اور قرآن کریم) میں جسطرح یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس کی رو سے اس کے معنی بڑے وسیع ہیں۔ زبان کے اعتبار سے زوجاً ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے مطابق ہوں۔ جب دو چیزیں ایسی ہوں کہ ان میں سے ایک کے بغیر دوسری کی تکمیل نہ ہو سکے تو ان میں سے ایک کو دوسری کا زوج کہا جائے گا۔ مثلاً گاڑی کے دو پہیے ایک دوسرے کے زوج کہلائیں گے، کیونکہ اگر ایک پہیہ نہ ہو تو دوسرا بیکار رہ جاتا ہے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دونوں پہیے ایک جیسے ہوں۔ اگر ان میں ذراسی بھی عدم مطابقت ہوگی تو گاڑی چل نہیں سکے گی۔ اس اعتبار سے ازواج کے معنی ہوتے ہیں ہم فکر، ہم رنگ، ہم آہنگ رفقاء (COMPANIONS)۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن کریم کے معیار کی رو سے، میاں بیوی کو سب سے زیادہ اہم آہنگ و یکرنگ، ایک دوسرے کا رفیق ہونا چاہیئے، اس لئے میاں بیوی کا زوج ہوتا ہے (۱/۵۸) اور بیوی میاں کی زوج۔ اس نقطۂ نگاہ سے

دیکھئے تو جنتِ ارضی میں ازواج سے مراد ہم فکر و ہم رنگ رفقاء بھی ہوں گے اور ہم مزاج و ہم آہنگ میاں بیوی بھی۔ لیکن جنتِ اُخروی کا تصور چونکہ اس قسم کا مادی تصور نہیں، اس لئے اس میں ازواج سے مراد ہم آہنگ رفقاء کے ہوں گے جن میں مرد اور عورتیں سب شامل ہوں گے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس زندگی میں مرد اور عورت کی موجودہ حیاتیاتی (BIOLOGICAL) یا جنسی (SEXUAL) تمیز علی حالہ رہے گی یا اس کا انداز بھی کچھ اور ہوگا، کیونکہ وہاں کی زندگی کی کیفیت و ماہیت کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ محض لفظ ازواج سے ذہن کو جنسی تعلقات کی طرف منتقل نہیں ہوجانا چاہیئے۔ اس سے رفقاء کا مفہوم ہی لینا چاہیئے۔ کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنت کی زندگی اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ اُس میں خدا کے بندوں کا ایک دوسرے سے مل کر رہنا ضروری ہے (۸۹/۴۹)۔ یہ سب ایک دوسرے کے زوج ہوں گے۔

حوروں سے مراد

جنت کے سلسلہ میں حوروں کا ذکر بھی آتا ہے اور اس کے عام مفہوم کے اعتبار سے بھی ذہن اخروی جنت میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اگر اُخروی جنت میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کا سلسلہ بھی باقی رہے گا تو یہ بھی کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں لیکن، جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں، وہاں کی زندگی کی تفاصیل کو مادی پیکروں میں سامنے لانا ہی نہیں چاہیئے۔ یہاں ہم اتنا واضح کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ لفظِ حُور بھی صرف مؤنث کے لئے نہیں بولا جاتا، مذکر کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ یہ لفظ جمع ہے اور اس کا واحد اَحْوَرُ بھی ہے جو مذکر ہے، اور حَوْرَاءَ بھی، جو مؤنث ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ایسے لوگ (مرد یا عورتیں) جن کی آنکھ کی سفیدی نہایت صاف اور اس کی سیاہی نہایت گہری ہو۔ عربوں کے ہاں ایسی آنکھ بڑی خوبصورت سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اس کے بعد ان کے ہاں یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بولا جانے لگا جن کی سیرت بڑی پاکیزہ اور نگاہ بڑی صاف ہو۔ کیونکہ لفظ اَحْوَرُ (جس کی جمع حُوْرٌ ہے) کے معنی پاکیزہ عقل کے ہیں۔ یعنی چالاک اور مکار عقل نہیں بلکہ پاک اور صاف عقل۔

قرآن کریم میں بعض مقامات پر حُوْرٌ کے ساتھ عِیْنٌ کا لفظ بھی آیا ہے (۴۴/۵۴ ; ۵۲/۲۰) معنی اس کے بھی ایسے شخص کے ہیں جس کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہوں اور اس کا استعمال بھی مذکر و مؤنث دونوں کے لئے ہوتا ہے۔

لہٰذا جنت کی زندگی میں باہمی رفقاء (حُوْرٌ عِیْنٌ) خواہ وہ عام ہم نشین ہوں یا میاں بیوی، کی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کی عقل و خرد ایک دوسرے کو . . . . . . دھوکہ دینے کے کام میں نہیں لائی جائے گی۔ وہ عقل، ادب خوردۂ دِل ہوگی۔ یعنی پاکیزہ اور شفاف عقل نہ کہ حیلہ جُو اور فریب کار۔ یہ ہیں آیۂ زیرِ نظر میں وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (۲/۲۵)

کے معانی۔ یعنی جنتی زندگی (خواہ وہ اس دنیا کی ہو یا آخرت کی) ایسے رفقاء پر مشتمل ہو گی جن کی سیرت نہایت بلند اور فکر نہایت پاکیزہ ہو گی۔

ان تصریحات کے بعد آپ آئیے آیۂ زیر نظر کے اس ٹکڑہ کی طرف، جس کا مفہوم ابھی باقی ہے۔ یعنی كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا (۲۵)۔ "جب انہیں رزق دیا جائیگا تو کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے دیا گیا تھا۔ ان سے کہا جائیگا، نہیں! یہ بعینہٖ وہی نہیں، اس سے ملتا جلتا ہے۔"

اس میں بھی ایک عمیق حقیقت مضمر ہے۔ لفظ رزق کے معنی ایسے سامانِ زیست کے ہیں جو بروقت ملے یعنی تقاضائے زندگی کے عین مطابق۔ آیت (۲) کی تشریح کرتے ہوئے یہ بتایا جاچکا ہے کہ کائنات میں سلسلۂ ارتقاء جاری وساری ہے ملخص اس کا یہ ہے کہ زندگی، اولیں جرثومۂ حیات (LIFE-CELL) سے شروع ہوکر، مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی، انسانی پیکر تک پہنچی ہے۔ اس رہِ دور دراز میں، جوہرِ حیات تو ایک ہی رہا لیکن اس کے پیکروں میں بڑا فرق پیدا ہوتا رہا۔ اس کا پیکر جس حالت میں بھی تھا اسے اس کی مناسبت سے سامانِ زیست ملتا رہا۔ اسی سے وہ زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے قابل ہوا۔ یہ رزق مقصد کے اعتبار سے تو ایک ہی تھا لیکن خواص کے اعتبار سے اس میں بڑا فرق ہوتا تھا۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے کسی سائنسدان کے دماغ کی ضرورت نہیں یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے (مثلاً) آپ ایک انسانی بچہ کو لیجئے۔ اس کا رزق ماں کا دودھ ہوتا ہے۔ بچے کی

غذا کی کیفیت میں فرق

ابتدائی زندگی میں چونکہ اس کا معدہ کمزور ہوتا ہے اس لئے اس کی ماں کے دودھ میں پانی زیادہ ہوتا ہے اور غذائیت کے اجزا بہت کم۔ جوں جوں اُس کا معدہ قوی ہوتا جاتا ہے ماں کے دودھ میں خود بخود مائیت کم اور غذائیت بڑھتی جاتی ہے۔ حتّٰی کہ دو اڑھائی سال کے بعد دودھ کافی گاڑھا ہو جاتا ہے۔ اس تمام عرصہ میں وہ کہلائے گا تو دودھ ہی، لیکن پہلے دن کے دودھ اور اس دو اڑھائی سال کے عرصہ کے بعد کے دودھ میں نمایاں فرق ہو گا۔ اس مثال سے آپ قرآنِ کریم کی اس آیت کو پھر سامنے لائیے جو پہلے بھی لکھی جاچکی ہے۔ یعنی يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۵۵/۲۹) کائنات کی ہر شے اپنے سامانِ زیست کے لئے ربوبیتِ خداوندی کی محتاج ہے۔ ان اشیائے کائنات کی کیفیت یہ نہیں کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ہی حالت میں رہتی ہوں۔ ان کی حالتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اور حالات کی اسی نسبت سے، ان کے سامانِ زیست کے تقاضوں میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ خدا کی ربوبیت کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر شے کو، اُس کی اُس وقت کی حالت کے تقاضے کے مطابق

سامانِ پرورش عطا کرتا ہے۔

اب اسی حقیقت کو پھیلا کر اعمال کے نتائج کی دنیا کی طرف لیجائیے۔ یہ آخرت میں کس شکل میں نمودار ہوں گے، اُسے بھی چھوڑئیے۔ خود اسی دنیا میں دیکھئے۔ چودہ سو سال پہلے ان اعمال کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی نعمائے خداوندی کی جو کیفیت اور نوعیت تھی، آج کی نعماء اُن سے مختلف رنگ میں ہوں گی۔ روح اور جوہر تو ان کا وہی ہوگا لیکن ان کی شکلیں کچھ اور ہوں گی۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآنِ کریم نے اِس تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے کہ اہلِ جنت کو جو سامانِ زیست ملے گا۔ وہ ہر دور (بالخصوص دنیا اور آخرت) میں یکساں نہیں ہوگا بلکہ باہم متشابہہ — ملتا جلتا — ہوگا۔ جوہر، غیر متغیر رہے گا، لیکن اس کے پیکر حالات کی مناسبت سے بدلتے چلے جائیں گے۔

اب آگے چلئے:

(۲/۲۶) إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ۔

عام معنی اس آیت کے یہ ہوں گے کہ اللہ کے لئے یہ بات کسی جھجک اور تامل یا حجاب و ندامت کی نہیں کہ وہ مجرد حقائق کو، مچھر یا اس سے بھی کسی کمتر درجے کی شے کی مثال سے واضح کرے۔ ان مثالوں کے متعلق، ان لوگوں کا تاثر جو وحی کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں، یہ ہوگا کہ یہ بھی ان کے ربّ کی طرف سے سراسر حق و صداقت پر مبنی ہیں۔ لیکن جو اِن صداقتوں سے انکار کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اس قسم کی حقیر سی چیزوں کی مثالیں دینے سے اللہ کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ اس طرح، ایک ہی بات سے کچھ لوگ صحیح راہنمائی حاصل کرلیں گے، دوسرے گمراہ ہوں گے۔ لیکن گمراہ فاسقین ہی ہوں گے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم مجرد (بالخصوص ماوراء الطبیعیاتی) حقائق کو محسوس تمثیلات و تشبیہات کے ذریعہ سمجھاتا ہے یہی ان کے سمجھانے کا بلیغ ترین ذریعہ ہے۔ مثال ہر مناسب شے کی دی جاسکتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ ان تمثیلات کا ردِ عمل مومنین اور کفار کی طرف سے مختلف ہوتا ہے تو اس میں ایک نفسیاتی حقیقت پوشیدہ ہے۔ خارج میں، شے ایک ہی ہوتی ہے لیکن اپنے اپنے زاویۂ نگاہ کی رو سے مختلف لوگوں کا تاثر اس متعلق

مختلف ہوتا ہے۔ ایک شخص شاخِ گل پر مسکراتے پھول کو دیکھ کر اس کی رعنائیوں اور

تاثرات کا فرق

زیبائیوں، اس کی عطر بیزیوں اور شمیم ریزیوں سے وجد و کیف کے عالم میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا شخص، اس کے کانٹوں سے ہمہ تن شکایت بن جاتا ہے۔ یہ فرق زاویۂ نگاہ کا ہے۔ ہم اس موضوع کو پھیلانا چاہیں تو اس کے متعلق ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب کی جا سکتی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک ہی شے، ایک ہی واقعہ، یا ایک ہی شخص کے متعلق مختلف لوگوں کے تاثرات مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد ہوتے ہیں۔ یہ فرق زاویۂ نگاہ کے اختلاف کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

ایکہ منزل را نمیدانی ز راہ قیمتِ ہر شئے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود ایں زمین و آسماں، دیگر شود

قرآن کریم انسان کے زاویۂ نگاہ کو بدل دیتا ہے۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھتا ہے۔ اور اقدارِ خداوندی کے پیمانوں کے مطابق اس کی قیمت متعین کرتا ہے۔ قرآن کا پیدا کردہ یہی وہ تغیرِ نفس ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ کہتا ہے کہ

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

بالفاظِ دیگر:

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دل ہے بدل جانے سے اس کے رنگ ہے اِک چیز کا بدلا

قرآنِ کریم کی اصطلاح میں دل کے اِس رنگ بدلنے کو ایمان کہا جاتا ہے۔ یہ بڑی بنیادی تبدیلی ہے جو انسان کی نفسیات میں پیدا ہوتی اور خارجی تبدیلیوں کی بنیاد بنتی ہے۔ اس سے اشیائے کائنات کے پیمانے بدل جاتے ہیں، ان کی قیمتیں بدل جاتی ہیں، اُن کے مقاصد بدل جاتے ہیں، ان کی غایتیں بدل جاتی ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے آیۂ زیرِ نظر میں یہ کہکر بیان کیا ہے کہ مثال ایک ہی ہوتی ہے، اُسے مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے والوں کے تاثرات مختلف ہوتے ہیں۔ آگے چل کر ہم سورۂ آلِ عمران کی آیت (۳/۷) میں، دیکھیں گے کہ اس میں یہی بات "تشبیہات" کے سلسلہ میں کہی گئی ہے۔

قرآن کریم میں مختلف حقائق یا موضوعی کیفیات کو مختلف مثالوں کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے۔ یہ مثالیں آئندہ آیات میں ہمارے سامنے آتی جائیں گی۔ ہم یہاں ان میں سے چند ایک کو نمونتاً پیش کرتے ہیں۔

قرآن کی مثالیں

(۱) احکامِ سبت کی مخالفت کرنے والوں کی ذہنیت کو قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ سے تشبیہہ دی گئی ہے (۲/۶۵)۔

(۲) عقل و فکر سے کام نہ لینے اور تقلید کی روش اختیار کرنے والوں کو بھیڑ بکریوں سے تشبیہہ دی گئی ہے (۲/۱۷۱)

(۳) ناقابلِ تسکین حرص و آز کی مثال ہانپنے والے کتّے کی دی گئی ہے (۷/۱۷۶)۔

(۴) کلمۂ طیّب کی تشبیہہ شجرِ طیب سے اور کلمۂ خبیثہ کی شجرِ خبیثہ سے دی گئی (۱۴/۲۴-۲۶)

(۵) شرک سے پیدا ہونے والے خوف و دہراس اور عدمِ حفاظت کو اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ پرندے کا چھوٹا سا بچہ جو اپنے گھونسلے سے نیچے گر پڑے اور اُسے کوئی چیل یا عقاب اچک کرلے جائے۔ یا گھاس کا ایک سوکھا سا تنکا، جسے ہوا کا جھکڑ جدھر جی چاہے، اڑائے اڑائے پھرے (۲۲/۳۱)۔

(۶) جو قومیں اپنی محنت کے ماحصل کو خود اپنے ہاتھوں تباہ کردیں، ان کی مثال اس بڑھیا سے دی گئی ہے جو دن بھر بڑی محنت سے سوت کاتے لیکن اسے شام کو خود ہی ریزہ ریزہ کرکے رکھ دے (۱۶/۹۲)۔

(۷) معبودانِ باطل سے وابستہ امیدوں کو تارِ عنکبوت کہکر پکارا گیا ہے (۲۹/۴۱)۔

(۸) بے عمل مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی مثال ایک ایسے گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی مقدس کتابیں لاد دی گئی ہوں (۶۲/۵)۔

(۹) پاکیزگیٔ سیرت کو، سیپ کے اندر شفاف موتی سے تشبیہہ دی گئی ہے (۵۶/۲۲)۔ اور

(۱۰) قرآن کریم کو جس آسمانی قندیل سے تشبیہہ دی گئی ہے اُسے تو اس کے مقام پر وجہ نورانیتِ قلب و نگاہ بنایا جائے گا کیونکہ ڈر ہے کہ اختصار سے اس تشبیہہ کی درخشندگی اور تابندگی ماند نہ پڑھ جائے (۲۴/۳۵)۔

یہ، اور اسی قسم کی متعدد اور، مثالیں ہیں جن سے قرآن کریم نے مختلف حقائق کو سمجھایا ہے۔ اور، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اُخروی زندگی کی تمام کیفیات کا بیان تمثیلی اور تشبیہی ہے۔ یہی وہ تشبیہات و تمثیلات ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اکثر لوگوں کے لئے یہ قندیلِ راہ بنتی ہیں اور دوسروں کے لئے نکتہ چینی اور

فاسقین کا مفہوم

عیب جوئی کا موجب۔ ایسے لوگوں کو اس نے "فاسقین" کہکر پکارا ہے۔ ہمارے ہاں

فسق و فجور اور فاسق و فاجر کے الفاظ عام طور پر بولے جاتے ہیں لیکن ان کا صحیح مفہوم کم لوگوں کے سامنے ہوتا ہے۔ کھجور کے پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے جس کے اندر وہ نشوونما پاتی اور پختگی تک پہنچتی ہے۔ (یہی صورت دوسرے پھلوں کے ساتھ بھی ہوتی ہے) وہ چھلکا گویا اس پھل کا قالب (PATTERN) ہوتا ہے جس کے اندر اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہوتی اور وہ پختگی تک پہنچتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ پھل ایک طرف سے چھلکے سے باہر نکل جاتا ہے۔ ایسا پھل کبھی پختگی تک نہیں پہنچتا بلکہ گل سڑ جاتا ہے۔ عرب اس کے لئے فسق کا لفظ بولتے تھے۔ قرآن کریم ایک ایسا نظام معاشرہ یا اجتماعی زندگی کا قالب عطا کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افرادِ معاشرہ کی صلاحیتوں کی صحیح صحیح نشوونما ہو جاتی ہے۔ جو فرد یا گروہ اس نظام کے قالب سے باہر نکل جائے اُسے فاسق کہا جائے گا۔ اس کی نشوونما نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا ہر شخص جو قوانینِ خداوندی کے دائرے اور اس کے تجویز کردہ قالب سے باہر نکل جائے۔ وہ فاسق ہے۔ قرآن کریم نے اگلی آیت میں اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی کہ

۲/۲۷ (۲/۲۷) اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔

یعنی فاسقین وہ ہیں جو خدا سے باندھے ہوئے پختہ عہد کو توڑ دیتے ہیں اور جنہیں خدا نے باہمی ملانے کا حکم دیا ہے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور وہ اس طرح ملک میں، یا زمین پر، فساد برپا کر دیتے ہیں۔ اس آیت میں بیان کردہ، اساسی نکات کی تشریح آیت (۲/۱۱) میں، فساد کے عنوان کے تابع کر دی گئی ہے۔ نیز یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ خدا سے باندھا ہوا عہد کون سا ہے —— اس کی ایک مثال وہ عہد ہے جس کی رو سے مومن اپنی جان و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے (۹/۱۱۱) دیگر متعدد مقامات پر اس

عہد فراموش

کی اور تفصیلات بھی بتائی ہیں جن کا ذکر متعلقہ مقامات پر آئے گا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ ایک شخص جب خدا پر ایمان لاتا ہے تو وہ اُس سے اس امر کا عہد کرتا ہے کہ وہ اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ عہد شکنی ہو گی۔ عَهِدَ الشَّيْءَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی مسلسل حفاظت اور خبرگیری کرنا اس کی پیہم نگہداشت کرنا۔ اس کے اس بنیادی مفہوم کے لحاظ سے بھی خدا سے باندھے ہوئے عہد کے ایفا کے معنے ہوں گے اس کے احکام کی نگہداشت کرنا۔ جب اس لفظ کے بعد اِلٰی آئے تو اس کے معنے حکم کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے یعنی عَهْدُ اللّٰهِ کا ایفا درحقیقت احکامِ خداوندی کی اطاعت و نگہداشت کا دوسرا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عہد انہی لوگوں کی طرف سے ہو گا جو خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی ہوں۔ یہی

وہ لوگ ہو سکتے ہیں جن کے متعلق کہا جائے گا کہ انہوں نے خدا سے ایک عہد باندھا تھا۔ ایک وعدہ کیا تھا جسے وہ اب نباہتے نہیں۔ اس شق میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں جو زبان سے ایمان کے مدعی ہوں لیکن عملاً احکامِ خداوندی کی اطاعت نہ کریں۔ یہ سب فاسق کہلائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کہیں ظالمین کو فاسق کہکر پکارا ہے (۲/۵۹)۔ اور کہیں ان لوگوں کو جو احکامِ خداوندی کی اطاعت سے گریز کی راہیں نکالیں (۳/۸۱) اور، مختصر لیکن جامع ترین الفاظ میں یہ کہ اس نے مومن اور فاسق کو ایک دوسرے کی ضد بتایا ہے۔ (۳/۱۰۹) یعنی احکامِ خداوندی کی اطاعت نہ کرنے والا (ان کے تجویز کردہ قالب سے باہر نکل جانے والا) مومن کہلا ہی نہیں سکتا۔ تفصیل ان امور کی آیت (۲/۴) کی تفسیر میں گذر چکی ہے جہاں مومن اور رسمی اور اسمی مسلمانوں میں فرق بتایا گیا ہے۔ ان لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲/۲۷)۔ خسران کا لفظ بھی بڑے وسیع معانی کا حامل ہے۔ اَلْخَاسِرُ کے معنی ہوتے ہیں راستہ کھو جانے والا، ہلاک ہو جانیوالا۔ یا جو شخص کامیاب نہ ہو سکے۔ جو تجارت میں گھاٹے میں رہے۔ خُسْرٌ میں مادی اشیاء میں کمی اور معنوی اشیاء کا نقصان دونوں شامل ہوتے ہیں۔ یعنی مال و دولت میں نقصان اور عقل و ایمان اور شرف و عزت میں کمی، دونوں کے لئے خُسْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے قرآن کریم نے اسے سورۃ العصر میں نہایت مختصر لیکن جامع ترین الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ جب کہا ہے۔ وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۱-۳)۔ تاریخ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اگر انسان ہدایتِ خداوندی کی پیروی نہ کرے تو وہ نقصان میں رہتا اور آخر الامر تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔ اس تباہی سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو اقدارِ خداوندی کی صداقت پر ایمان

خاسر و نامراد کون ہیں؟

رکھیں اور اس کے بتلائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں۔ اس پروگرام کی رو سے ایک ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جس میں ہر فرد اپنا فریضہ اتنا ہی نہیں سمجھتا کہ جو کام اس کے ذمہ لگا دیا گیا تھا اس نے اُسے پورا کر دیا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بھی کہتا ہے کہ وہ بھی حق کے راستہ پر قائم رہیں اور اس میں جس قدر مشکلات آئیں ان کا مقابلہ ثبات و استقامت سے کریں۔ ان کی ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین، خود ان میں باہمی ربط و ضبط کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ (۳/۱۹۹) وہ مسلسل اور متواتر اس روش پر گامزن رہتے ہیں اور اس طرح آنے والی نسلوں کے لئے زمانہ کی ریگِ رواں پر اپنے نقوشِ قدم ثبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ جماعت ہے جو کامیاب و کامران زندگی بسر کرتی ہے۔ ان کے سوا، دیگر انسانوں کی زندگی ناکامیوں اور نامرادیوں کی حسرت انگیز داستانوں کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ تاریخ کے اوراق اس پر

شاہد ہیں۔"

قرآن کریم انسانیت کی تاریخ کو اس حقیقتِ کبریٰ کی شہادت کے طور پر پیش کرنے کے بعد یہ پوچھتا ہے کہ بتاؤ تم اس صداقت سے کس طرح انکار کر سکتے ہو؟

(۲/۲۸) كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے "تم کس طرح خدا کی ہستی کا انکار کر سکتے ہو۔ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تم پر موت وارد ہوگی۔ اس کے بعد پھر تم زندہ ہوگے۔ اور اس کی طرف رجوع کردگے"

اس آیت میں سب سے پہلے خدا نے اپنی ہستی کے ثبوت کے لئے ایک دلیل یہ دی ہے کہ اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ "زندگی" کا پیدا کرنا کتنی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے ان دو الفاظ — موت اور حیات — کے لغوی معنی دیکھ لیجئے۔

حیات لفظ حیات کا مادہ (ح-ی-ی) ہے۔ علمائے لغت نے اس کے بنیادی مفہوم کے سلسلہ میں لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں جو ہمارے مفیدِ مطلب نہیں۔ اس کے بالمقابل موت کا لفظ آتا ہے۔ استعمال کی رُو سے اس لفظ کے بھی متعدد معانی ہیں۔ بنیادی طور پر:-

موت (۱) حیات اور موت کے الفاظ طبیعی معنوں میں زندگی اور موت کے لئے بھی آتے ہیں۔

(۲) قرآن ان لوگوں کو بھی مردہ کہتا ہے جو طبیعی طور پر تو زندہ ہوتے ہیں لیکن ان کی انسانی صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ ان کے مقابلہ وہ، انہیں زندہ انسان قرار دیتا ہے جو عقل و شعور سے کام لے کر خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن ہوں۔

(۳) وہ ان قوموں کو بھی مردہ کہتا ہے جو زوال پذیر ہو چکی ہوں۔ اگر ان میں عروج حاصل کرنے کی استعداد و صلاحیت باقی ہو تو وہ قوانینِ خداوندی پر عمل کرنے سے دوبارہ زندگی حاصل کر سکتی ہیں۔ اور

(۴) انسان کی طبیعی موت کے بعد اگلی زندگی کو بھی حیات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہی وہ اُخروی زندگی ہے جو جزوِ ایمان ہے۔

آیۂ زیرِ نظر میں سب سے پہلے انسان کی طبیعی زندگی کا سوال سامنے آتا ہے۔ ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ سائنسدانوں کے لئے یہ سوال کس قدر لاینحل معمہ ہے کہ مادی کائنات کی ابتدا کیسے ہوگئی! اس سلسلہ میں ان کا

سرچشمۂ حیات کے متعلق سائنسدانوں کا عجزِ فہم

اعترافِ عجز بھی ہمارے سامنے آچکا ہے۔ لیکن یہ سوال کہ "زندگی" (LIFE) کیسی پیدا ہو گئی، ان کے لئے اس سے بھی زیادہ لاینحل ہے اور، اس باب میں بھی، دورِ حاضرہ کا بڑے سے بڑا سائنسدان اور مفکر اسی طرح سرگرداں ہے جس طرح اڑھائی ہزار سال پہلے کے اربابِ فکر و دانش انگشت بدنداں تھے ہم چاہتے تو اس باب میں مفکرین اور محققینِ مغرب کے بیسیوں اعترافات نقل کر دیتے۔ لیکن اس تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ سمجھنے کے لئے دو ایک اقتباسات ہی کافی ہوں گے۔ علمائے حیاتیات میں (J.S. HALDANE) کا شمار ممتاز محققین میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی تصنیف (THE PHILOSOPHICAL BASIS OF BIOLOGY) میں لکھتا ہے :-

> اب اس حقیقت کے تسلیم کر لینے میں کوئی باک نہیں کہ زندگی محض طبیعیاتی اور کیمیاوی کیفیات کی پیدا کردہ نہیں۔ یہ ان مادی کیفیات سے پہلے موجود تھی اور ہمیشہ سے موجود تھی۔ نیز اس امر کے باور کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں کہ اس مادی کائنات کے پیچھے ایک اور دنیا ہے جسکی تعبیرات کی روشنی میں ہمارے حیاتیاتی اصولوں کو عملاً منطبق کرنا چاہئے۔ لہٰذا زندگی کے مسئلہ کو طبیعیاتی اور کیمیاوی مسئلہ سمجھنا ہی غلط ہے۔ زندگی اور انسانی ذات کا وجود اس حقیقت کی دلیل ہے کہ ہماری کائنات کی محض مادی تعبیر ناممکن ہے اور یہ تعبیر ناممکن ہی رہتی ہے خواہ ہم زمان کے اعتبار سے کتنے ہی پیچھے اور مکان کے اعتبار سے کتنے ہی اونچے کیوں نہ چلے جائیں۔ زندگی کو پیچھے لے جانے سے اس کی مادی تعبیر کبھی نہیں مل سکے گی۔ نہ ہی انسانی ذات کو پیچھے لے جانے سے ہم کسی ایسے مقام تک پہنچ سکیں گے جہاں ہم کہہ سکیں کہ انسانی ذات اس طرح مادہ سے پیدا ہو گئی (صفحہ ۳۸ و ۱۱۱ و ۱۲۲)

نظریۂ ارتقاء کی ابتداء تو ڈارون کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کے نظریہ میں بڑی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ جن سائنسدانوں نے یہ تبدیلیاں پیدا کی ہیں ان میں (SIMPSON) کی حیثیت بڑی نمایاں ہے وہ زندگی کی ابتداء اور سلسلۂ علت و معلول کی اولین کڑی کے متعلق لکھتا ہے :-

> زندگی کی ابتداء کیسے ہو گئی۔ نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم

نہیں۔ اِس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کے قریب پہنچا جارہا ہے لیکن اس معمہ کا آخری نقطہ (یعنی زندگی کا نقطہ آغاز) وہ مقام ہے جو سائنس کے انکشافات کی دسترس سے باہر ہے۔ اور شاید انسان کے حیطۂ ادراک ہی سے باہر۔ کائنات کے آغاز اور سلسلۂ علّت و معلول کی اولین کڑی کا مسئلہ لاینحل ہے اور سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہ اولیں کڑی، راز ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ذہن انسانی اس راز کو کبھی نہیں پا سکے گا۔ ہم اگر چاہیں تو اپنے اپنے طریق پر اس علّتِ اولیٰ کے حضور اپنا سر جھکا سکتے ہیں، لیکن اسے اپنے ادراک کے دائرے میں کبھی نہیں لا سکتے۔

(THE MEANING OF EVOLUTIN. ; P.P. 13, 135)

چونکہ یہ مسئلہ سرحدِ ادراکِ انسانی سے ماوراء ہے اس لئے قرآن کریم بھی اس کی تشریح میں نہیں جاتا۔ وہ اس سے گفتگو نہیں کرتا کہ زندگی وجود میں کیسے آگئی، وہ آغازِ سخن اس سے کرتا ہے کہ زندگی کی نمود کس طرح ہوتی۔ اس سلسلہ میں آیات (۲/۱ ; ۲/۲ ; ۲/۲۱) میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے۔ نمودِ حیات کے سلسلہ میں ہم بھی ایک مثال کے ذریعہ بات سمجھنے اور سمجھانے سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے جو آواز نشر کی جاتی ہے وہ فضا کی کہربائی لہروں میں پھیل جاتی ہے لیکن ہمیں اس کی موجودگی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ ہمیں اس کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب وہ آواز ہمارے ریڈیو سیٹ کی وساطت سے محسوس طور ہمارے کانوں میں پہنچتی ہے۔ ہمارے احساس (سماعت) کی گرفت میں آنے سے پہلے یہ آواز معدوم نہیں تھی۔ موجود تھی۔ لیکن ہم اس کی موجودگی کا احساس نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد اگر ہمارا ریڈیو سیٹ خراب ہو جاتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ آواز ختم (یا معدوم) ہو گئی۔ حالانکہ وہ ختم یا معدوم نہیں ہوتی سیٹ کی خرابی کی وجہ سے ہمارے کانوں میں نہیں آتی۔ ازاں بعد، اگر ہمارا سیٹ پھر درست ہو جاتا ہے یا ہمیں ایک نیا سیٹ مل جاتا ہے، تو اس آواز کا وجود پھر ہمارے احساس کی گرفت میں آجاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا نے زندگی کو اس کے مادی پیکر (اولیں جرثومہ حیات) میں آنے سے پہلے پیدا کر رکھا ہو۔ لیکن چونکہ اس وقت وہ ہمارے احساسات کی گرفت میں نہیں آئی تھی اس لئے اس نے ہماری اس حالت کو موت سے تعبیر کیا ہے (كُنْتُمْ اَمْوَاتًا)۔ اس حالت کے متعلق مزید اشارہ اتنا ہی کیا ہے کہ تم کوئی قابل ذکر شئے نہیں تھے (۷۶/۱)۔ ذکر کے معنی اپنے مقام پر بیان کئے جائیں گے) جب اس کی نمود محسوس پیکر دل میں ہو گئی تو حَيَاتًا کہہ کر پکارا، کیونکہ وہ ہمارے احساس کی گرفت میں آگئی جب وہ پھر

نمودِ حیات کی ایک مثال

ہمارے احساس کی گرفت سے باہر ہوگئی تو اُسے موت سے تعبیر کیا گیا۔ اس کے بعد، جب پھر اس کی نمود ہو جائے گی تو اُسے حیات بعد الممات سے تعبیر کیا جائے گا۔ (ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت ہم اس کی نمود کو کس طرح محسوس کریں گے کیونکہ اس وقت ہمارا "ریڈیو سیٹ" موجود سیٹ سے مختلف ہوگا۔ یہ ہے زندگی کے مستتر (مضمر) اور بارز (نمودار) ہونے کا تمثیلی بیان۔

زیرِ نظر آیت میں قرآنِ کریم نے موجودہ حیات سے پہلے کی موت، پھر حیات، اس کے بعد کی موت، اور حیاتِ اُخروی کا ذکر کیا ہے۔ اسی کو اس نے دوسری جگہ دو موتیں اور دو زندگیاں کہکر پکارا ہے (۴۰/۱۱)۔ اور موت کے بعد کی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ اس کے بعد پھر موت وارد نہیں ہوگی (۴۴/۵۶ ؛ ۳۷/۵۹)۔ قرآنِ کریم کی رو سے حقیقی اہمیت، حیات بعد الممات کے سوال ہی کو حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے جو دین کی اصل و اساس ہے۔ اِنسان کی موجودہ زندگی تو طبیعیات کا مسئلہ بن کر رہ جاتی ہے۔ کفر اور ایمان کا تعلق، حیات بعد الممات سے ہے۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے کہا ہے کہ :-

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں، میری انتہا کیا ہے

بنیادی طور پر، فکر کرنی بھی اسی کی چاہیئے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اس کا تعلق کفر و ایمان، اور دین کی اساس سے ہے۔ جو شخص حیاتِ بعد الممات کا قائل نہیں وہ (بزعمِ خویش) یہ سمجھتا ہے کہ اس زندگی میں جو کچھ میرے

حیات بعد الممات

جی میں آئے، کروں۔ اگر میں ایسا انتظام کرلوں کہ میرے جرائم کسی کی نگاہوں میں نہ آسکیں، اور اگر آ بھی جائیں تو مجھے ان کی سزا نہ بھگتنی پڑے، تو کوئی میرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد موت ہے اور موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسان جسقدر ظلم اور زیادتیاں کرتا ہے اس کا بنیادی سبب یہی زعمِ باطل (یعنی حیاتِ اُخروی سے انکار) ہوتا ہے۔ اور اگر آج دنیا میں دھاندلی اور بد اخلاقی اسقدر عام ہو رہی ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ حیاتِ آخرت (یا قانونِ مکافاتِ عمل) سے انکار، گویا ایک عقیدہ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ قرآنِ کریم حیاتِ اُخروی کے ایمان پر اِسی لئے اس قدر زور دیتا ہے کہ اس سے انسانی معاشرہ بھی صحیح حالت میں رہتا ہے اور افراد کی ذات بھی اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے مزید ارتقائی منازل بحسن و خوبی طے کر سکے۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَّهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (۶۷/۲)۔ "خدا وہ ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہارے اعمال کی پرکھ ہو سکے۔ وہ

عزیز بھی ہے اور غفور بھی"۔ دوسری جگہ ہے۔ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (۱۰/۴)۔ یعنی خدا وہ ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اُسے گردشیں دیتا ہے تاکہ ایمان و عمل صالحہ کا نتیجہ قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ٹھیک ٹھیک مرتب ہو جائے اور حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے جرائم بلا عقوبت نہ رہنے پائیں۔ بالفاظ دیگر تخلیق موت و حیات کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ زندگی عمل کی آماجگاہ بنے اور جن اعمال کے نتائج اس زندگی میں سامنے نہ آسکیں وہ حیاتِ اُخروی میں سامنے آجائیں۔ حیاتِ اُخروی کے متعلق آیت (۴/۲) کی تفسیر میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس کے متعلق مزید تصریحات، قیامت، حشر، نشر، حساب کتاب، جنت، جہنم وغیرہ عنوانات میں کی جائے گی کہ وہی ان کے مناسب مقامات ہیں۔ اس مقام پر اتنا مزید واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم حیاتِ اُخروی پر اسقدر زور اس لئے نہیں دیتا کہ لوگ اُخروی عذاب سے "ڈرکر" اچھے کام کرنے لگ جائیں، قطعاً نہیں حیاتِ بعد الممات ایک حقیقت ہے اور وہ اِسے (دیگر حقائق کی طرح) حقیقت کے طور پر بیان کرتا ہے۔ مقصد اس سے یہ بتانا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی، زندگی کی آخری کڑی نہیں۔ زندگی کو ابھی مزید ارتقائی مراحل طے کرنا ہیں اور اس کے لئے سلسلۂ حیات، مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا۔ اعمال کے نتائج کا ذکر انہی ارتقائی منازل کے سلسلہ میں آتا ہے۔

اس آیت میں تشریح طلب بات ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲/۲۸) کی ہے۔ اس کے متعلق ابتدائی گفتگو آیات (۱/۵ و ۲/۱۸) میں کی جا چکی ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر مزید وضاحت یہاں بھی ضروری ہے۔

اِلیہ راجعون کا مفہوم

تُرْجَعُوْنَ کا مادہ (ر۔ ج۔ ع) ہے۔ رُجُوْعٌ کے معنے ہیں پلٹنا، لوٹنا، واپس ہونا۔ رَجَعَ اِلَيْهِ کے معنی ہوتے ہیں کسی کی طرف امداد وغیرہ کیلئے رجوع کرنا۔ اور رَجْعٌ کے معنی نتائج مرتب ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ یہ وہ معانی ہیں جو خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں پہلے معانی کی رو سے "رجعت الی اللہ" کے معنے ہوں گے زندگی کے ہر مرحلہ کے حل کے لئے قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنا۔ اور دوسرے معانی کی رو سے مفہوم ہوگا انسانی اعمال کا قانون مکافات کے مطابق نتیجہ خیز ہونا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان معانی میں بکثرت آیا ہے۔ متعلقہ آیات میں اس کا یہ مفہوم واضح طور پر سامنے آجائے گا۔ سردست ہم "اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کے ان دو غلط مفاہیم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی رو سے ذاتِ باری تعالیٰ اور خود انسان کے متعلق بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں حیاتِ اُخروی کے متعلق عام

تصور یہ ہے کہ مرنے کے بعد جب انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو ایک بہت بڑا میدان ہوگا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ عدالت کی کرسی پر متمکن ہوں گے۔ ہر شخص ملزم کی حیثیت سے اس کے حضور پیش ہوگا۔ وہاں اس کا حساب کتاب ہوگا اور خدا کی طرف سے فیصلے صادر ہوں گے۔ مجرموں کو داخل جہنم کر دیا جائیگا اور جو مجرم ثابت نہیں ہوں گے انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے بھی قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے اعمال کی جزا اور سزا کا کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچا ہے لیکن (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) حیاتِ اُخروی کے متعلق قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ تمثیلاً بیان کیا گیا ہے، حقیقتاً نہیں، اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ سچ مُچ کا ایک میدان ہوگا اور اس میں خدا کرسیٔ عدالت پر متمکن ہوگا۔ مجرم اس کے حضور پیش ہوں گے، تو اس سے خدا کا مکان (SPACE) اور زمان (TIME) میں محدود ہو جانا لازمی قرار پائے گا۔ خدا کے متعلق ایسا تصور، قرآنی تصورات کے خلاف ہے (وہ ان حدود سے منزہ اور ان قیود سے ماوراء ہے)۔ لہٰذا خدا کے حضور حاضر ہونے، یا اس کی طرف جانے (الیہ راجعون) کے معنے ہوں گے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق نتائج کا سامنے آنا۔ مرنے کے بعد یہ کیسے ہوگا۔ اس کا عملی طریق کیا ہوگا اور نوعیت کیا، اسے ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔ اس وقت بہر حال اتنا سمجھ لینا ضروری ہوگا کہ یہ... "کسی خاص" مقام کے اندر نہیں ہوگا۔ (الیہ راجعون (خدا کی طرف لوٹ کر جانے) کے صحیح مفہوم کو ایک مثال کی رو سے یوں سمجھئے کہ ایک مفرور اشتہاری مجرم ہے جو گرفتاری سے بچنے کے لئے بھاگتا اور چھپتا پھرتا ہے۔ اس کے متعلق عدالت کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ اوّل و آخر تمہیں یہاں آنا پڑے گا۔ اس سے کسی صورت میں مفر نہیں۔ یہ ہے مطلب انسانوں کا آخر الامر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہونے (یعنی الیہ راجعون) کا۔

اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا دوسرا غلط مفہوم اہلِ تصوف کا پیدا کردہ ہے جسکی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا ایک جزو ہے جو اس سے الگ ہو کہ مادہ کی دلدل میں پھنس چکی ہے۔ اب مقصودِ حیات یہ ہے کہ یہ جزو، مادہ کی دلدل سے چھٹکارا حاصل کر کے پھر سے ذاتِ خداوندی میں مل جائے۔ تصوف کے اس خلافِ قرآن عقیدہ کے متعلق آیت (۲/۵) میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے جس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

اور یہ جو ہم، کسی کے مرنے کی خبر سن کر، کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (۲/۱۵۶) اور اس سے مراد انتہائی رنج و الم، غم و اندوہ اور صدمہ و مصیبت کا اظہار ہوتا ہے، تو، جیسا کہ آیت (۲/۱۹) کے تابع آیات (۲/۱۵۶-۱۵۷) کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے، یہ ایک، عظیم القدر، حیات بخش، انقلاب آفریں، ولولہ خیز، مسرت آمیز جذبۂ بے پایاں

کا زلزلہ انگیز اعلان ہے، جسے بدقسمتی سے پیامِ مرگ کا نوحۂ ماتم بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کا ہر حیات بخش تصور، مرگ آفریں عقیدہ بن جاتا ہے۔ مذہب، قبرستانوں میں وعظ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا، جب کہ دین، جنگاہِ حیات میں مجاہدِ مسلسل کا داعی ہوتا ہے (تفصیل آیت ۲/۱۴ میں بیان کی جا چکی ہے۔)

آیۂ زیرِ نظر کے آخری الفاظ (ثُمَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ) ہمیں اگلی آیت کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں جو، یوں ہے:

(۲/۲۹) هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا۔ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ۔ وَهُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ۔ (۲/۲۹)

عام معنی اس کے یہ ہیں کہ "خدا وہ ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے، اسے تم سب کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ارض کی طرح سماء پر بھی اسی کا کنٹرول ہے جسے اس نے نہایت اعتدال سے استوار کر رکھا ہے۔ اور اُس کا یہ غلبہ اور کنٹرول علم کی بنا پر ہے۔"

اس باب کی ابتداء ہوئی تھی ان الفاظ سے کہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ (۲/۲۱)۔ اور اگلی آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ اس نے زمین اور آسمان سے تمہارے لئے سامانِ زیست پیدا کیا ہے۔ اب جو کہا گیا ہے کہ تم اسی بنیادی حقیقت کی طرف رجوع کرو تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس آیت میں اسی حقیقت کو، دھرایا گیا ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ خَلَقَ لَکُمۡ جَمِیۡعًا (۲/۲۹)۔ جو کچھ زمین میں ہے وہ تمام نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے ہے کسی خاص خاندان، قبیلہ، گروہ، قوم یا طبقہ کے لئے نہیں —— تمام نوعِ انسان کے لئے ہے۔ یہاں ارض کے بعد سماء۔ بلکہ سمٰوٰت کا ذکر ہے سماء کے معنی ہیں بلند فضائے کائنات، اور سمٰوٰت کے معنی وہ مختلف اجرامِ فلکی (کُرّے) جو اس فضا میں پھیلے ہوئے اپنے اپنے مدار میں تیرتے پھرتے ہیں (۳۶/۴۰)۔ ارض و سمٰوٰت سے متعلق تفصیلی بحث تو اس مقام پر ہوگی جہاں ہم نظامِ کائنات کے متعلق گفتگو کریں گے۔ یہاں دو ایک الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ جو کہ آیۂ زیرِ نظر میں استعمال ہوئے ہیں۔

سبع سمٰوٰت

(۱) ہمارے ہاں "سبع سمٰوٰت" کا عام طور پر ترجمہ "سات آسمان" کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان میں سَبۡعٌ سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے ہاں یہ عدد تامّہ (PERFECT NUMBER) تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے وہ اسے "کئی ایک"، یا "متعدد"، کے معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے، جب ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ تمہیں دس بار سمجھایا ہے! یا میں بیسیوں مرتبہ گیا ہوں یا تم ایک بار

چھوڑ، سو بار آؤ۔ اس سے مراد کوئی معین عدد نہیں ہوتا۔ اس سے صرف کثرت مراد ہوتی ہے۔ لہٰذا سبع سمٰوٰت کے معنی متعدد اجرام فلکی (آسمانی کرّے) ہوں گے۔

(۲) اِستویٰ کا مادہ (س۔و۔ی) ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی ذات میں پورے پورے اعتدال پر ہونا۔ ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود اور اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچے ہوئے ہونا۔ استویٰ الی الشیٔ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا قصد و ارادہ کرنا، یا اس کی طرف متوجہ ہونا اور استویٰ علیٰ میں غلبہ و تسلط کا مفہوم ہوتا ہے۔ آیۂ زیرِ نظر میں ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۲/۲۹) کے معنی ہوں گے "اور وہ سمٰوٰت کی طرف متوجہ ہوا تو وہاں متعدد کرّے معلق کر دیئے جن میں انتہائی تناسب و توازن پایا جاتا ہے۔"

(۳) ثُمَّ، حرف ہے اور عام طور پر اس مقام پر آتا ہے جہاں کوئی ترتیب بیان کرنا مقصود ہو، جیسے ہم کہتے ہیں کہ پہلے اس نے کھانا کھایا پھر پانی پیا۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ ہر جگہ ترتیب (پھر) کے معنوں میں ہی استعمال ہو۔ یہ (اور) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بنابریں، آیۂ زیرِ نظر میں خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ (۲/۲۹) کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ اس نے پہلے زمین کو پیدا کیا اور پھر سمآء کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں متعدد کروں میں استوار کیا۔ یہاں اس کے معنی یہی ہوں گے کہ اس نے زمین کو پیدا کیا اور وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی تائید سورۃ النّٰزعٰت کی ایک آیت سے ہوتی ہے جس میں پہلے آسمانی کروں کے متعلق ہے رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا (۷۹/۲۸)۔ "اس نے آسمان کی بلندی کو اونچا کیا اور اُسے ٹھیک ٹھیک بنایا"۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا (۷۹/۳۰)۔ "اور اس کے بعد کرۂ ارض کو دور پھینک دیا"۔ اس نے تو بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۔ ۔ ۔ ۔ (۲۱/۳۰)۔ ابتداءً تمام کائناتی کروں (ارض و سمٰوٰت) کا ہیولیٰ (NEBULAR MASS) ملا جلا ایک ہی تھا۔ بعد ازاں انہیں الگ الگ کیا گیا"۔

ان آیات کا مفہوم اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ آیۂ زیرِ نظر میں (ثُمَّ) کا حرف ترتیب کے لئے نہیں آیا (اور) کے معنوں میں آیا ہے۔

اس حقیقت کو پھر سامنے لائیے کہ اس باب کی ابتداء ہوئی تھی اِعْبُدُوْا سے اور اس کے بعد پیدائش رزق کا ذکر آیا تھا۔ زیرِ نظر آیت میں پیدائش رزق کو پھر دھرایا گیا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتفصیل بیان کیا جا چکا ہے رزق کی پیداوار خدا کے مقرر کردہ قوانین فطرت کی رو سے ہوتی ہے اور جو شخص (یا قوم) بھی ان قوانین کے مطابق محنت کرے، اسے یہ رزق حاصل ہو سکتا ہے ـــــ اس میں "کافر و مومن" کی بھی کوئی تمیز نہیں۔

رزق اور رزقِ کریم

لیکن رزق کی ایک قسم وہ بھی ہے جسے قرآن کریم نے "رزقِ کریم" (عزت کی روٹی) کہکر پکارا ہے۔ یہ وہ رزق ہے جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا محتاج ہوتا ہے نہ محکوم۔ یہ حاصل ہوتا ہے اس نظام کے اندر جو ان قوانین کی رُو سے قائم ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے (قرآن کریم میں) انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے متعین کیا ہے۔ یہ رزق اس "اُعْبُدُوْا" سے مشروط ہے جسے خدا کی محکومیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ سورۃ فاتحہ کی تشریح میں دیکھ آئے ہیں۔ خدا کے محکوم بندے، خدا کے حضور اعتراف اور اعلان کرتے ہیں کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ (۱/۴) ہم تیری اور صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں، اور

اعانت طلبی اور اطاعت گزاری کا باہمی تعلق

تجھ سے اور صرف تجھ سے طلبگار اعانت ہیں"۔ اس سے واضح ہے کہ خدا سے اعانت طلب کرنے کا حق اسی کو پہنچتا ہے جو اس کی محکومیت اختیار کرے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ آج دنیا میں ہر طرف "حقوق ــ حقوق" کا شور سنائی دیتا ہے۔ لیکن ان حقوق طلب کرنے والوں کو کوئی یہ نہیں بتاتا کہ ہر حق مشروط ہوتا ہے ذمہ داری کے پورا کرنے سے۔ حقوق طلب کرنے کا حق اسی کو پہنچتا ہے جو پہلے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے رزقِ حسنہ۔ رزقِ کریم۔ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً، یا اپنی اعانت اور نصرت کے وعدوں کے ایفاء کو ایمان و عملِ صالحہ سے مشروط قرار دیا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۴۲/۲۶)۔ وہ جواب ہی ان لوگوں کی پکار کا دیتا ہے جو ایمان و اعمالِ صالحہ کی شرط پر پورے اتریں۔ ہم جو اس کی اعانت و نصرت سے محروم اور رزقِ کریم سے مہجور رہتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اِیَّاكَ نَعْبُدُ کی شرط پوری کئے بغیر اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہتے رہتے ہیں۔

اس وضاحت پر اس باب کو ختم کیا جاتا ہے۔

خلاصہ باب

اے گروہِ نسلِ انسانی! تمہیں ان اقوام کے خود ساختہ نظام کی نگاہ فریب جگمگاہٹ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے آپ کو، اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کے تابع لے آؤ۔ وہ نشوونما دینے والا جس نے تمہیں اور تمہارے آباؤ اجداد کو پیدا کیا، اور کائنات کی اس قدر تخریبی قوتوں کے باوجود، نسلِ اِنسانی کو مختلف مراحل میں سے گذارتے ہوئے اس مقام تک لے آیا (۲/۲۱)۔ بس یہی ایک طریق ہے جس سے تم راستے کے خطرات سے محفوظ رہ سکو گے۔

یہ حفاظت تمہیں خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کی رو سے مل سکے گی جس کے مطابق اس نے تمہارے لئے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کر دیا۔ اوپر فضا میں کُرّے بکھیر دیئے تاکہ باہمی کشش و جذب سے یہ اپنی اپنی جگہ برقرار رہیں۔ پھر ایسا انتظام کر دیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمہارے لئے سامان رزق پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملا ہے۔ اس پر ملکیت خدا ہی کی ہے، تمہیں صرف اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا تم ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اس کا مالک بنا دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ، جانتے بُوجھتے، خدا کے ساتھ شرک ہوگا۔ ذرائع پیداوار پر ذاتی ملکیت (خواہ وہ کسی کی ہو) انسانوں کو خدا بنا دینا ہے۔ انہیں تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ (۲/۲۲)

اگر تم اس قدر محکم دلائل و شواہد کے باوجود، اس باب میں کسی شک و شبہ یا نفسیاتی اُلجھن میں مبتلا ہو کہ جو ضابطۂ زندگی ہم نے، اپنے بندے کی وساطت سے، تمہیں دیا ہے، وہ واقعی حقیقت پر مبنی ہے یا نہیں، تو اس کے دور کرنے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ اِنسانی زندگی کے لئے جو نقشہ یہ ضابطہ پیش کرتا ہے، اس کے بجائے کوئی متبادل نقشہ تم مرتب کر کے دکھاؤ —— پوری کی پوری عمارت کا نہیں تو اس کی ایک منزل ہی کا سہی —— یعنی اس ضابطہ کی کسی ایک شق جیسی شک بنا کر لاؤ (۱۰/۳۸ و ۱۱/۱۳)۔ اس کے لئے کسی ایک شخص پر ذمہ داری ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ جتنے ادیب و مفکر اور تمدنی اور سیاسی مقنن تمہارے معاشرہ میں پائے جاتے ہوں، ان سب کی ایک کمیٹی بنا لو، بس ایک اللہ کی وحی کو الگ چھوڑ دو، اور ان سے کہو کہ ایسا کر کے دکھائیں۔ اگر تم واقعی اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ تم اس کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ یہ ضابطہ خدا کی طرف سے ہے یا نہیں، اور محض اپنی مفاد پرستیوں سے چمٹے

رہنے کی خاطر شکوک و شبہات کا ساز نہیں بجا رہے، تو تمہیں اس چیلنج کو قبول کر لینا چاہیئے۔

لیکن اگر تم نے ہمارے چیلنج کو قبول نہ کیا ــــ اور ہم بتائے دیتے ہیں کہ تم اسے ہرگز قبول نہیں کرو گے ــــ اور عقل و بصیرت کی رو سے بات سمجھنے کی کوشش نہ کی بلکہ اپنی مخالفت میں اندھا دھند آگے بڑھتے گئے اور حق کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو گئے، تو اس کا نتیجہ وہ تباہی و بربادی کا جہنم ہوگا جس میں تمہارے عوام اور خواص، اور چالاک لیڈر اور ان کے متبعین، سب اپنی دولت و حشمت کے ساتھ، جا گریں گے ــــ خواہ یہ جنگ کی صورت میں ہو، جس کی آگ انسانوں کے ہاتھوں سے اور معدنی آلات حرب و ضرب کے ذریعے بھڑکائی جاتی ہے۔ اور خواہ غلط نظام زندگی کے تباہ کن انجام کی شکل میں ہو۔ بہرحال یہ وہ جہنم ہے جو صحیح ضابطۂ حیات سے انکار اور سرکشی برتنے والوں کے اعمال نے ان کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ (۶۶/۶)

اس ٹکراؤ میں اس جماعت کے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں جو قوانین خداوندی اور زندگی کی بلند اقدار کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے، اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتی ہے۔ اے رسول! تو انہیں خوشخبری دیدے کہ ان کے لئے ایک ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے گا جس کی شادابیاں سدا بہار، اور جس کی آسائشیں زوال ناآشنا ہوں گی (۱۴/۷۵؛ ۱۳/۳۵)۔ اِس زندگی میں خزاں نادیدہ بہاریں، اور بعد کی زندگی میں بھی حیاتِ جاوید۔

خوشگواریوں اور سرفرازیوں کے یہ وعدے تمہاری موجودہ جماعت کے ساتھ مخصوص اور اسی تک محدود نہیں۔ جب اور جہاں بھی کسی جماعت نے ایسی روش اختیار کی، اس کا یہی نتیجہ نکلا (۲۴/۵۵؛ ۳۹/۷۴) اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ ان اعمال کے نتائج ہمیشہ ایک جیسے ہوتے ہیں، البتہ ان کے پیکر زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ملتے جلتے ہیں۔

اس معاشرہ میں ان کے ساتھ اور لوگ بھی ملتے اور ان کے رفیق بنتے جائیں گے۔ یہ بھی ان ہی جیسی پاکیزہ سیرتوں کے حامل ہوں گے۔ جب تک یہ معاشرہ قوانین خداوندی کی بنیادوں پر استوار رہے گا، یہ اپنے پھل اسی طرح دیتا جائے گا۔ اس میں فساد اور تغیر واقع نہیں ہوگا۔

ہم نے اس معاشرہ کو ایک سرسبز و شاداب باغ (جنّت) کہہ کر پکارا ہے، اور ان کے اعمالِ حسنہ کے نتائج کو لذیذ پھلوں سے تشبیہہ دی ہے تو اس لئے کہ بلند حقیقتیں، محسوس تشبیہات سے سمجھائی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا، یہ بات شانِ خداوندی کے منافی نہیں کہ وہ حقائق کو تمثیلات کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ اس نے جنّتِ اُخروی کو

بھی تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ (۱۳/۳۵) یہ تو خیر پھر بھی باغات اور پھلوں کی مثالیں ہیں، اگر ضرورت پیش آئے تو اُسے اس میں بھی کسی قسم کا باک نہیں ہوگا کہ وہ مچھر جیسی حقیر شئے، یا اس سے بھی کسی کم تر چیز کی مثال دے کر بات واضح کردے۔ جو لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے (وحی کے ذریعے) بیان ہو رہا ہے، وہ ان مثالوں سے سمجھ جائیں گے کہ یہ، اُن کے نشو و نما دینے والے کی طرف سے حقیقتِ ثابتہ ہے۔

لیکن جو لوگ اس بنیادی حقیقت ہی سے انکار کرتے ہیں وہ ان تمثیلات اور تشبیہات میں بھی ہزار نقص نکالیں گے، اور کہیں گے کہ اس قسم کی مثالوں سے بالآخر مقصد کیا ہے؟ ۔ یوں بھی تشبیہہ اگر سچی بات سمجھانے کے لئے ہو تو اس کے نتائج حقیقت کشا اور بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ اور اگر باطل کی نقاب پوشی کے لیۓ ہو تو اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی سے فتنے پھیلتے ہیں۔ اس سے تم سمجھ لو کہ ایک ہی بات سے کس طرح دو متضاد نتیجے اخذ کیۓ جاسکتے ہیں۔ فرق زاویۂ نگاہ کا ہوتا ہے۔ ایک اندازِ نگاہ سے دیکھو تو اسی سے گمراہی کے راستوں پر جا پڑو۔ اور دوسری سے دیکھو تو اسی سے کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہیں کشادہ ہو جاتیں ہیں لیکن غلط راہوں پر صرف وہ لوگ چل نکلتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کے قالب کے اندر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ان سے گریز کی راہیں نکال کر، اپنے لیۓ الگ راستے اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو ان تمام ذمہ داریوں کے قبالہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں جو اُن پر خدا کی ربوبیتِ عالمینی کی رُو سے عائد ہوتی ہیں، نیز اُس عہد کو بھی توڑ ڈالتے ہیں جو انہوں نظامِ خداوندی سے باندھا تھا (۹/۱۱۱) اور اس طرح انسانیت کے تمام رشتوں کو منقطع کرکے (۱۳/۲۱؛ ۱۳/۲۵) اُسے نسلوں، برادریوں، وطنوں، قوموں کے غیر فطری امتیازات سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور انفرادی یا قومی مفاد پرستی کو زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں، حالانکہ خدا کے قانونِ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ ان رشتوں کو جوڑ کر، تمام نوعِ انسان کو ایک برادری کے افراد اور ایک درخت کی شاخیں سمجھا جاتے (۲/۲۱۳؛ ۱۰/۱۹؛ ۳۱/۲۸)۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور آخر الامر تباہی اور بربادی کے سوا ان کے حصے میں کچھ نہیں آتا۔

ان لوگوں سے (جن کی روشِ زندگی کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے) کہو کہ تم قانونِ خداوندی کا انکار کس دلیل سے کر سکتے ہو، جبکہ خود تمہاری اپنی ہستی اس کی زندہ شہادت ہے۔ تم کسی انداز سے بھی غور کرو، اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک وقت ایسا تھا کہ کرۂ ارض پر زندگی کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ یہ پورا کرۂ بے جان مادہ کا ڈھیر تھا۔ پھر اس میں زندگی کی نمود ہوئی اور وہ اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی پیکرِ انسانی تک پہنچی۔ (اس سے پہلے تم زندہ انسان تو ایک طرف کوئی قابلِ ذکر شئے تک نہیں تھے (۷۶/۱))۔ اس مقام پر پہنچ کر تم جیتے جاگتے انسان

بن گئے اور اس قابل ہو گئے کہ تمہیں "تم" کہکر پکارا جاسکے (۳۹/۹)۔ - اس سے ظاہر ہے کہ زندگی تمہاری پیدا کردہ نہیں اِسے خدا ہی نے عطا کیا ہے۔

اس کے بعد جب تم طبیعی قانونِ خداوندی کے مطابق مرجاؤ گے تو خدا کیلئے کونسی مشکل ہو گی کہ تمہیں پھر زندہ نہ کر سکے (۳۷/۵۸؛ ۴۰/۱۱؛ ۴۴/۵۶)۔ لہٰذا، موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ زندگی آگے چلتی ہے مکافاتِ عمل کے لئے۔ اس لئے تم اس قانون کی گرفت سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔ تم اس سے ہزار بھاگنے کی کوشش کرو، تمہیں آخر الامر اس کی طرف لوٹ کر آنا ہوگا ـــــ بلکہ یوں سمجھو کہ اب بھی تمہارا قدم اسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔

یہ قانون اس خدا کا متعین کردہ ہے جس نے تمہیں اس زمین پر پیدا کیا تو تمہارے لئے سامان نشو و نما بھی ساتھ ہی مہیا کر دیا۔ پھر تم کائنات کی پہنائیوں میں غور کرو کہ اس میں متعدد اجرامِ فلکی کس توازن و اعتدال کے ساتھ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہیں (۵۷/۱-۲)۔ یہ بھی خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ اُس خدا کے قانون کے مطابق جو ہر شے کی مضمر قوتوں اور تقاضوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔

ارض و سما کا یہ کائناتی نظام اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ انسانوں کے اعمال کے ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب ہوں (۵۳/۳۱؛ ۱۱/۷؛ ۴۵/۲۲) اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے انسانی خصوصیات اور کائنات میں اس کے مقام کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اُسے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے، جو درحقیقت خود انسان ہی کی سرگذشت ہے۔ (مفہوم القرآن)

اس باب میں نوعِ انسان سے متعلق اصولی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے انسان کی تمدنی زندگی کا ذکر کیا ہے اور اس کا آغاز "قصۂ آدم" کے تمثیلی بیان سے کیا گیا ہے اسے ہم اس کتاب کی دوسری جلد پر اٹھا رکھتے ہیں۔

ے باقی و ماہتاب باقیست ٭ ما را تو صد حساب باقیست

والسلام

